Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

Join us on Google+

Get Notifications About Newly Uploaded Books

Click Here to Join

www.urdusoftbooks.com

شعبہ	عنوان	صفحہ	تعارف	مصنف
سرگزشت	شاعرِ جذبات	07	ایک صفحے میں مکمل، مختصر مختصر، ایک نادر روزگار کا تعارفِ خاص	ادارہ
گفت وشنید	شہرِ خیال	08	آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال	مدیر اعلیٰ
شخصیت	قصیدہ گو	16	اس کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی	ڈاکٹر ساجد امجد
فلم نگری	لازوال	47	اس نے موت سے قبل پاکستان چھوڑ دیا تھا	انور فرہاد
مشعل راہ	فخرِ انسانیت	63	خدمتِ خلق کی اس نے نادر مثال پیش کی ہے	زویا اعجاز
روداد	ملکہ مارجوری	69	ایک ملکہ کی داستانِ عشق کا سبق آموز قصہ	سلمیٰ اعوان
سفر کہانی	شمشال سے ٹورنٹو	77	جانبِ شمال کا شہکار ایک ایک الگ انداز کی داستان	ندیم اقبال
تحریر خاص	جولائی کی شخصیات	104	اس ماہ سے جڑی اہم شخصیات کا ذکرِ خاص	صائمہ اقبال
خراجِ تحسین	قابلِ فخر	117	ان قابلِ فخر شخصیت کا تذکرہ جنہوں نے مثال رقم کی	شکور پٹھان
پراسرار	وقت کی جست	139	ایک ایسا واقعہ جس کی توجیہہ پیش کرنا ناممکن ہے	ابن کبیر
جنگ عظیم	عیار حسینہ	149	دوسری جنگِ عظیم کا عبرت بھرا واقعہ	شکیل صدیقی
حیرت انگیز	بدنصیب	155	ان افراد کا تذکرہ جن کے تعاقب میں بد قسمتی تھی	شمائلہ حسن

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

❁ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

UrduSoftBooks

تاریخ — 159
تاریخ عالم
کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر
منظر امام

معاشرت — 166
سراب
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان
[illegible]

پہلی سچ بیانی — 202
فلرٹ
اس نے مفاد کی خاطر خطرہ مول لیا تھا
مہناز

دوسری سچ بیانی — 215
بے حسی
بیٹی اغوا ہوئی ماں نے دعا کی کہ اب وہ واپس نہ آئے
اختر شہاب

تیسری سچ بیانی — 227
سزا
ایک ناقابل فراموش عبرت اثر واقعہ
شہناز احمد

چھوتی سچ بیانی — 239
صحیح راستہ
اس نے دانستہ دوست کی شادی رکوادی
اسلم فاروق

پانچویں سچ بیانی — 245
پولیو زدہ محبت
گھر والوں کے لیے اس نے بے شمار قربانیاں دیں
محمد جمیل اختر

چھٹی سچ بیانی — 251
مظلوم ظالم
وہ لڑکی عجیب و غریب فطرت کی تھی
کلثوم اشفاق

ساتویں سچ بیانی — 261
فریب نظر
ایک معمولی سی بات نے کیسا رخ اختیار کرلیا
اعجاز احمد راحیل

آٹھویں سچ بیانی — 268
جڑواں
اندھیری رات میں اس کے ساتھ عجیب حادثہ گزرا
طارق عزیز خان

نویں سچ بیانی — 275
کالا علم
کیا واقعی اس پر کالا علم ہوا تھا
سائرہ

سوغات — 000
پارچے
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے
قارئین / ادارہ

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

www.urdusoftbooks.com

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

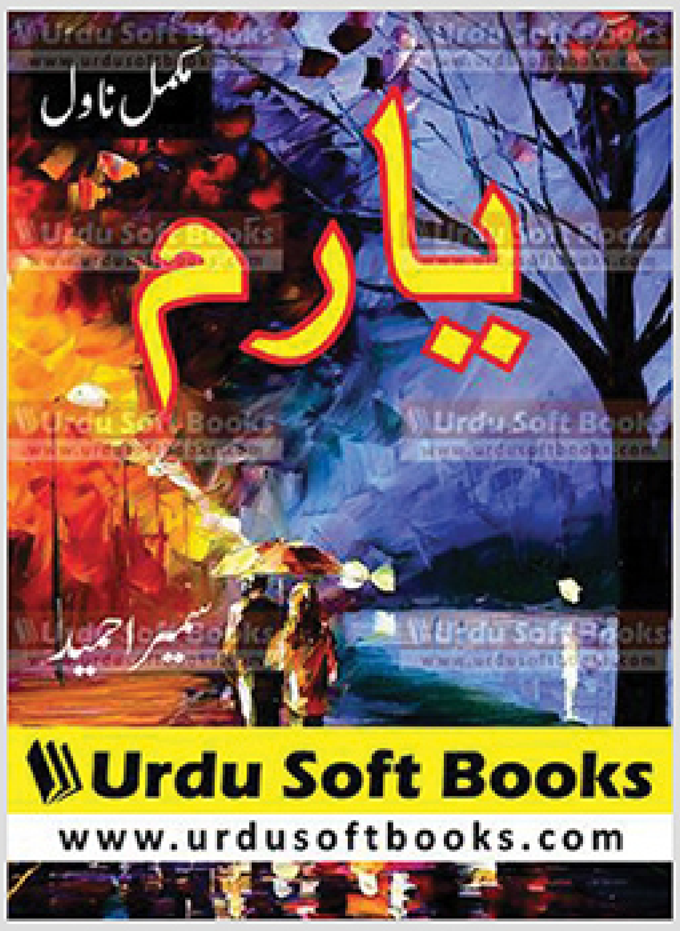

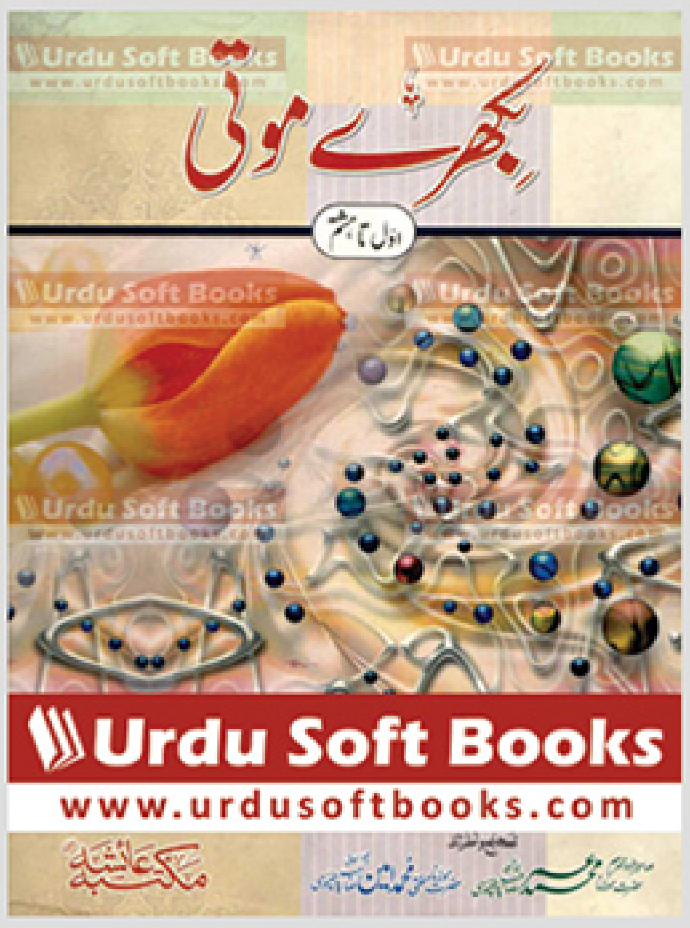

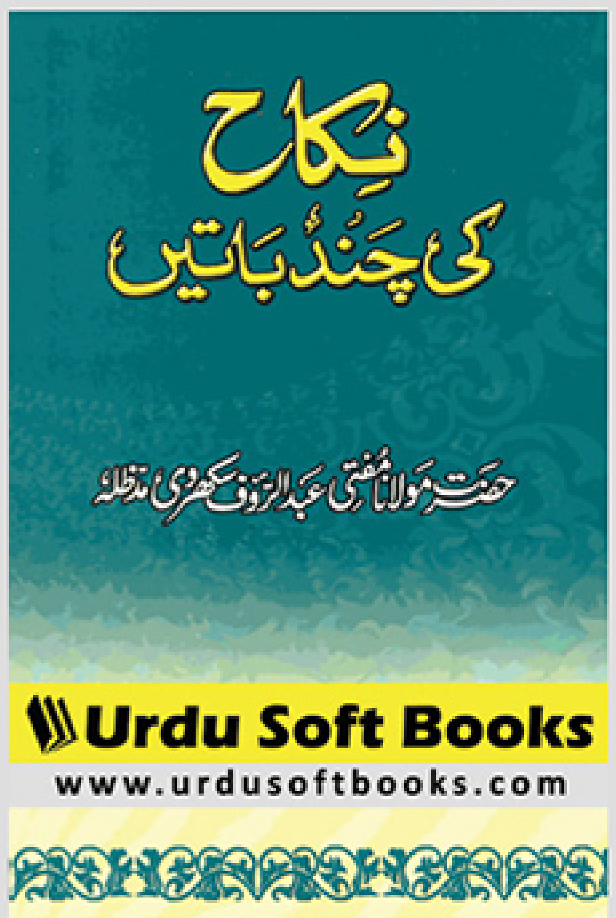

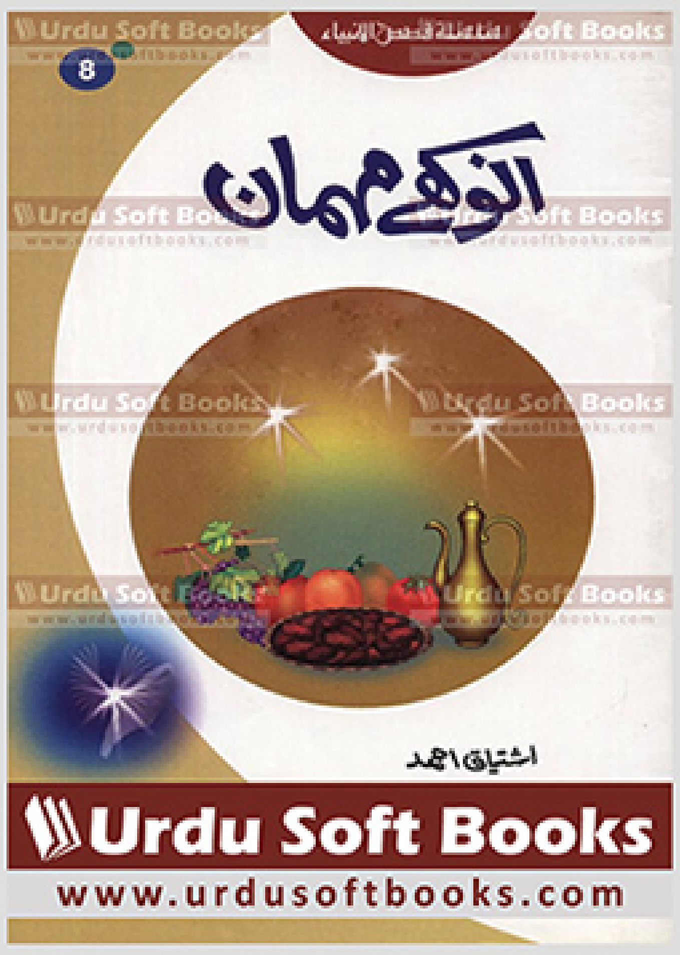

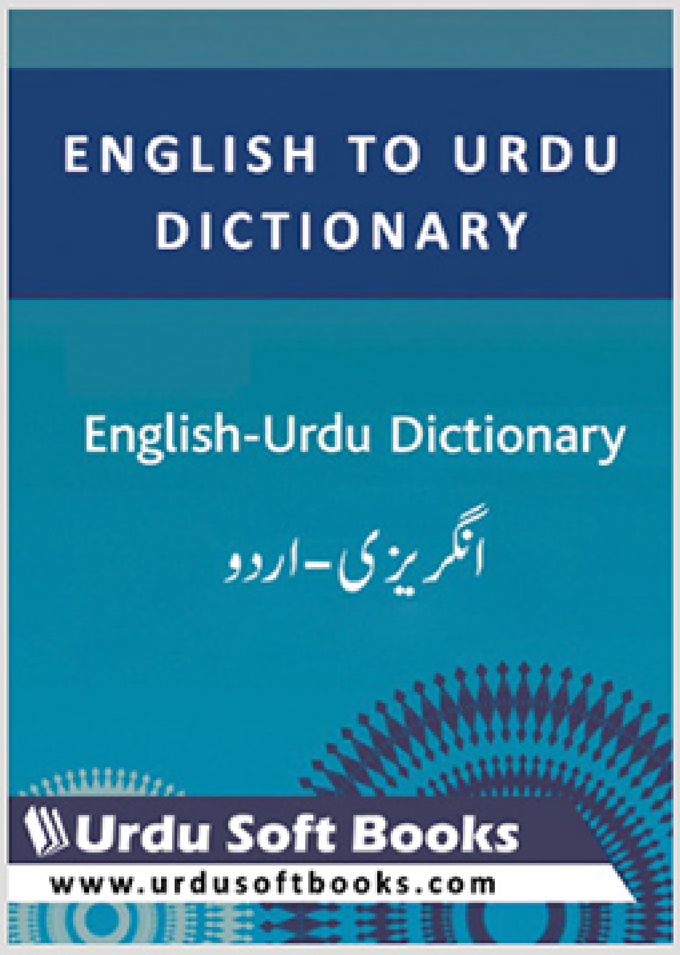

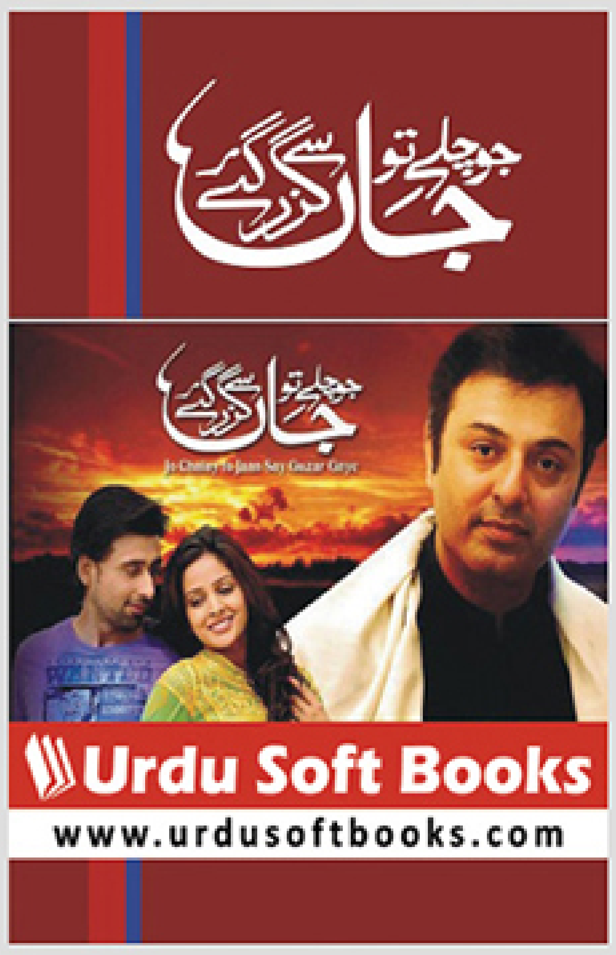

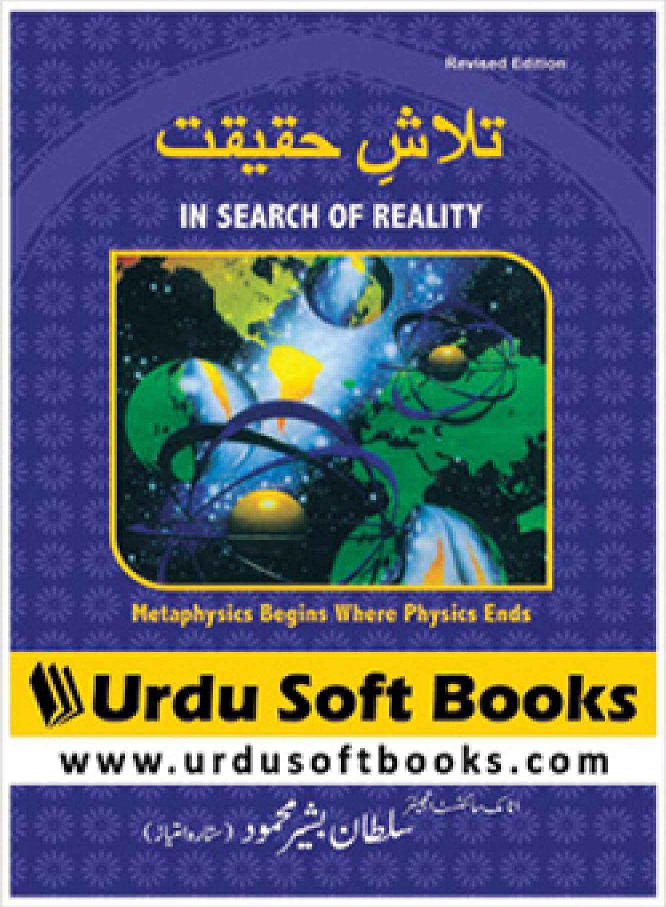

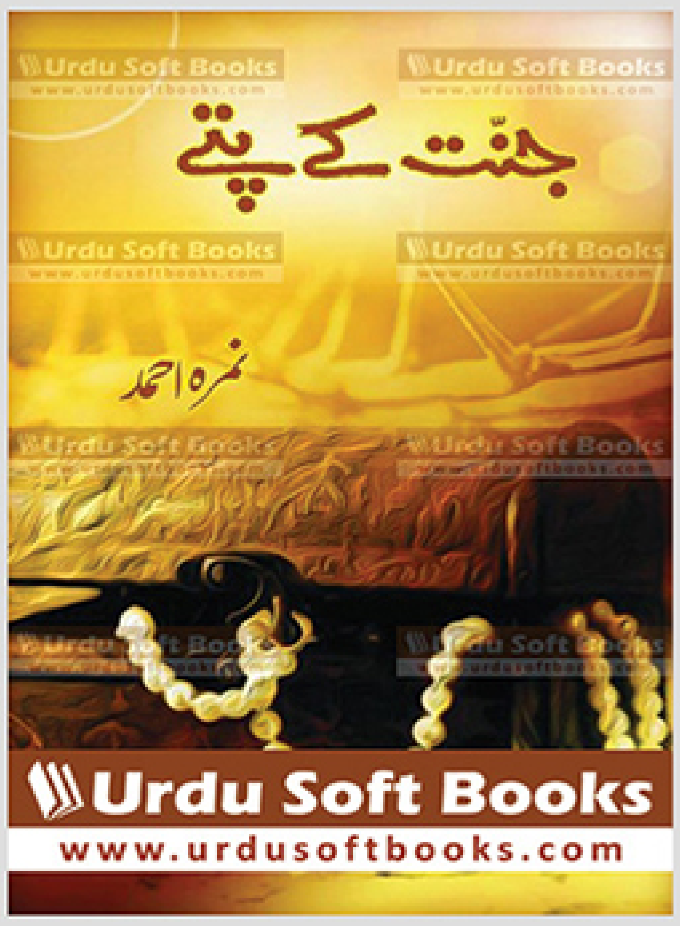

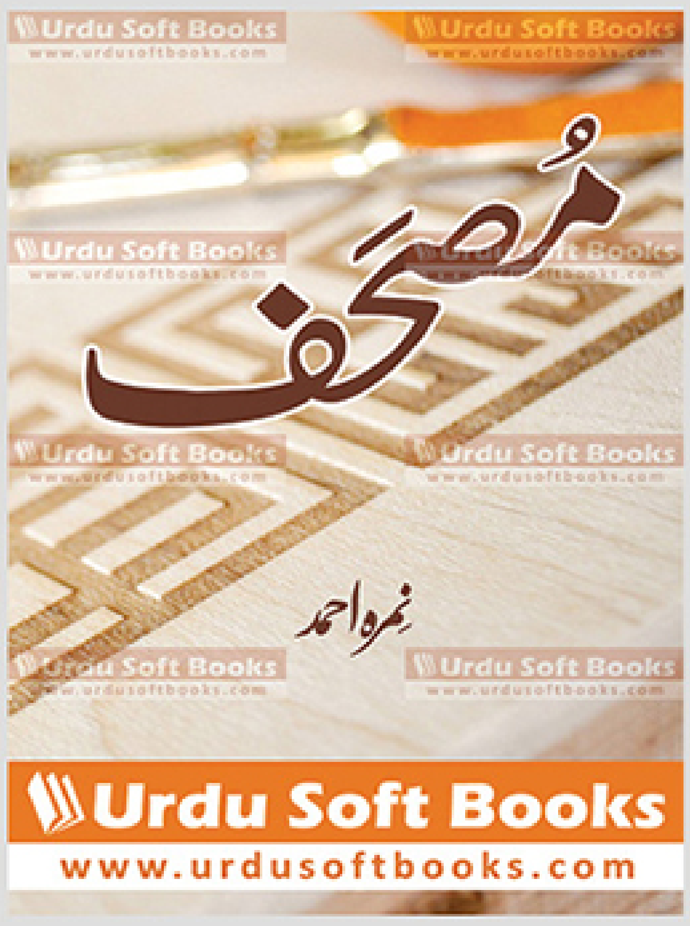

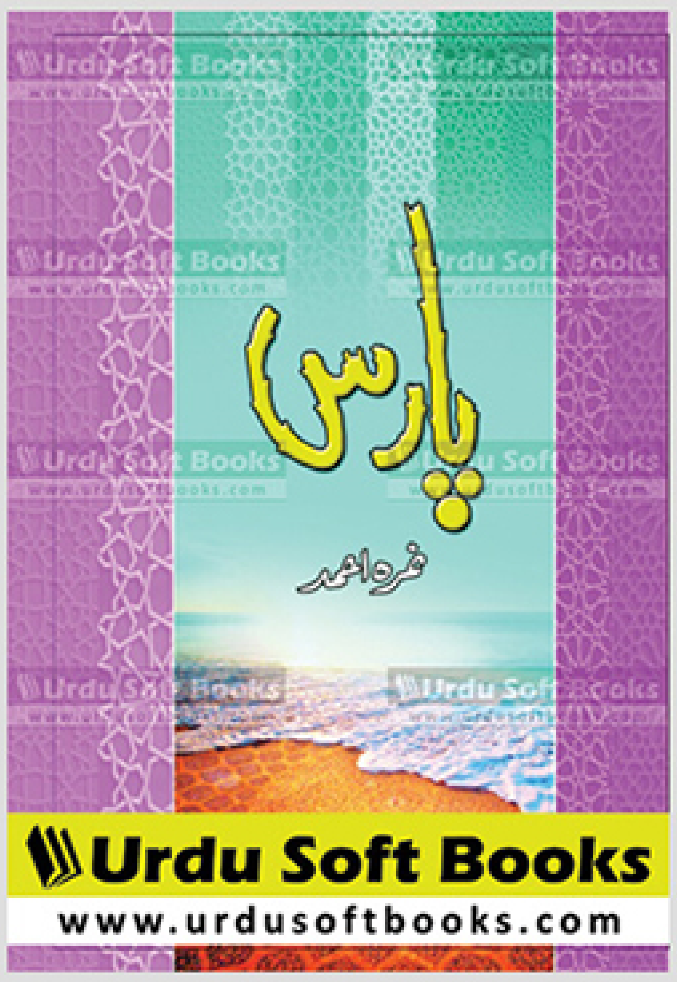

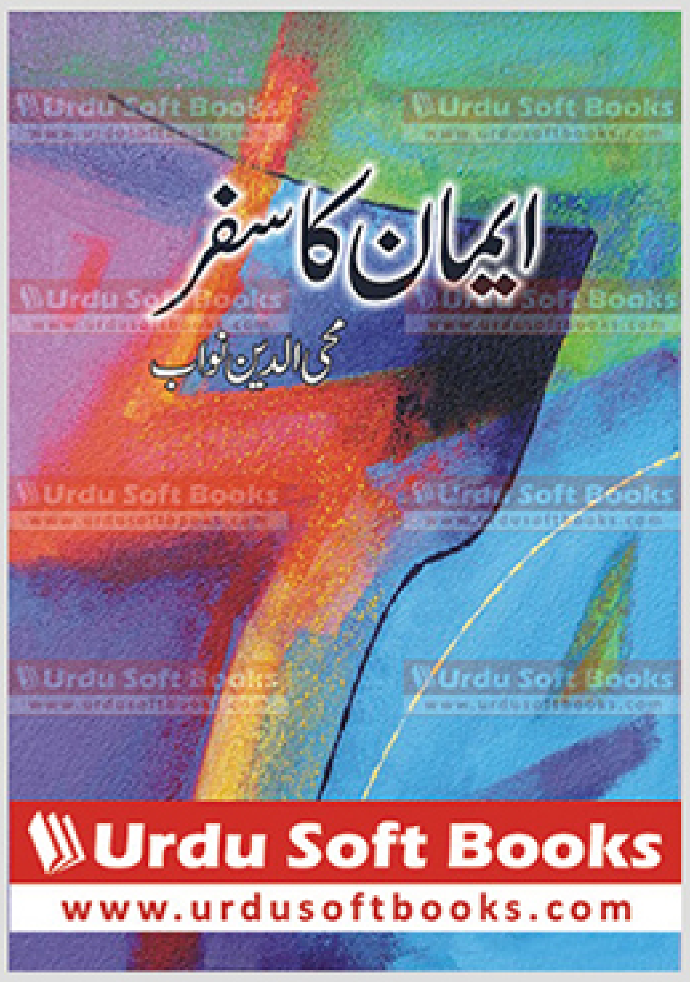

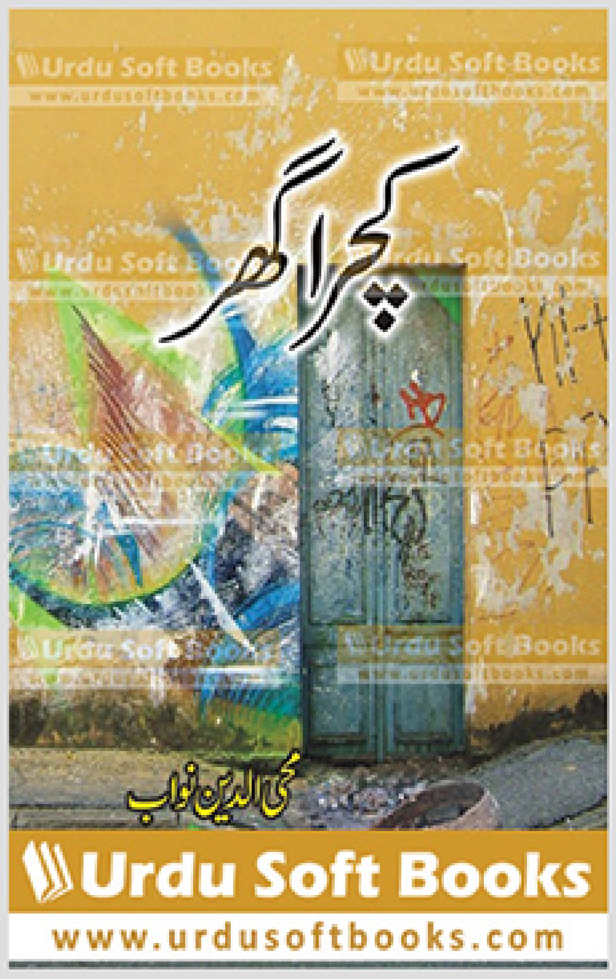

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 26 ❖ شمارہ 06 ❖ جولائی 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کیوں نا اس ماہ بھی ایک کہانی سنا دوں؟ عنوان ہے ”کوئی بھول ہوئی ہے“۔ کہانی کچھ یوں ہے ”مسجد کے سامنے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ایک پولیس والا نہایت تیزی سے مسجد سے نکلا۔ سفید گول ٹوپی کو جیب میں رکھا اور سیدھے سامنے کھڑے پھلوں کے ٹھیلے پر پہنچا۔ کئی اچھے اچھے پھل چنے۔ شاپر میں رکھا اور دوسرے ٹھیلے پر پہنچا۔ وہاں سے بھی کچھ پھل منتخب کر کے تیسرے ٹھیلے پر پہنچا جہاں میں (مصنف) کھڑا تھا۔ ابھی وہ پھل اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے پوچھا ”ان سے آپ افطار کریں گے؟“ پولیس والے نے جواب دیا ”اور کس لیے اٹھا رہا ہوں؟“ میں نے کہا ”کیا ان پھلوں سے افطار کریں گے تو روزہ قبول ہوگا؟“ اس نے خونخوار نگاہوں سے دیکھا پھر کہا ”کیوں نہیں ہوگا۔ آخر سیاست داں بھی تو حج و عمرہ کرتے ہیں۔“ اس کہانی کو پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں واقعی ہم سے کہیں نہ کہیں بھول ہوئی ہے جو آج معاشرہ بے لگام ہو رہا ہے۔ ایسے وقت میں مجھے مولانا حالی کا شعر یاد آ رہا ہے

”اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
مومن ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہ باں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے۔“

معراج رسول

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

شاعرِ جذبات

دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے ضلع میانوالی کا ایک گاؤں تھا۔ اس وقت وہ گاؤں ضلع بنوں میں آتا تھا اور عام سا گاؤں تھا جہاں تعلیم کا کوئی بھی چرچا نہ تھا۔ یوں بھی وہ گاؤں ساٹھ ستر پھوس کے جھونپڑی نما گھروں پر مشتمل تھا۔ اسی گاؤں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ قدرتی مناظر، شاداب میدانوں اور سرسبز کھیتوں کے درمیان وہ عمر کی منزلیں طے کررہا تھا۔ کبھی کبھی بادوباراں کی ستم دانی اور دریائے سندھ کی طغیانی ناقابلِ برداشت بھی ہوجاتی تھی مگر یہ مناظر اس کے لیے نت نئی دلچسپیوں کا باعث ہوتے اور وہ مناظر اس پر سحر طاری کردیتے۔ وہ کھوسا جاتا۔ ایک بے نام سی امنگ اس کے دل میں پیدا ہوجاتی۔ جب ساون بھادوں میں دریا چڑھاؤ پر ہوتا تو اس کے دل میں بھی ایک عجیب سا تموج پیدا ہوجاتا گویا شعر کہنے سے پہلے طبیعت نامعلوم طور پر شعر گوئی کے لیے تیار ہورہی تھی۔ چنانچہ سن شعور پر پہنچتے ہی اس نے کئی نظموں میں اس کا اظہار کردیا۔ دیگر دیہات کی طرح اس کے ہاں بھی دستور تھا کہ چھوٹی عمر میں اسکول نہ بھیجا جائے۔ اسے بھی سات سال کی عمر میں اسکول بھیجا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے آزاد کے دلکش طرزِ بیان نے اسیر کرلیا تھا۔ اسی دور میں اس کے ہاتھ مجموعہ قصص آگیا۔ اس میں منظوم قصے سہل زبان اور چھوٹی بحر میں تھے۔ انہیں وہ بار بار پڑھا کرتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خود بخود موزوں مصرعے زبان پر آنے لگے۔ پانچویں میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی نظمیں کہنے لگا۔ ابتدا سے ہی وہ صحیح وزن میں شعر کہنے لگا تھا۔ گو کہ اس کی مادری زبان ملتانی (سرائیکی) تھی مگر پڑھے لکھے لوگوں کی اور کاروباری زبان اردو تھی اسی لیے وہ اردو کو فوقیت دیتا تھا۔ پھر اردو زبان پر اس کی گرفت بھی بہت مضبوط ہوگئی تھی اور سرعبدالقادر جیسے نقاد کو گنج معنی کے دیباچے میں لکھنا پڑا۔ ”جب تک میں نے اسے دیکھا نہ تھا اسے یوپی کے کسی شہر کا باشندہ سمجھتا رہا۔“ جب کہ خود اس نے بہت پہلے اقرار کرلیا تھا۔ ”دیکھی ہے میں نے دہلی نہ دیکھا ہے لکھنو۔ خود روبروئے اہلِ زباں شرمسار ہوں۔“ خیر جناب! پانچویں کے بعد چھٹی ساتویں اور آٹھویں میں اردو، فارسی میں خوب دلچسپی لی۔ میر، سودا، غالب، مومن ذوق جیسے قدیم شعرا کے ساتھ اس دور کے شعراء میں حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی کو بھی دلچسپی سے پڑھا۔ 1901ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا اس وقت وہ ساتویں میں تھا۔ ملک بھر کی طرح اس کے اسکول میں بھی سوگ میں جلسہ منعقد ہوا جس میں اس نے مسدس کی صورت ایک طویل مرثیہ کہہ کر سنایا جس کی دھوم پورے ضلع میں ہوگئی۔ انہی دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکول معائنہ کے لیے آگئے۔ اساتذہ نے اسے ان کے سامنے فخر سے پیش کیا۔ انہوں نے کلام سنانے کی فرمائش کی تو اس نے خدمتِ والدین کے عنوان سے ایک طویل نظم سنادی جسے سن کر انسپکٹر نے اس کے لیے نہ صرف تعریفی اسناد جاری کی بلکہ ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم کو بھی خط لکھا جس پر ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت خوشنودی کا پروانہ بھی آیا جس نے اس کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول میں پہنچا تو بطور شاعر اس کی شہرت پہلے سے پہنچی ہوئی تھی۔ یہ ہائی اسکول بنوں میں تھا جہاں اکثریت پشتو بولنے والوں کی تھی جن کی اردو پر وہ خوب ہنسا کرتا۔ اس لیے کہ اکثر قبائلی لڑکے پتلی دال کو ”دبلا دال“ کہتے۔ بنوں میں اس کے حلقۂ احباب میں ایسے لوگ شامل ہوتے گئے جو فکروسخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے اس کی قوتِ فکر کو جلا ملنے لگی۔ 1906ء میں جب وہ دسویں میں تھا۔ ”زمانہ“ کانپور اور ”مخزن“ لاہور میں تواتر سے اس کی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ زمانہ کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم خطوط سے خوب حوصلہ افزائی کرتے۔ اب اس نے سیاسی اور قومی نظمیں بھی کہنا شروع کردی تھیں جو ملک بھر کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد 1907ء میں وہ ایک سال کے لیے سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں مدرسی کی تربیت کے لیے داخل ہوا۔ لاہور آیا تو اخبار ”صدائے ہند“ کے ایڈیٹر دین محمد کی طرف سے منعقد مشاعرے میں شرکت کی جس میں ملک کے نامور شعراء آئے ہوئے تھے۔ 08-1907ء میں اس نے خوب خوب سیاسی نظمیں کہیں جو مختلف اخبارات میں شائع بھی ہوئیں اور انگریز حکومت کی جانب سے پرسش بھی ہوئی۔ لاہور کے سینٹرل کالج سے فارغ ہوکر وہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مشن اسکول میں ملازمت کرنے لگا۔ یہیں رہتے ہوئے اس نے 1916ء میں اخلاقی، معاشرتی نظموں کا پہلا مجموعہ ”کلام محروم“ شائع کرایا جسے پڑھ کر اکبر الہ آبادی نے کہا۔ ”ہے داد کا مستحق کلام محروم۔ ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم“ جواب میں اس نے بھی رباعی میں اخبار کی معرفت شکریہ ادا کیا جس کا ایک شعر تھا۔ ”آیا مجھ کو یقین کہ شاعر ہوں۔ جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی“۔ کلام محروم کے بعد اس کے اور بھی بہت سے مجموعے آئے ”گنج معانی، رباعیات، کاروانِ وطن، نیرنگ معانی، بہارِ طفلی، کلام محروم حصہ دوم اور شعلہ نوا نے خوب پذیرائی حاصل کی۔ اس شاعرِ جذبات کو ہم تلوک چند محروم کے نام سے پہچانتے ہیں.............☆☆

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

شہرِ خیال

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا اظہاریہ کراچی سے۔ ”رمضان جیسے بابرکت تہوار میں ہماری سالگرہ پر سرگزشت ہمیں کسی بہت ہی عزیز اور دل پسند مہمان کی طرح ملا۔ اس میں شامل اکثر تحریریں ہمارے لیے کسی سرپرائز اور خوب صورت تحفوں سے کم نہ تھیں۔ شاندار اداریہ اور ”مصنفہ“ نے دل لبھایا تو شہرِ خیال کی اوجِ ثریا پر اعجاز حسین سٹھار کو براجمان دیکھ کر گردن میں تھوڑی تکلیف ہوئی لیکن دل خوش ہو گیا۔ تبصرہ بھی خوب تھا۔ محمد خواجہ کورنگی میں کہیں بستے ہیں اور ہم بھی یہیں پائے جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی قوم کے ڈپریشن میں معراج رسول مبتلا تھے۔ عاقبت نااندیش رہبرو رہنما ہم نے خود چنے جو ہم پر مسلط ہو کر وہ کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ چند ٹکوں کے عوض ہمارے سرکاری ملازم غیر ملکیوں کو شہریت دے دیتے ہیں اور رہنما چند ووٹوں کی خاطر ان کو تحفظ، ایٹمی طاقت کا زعم اس وقت پارہ پارہ ہو جاتا ہے جب دوست نما دشمن ہمیں ہماری اوقات یاد دلا دیتے ہیں کیونکہ رہبر ہمارے کاسہ لیس ہیں۔ سدرہ بانو، بشریٰ افضل، فلک شیر اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات خوشگوار رہی۔ مسلم رشید کا سندیسہ سب سے دلچسپ تھا۔ حکیم الشعراء کی رباعیوں نے دل جیت لیا۔ فریضہ حج کی ادائیگی کو سفرنامے میں پہلے شہاب نامے میں قدرت اللہ شہاب ڈھال چکے ہیں لیکن احمد حسین صاحب کے سفر حج کا منظرنامہ پڑھ کر یقین ہے کہ مکمل پڑھنے والوں کو روحانی سکون ضرور ملا ہوگا۔ ”شمشال سے ٹورنٹو تک“ میں صرف شمشال کا تذکرہ ہی اتنا پُرلطف ہے تو ٹورنٹو پہنچ کر کیا ہوگا۔ ندیم اقبال کی گلگت کی وادیوں کے بارے میں سحر انگیزی کیا کم تھی کہ سلمیٰ اعوان نے شہزادی جوار خان اور شہزادہ فردوس کی شاندار داستانِ عشق میں وادی گلگت کی سیر کروادی۔ سیر سے محظوظ ہو رہے تھے کہ شہزادہ فردوس کی روایتی انا پرستی نے افسردہ کر دیا۔ شاہی محلوں کی غلام گردشوں میں ہونے والی سازشوں کا شکار ہو کر شہزادہ کا شہزادی سے بدظن ہو جانا ایک آنکھ نہ بھایا۔ انڈین کرکٹ اسٹار ویراٹ کوہلی کو زویا اعجاز کا خراجِ تحسین کھلاڑی کے شایانِ شان تھا۔ حالیہ آئی پی ایل میں اس کی ریکارڈ توڑ کارکردگی اچھی رہی۔ منظر امام کے کارناموں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ نگینے لوگ کراچی کے نگینوں پر شکور پٹھان کا احسان ہے جسے ہم ہر سال یاد رکھیں گے۔ جون میں اپنی سالگرہ پر کراکاٹوا کا تحفہ جہاں اچھا لگا وہاں آخری امتحان اور پُراسرار قاتل وہ مہمان ثابت ہوئیں جو کسی کی خوشی میں شرکت تو کرتے ہیں مگر واجبی سے انداز میں۔ ”ذرہ بنا آفتاب“ زوال پذیر ہو کر غروب ہو گیا۔ ”دیا اور طوفان“ سے لے کر ”کبڑا عاشق“ تک کے تمام سفر میں ہم رنگیلا کے شریک رہے ہیں۔ انور فرہاد اگر یہ بھی فرما دیتے کہ ان کے زوال میں اداکار اورنگزیب کی بدقسمتی بھی شامل رہی ہے جس کو رنگیلا نے ہیرو ثابت کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ جون کی شخصیات میں سب کی سب شخصیات ہمیشہ شاندار ہوا کرتی ہیں لیکن اس مرتبہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کا تذکرہ ہمارا پسندیدہ ترین تحفہ تھا۔ صائمہ اقبال سے گزارش ہے کہ شخصیات کے انتخاب میں صرف تاریخ پیدائش کو پیرامیٹر بنائیں تو آپ کی تحریر کو تاریخی دستاویز کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ ”بیت بازی“ میں اشفاق حسین میمن کا شعر بہت ہی خوب صورت تھا۔ آخر میں آپ کا شکریہ کہ 5 جون کو دنیا میں ہماری آمد پر ہمیں خوب صورت تحفوں سے نوازا۔ ”سراب“ نے اپنا رنگ جما لیا ہے پہلے سے بھی بہتر ثابت ہوئی۔ سچ بیانیوں میں رشتے اور بزدل نے خاص مزہ دیا۔ وی آئی پی ہمارے معاشرے کی عکاس ہے۔ گمان چھوٹی سی تھی لیکن پسند آئی۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار کا نامہ خلوص نور پور تھل سے۔ ”دوستوں کی محفل میں شامل ہونا پھر کرسی صدارت مل جائے تو کتنے اعزاز کی بات ہے لیکن سچی بات ہے کہ اگر خط شائع ہو جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ بہر حال احباب کی حوصلہ افزائی کا شکریہ کہ یہ اعزاز ملا۔ اس بار کافی طویل خطوط شاملِ اشاعت ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم از کم معاشرے کی سچی کہانیوں، کرداروں اور شیطان صفت انسانوں پر کھل کر بحث

www.urdusoftbooks.com

ہونی چاہیے۔ ان کے اوصاف اور چھپے کر یہہ چہروں کو پڑھنے والوں کو وضاحت سے روشناس کرانا چاہیے۔ یوں اس کالم کا حق ادا ہو جائے گا اور وضاحت سے ہمیں چہروں کو پڑھنے، پرکھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ بھکر والے درجہ حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے ستا رہے ہیں اس لیے حاضری نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابتدائی کہانیاں کافی پُر پیچ اور نئے موضوعات پر ہیں کیونکہ سرگزشت ہر مکتبہ فکر کا قاری پڑھتا ہے اس لیے ہر ایک کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ کئی ایسے موضوعات اور سلسلے ہیں جنہیں میں بھی سرسری پڑھتا ہوں لیکن حقیقی زندگی سے قریب کہانیوں جیسے جرم و سزا، حادثے اور شکاریات جیسے سلسلے دیکھ کر جسم میں سنسنی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب سب کی پسند کا خیال رکھا جائے گا تو بوریت نہیں ہوگی۔ ''شکاری'' ویراٹ کوہلی کی محنت اور لگن کی عظیم داستان ہے۔ ابھی ان کی عمر محض 27 سال ہے۔ کرنے کو کافی سال پڑے ہیں۔ کامیابیوں کے کئی در کھلیں گے۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' میں رنگیلا نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں تجربات کیے اور کامیابیاں سمیٹیں۔ آخر زوال بھی زندگی کا حصہ ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں کے اصول کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے بھی لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ ''جون کی شخصیات'' میں جاوید میاں داد اور وسیم اکرم کا نام اور فوٹو دیکھ کر ہم سب کچھ بھول گئے۔ کتنی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ کیسے کھلاڑی اور جذبے تھے بس اب سب کچھ خواب لگتا ہے۔ ''سراب'' کی موجودہ قسط کو حد سے... بڑھ کر تیز چلایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ ذرا ہولا رکھیں تاکہ پڑھنے کا مزہ برقرار رہے کیونکہ مصنف صاحب اب حالات و واقعات پر مکمل قابو اور کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ ماہ بہ ماہ صفحات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ٹھیک سمت سفر کر رہے ہیں۔ سچ بیانیوں میں اوّلین کہانی پڑھ کر ہی رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ بھلا کس ''رشتے'' پر اعتبار کیا جائے۔ ذہنوں کی نفرت کتنی بربادیاں کرتی ہیں یہ کہانی ایسے حالات کا مجموعہ ہے۔ یہاں پولیس انسپکٹر کا کردار افسانوی لگتا ہے ورنہ یہ بہترین سچ بیانی ہے۔ ''حاصلِ عشق'' میں سبین کو کسی طور بھی گلزار سے ہمکلام نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے عشق کے عین سے لے کر قاف تک تمام روداد نفیس کو بتا چکی تھی۔ وہ خاوند کے ذہن میں شک اور رقابت کا کانٹا پہلے ہی بو چکی تھی۔ اب اسے بدگمان ہوتے دیر ہی کتنی لگتی بس عورت ہونے کے باوجود پہلی اور آخری عقل مندی یہ کی کہ آنے والے وقت میں مکمل طور پر گلزار سے قطع تعلق کر کے جہاں مستقبل محفوظ بنایا وہیں ضمیر کو بھی مطمئن کر لیا۔ میں انہیں اس فیصلے اور کامیابی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ ''محسن قاتلہ'' میں جو کارنامہ دونوں ماں بیٹی نے سرانجام دیا وہ ہوس پرستوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے لیکن اگر وہ ہاتھ پاؤں بچا کر یہ سب کرتیں تو خوشی کی انتہا نہ ہوتی۔ اب دونوں ایک نیک کام کرنے کے بدلے میں سزا پا کر جیل میں زندگی ضائع کریں گی۔ ''گمان'' میں پولیس محکمہ کے مسائل کی معمولی جھلک ہے، ہر اہلکار ظالم اور ناانصاف نہیں ہوتا کئی عام لوگوں سے زیادہ سازشوں کا شکار ہو کر افراتفری کی زندگی گزار رہے ہیں بلکہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو انہیں مظلوم گردانا جا سکتا ہے۔ یہاں چوہدری رب نواز کی انسان دوستی اور احسان چکانے کے جذبے کو نہ سراہنا سراسر زیادتی ہوگی۔ ''بلے والی خالہ'' جہاں خود مجبور نظر آئی وہاں اس کا کردار خطرناک بھی ہے۔ باپ اور خاوند کی طرف سے بلے کی بجائے کسی بچے کی قربانی کی فرمائش کی جا سکتی تھی تب اڑوس پڑوس اور محلّہ کیسے محفوظ رہ سکتا تھا وہ کام بڑی صفائی اور پس پردہ رہ کر کرتی تھی۔ جب تک شک سے بات یقین تک آتی، کتنے معصوم اس نام نہاد رسم کی بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔ شکر کیجیے کہ وہ غائب ہوئی ہے اور دعا کیجیے کہ وہ مر کھپ چکی ہو اور معاشرہ اس کے شر سے محفوظ ہو گیا ہو۔ ''دھندلے سائے'' اور ''تہی داماں'' کے شروع سے آخر تک واقعات الجھے ہوئے ہیں۔ ''وی آئی پی'' موجودہ حالات کا عکس ہیں ادھر ہر پارٹی کا اس کلچر پر رونا دھونا سننے پڑھنے میں آتا رہتا ہے لیکن یہ سب مذاق لگتا ہے۔ نچلا طبقہ بے بس خاموش تماشائی ہے۔ دوسروں پر الزام تراشی کرنے والے خود عمل کرنے پر تیار نہیں۔''

☆ **محمد احمد رضا انصاری**، کوٹ ادو کا خط۔ ''اداریہ میں محترم معراج رسول ایک کہانی سنا رہے تھے جو ایک تلخ حقیقت ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں تمام خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی اب تک جتنے بھی خط میں نے لکھے ہیں سب کے سب شائع ہوئے۔ انکل جی کیا ''علمی آزمائش'' اور ''بیت بازی'' کے کوپن ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں (ضرور بھیج سکتے ہیں) اور کیا میں ایک مضمون بھیج سکتا ہوں جو کہ کیپٹن کک کے بارے میں ہے (کیپٹن کک پر مفصل چھپ چکا ہے) اس بار مختلف صفحوں پر لکھے اقوال زریں بہت پسند آئے کیا میں بھی بھیج سکتا ہوں (جی ہاں ضرور بھیجیں لیکن کوشش معیاری ہوں اور حوالہ بھی منسلک ہو۔ سنی سنائی باتیں ردی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ معتبر کتابوں سے ہی اقتباس لیا کریں)۔ سلمیٰ اعوان ایک اور محبت نامہ لے آئیں۔ شمالی علاقہ جات سے بہت خوب صورت سفرنامہ نما کہانی تھی لیکن اختتام رلا دینے والا تھا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا دوسرا حصہ بھی معلومات کا خزانہ تھا۔ پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوئے۔ اگلی پیراگراف سسپنس سے بھرپور تھا۔ آخری قسط کا انتظار ہے۔ ''سراب'' کی یہ قسط بہت پسند آئی۔ ایسا لگا کہ مرحوم کاشف زبیر نے ہی لکھی ہو۔ لگتا ہے اب سراب کا اختتام ہونے والا ہے۔ کہانی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے۔ ''بیت بازی'' میں نازمین ناز، سلمیٰ شاہین، مہوش صدیقی، ندیم یامین اور فرحت اللہ کے اشعار بہت اچھے لگے۔''

☆ **اصغر عباس** نے میاں چنوں سے لکھا ہے۔ ''ابھی انکل علی سفیان آفاقی کی موت کا غم کم نہ ہوا تھا کہ انکل محی الدین نواب اللہ

www.urdusoftbooks.com

کو پیارے ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ''دیوتا'' کو میں نے کئی سال بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ ان کی تحریر کے بارے میں اتنا عرض کروں گا کہ کہانی بیان کرنے، فن اور اس میں نئے موڑ لانا اور قاری کو ساتھ لے کر چلنا نواب صاحب کا خاصا تھا۔ ان اموات کے بعد تو یقین کریں کاشف زبیر کی اچانک اور جوان موت نے ہلا کر رکھ دیا اور ابھی تک ان کے مرنے کا یقین نہیں ہو رہا۔ کاشف بھائی وہ تھے جن کی ''سراب'' نہ صرف پڑھی بلکہ اس کہانی سے میں نے کہانی لکھنا بھی سیکھی۔ سچی بات ہے کہ ابھی تک دیوتا کے سحر سے نہیں نکل سکا اور ''سراب'' تو کئی لحاظ سے میرے لیے اہم ہے۔ اللہ ان تمام پیاروں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ سرگزشت کے تمام مصنفین کو اللہ تبارک و تعالیٰ صحت اور لمبی عمر عطا فرمائے۔''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''اس ماہ ایگزام اسٹارٹ ہونے والے ہیں تو تبصرے سے معذرت چاہتا ہوں۔ ''شہرِ خیال'' کے دوستوں عمران جونانی، طاہرہ گلزار، رانا شاہد، سدرہ بانو سمیت سبھی قارئین کو میرا سلام۔ آمدِ رمضان کی سب کو مبارک باد اور آپ کو بھی۔ عید الفطر کے روز دونوں شمارے اکٹھے پڑھ سکوں گا۔''

☆ سید مسرت حسین رضوی کا مسرت نامہ کراچی سے۔ ''ماہ جون 2016ء کا شمارہ پڑھا۔ پہلی کہانی پڑھ کر مزہ آیا، سال بہ سال کی کتھا پسند آئی۔ بقول آپ کے آنے والے وقت میں کہانی حقیقت کا روپ دھار لے گی اور عوام مہنگائی کے جنجال میں پھنس جائیں گے، آپ کا تجزیہ صحیح ہے۔ مزاحیہ اداکار رنگیلا کی کہانی پڑھی پسند آئی کہ رنگیلا کا آخری دور فلمی دنیا سے دور گزرا اس اداکار نے اپنے آپ کو منوانے کے لیے بہت جدوجہد کی جس کی وجہ سے آج اس کا نام تازہ ہے۔ ''رشتے'' میں کہنا یہ ہے کہ رشتوں ناتوں میں اکثر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور اپنے بیگانے بن جاتے ہیں، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ''حاصلِ عشق'' میں گلزار کے کردار پر خوشی ہوئی اور سیمین کے کردار پر افسوس ہوا لیکن بعد کے حالات اور شوہر نفیس کے رویے نے حالات کو سدھار دیا اور کوئی خرابی نہیں ہوئی ورنہ تو مرد ذات فطرت میں لچک ضرور رکھتا ہے۔ ''محسن قاتلہ'' بہت حساس موضوع ہے۔ عمران حسن کو قتل کرنے کا اقدام ماں ادیبہ اور بیٹی شازیہ کا کردار نہایت شاک پروف رہا۔ دونوں ماں بیٹی نے جو جو کردار ادا کیا بہت اچھا کیا۔ سرکاری وکیل کی حیثیت واقعی کشمکش والی ہے اور وہ کوئی بھی یکطرفہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو وہی کرنا تھا جو قانون کہتا ہے۔ دونوں ماں بیٹی کا کردار قابلِ ستائش ہے، ان کا غصہ بھی جائز ہے۔ عزتِ نفس کا کوئی مول نہیں قانون اندھا ہے عمران حسن جیسے لوگ دولت اور اپنی جوانی کے نشہ میں تمام اصولوں بھول جاتے ہیں۔ ایسا ہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ''گمان'' پسند آئی۔ امرِ واقعہ ہے کہ آج کل بھی تھانوں کی حدود کا تعین ہوتا ہے اور کئی جگہ بورڈ بھی نظر آتے ہیں۔ خوش آمدید فلاں تھانہ خدا حافظ فلاں تھانہ، خدا رحم کرے پولیس والوں پر۔ پہلے زمانے میں پولیس والوں کا بڑا رعب ہوتا تھا مگر آج کل عنقا ہے۔ ''پلنے والی خالہ'' سمجھ میں نہیں آئی۔ ملیر کے علاقے میں ایک گھر ایسا ہے کہ جس میں اثرات ہیں۔ کوئی اس مکان میں نہیں رہتا۔ دھندلے سائے، سلمیٰ جیلانی نیوزی لینڈ والی، ایسے واقعات پاکستان میں بھی اکثر ہوئے ہیں۔ ''تہی داماں'' جیسے واقعات آج کل کے دور میں بہت زیادہ سنائی میں آ رہے ہیں۔ لڑکی یا عورت ہر طبقے میں پس رہی ہیں کہیں زیادہ کہیں کم۔ آخری سچ بیانی ''بزدل'' سب کہانیوں پر بھاری ہے۔ محمد یوسف نے سوچنے اور عملی قدم اٹھانے میں واقعی دیر کر دی جس کی وجہ سے شمسہ کی جان گئی اور ثابت ہوا کہ سچی محبت اور الفت اسی کو کہتے ہیں۔ اتنا انتظار ہر لڑکی نہیں کرتی جتنا شمسہ نے کیا یوسف کی بدنصیبی ہی تھی جو وہ معجزہ کے انتظار میں رہا اور آخری وقت بھی گنوا دیا۔ بہر حال کہانی عبرت آمیز ہے پسند آئی یوسف کی کم ہمتی کی وجہ سے افسوس ہوا۔ یہ اظہارِ خیال کہہ لیں یا ''شہرِ خیال'' یہاں اجازت چاہوں گا یہ کہنے کی کہ شہباز ملک کی کہانی۔ ''سراب'' جلد اختتام پذیر ہو جائے جب کہ اب اس پر نکھار آیا ہے اور اس کو آپ نے ...... سے ہی مکمل کرایا ہے یہ میرا خیال ہے (شاید اگست کے شمارے میں اصل مصنف کا نام اور انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب کا نام آپ پڑھ لیں گے)۔ باقی حقیقت آپ ہی بتائیں گے اور عرض کروں کہ اس ڈائجسٹ میں سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی طرح دو کہانیاں شروع کریں۔ یعنی سرگزشت ڈائجسٹ میں دو کہانیاں سلسلہ وار شروع کریں۔ باقی تمام چیزیں یعنی کہانیاں اپنی جگہ درست ہیں اگر یہ خیال آپ کو پسند آئے تو ضرور ایسا کریں یا قارئین کی رائے لے لیں کیونکہ قارئین کی اکثریت کہانیاں پڑھنا چاہتی ہے۔ باقی کرنا تو آپ نے وہی ہے جو آپ کو پسند ہو گا۔''

☆ غلام سرور کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''قارئین کی دینی معلومات کے لیے منتخب قرآنی آیات کی تشریح تفہیم القرآن کے مطابق برائے اشاعت ارسال خدمت ہے (ڈائجسٹ میں قرآنی آیات وغیرہ شاملِ اشاعت کرنا ممکن نہیں کیونکہ لوگ ڈائجسٹ میں چھپی آیات وغیرہ کا احترام نہیں کرتے ہیں)۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''انکل اس بار آپ کی کہانی نے بہت ڈسٹرب کیا۔ کیا ہم مایوس ہوتے جا رہے ہیں، کیا اچھے دنوں کی اُمید نہ رکھیں۔ میرے ملک کے حالات اتنے بھی خراب نہیں کہ ''لائٹ'' گالی بن جائے۔ نہیں نہیں انکل اتنی مایوسی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اچھی نہیں ''پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ'' اچھے دن بھی آئیں گے لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان اچھے دنوں کے لیے ہم نے کیا قربانی دی، کیا کام کیا۔ بشریٰ افضل ہم آپ کو بھولے نہیں ہیں۔ ہاں کبھی آپ کا تذکرہ کرنا بھول جائیں تو اس کے لیے معذرت۔ مجی رحمان تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ، بہت دور سے آپ نے ہمیں یاد کیا۔ اچھا لگا۔ طاہرہ آپا کی کمی محسوس ہوئی، باقی سب کے تبصرے خوب سے خوب تر تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے اردو ادب کے ایک بڑے شاعر سے متعارف کروایا اور تعریف و تحسین کے حقدار ٹھہرے۔ سلمٰی اعوان آنٹی معذرت کہ ہمیں آپ کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ تجسس کی انگلی تھام کے آپ کی تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا کہ آپ تو اردو افسانے کا بڑا نام ہیں۔ ایک معتبر رسالے میں آپ کی وہ سفر کہانی پڑھی جس میں آپ کو ایک شاطر نے لوٹ لیا تھا۔ غالباً استنبول میں، وہاں آپ کی ایک عدد فل چارمنگ تصویر بھی دیکھی اور پہلا خیال یہی آیا کہ ماں ہو تو ایسی جس کے سائے میں شفقت، خلوص، محبت اور تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے ہونے کا احساس بھی ہو۔ خوش رہیں اور ہمیں اپنی تحریروں سے سحر زدہ کرتی رہیں۔ (سرگزشت میں شامل ہر مصنف باکمال ہی ہوتا ہے ابتدائی حصے میں منجھے ہوئے اور معروف قلمکار کو ہی جگہ دی جاتی ہے۔) ''نگینے لوگ'' یہ تحریر شکور پٹھان نے خوب لکھی اور مختصر مگر جامع بھی اتنا ہی کہوں گی کہ اس تحریر میں پرانا کراچی جو کہ بزرگوں سے سنا تھا آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اچھا لگا ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کا نام بھی اڑتا اڑتا سنا تھا۔ مکمل تعارف بھی حاصل ہوا۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' رنگیلا کی کہانی بھی آخر اختتام کو پہنچی۔ سبق ہمیں یہ ملا کہ عروج کی حدود کے کہیں آس پاس ہی زوال کی حدود شروع ہوتی ہے۔ یعنی بلندی اپنے پہلو میں موجود پستی کی وجہ سے ہی بلندی کہلاتی ہے۔ رنگیلا نے اچھی زندگی گزاری۔ شہرت کا ذائقہ لیا، ان بلندیوں کو چھولیا جن کو چھونے کی تمنا لیے لاکھوں لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ابن کبیر طویل غیر حاضری کے بعد آئے اور مغرب میں ہونے والے ظلم کو سنا کر دلوں کو دہلا گئے۔ عورتوں کا لرزہ خیز قتل اور قاتل کی پُراسرار گمشدگی نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ''ہم نے دیکھا'' کہ وقت کی کمی کے باعث سرسری سا ہی دیکھ سکے۔ ''رشتے'' میں حساس موضوع اپنایا گیا ہے۔ ہمیں تو شروع سے ہی اجمل کے مجرم ہونے کا گمان تھا مگر ہمارے اس گمان کو انسپکٹر سعدی نے اس وقت یقین میں بدل ڈالا جب اس کے بچھائے ہوئے جال میں اجمل بری طرح پھنس بیٹھا۔ رشتوں کا تقدس پامال کر کے وہ خالی ہاتھ ہی رہا۔ ''حاصل عشق'' ایسے ایثار پسند عاشق تو اب بس کتابوں میں ہی ملتے ہیں یا پھر منظر امام کی کہانیوں میں۔ حقیقی دنیا میں ان کا گزر کہاں یہ اگر حقیقی دنیا میں دستیاب ہوتے تو شاید بنت حوا کی زندگی تھوڑی آسان ہو جاتی۔ اس شمارے نے ثابت کیا کہ لوگ چلے جاتے ہیں ادارے چلتے رہتے ہیں۔ بقول شاعر یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے۔ اس شمارے میں کاشف زبیر کہیں بھی نہیں تھے محفل پھر بھی جوان تھی، حسین تھی۔''

☆ سیف اللہ نے ملک وال سے لکھا ہے۔ ''ساجد امجد صاحب کے مضامین تو معلوماتی ہوتے ہی ہیں ان کی کہاں تک تعریف کریں۔ مضمون جوار خان اس بلندی پر نہیں لگا جس کی توقع سلمٰی اعوان صاحبہ سے وابستہ ہے۔ زویا اعجاز کی تحریر ''شکاری'' کرکٹ کے شائقین کے لیے یقیناً ایک تحفہ ہے لیکن شکور پٹھان کا لکھا ہوا ''نگینے لوگ'' انفرادیت لیے ہوئے نظر آیا ہے کیونکہ ڈھیروں معلومات اور اچھوتے انداز بیان کے ساتھ قاری اپنی پرانی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ ''تاریخ عالم'' اپنے روایتی انداز سے منظر امام صاحب آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہر صفحہ علم میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ علیم شاہ کی تحریر ''ہم نے دیکھا'' محمد نذر صاحب کی ''آخری امتحان'' اور ابن کبیر کی ''پُراسرار قاتل'' تینوں تحریروں کو خانہ پری ہی کہا جا سکتا ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک میں اس دفعہ ندیم اقبال راستوں کی سختی اور اپنے پاؤں کے چھالوں کا رونا ہی روتے رہے ہیں پھر بھی دلچسپی بنی رہی ہے کہ انداز تحریر خوب ہے۔ فرزانہ نگہت کی تحریر ''کراکاٹوا'' میں ہر طرف تباہی ہی تباہی پڑھی اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' مکمل ہوئی۔ انور فرہاد نے ڈھیروں معلومات اکٹھی کر دی ہیں جو کہ بہت اچھی اور خوب صورت کوشش ہے۔ ''جون کی شخصیات'' حسب سابق بہت اچھا ہے اور دوبارہ پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ اختر شہاب کی تحریر ''غلطی'' سرسری نہیں پوری توجہ سے پڑھی جائے تو قاری یہ ضرور سوچے گا کہ زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا۔''

☆ احمد سعید مخدومی نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔ ''سرخی روشناس کراتا ٹائٹل لیے سرگزشت سامنے آیا۔ اداریہ نے بہت مزہ دیا۔ اس قسم کا اداریہ کسی اور ڈائجسٹ میں نہیں دیکھا۔ نہایت اہم موضوع اور اتنے شگفتہ پیرایا میں بہت مزہ آتا ہے۔ تاریخ عالم اپنی بھرپور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ''ہم نے دیکھا'' اور ''آخری امتحان'' بالکل پسند نہ آئی۔ ''ذرہ بنا آفتاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے دل پر سحر طاری کر دیا۔ اختر شہاب کی ''غلطی'' بھی کمال کی تحریر تھی۔ ''جون کی شخصیات'' بھی پسند آئی۔''

☆ سعید احمد چاند نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''اس دفعہ پرچہ ٹھیک وقت پر ملا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا۔ ویسے سرورق بہت اچھا تھا۔ خدیجہ مستور کی زندگی کا حال تفصیل سے پڑھا۔ ایک دو کو چھوڑ کر ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ ساجد امجد صاحب ''حکیم الشعراء'' شکور پٹھان کا ''نگینے لوگ'' منظر امام کا ''تاریخ عالم'' شیراز حسن کی ''انسانی نیکی'' ندیم اقبال کی ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' اچھی تھی۔ محمد نذر کا ''آخری امتحان'' انور فرہاد صاحب کا ''ذرہ بنا آفتاب'' میں رنگیلا کو آخر ہیرو بنا ہی دیا۔ صائمہ اقبال کی جون کی سرگزشت

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میں جون کی شخصیات کرکٹ کے کھلاڑیوں کے شوقین لوگوں میں اچھی کاوش تھی۔ سنتوش کمار تو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے پر ان کی پیدائش لاہور میں کہاں سے ہوئی (سہواً لاہور چھپ گیا) شکر ہے ''سراب'' میں شہباز ملک کی پہاڑوں سے جان چھوٹی، ''بیت بازی'' میں سارے ہی شعر اچھے تھے۔ اب آتے ہیں سچ بیانیاں کی طرف۔ اوّل نمبر ''رشتے'' بہترین تھی۔ سین کی ''حاصل عشق'' لاجواب تھی۔ غزالہ جلیل راؤ کی ''محسن قاتلہ'' میں عمران حسن کا یہی انجام ہوتا تھا۔ کے ایم خالد کا گمان پڑھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی چھوٹی سی نیکی آدمی کو بڑے انعام کا مستحق بنا دیتی ہے۔ تعجب ہے سلیم ملیر کراچی کی ''بلے والی خالہ'' جیسی عورتیں بھی اس دور میں بھی رہتی ہیں۔ محمد سلیم اختر راولپنڈی کا ''وی آئی پی'' میت میں وی آئی پی لوگوں کا اتنا انتظار رہتا ہے۔ محمد یوسف کی ''بزدل'' میں شمسہ نے اچھا انتقام لیا۔ جن لوگوں نے ''شہرِ خیال'' میں حصہ لیا۔ بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری، نجمی رحمٰن، فلک شیر ملک، سعید مسرت رضوی، صائمہ نور، ذیشان ریاض، مسلم رشید، عدالجبار رومی کے خطوط پسند آئے اور کچھ ستارے کہاں چھپ گئے۔ شہر خیال کی ہیروئن طاہرہ گلزار، شاہدہ جہانگیر شاہد، ناصر حسین رند، رانا محمد شاہد، محمد سلیم قیصر، منظر علی، قیصر خان، انور عباس شاہ، عمران نقشبندی، احسان سحران سب سے گزارش ہے کہ یہ آپ کا ہی رسالہ ہے۔ اس سے اتنی غفلت؟ (شاہد جہانگیر شاہد کا ڈائیلائسز ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ان کی بینائی متاثر ہوگئی ہے)''

☆ عبدالعزیز میمن کا شکایت نامہ کراچی سے۔ ''میں آپ کی توجہ آپ کے رسالے ماہنامہ سرگزشت کراچی کے فروری 2016ء کے شمارہ میں شائع ہونے والے مضمون ''قدیم تہذیب'' کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس مضمون کے صفحہ 136 پر سندھ کے آثار قدیمہ میں ''موئن جودڑو'' کا ذکر آیا ہے جس میں محترم مضمون نگار نے اس کو ''موہن جودڑو'' لکھا ہے۔ ''موہن'' ایک ہندو کا نام ہے اور ''موہن جودڑو'' لکھنے یہ دڑو اس کے نام سے منسوب سمجھا جائے گا۔ ''موئن'' یا ''مئن'' سندھی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''مرے ہوئے'' اور ''موئن جودڑو'' کا مطلب ہوگا ''مرے ہوئے لوگوں کا ٹیلہ'' یا ''مُردوں کا ٹیلہ'' اس کی وضاحت آپ کے کسی شمارہ میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ (جی ہاں، ایسا سہواً ہوا ہے)''

☆ انور عباس شاہ کا خط دریا خان بھکر سے۔ ''بہت خوب صورت انداز میں بجلی پر کہانی سنائی ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ بجلی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا لیکن جب اس کا بل آتا ہے تو خاص کر غریب عوام پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ بھی غریب عوام کو لوٹنے کا ایک طریقہ ہے۔ اب بجٹ کی آمد آمد ہے۔ ہماری یہ سطور جب شائع ہوں گی تو بجٹ آچکا ہوگا۔ سنا ہے حکومت اس سال عوام پر ڈبل ٹیکس عائد کرنا چاہتی ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں قارئین کے خطوط جگمگا رہے تھے لیکن کافی بہن بھائی نظر نہیں آرہے جیسے شاہد جہانگیر، طاہرہ گلزار، رانا سجاد اور قیصر عباس وغیرہ۔ ''بلے والی خالہ'' کافی دل دہلا دینے والی کہانی تھی۔ اس قسم کی باتوں پر یقین رکھنے والے افراد ہندوستان میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہیں لیکن کم ہیں۔ شکور پٹھان کی تحریر ''نگینے لوگ'' ایک پُراثر تحریر تھی۔ ان کی لکھی ہوئی باتیں دل میں اتر گئیں۔ خداوند کریم تمام مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ''بدگمان'' بے ضمیر پولیس والوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر تھی۔ آخر میں چودھری رب نواز کا دونوں پولیس والوں کو شرم دلانے کے لیے طریقے سے تحفہ بھیجنا کافی تھا۔ ''سراب'' تقریباً اب اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو ہی چکی ہے۔ اس کی جگہ نئی سلسلے وار کہانی کا کم از کم ٹریلر تو جاری کر دیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' کا سفر بے حد دلچسپ انداز میں جاری ہے۔ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود بھی رائٹروں میں شمار ہو گئے ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ ہمارے ہی علاقے کے ہیں۔ ''مئی کی شخصیات'' پڑھ کر معلومات میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ مضمون میں کافی مشہور شخصیات شامل تھیں۔ ''بزدل'' ایک دکھی تحریر تھی جو بھی ہو شمسہ نے آخر میں آکر بہت بڑی غلطی کی تھی جو کہ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔''

☆ ایم ایچ ادیب کا خط لاہور سے۔ ''اس مرتبہ بھی شمارہ حسبِ معمول اپنی خوشانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ کہانیوں اور واقعات کے سلسلے میں ہر ماہ جو آپ بیتیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ ایک منفرد سلسلہ ہے اور اس نوع کا کوئی اور ماہنامہ اپنے ملک میں کم ہی نظر آتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ آپ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ ضرور آئندہ اشاعت میں شائع فرمائیں گے۔''

☆ شیریں زادہ خدخیل صوابی سے لکھتے ہیں۔ ''محترم مدیر صاحب السلام علیکم! تقریباً دو سال قبل ایک مضمون بھیجا تھا۔ تاحال شائع نہ ہوسکا۔ اس لیے گزشتہ دنوں اس پر تنقیدی نظر پھر ڈالی تو کئی خامیاں نظر آئیں۔ اس کو دور کر کے دوبارہ بھیج رہا ہوں۔ اس بار انشاء اللہ معیار پر اترے گا اگر جلد اطلاع دیں تو اس تاریخی موضوع پر دوسرا مضمون بھی روانہ کر دوں گا۔ (گزشتہ بار ہی مضمون پڑھ لیا تھا لیکن اس میں معلومات کی کمی تھی اسے مسترد کرنا پڑا تھا۔ دوبارہ سے اسے پڑھ لیتا ہوں۔'')

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پیغام پشاور سے۔ ''گزشتہ کئی روز سے طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ اب کچھ افاقہ ہے۔ اب بھی چلنے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پھرنے سے قاصر ہوں۔ وہیل چیئر کے ذریعے گھر میں کچھ دیر چل لیتا ہوں۔ پرویز بلگرامی کی والدہ کے انتقال کا سن کر دلی صدمہ.... پہنچا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، (آمین) پلیز تمام احباب مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں (شاہد جہانگیر شاہد کی بینائی ڈائبیٹیز کی وجہ سے متاثر ہوگئی ہے پھر بھی وہ بیٹوں سے سرگزشت پڑھوا کر سنتے ہیں۔ بینائی کے لیے خصوصی دعا کریں)۔''

☆ شوکت رحمٰن خٹک کا پیغام پشاور سے۔ ''فلم نگری پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ انور فرہاد سے خصوصی درخواست ہے کہ وہ مایا دیوی کے بارے میں مفصل مضمون ضرور لکھیں۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کو تباہ کردیا گیا۔ اس تباہ حال انڈسٹری کا نوحہ پڑھنے والے علی سفیان آفاقی بھی نہ رہے۔ پاکستانی فلمی دنیا پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں تاکہ آنے والی نسل جان سکے کہ کبھی ہمارے ہاں بمبئی کے مقابلے میں نہایت کم پیسوں میں ان سے اعلیٰ درجے کی فلمیں بنتی تھیں۔''

☆ اکبر احمد ذیشان کا خط حافظ آباد سے۔ ''اس بار حکیم الشعراء نے بہت لطف دیا معلومات میں اضافہ ہوا۔ نگینے لوگ نے دل موہ لیا۔ میرا بچپن لڑکپن اور جوانی کراچی میں گزری ہے اس لیے بھی یہ تحریر اچھی لگی۔ تاریخ عالم معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے سحر طاری کردیا ہے۔ اتنی اچھی تحریر پر ندیم اقبال کو مبارک باد۔ اُمید ہے کہ تحریر چلتی رہے گی۔ ''رشتے'' نے جھنجوڑ دیا۔ بہت عمدہ سچ بیانی تھی۔ کے ایم خالد کی گمان بھی خاصے کی چیز تھی بزدل بھی پسند آئی۔''

☆ میر زبیر اعجاز تارڑ تحصیل میلسی ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ''میں آپ کے میگزین جاسوسی اور سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ پہلی بار ایک سبق آموز کہانی لکھی ہے جسے قارئین بہت زیادہ پسند کریں گے۔ براہ کرم میری تحریر پر خصوصی توجہ دیجیے گا۔ یہ تحریر سچ پر مبنی ہے اور میں نے بڑی مشکل سے اسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے میں نے کئی لوگوں سے اصلاح لی ہے۔ کہانی کو کئی مرتبہ لکھا ہے اور اپنے پروفیسرز صاحبان کو چیک کرائی ہے کہ کہیں اس میں کوئی غلطی تو نہیں۔ (اس شمارے سے فارغ ہوکر پڑھ لوں گا)۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیا نے بکھر سے لکھا ہے۔ ''جون کے شمارے میں سلمٰی اعوان کی تحریر بعنوان ''جوار خان'' نے ماہنامہ سرگزشت کو زینت بخشی۔ انمول جذبوں سے بھری محبت کی یہ داستان بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ سلمٰی اعوان صاحبہ کے لیے دعا ہے ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ'' عشق کی دبے دبے لفظوں میں باوقار اظہارِ تحریر، الفاظ کا چناؤ، سسکیاں اور سرگوشیاں سب کچھ احترام آدمیت ملحوظ رکھتے ہوئے لکھاری کی مضبوط گرفت کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہماری اعوان برادری میں ایسے بلند فکر اعلیٰ ادبی رجحان والے انسان موجود ہیں۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا پیام لاہور سے۔ ''خدیجہ مستور کے ذہن میں بنے پلاٹوں پر تحریروں کی کامیاب عمارتیں کھڑی ہوئیں اور وہ کامیاب مصنفہ قرار پائی۔ اس دفعہ سرگزشت کوئی خاص نہیں پڑھ سکا وہ اس لیے کہ 5 جون کو میری شادی تھی اور پھر مصروفیت میں کچھ پتا نہیں چل سکا البتہ ''شہرِ خیال'' کی محفل سے بھی آؤٹ ہونے کو دل نہیں چاہا تو مصروفیت کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔ اعجاز حسین سٹھار کو مبارک ہو بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ محمد خواجہ نے بھی اچھا لکھا تھا طاہر نقاش کی سرگزشت سے وابستگی اچھی تھی اور پھر کبھی جو صدمہ پہنچتا ہے تو اللہ کی رضا کے لیے برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ سدرہ بانو کی آمد زبردست ہوتی ہے جس میں تقریباً ہر طرح کی باتوں کو سمیٹ کر تبصرہ کیا ہوتا جو بہت اچھا لگتا ہے۔ نجمی رحمان کی سچائی پر مشتمل باتیں بے حد اچھی لگیں۔ سعید احمد چاند کی انتہائی مختصر مگر جامع تحریر اچھی تھی۔ سید مسرت حسین کو خوش آمدید۔ صائمہ نور سیاستدان بھی تو عوام کو کاٹ کا اُلو ہی سمجھتے ہیں نا۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت پیارا ہے۔ مسلم رشید کے قلم نے تو لفظ لفظ جوڑ کے بھرپور تبصرہ لکھ ڈالا زبردست لگا۔''

☆ انجم فاروق ساحلی کا نامۂ شوق لاہور سے۔ ''گزشتہ ماہ مختصر خط شائع کرنے کا شکریہ۔ گزارش ہے کہ ''موہن کا آدم خور'' اور ''کوپرا کار یچھ'' شکاریات کی تحریریں ہیں اور اس موضوع پر آپ میری کہانیاں شائع کرچکے ہیں۔ ''علم و ادب کا گہوارہ'' (حیدرآباد) تحقیقی علمی مضمون ہے۔ گزشتہ موسم سرما میں بہت سی علمی ادبی شخصیات ہم سے جدا ہوگئیں ان کی کمی کا پورا ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔''

☆ قیصر خان کی بھکر سے آمد۔ ''ہمیشہ کی طرح اداریہ میں سلگتا ہوا موضوع زیرِ باعث تھا۔ بجلی کی وجہ سے بے روزگاری میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں حاجی صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ بہت اچھا تبصرہ تھا۔ بھکر سے شاہ جی ہمیشہ کی طرح حاضر تھے۔ سب کے تبصرے اچھے تھے۔ کچھ نئے لوگ تھے اور کچھ نام لکھنا بھول گئے تھے۔ بندہ بہت لائق ہے لیکن نام و پتا معلوم نہیں۔ غیر حاضر میں ڈاکٹر روبینہ نفیس، ڈاکٹر قرۃ العین، شاہد جہانگیر، عامر ساحل، رضا اعوان، طاہرہ گلزار وغیرہ کا خط نہ پڑھ کر بہت کمی محسوس کرتا ہوں۔ اس مرتبہ پرچہ بہت خاص لگا۔ پہلی کہانی میں سب کا شک طلعت پر تھا پر چودھری قاتل نکلا۔ ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ ''حاصلِ عشق'' میرے مطابق سچے پیار کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ محبت میں محبوب کا بھلا سوچنا ہے تاکہ اپنا بہت اچھا فیصلہ کیا گلزار ایک عظیم محبت کا پیکر شخص

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

ہے۔ ''بزدل'' جناب کوئی اتنی ترقی کے ساتھ اتنا سوچتا ہے کہ کروں یا نہ کروں، جناب کپتان صاحب آپ کو جانا چاہیے تھا۔ فیصلے کی دیر دو زندگیاں لے ڈوبی۔ ہر ماہ کی شخصیت پر صائمہ اقبال کا مضمون بہت اچھا جا رہا ہے اور سب سے بڑھ کر ندیم اقبال کا سفرنامہ بہت لاجواب ہے میرے نزدیکی صوبہ اور ضلع کے رہائشی بہت کمال لکھتے ہیں کبھی آپ آئیں تو یاد کرنا ہم ملاقات کے خواہش مند رہیں گے۔ باقی پرچہ ابھی نہیں پڑھ سکا۔ ایک رائے تھی یا عرض تھی۔ میرا دل چاہتا ہے ہمارے جو محسن پاکستان تھے ان سب پر مضمون آنا چاہیے۔ جیسے کہ قائداعظم، لیاقت علی خان بہت سے لوگ جن کے بارے میں کچھ کچھ معلوم ہے نہ ان کی اولادوں کے بارے میں پتا ہے وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، کیا کرتے ہیں اور کون کون سے سچے اور کھرے محسن تھے۔ ان میں علماء کرام، لکھاری حضرات، صحافی، تاجر، سیاستدان وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً ایدھی صاحب، رمضان چھیپا صاحب وغیرہ جیسے لوگ جن کے بارے میں مکمل جان کاری کی ضرورت ہے اور ساتھ میں ادارہ اور دوستوں سے اپیل ہے کتابوں کے بارے میں تبصرہ ہو مجھے کون سی کتاب پڑھنی چاہیے، کون سی نہیں اور ساتھ آپ دوستوں سے اپیل ہے اپنے ہر خط میں ایک کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ روسو کا اعتراف پڑھنی ہے کہاں سے ملے گی کون سے پبلشر ہیں (ان میں سے بہت سوں پر تحریر آچکی ہے پرانے شمارے دیکھ لیں)۔''

☆ محمد فیاض احمد قادری مظفر آباد آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں۔ ''میں ماہنامہ سرگزشت کا قدیم قاری ہوں۔ بہت علمی اور بہترین شمارہ ہے۔ ہمارے ادبی ذوق کی تسکین کا اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں کہ سرگزشت کو پڑھنا نہ بھولیں۔ مجھے تقریباً 8 سال ہوگئے ہیں۔ میں سرگزشت جاسوسی، پاکیزہ اور سسپنس پڑھتا ہوں۔ اس سے قبل کبھی بذریعہ مکتوب حاضری نہیں دی اس بار قلب کی گہرائیوں کے ساتھ دعائیں اور نیک خواہشات لے کر حاضر ہوا ہوں اپنی محفل میں جگہ عنایت فرمائیں اگر شمارہ میں شاعری کے عنوانات سے کوئی ایسا سلسلہ جاری ہو جائے کہ نئے شاعروں کی شاعری کی رہنمائی اور نوک پلک سنواری جائے تو بہت خوب رہے گا۔ آج کل شاعر تو بہت ہیں مگر قابل شعراء نہیں ملتے مجھے اُمید ہے آپ میری اس گزارش پر نظرثانی فرمائیں گے۔ (''شاعری'' سرگزشت نہیں ہے)۔''

☆ محمد سلیم قیصر کا خط ملتان سے۔ ''ارضِ پاک کے پیارے باسیوں، ٹیم سرگزشت، سیلز پرسن، رائٹرز اور قارئین کرام کو ایڈوانس عیدالفطر مبارک ہو۔ ماہ صیام کے بقیہ چند مبارک ساعتوں میں اہلِ پاکستان، اپنے پیاروں اور راقم کے لیے خصوصی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں۔ پیارے واجب القدر معراج انکل ایک معمولی سا شکوہ بہت معذرت کے ساتھ۔ میری تحریروں سے اکثر و بیشتر لفظوں کو حذف کردیا جاتا ہے۔ میری کوشش تو ہوتی ہے کہ غیر معیاری لفظوں سے اجتناب کروں تاہم میں بلند و بالا دیواروں کے آنگن میں موجود فولادی پنجروں میں مقید پھر بھلا میری سوچ کی وسعت اور لفظوں کا انتخاب اس پائے کا نہیں ہوسکتا جو آزاد... زندگی بسر کرنے والا انسان رکھتا ہے۔ شمارہ مئی اختتام سے آغاز تک جا پہنچا ہے۔ تحریر میں تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا نیا چاند نظر آئے گا تو تبصرہ بھی ڈالیں گے۔ سلسلہ بیت بازی سمیت سب بہت خوب رہے۔ سدرہ بانو ناگوری آپ کا بہت مشکور ہوں اسی طرح سب سے دعاؤں کی اپیل ہے۔ جناب محمد اشفاق، سلیم رشید، انجم فاروقی ساحلی، خالد محمود، محمد خلیل چوہدری، رانا محمد شاہد، ناصر حسین رند، ملک جاوید خان سرکانی، عبدالجبار رومی انصاری، صوبی شاہ، محمد احمد رضا انصاری، محترمہ فرزانہ نگہت، اعجاز حسین سٹھار، نہی فردوس احمد، سعید احمد چاند، اولیس شیخ اور محمد عباس کے تبصرہ بھی آپ کی طرح اچھے تھے۔ انور عباس شاہ صاحب لیٹ ہوگئے کیوں؟''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''اس بار تو انکل نے کیا خوب لکھا ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ ہمیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا بن گئے ہیں۔ کیا واقعی ہم اشرف المخلوقات ہیں؟ اس بار یک کمی میں معنف میں اتنی بڑی اور مشہور شخصیت خدیجہ مستور کو لے کر آئے اور ہمیں ان کے بارے میں مختصر لیکن جامع پڑھنے کو ملا۔ اب چلتے ہیں ''شہرِ خیال'' جہاں کے دربار کے باہر نوکری یعنی بلیک لسٹ میں بھی میری جگہ نہیں تھی خیر خط لیٹ پہنچا ہوگا۔ دروازے پر بھائی اعجاز حسین سٹھار ملے، سلام دعا ہوئی میں نے مبارک باد دی کہ ہمیشہ کی طرح بہت ہی شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ ساتھ میں ہم جیسے مسلمانوں کو صحیح مسجد کے بارے میں بھی بتایا جو ابھی تک وہاں نہ جاسکے اللہ آپ کو اجر دے۔ محمد خواجہ نے مختصر لیکن کافی حد تک جامع تبصرہ کیا ہے۔ طاہر نقاش پہلی بار حاضر لیکن بہت شاندار انداز میں انٹری۔ بشریٰ افضل بھی مختصر تبصرہ لے کر حاضر تھی میں تو آپ کو ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔ سدرہ بانو بھی اپنا لاجواب تبصرہ لے کر حاضر تھی۔ سدرہ ڈیئر میں نے یہ عورت والی بات مردوں کو طنزاً سے کہا ہے جس کے پاس تھوڑی سمجھ ہوگی وہ اس جملے کی کاٹ کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیا آپ کسی اور معاشرے میں رہ رہی ہو، کیا آپ کو اپنے اردگرد نظر نہیں آتا کہ عورت کو کیسے کیسے ذلیل کیا جاتا ہے۔ کبوتر آنکھ بند کرکے سمجھتا ہے کہ وہ بلی کو نظر نہیں آرہا۔ فہیم احمد عباسی بھی آخر آگئے ہماری محفل میں پہلی بار اور اتنا اچھا تبصرہ۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اب آتے جاتے رہنا۔''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:
اکبر علی رند، حب بلوچستان۔ معصومہ عنایت، کوئٹہ۔ افسر علی شیخ، چنیوٹ۔ رابعہ مظہر، فصیح الدین، حارث علی، کراچی۔ انم شیراز، لاہور

www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے
لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں
صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب
ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن
حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے
۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox
کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے
Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause
ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

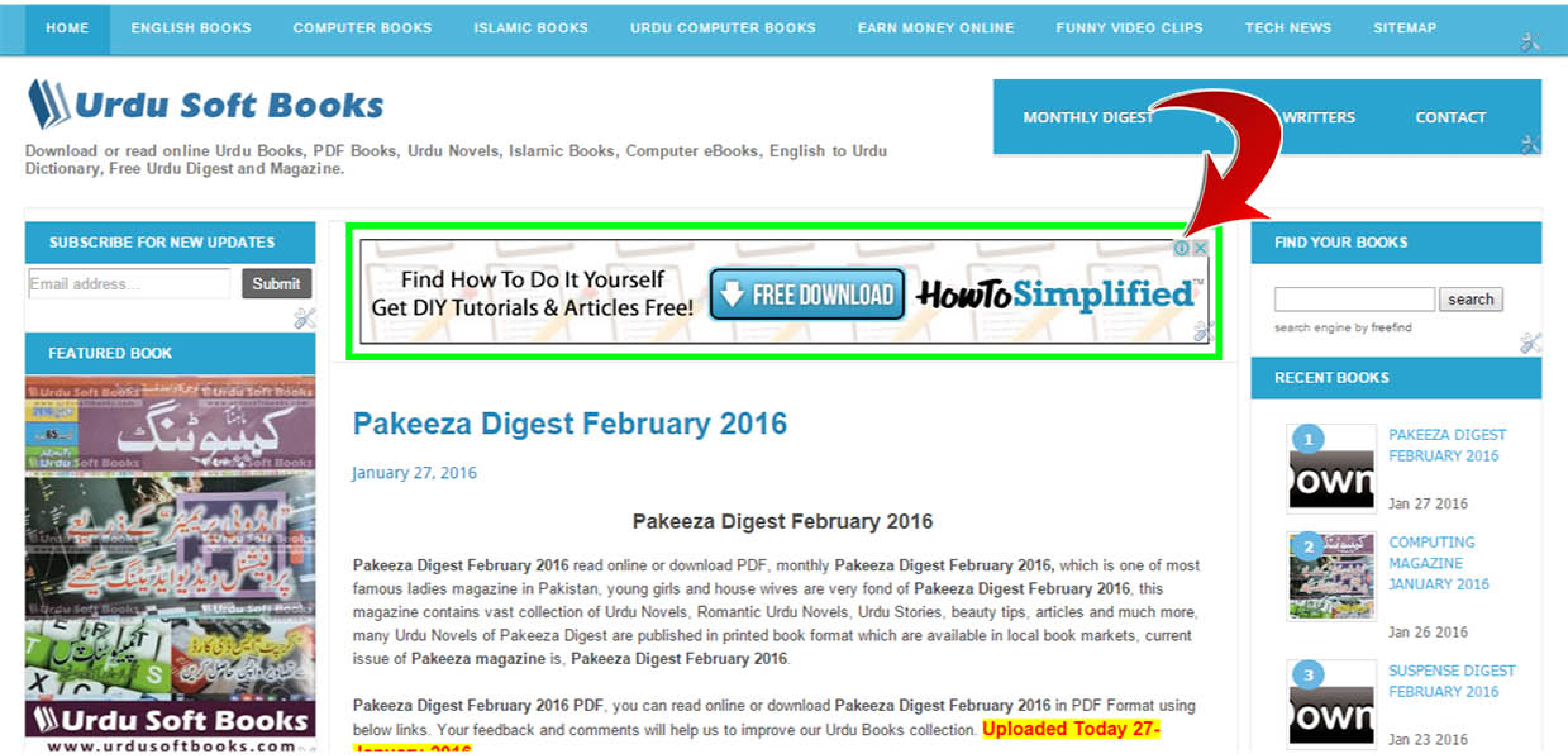

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کر کے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

قصیدہ گو

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ باپ کی شفقت و ماں کی ممتا سے محروم تھا۔ فاقہ کشی میں بچپن گزرا مگر جب جوانی کی سرحد پر پہنچا تو زندگی سنوارنے کی ایک نئی راہ سُجھائی دی۔ اس نے اشعار کے ساز پر خیالات کے سوز کو روشن کیا اور کاخِ امرا کی جانب بڑھا کہ اسے خبر تھی، تقدیر کے پابند نباتات و جمادات تو ہو سکتے ہیں، انسان نہیں اور یہی نکتہ اس کے لیے سود مند ٹھہرا کیونکہ آدمی کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری اور اس کے لیے ضروری ہے دلِ خوبیدہ پر ضرب کاری۔ یوں بھی دل خاکی میں جب یقین پیدا ہوتا ہے تو مستقبل تعمیر ہوتا ہے۔ یہی قوت صورت گرِ تقدیر بنتی ہے۔ اس لیے وہ قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال کے ساتھ جنگاہِ زندگی میں تیغ بے نیام بن گیا۔ اس کی یہی ادا شہرت کا اوج بنی اور اسے فاقہ کشی کے چُنگل سے چھڑا کر عیش کوش بنا گئی۔ وہ بادشاہان کے لیے رطب اللسان بن گیا۔ ایسے ایسے قصیدے کہے کہ چیونٹی کو بھی خود پر ہاتھی کا گمان ہونے لگا۔ اس کے اشعار خطۂ عرب میں سند قرار پائے لیکن ہیہات' ایک معمولی سے شخص نے اس کی گردن ریت دی اور کئی دن تک اس کی لاش بے گورو کفن پڑی رہی۔

ایک بدقسمت ماہرِ زبان و بیان کا زندگی نامہ

سورج نے منہ دکھا دیا تھا۔ بازاروں میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ابو خالد کتب فروش نے بھی اپنی دکان کھول ضرور لی تھی لیکن اس کے مخصوص گاہکوں نے ابھی اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا صرف وہ لڑکا ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا تھا جو تقریباً روز ہی آتا تھا اور یہاں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کی کم عمری اور شوق مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ابو خالد نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ کتاب خریدے بغیر وہ اس کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ اس لڑکے کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن شوق کا یہ عالم تھا کہ دکان کھلنے سے پہلے ہی دکان کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی ابو خالد دکان پر آتا وہ کچھ دیر ابو خالد کی مدد کرتا اور پھر کوئی کتاب لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہتا کہ کون دکان پر آیا اور کب چلا گیا۔ ابو خالد اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک غریب گھر کا لڑکا ہے۔ اتنا غریب کہ اپنی جیب سے کوئی کتاب نہیں خرید سکتا۔ اس لیے اس نے رعایت دے دی تھی کہ وہ جو کتاب چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن یہیں بیٹھ کر البتہ اسے یہ تعجب ضرور ہوتا تھا کہ وہ ایسی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتا ہے جنہیں نہایت مشکل سمجھا جاتا ہے۔

وہ لڑکا حسبِ معمول ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا تھا کہ ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ ابو خالد کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں مشغول تھا اس لیے وہ شخص براہِ راست اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔

''میں ایک کتاب بیچنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا تم اسے خریدو گے۔'' اس شخص نے کہا جو اس لڑکے کو ہی دکاندار سمجھا تھا۔

''یہ کتاب اس قابل ہے بھی کہ کوئی اسے خرید سکے۔''

''یہ ابو عبیدہ کی لغت ہے۔ تیس ورق پر مشتمل ہے لیکن ہے بڑی جامع۔ اگر تم اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہو تو لو یہ دیکھ لو۔'' اس نے کتاب اس لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اس لڑکے نے کتاب لے لی اور اسے پڑھنا شروع کردیا۔ جب زیادہ دیر ہوگئی اور بیچنے والا تنگ آگیا تو اس شخص نے لڑکے کو ٹوکا۔

''میاں صاحبزادے! یہ ایک دن میں تو یاد ہونے سے رہی۔ خریدنا ہے تو خریدو ورنہ واپس کردو۔''

''اگر میں کتاب یاد کرچکا ہوں تو کیا انعام ملے گا۔'' لڑکے نے کہا۔

اتنی دیر میں دکان کا مالک ابوخالد بھی قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ بھی یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بھی اس لڑکے کا ساتھ دیا۔

''یا شیخ! معاملہ طے کرلو اگر اس نے کتاب یاد کرلی ہو گی تو کیا انعام دوگے۔''

''اگر اس نے کتاب یاد کرلی ہوگی تو کتاب مفت دے دوں گا۔''

معاملہ طے ہوگیا۔ کتاب فروش نے کتاب اس لڑکے کے ہاتھ سے لے لی اور لڑکے نے بغیر دیکھے کتاب سنانا شروع کردی۔ یہاں تک کہ اس نے پوری کتاب سناڈالی۔ کتاب فروش کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کتاب میں جو کچھ تھا وہ سب یاد کرچکا تھا۔

''لڑکے! تم جادوگر ہو یا تمہارا حافظہ واقعی اتنا تیز ہے۔ میں نے تم جیسا باکمال آج تک نہیں دیکھا۔ تم تو علم کے میدان میں زبردست ترقی کروگے۔ میں ہمیشہ ناز کیا کروں گا کہ میں نے تمہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ تمہاری عمر کے بچے تو ایسی کتابوں کو پڑھنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں اور تم نے اسے زبانی یاد کرلیا۔ تم تو خطرناک ہو۔ میں تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہوں گا۔''

''میرا نام احمد بن حسین ہے۔ تم مجھے ابن عیدان بھی کہہ سکتے ہو کیونکہ میرا باپ عیدان کے نام سے مشہور تھا۔''

احمد بن حسین نے جان بوجھ کر باپ کا نام صرف عیدان بتایا حالانکہ وہ اپنے پیشے کے اعتبار سے ''عیدان السقہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ احمد بن حسین کو غالباً یہ کہتے ہوئے شرم آئی تھی کہ اس کا باپ ایک معمولی غریب سقہ تھا۔

''تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''نہ صرف یہ کہ میرا باپ نہیں ہے بلکہ میں تو ماں کی آغوش سے بھی محروم ہوچکا ہوں۔ میری نانی نے مجھے پالا ہے۔ میں اسی کو ماں کہتا ہوں۔''

''مجھے تمہارے حالات سن کر افسوس بھی ہو رہا ہے اور مزید جاننے کی خواہش بھی پیدا ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔''

''میں باپ کی جانب سے جعفی ہوں اور ماں کی جانب سے ہمدانی۔ یہ دونوں خاندان یمنی ہیں لہٰذا میں یمنی ہوں۔ عربی نژاد ہوں۔ میرا قبیلہ یمانی ہے جو کوفہ کے محلّہ کندہ میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ میری پیدائش اسی محلے میں ہوئی ہے۔ اسی لیے بعض لوگ مجھے الکندی کہتے ہیں جو میرا قبیلہ نہیں محلّہ ہے۔''

''تیری عمر اس وقت کتنی ہوگی؟''

''میری پیدائش 302ھ میں ہوئی اور اب 313ھ ہے۔ اے شخص تو خود حساب لگالے۔''

''اتنی سی عمر میں تم نے کیا تعلیم حاصل کی ہوگی جب کہ تمہارے گھر میں غربت بھی ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں نے بعض مدارس میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور علوم صرف ونحو علوم ولغت و ادب اور علوم دین وغیرہ کی تعلیم ضرور حاصل کی ہے لیکن یہ برائے نام ہے۔ میرے عزائم اس سے کہیں زیادہ ہیں۔''

''لڑکے تم سب کچھ کرسکتے ہو اگر تمہاری مالی حالت درست ہو۔''

''یہ تو کبھی درست نہیں ہوسکتی۔''

''کیوں نہیں ہوسکتی۔ تم بڑے ہوکر کسی دربار سے وابستہ ہوجانا۔ پھر تمہارے پاس دولت ہی دولت ہوگی۔'' اس آدمی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد دکاندار اس کے قریب آیا۔

''احمد تم نے تو مجھے حیران کردیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مفلس بھی کردیا۔ تم نے تو میری دکان کی ساری کتابیں زبانی یاد کرلی ہوں گی۔ خبردار! ان کتابوں کی نقلیں تیار کر کے فروخت مت کردینا۔''

دکاندار اسے خود ترکیب سکھا رہا تھا اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ وہ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ کسی بڑے سردار یا دربار تک اس کی رسائی کیسے ہوگی۔

وہ دکان سے اٹھا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ چلتے چلتے کچھ پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے بازار میں ایک تربوز دیکھا۔ اس نے دکاندار سے اس کی قیمت پوچھی۔ دکاندار نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا۔

''جاؤ جاؤ یہ تمہارے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ یہ مہنگا

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"پھل تم نہیں کھا سکتے۔"

"کیوں نہیں کھا سکتا۔ میرے پاس پانچ درہم ہیں وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

"نہیں یہ کم ہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک مالدار آدمی آیا۔ دکاندار نے اسے وہ تربوز دو درہم میں دے دیا۔ اب احمد بن حسین خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

"تو نے مجھ کو پانچ درہم میں نہیں دیا اسے دو درہم میں کیسے دے دیا۔"

"خاموش! تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔ تم صرف پانچ درہم رکھتے ہو وہ ایک لاکھ دینار کا مالک ہے۔"

احمد بن حسین کو اپنی غربت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی اس وقت تک کوئی عزت نہیں ہوتی جب تک کوئی ایک لاکھ دینار کا مالک نہ ہو۔

وہ دولت مند بننے کے خواب دیکھتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ نانی سے پوچھے دولت مند کس طرح بنا جاتا ہے پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر نانی کو معلوم ہوتا تو وہ خود دولت مند نہ بن گئی ہوتیں۔ اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو کتاب بیچنے والے شخص نے اسے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ بڑے ہو کر کسی دربار سے وابستہ ہو جانا پھر تمہارے پاس دولت ہی دولت ہوگی۔ تو کیا بڑے ہونے تک میں مفلس ہی رہوں گا؟ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا اس کی الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے لیکن اس وقت کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ کئی دن تک انہی خیالوں میں گم پھرتا رہا۔ کئی دن ہو گئے تھے وہ کتب فروش کی دکان پر بھی نہیں گیا تھا۔ پھر ایک دن شاید قدرت نے اس کی رہنمائی کی۔ اس کے جی میں آئی کہ مطالعہ ہی اس کو کسی بڑے مرتبے تک پہنچائے گا۔ وہ صبح ہوتے ہی کتب فروش کی دکان پر پہنچ گیا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں تمہارا کب سے انتظار کر رہا تھا۔ ایک نایاب کتاب آئی ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں وہ تم پڑھ لو۔ کوئی خرید لے گیا تو تم اس سے محروم ہو جاؤ گے۔" دکاندار نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے وہ کتاب لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک ایسی کتاب تھی جس میں دورِ جاہلیت کے شعرا کے حالات اور نمونہ کلام درج تھا۔

اس کتاب کو پڑھنے بیٹھا تو اسے معلوم ہوا کہ شعرائے جاہلیت میں زہیر بن ابی سلمٰی پہلا شخص تھا جس نے پہلے پہل اپنے قبیلے کے سردار ہرم بن سنان کی تعریف میں قصیدہ کہہ کر پیش کیا گویا پہلی مرتبہ شاعری کو حصول دولت کا ذریعہ بنایا ورنہ اس سے پہلے شعراء اپنے محبوب کی شان میں قصیدے کہا کرتے تھے یا اپنے حسب نسب کی شان میں زمین آسمان ایک کیا کرتے تھے۔ شاعری دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بنی تھی۔ اس کے اور نابغہ ذبیانی نامی شاعر نے سلاطین اور امراء کی مداحی میں قصائد لکھنا شروع کیے اور اس قدر مالدار ہو گیا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھانے لگا۔ نابغہ کے بعد "اعشیٰ" نے شاعری کو پیشہ بنالیا، وہ جا بجا لوگوں کی مدح کرتا پھرتا اور انعام حاصل کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ مرض عام ہو گیا۔ شعراء اپنی شعر گوئی کی بدولت ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔

وہ اپنے دور کی قریب تر تاریخ میں بھی یہی سب کچھ دیکھ رہا تھا یا یہ کہیے..... کہ اس نے پہلی مرتبہ اس پہلو پر غور کیا تھا۔

دورِ جاہلیت میں جن شعراء نے قصیدہ گوئی اختیار کی تھی انہوں نے دولت تو کمائی تھی لیکن عربوں میں ان کی عزت جاتی رہی تھی۔ احمد بن حسین کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ دولت کس طرح کمائی جاتی ہے۔

یہ کتاب پڑھ کر اسے ایک نسخہ ہاتھ آگیا۔ اسے شاعر بن جانا چاہیے۔ حکمرانوں کے قصائد لکھ کر دولت کمائی جاسکتی ہے۔

اس نے اس کتاب میں شامل نمونہ کلام کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے ایک ایک قصیدے کو غور سے پڑھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قصیدہ نگاری کے لیے کثرت الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ استعارہ و تمثیل کی لطافت اور طرز ادا کی دلکشی ضروری ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اسے ان قصائد میں کچھ خامیاں بھی نظر آئیں۔ پہلی تو یہی کہ یہ قصیدے حقائق نگاری کے نمونے تھے ان میں تخیل کی بلند پروازی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تخیل کی بلند پروازی سے کلام پُرشکوہ ہو جاتا ہے۔ قدیم شعرائے عرب کے نزدیک حقائق نگاری شاعری کا ایک اہم جزو تھا۔ تخیل کی بلند پروازی اور مبالغہ آرائی ان کے کلام میں یا تو تھا ہی نہیں اور اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔

بات بات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک بات سیدھے سادے طریقے سے کہی جائے تو ایک معمولی سی بات ہوگی

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

مگر اسی کو جدید انداز اور نئے اسلوب میں ادا کیا جائے تو شاعری بن جائے گی مثلاً اگر کوئی کہے کہ رات میں بہت غمگین تھا یہ محض خبر ہے لیکن کہا جائے کہ رات مجھ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تو یہ شاعری ہے۔ احمد بن حسین ان قصیدوں میں یہی خامی دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسا شاعر ضرور آئے گا جو ان خامیوں کو دور کرے گا۔ اس وقت وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص وہ خود ہی ہوگا جو عربی شاعری کو اس مقام پر پہنچا دے گا کہ پھر اس میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہے گی۔

وہ اس کتاب میں نابغہ ذبیانی کے حالات پڑھ چکا تھا کہ وہ اسی شاعری کی بدولت سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے کے لائق ہو گیا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ بھی شاعری کا پیشہ اختیار کرے گا۔ وہ شاعر کیسے بنے؟ اس سوال کے جواب میں وہ مختلف کتابیں پڑھتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعری ایک فطری چیز ہے اکتسابی نہیں یعنی جس طرح بڑھئی کا کام یا اس طرح دوسرے کام سیکھے جاتے ہیں۔ شاعری سیکھی نہیں جاسکتی۔ انسان کے صحیفۂ قلب پر رنج وغم، خوشی و مسرت اور سوز و گداز وغیرہ کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، انہیں اگر کلام موزوں کی شکل میں ڈھال دیا جائے تو اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کو شاعر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو محسوس کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ بہت سے ایسے معمولی واقعات ہوتے ہیں جو اسے دکھی کر دیتے ہیں جب کہ اس کی نانی پر ان باتوں کا اثر تک نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے میں دوسروں کے مقابلے میں بڑی شدت سے چیزوں کو محسوس کرتا ہوں۔

اب صرف یہ دیکھنا رہ گیا تھا کہ وہ موزوں طبع ہے یا نہیں۔ وہ ایک ایسے خیال کے تعاقب میں نکل گیا جسے وہ شعر کی شکل میں ڈھال سکے بالآخر ایک خیال اسے سوجھ گیا کہ وہ ایک شخص سے محبت کرتا ہے لیکن محبت ہوتے ہی زمانہ دونوں میں جدائی پیدا کردیتا ہے۔ طویل انتظار کے بعد اس کو اپنے محبوب سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے محبوب کی صحبتوں سے لطف اندوز ہو ظالم زمانے نے اس کو پھر جدا کر دیا۔ خیال اچھا تھا اس نے ذہن پر زور ڈالا اور اس خیال کو نظم کر دیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس خیال کو اس نے دو شعروں میں بیان کر دیا تھا۔ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کی قدرت ابھی اسے حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اس میں کیا خامی رہ گئی ہے۔ یہ تو بعد میں آنے والوں نے بتایا کہ ان شعروں کے ایک ایک لفظ سے نومشقی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ دن گزر رہے تھے کہ اس نے تین شعر اور کہے جن میں کہا گیا تھا کہ سوزِ غم محبت میں گھل گھل کر بالکل لاغر ہو گیا ہے اور یہ حالت ہو گئی ہے کہ اگر وہ اپنے مخاطب سے باتیں نہ کرتا ہوتا تو مخاطب اس کو دیکھ بھی نہ سکتا۔

اس نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے تین شعر کہے۔ ان سے بھی نومشقی ظاہر ہو رہی تھی لیکن اتنی ترقی ضرور ہوئی تھی کہ دو شعر تو تکلفات سے لبریز تھے لیکن تیسرا شعر حسن ادا اور خوبی کے اعتبار سے بہترین شعر تھا۔ اس کی تنقیدی نگاہ خود بھی سمجھ رہی تھی کہ اس شعر میں فنی خوبی موجود ہے۔

اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ ان طباع شعرا میں سے ہے جو فطری طور پر موزونیت طبع رکھتا ہے۔

وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے نظم کلام پر قدرت اور حسن ادا میں حدت حاصل ہوتی گئی۔

دنیائے عرب میں یا تو قصیدے کہے جاتے تھے یا ہجو نگاری کا رواج تھا۔ کوئی شاعر کسی سے خوش ہوتا تو اس کا قصیدہ لکھتا۔ اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آجاتی تو اس کی ہجو کہتا۔ ابھی تک احمد بن حسین کا کوئی ممدوح نہیں تھا اور نہ ہی وہ ''متنبی'' کے لقب سے مشہور ہوا تھا لیکن زمانے کے رواج کے مطابق اس نے بچپن ہی میں ایک خیالی ''ہجو'' بھی کہی۔

اس نے چند اشعار میں ایسے دو آدمیوں کا مذاق اڑایا جو ایک چوہے کو موت کے گھاٹ اتار کر بڑی شان سے اپنی تیس مار خانی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ احمد بن حسین (متنبی) غریب چوہے کی موت پر اظہار تاسف کرتا ہے اور اس کے دونوں قاتلوں کا مذاق اڑاتے ہوئے ان کی ہجو کرتا ہے۔

پہلے شعر میں اس نے تاسف کیا کہ آخر چوہا موت کے پنجے میں پھنس گیا۔ دوسرے شعر میں اس کے قاتلوں کو دو عرب سورماؤں کنانی اور عامری سے تشبیہ دے کر ان کا مذاق اڑایا جنہوں نے حقیر جانور کو قتل کیا۔ تیسرے شعر میں اس نے پوچھا تم نے اس چوہے کو قتل تو کر دیا، یہ بتاؤ کہ دونوں میں سے کس نے اس کے مال و متاع پر قبضہ کیا۔ چوتھے اور آخری شعر میں یہ ہجو اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس نے پوچھا، اچھا یہ تو بتاؤ تم دونوں میں سے اس کے پیچھے کون تھا اس لیے کہ اس کی دُم پر دانت کے نشانات ہیں۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اسی قسم کی طفلانہ شوخیاں اس کے دوسرے شعروں میں بھی نظر آتی ہیں۔

وہ بچپن کے دور سے گزر کر جب سن بلوغ میں داخل ہوا تو وہ ایک قادر الکلام شاعر بن چکا تھا۔ اب اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ وہ جب اپنے اشعار کا موازنہ دوسرے شعرا سے کرتا تو ان سے بہت مختلف پاتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر اسے کوئی قدر دان نصیب ہو جائے تو عیش و نشاط اس کا مقدر بن جائے۔ اس نے اِدھر اُدھر کوئی ایسا نام ڈھونڈا جس کی مدح میں وہ لب کشائی کر سکے لیکن کسی نام نے اسے اپنی طرف نہیں کھینچا آخر وہ چیخ اٹھا۔

"بے شک! میں نے بہت صبر کیا یہاں تک کہ اب صبر کی گنجائش نہیں رہی۔ اب میں جنگ میں گھستا ہوں اور اس تختی کے ساتھ کہ پھر جنگ کی ضرورت نہ رہے۔"

میں لڑائی کی شدت کی وجہ سے گھوڑوں کے چہروں کو لاغر اور متغیر کر ڈالوں گا۔ اس طرح لڑائی خوب جم جائے گی اور اپنے پیروں پر قائم ہو جائے گی۔

اور نیزہ بازی ان گھوڑوں کو آتش غضب میں ڈال دے گی اور ان کو ڈانٹنا ان میں ایسی تیزی پیدا کر دے گی گویا ان کو کسی قسم کا جنون ہے۔ ان گھوڑوں کو نیزوں نے اس طرح زخمی کر دیا ہوگا کہ ان کے منہ کھلے ہوں گے گویا ان کی لگام پر ایلوا چھڑک دیا گیا ہے۔

میں یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کی مدد سے کروں گا جو قاطع تلوار کی طرح اپنا ارادہ پورا کرنے والا ہوگا۔ عنقریب میں اپنا حق نیزوں اور ایسے تجربہ کار مشائخ کی اعانت سے حاصل کروں گا جو ہمیشہ جنگی تیاریوں کی وجہ سے ڈھاٹا باندھے رہتے ہیں۔

اور میں اپنا حق ایسی نیزہ بازی سے حاصل کروں گا کہ اس کی حرارت کے مقابلے میں آگ بھی سرد ہے۔

جب میں چاہوں گا تو میرے گرد تیز رو گھوڑوں پر ایسے شہسوار جمع ہو جائیں گے جن کے منہ میں موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

اپنے اس ارادے کے اظہار کے ساتھ ہی وہ کسی بڑے میدانِ جنگ کی تلاش میں شمالی شام کی طرف ہجرت کر گیا۔

یہاں سے اس کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جو جوانی کا دور تھا، بچپن کا نہیں۔ اس دور میں داخل ہونے سے پہلے وہ شعر و شاعری میں کمال حاصل کر چکا تھا۔

چوتھی صدی ہجری جس میں احمد بن حسین سانس لے رہا تھا بڑا پرفتن اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ یہ وہ پُرآشوب دور تھا جس میں دن رات فتنے اٹھتے رہتے تھے۔ جھوٹے نبوت کے دعوے داروں کی غارت گریوں کی وجہ سے ملک تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ اس پُرآشوب دور میں کوفہ ان شورشوں کا خاص طور پر آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اس انتشار اور طوائف الملوکی کے دور میں مختلف فرقے اپنے اپنے خیالات اور معتقدات کا زور و شور سے پرچار کر رہے تھے۔

وہ بڑا بہادر اور تیز رفتار تھا۔ وہ جنگ اور بیابانوں کے ان مقامات سے خوب واقف تھا جہاں چشمے اور تالاب تھے اور اہل عرب سفر کے دوران ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ایک منزل سے دوسری منزل تک چار دن کی مسافت ایک ہی روز میں طے کر لیتا تھا۔ وہ کہتا تھا زمین کے طبقات اس کے لیے لپیٹ دیے گئے ہیں۔ وہ عموماً پیدل سفر کیا کرتا تھا۔

اس نے ایک قصیدے میں اپنی پا پیادہ صحرا نوردی کا ان الفاظ میں ذکر کیا تھا۔

"بہت سے ایسے میدان ہیں جن کو میں نے پا پیادہ قطع کیا ہے جنہیں مضبوط اور مشاق اونٹنیاں بھی طے نہیں کر سکتیں۔"

وہ شمالی شام کے سفر پر بھی پا پیادہ روانہ ہوا۔ اس سفر میں بعض ایسے بدوی قبائل سے اس کا گزر ہوا جو اپنے فرماں رواؤں سے سخت بیزار تھے۔ اس کے سر میں تو پہلے ہی سے امارت و سیادت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اسے موقع مل گیا وہ دیکھ رہا تھا کہ جگہ جگہ نبوت کے دعویدار پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ بھی کسی ایسے ہی دعوے پر غور کرنے لگا۔ اس نے ان بدوی قبائل کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کرنے کی کوشش کی اس نے ان کے سامنے ایسے اشعار پڑھے جن میں اس نے کبھی خود کو حضرت مسیح سے تشبیہ دی، کہیں حضرت صالح سے، کبھی ان مسلمانوں کو جن میں وہ رہتا سہتا تھا یہود کہا اور کہیں ان کی "ثمود" سے تشبیہ دی۔

سرزمین نخلہ میں میرا قیام ویسا ہی معاندانہ ہے جیسے حضرت مسیح کا قیام، یہود کے درمیان تھا۔

اگر میں خود پسندی اور غرور کروں تو یہ اس شخص کے جیسا غرور ہوگا جو اپنے سے زیادہ کسی کو نہ پائے۔

میں بخشش کا ساتھی اور ہجولی ہوں۔ اشعار و قوافی کا آقا، دشمنوں کے لیے زہر قاتل اور حاسدوں کو غیظ و غضب

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میں ڈالنے والا ہوں۔

میں ایک ایسی امت میں ہوں جو میری قدر نہیں جانتی۔ خدا اس کی اصلاح کرے۔ میں ان میں ایسا اجنبی ہوں جیسے حضرت صالح قوم ثمود میں تھے۔

اپنی جادو بیانی سے اس نے بعض قبائل کو اپنے قابو میں کرلیا اور بہت سے قبائل اس کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھے۔

وہ ایک مقام لاذقیہ میں تھا تو ایک شخص عبداللہ بن معاذ نے اس کی تعریف کی۔

''تم کس لیے بھیجے گئے ہو۔''

''میں دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح مالا مال کروں گا جس طرح اب وہ جور وستم سے لبریز ہے۔''

''یہ کس طرح ہوگا۔ میرا مطلب ہے تم یہ کس طرح کروگے۔''

''ان لوگوں کو رزق وثواب عاجل سے فیض یاب کروں گا جو میری اطاعت کریں گے اور ان لوگوں کی گردنیں اڑا دوں گا جو میری اطاعت سے سرکشی کریں گے۔''

وہ شخص (عبداللہ بن معاذ) پہلے تو یہ سمجھا کہ وہ مذاق کررہا ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ معاملہ سنجیدہ ہے تو عبداللہ بن معاذ نے اسے ملامت کی اور اس کے ان خیالات کے نتائج سے اسے خبردار کیا۔ احمد بن حسین نے جواب خود کو ابوالطیب کہلوانے لگا تھا شرمندہ ہونے کی بجائے برجستہ یہ اشعار پڑھ دیے۔

''اے عبداللہ معاذ! جنگ میں میرا مرتبہ تجھ سے پوشیدہ ہے۔''

میں نے اپنے عظیم الشان مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ بے شک ہم اس کے حصول کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال دیں گے۔

کیا مجھ جیسے شخص کو مصائب زمانہ گھبرا سکتے ہیں اور کیا مجھ جیسا آدمی موت سے ڈر سکتا ہے۔

اگر زمانہ میرے سامنے مجسم ہوکر ظاہر ہوتو میری تلوار اس کی مانگ کے بال کو اس کے خون سے ضرور رنگ دے گی۔

زمانہ میرے معاملے میں اپنی مراد کو نہیں پہنچا۔ نہ وہ اس طرح چلا کہ میری لگام اس کے ہاتھ میں ہو یعنی نہ وہ مجھے ذلیل کرسکا نہ اپنا تابعدار بنا سکا۔

جب وہ بنی عدی میں تھا تو اس نے حکومت کے خلاف بغاوت کرنا چاہی اور دعویٰ نبوت کیا۔ ان لوگوں نے نبوت مانگا اور کہا، دیکھو یہ اونٹنی مستی میں گرمائی ہوئی ہے اس لیے کسی کو اپنی پیٹھ پر نہیں بیٹھنے دیتی تم اگر اس پر سوار ہوجاؤ تو ہم مان لیں گے کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہو۔ وہ کچھ تدبیر کر کے اس پر سوار ہوگیا۔ اونٹنی نے شروع میں سرکشی کی مگر تھوڑی دیر میں رام ہوگئی۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور انہوں نے اس کا دعویٰ مان لیا۔

جب اس کی دعوت عام ہونے لگی تو اس کی بغاوت کی خبر حاکم وقت کو ہوگئی۔ امیر حمص نے جو اخشیدی حکومت کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا اس کی اس جسارت پر اسے گرفتار کرلیا اور قید میں ڈال دیا۔

اس کے بعض شارحین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا ہاں اس پر غور ہی کررہا تھا کہ گرفتار کرلیا گیا۔ بعض نے لکھا کہ اس نے بغاوت پر لوگوں کو آمادہ کیا تھا لہٰذا گرفتار کرلیا گیا۔ بعض نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا کہ اس نے ایک لغو اور بے ہودہ دعویٰ کیا جس کی خبر حاکم کو ہوگئی اور گرفتار کرلیا گیا۔

یہ بے ہودہ دعویٰ کیا ہوسکتا ہے۔ یقیناً دعویٰ نبوت۔ بات یہ ہے کہ اس کے شارحین نے اس الزام سے اسے بچانے کے لیے کبھی ''بغاوت'' کا لفظ استعمال کیا کبھی محض ''بے ہودہ دعویٰ'' کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ قید ہو جانے کے بعد خود اس نے بھی دعوے سے انکار کیا اور اسے حاسدوں کی کارستانی قرار دیا اس نے قید میں رہتے ہوئے چند اشعار امیر حمص کے پاس بھیجے اور اس واقعے سے انکار کیا۔

میرے بارے میں کہا گیا کہ میں نے دنیا کو گمراہ کر کے اس پر ظلم کیا حالانکہ میں تو ابھی نومولود ہوں۔ ابھی اچھی طرح بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔

تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو لوگوں کی جھوٹی باتیں مان لیتا ہے حالانکہ گواہی پر گواہ کے مرتبے کے اعتبار سے غور کیا جاتا ہے۔

تو کینہ پرور دشمنوں کی باتیں مت سن اور جھوٹے یہودیوں کی باتوں کا اعتبار مت کر۔

ادھر تو وہ اشعار لکھ کر امیر حمص کی توجہ اپنی بے گناہی کی طرف مبذول کررہا تھا دوسری جانب اس کے دعوے کی بدولت اسے متنبی کہا جارہا تھا۔ یعنی یہ کہا جارہا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ پھر یہ لقب اس

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کے ساتھ ایسا پیوست ہوا کہ تاریخ میں وہ اسی لقب سے مشہور ہو گیا۔ آج اسے کوئی احمد بن حسین یا ابوالطیب کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ ''متنبی'' کے نام سے سب جانتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو متنبی کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ متنبی کے کیا معنی ہیں تو وہ کہا کرتا کہ یہ لفظ ''نبوہ'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''بلند ٹیلہ۔''

وہ یہ بھی کہا کرتا تھا جو لوگ مجھ سے جلتے ہیں انہوں نے میرا نام متنبی رکھ دیا ہے۔ میں ان کو ایسا کرنے سے کیونکر باز رکھ سکتا ہوں۔

وہ مسلسل جیل کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ یہ معمولی سختیاں نہیں تھیں۔ وہ اخلاقی مجرم تھا۔ لوگوں نے امیر حمص کے کان ایسے بھر دیے تھے کہ وہ اس کی طرف سے آنے والی ہر معذرت کو ٹھکراتا رہا۔ ان اشعار نے اس پر متنبی کے شاعرانہ جوہر ظاہر کر دیے تھے۔ ایسے صنائع بدائع، ایسی صنعت گری، ایسی معنویت، ایسی بلاغت اس نے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کا قائل بھی ہوتا جا رہا تھا لیکن ایسے جادو بیان شاعر کو آزاد کر دینا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

جیل کی سختیوں نے اسے قریب المرگ کر دیا تھا۔ وہ نہایت بہادر اور خوددار تھا لیکن ''بھوک شیروں کو بھی مردار خور بنا دیتی ہے۔'' متنبی نے اپنی حالت زار کی نہایت درد انگیز تصویر کشی کی اور اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے ہوئے چند اشعار امیر کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

لائق امیر میری مدد کر، کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ میں ایک پردیسی مسافر ہوں۔

یا اس مہربان ماں (نانی) کی وجہ سے مجھ پر رحم کر جب وہ مجھ کو یاد کرتی ہے تو اس کے دل کا خون آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا ہے۔

اگر تیری ملاقات سے قبل میں نے کوئی خطا کی تھی تو اب تیرے ہاتھوں پر توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔

وہ گھر سے اس اُمید پر شمالی شام کی طرف آیا تھا کہ کوئی نامور سردار اس کا مربی بنے گا۔ اس کے اشعار کو موتیوں میں تولے گا۔ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھائے گا، عیش و نشاط کی زندگی بسر کرے گا۔ یہ فارغ البالی اس کی شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دے گی لیکن دو سال ہو گئے تھے وہ قید خانے کی خاک چاٹ رہا تھا۔ اس کی شاعری معذرت اور معافی کی نذر ہو رہی تھی۔

اس کا ہر قصیدہ اب تک ضائع چلا گیا تھا۔ امیر حمص کسی طرح اس کی رہائی پر تیار نہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ایک زوردار قصیدہ امیر کی خدمت میں روانہ کیا۔

''تو مجھ پر حد شرعی جاری کرنے میں جلدی کر رہا ہے اس لیے کہ میں ابھی نابالغ ہوں۔ مجھ پر تو ابھی سجدہ بھی فرض نہیں ہوا۔

تیری بخششوں میں میری ذات کو بخشنا اور آزاد کرنا بھی ہے اگرچہ میں قوم ثمود کا بدترین انسان کیوں نہ ہوں۔

اس نے اس قصیدے میں یہ اقرار کر لیا کہ اس نے دعوے کا ارادہ ضرور کیا تھا لیکن نبوت کا دعویٰ کیا نہیں تھا۔ اس اقرار کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں نے کیسا ہی قصور کیا ہو اب میں تیری چشم کریم کا اُمیدوار ہوں۔ تو مجھے معاف کر دے۔

اس کھلی معافی پر امیر حمص کو متنبی کی حالت زار پر رحم آ گیا۔ اس نے علمائے دین اور اکابر سلطنت کو طلب کیا۔ ان کے سامنے متنبی کا قصیدہ رکھا۔ ان سب نے مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور معافی کا طلب گار ہے تو اسے ایک موقع دینا چاہیے۔

امیر حمص نے اس کی توبہ قبول کی اور اس کی قید سے رہائی کے احکام دے دیے۔ متنبی جو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اپنی رہائی کی خبر سنی تو خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اس نے امیر حمص جعفر بن کیغلغ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔

اس قصیدے سے اسے یہ اُمید تھی کہ امیر کے دل میں اس کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی اور شاید وہ اسے اپنی ملازمت میں رکھ لے لیکن امیر نے صرف اس کی توبہ قبول کر لینے پر اکتفا کیا اور اسے قید سے رہا کر دیا۔

وہ قید سے رہا ضرور ہو گیا تھا لیکن سخت مایوس تھا۔

''دنیا نے مجھ کو پیاسا بنا دیا۔ جب میں اس کے پاس سیرابی حاصل کرنے گیا تو اس نے مجھ پر بجائے پانی، مصائب برسا دیے۔''

وہ مصائب کی دھوپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔

پچھلی زندگی میں اپنی دلی آرزوؤں سے دوچار ہوا تھا اور اب مایوسی و ناامیدی کا شکار تھا۔ یہ بڑا انقلاب تھا۔ وہ مایوسی کے لفظ سے واقف نہیں تھا لیکن اب تھا۔ اس کی عمر

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

بیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ابھی اس کی پوری زندگی اس کے سامنے تھی اور وہ مایوس تھا۔ پہلے اس کی امنگیں اس کو بڑے بڑے کارناموں کی طرف مائل کر رہی تھیں مگر اب وہ راحت وعافیت کی تلاش میں تھا جس کی اُمید بہت کم تھی۔ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ تھا۔ حاضر پر تنگ دل اور اپنے تاریک مستقبل سے حد درجہ مایوس۔ وہ بے گھر بے در اور ایک بے یار و مددگار مسافر تھا۔

وہ بڑی بے دلی کے ساتھ حمص سے حلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ معمول کے مطابق اس کے پاؤں ہی اس کی تیز رفتار اونٹنی بنے ہوئے تھے۔ جب وہ ایک مقام فرادیس سے گزرا تو اس نے شیر کی دہاڑ سنی۔ اس نے اپنے کوف کو اشعار کی شکل میں ڈھال دیا۔

''اے فرادیس کے شیرو! کیا تمہارا پڑوسی معزز ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے یا وہ ذلیل ہے اور دشمنوں کے سپرد کیا ہوا ہے۔''

میرے آگے اور پیچھے بہت سے دشمن ہیں۔ مجھے چوروں کا ڈر ہے تیرا ڈر ہے اور دشمنوں کا ڈر ہے۔ کیا تم میرا حلیف بننا پسند کرو گے اس چیز میں جس کا ارادہ رکھتا ہوں اس لیے کہ میں روزی کے ذرائع سے خوب واقف ہوں۔

اگر ایسا ہوا تو رزق ہر طرف سے تمہارے پاس آئے گا اور تم دولت مند ہو جاؤ گے۔ اس مال سے جو تم لوٹو گے اور میں لوٹوں گا۔

خونخوار شیروں، رہزنوں اور لٹیروں سے بچتا بچاتا، جنگلوں اور بیابانوں سے گزرتا ہوا حمص سے حلب پہنچ گیا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ حلب میں ان دنوں انتشار کی کیفیت تھی۔ دولت عباسیہ اور دولت رشیدیہ دونوں وہاں اپنا قبضہ جمانے پر تلے ہوئے تھے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ کسی قابلِ ذکر مربی کا ملنا دشوار تھا بلکہ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

وہ حلب سے نکلا اور انطا کیہ روانہ ہو گیا۔ یہاں اسے کوئی عظیم الشان ممدوح تو میسر نہ آسکا لیکن روزی کا سامان ہو گیا۔ وہاں کے امراء و اشراف کی مدح سرائی کر کے پیٹ پالنے لگا۔ ان کی شان میں قصائد کہے اور ان سے انعامات حاصل کیے لیکن برائے نام۔ بہت کم لوگوں نے اس کو خاطر خواہ صلہ اور انعام سے نوازا۔ بعض لوگوں نے اس کے اشعار بے حد پسند کرنے کے باوجود چند درہم سے زیادہ انعام واکرام کا مستحق نہیں سمجھا۔

اس نے ایک ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھا تو عجیب لطیفہ سامنے آیا۔ اس نے انعام میں متنبی کو صرف دس درہم دیے۔ جب اس سے کہا گیا کہ متنبی کے اشعار بہت اچھے ہیں تو اس نے کہا مجھے معلوم نہیں اچھے ہیں یا برے، اچھا بیس درہم سہی۔

ایک ممدوح نے تو اپنے مدحیہ قصیدے پر اسے صرف ایک دینار انعام دیا۔ اس نے جل کر اس ممدوح کا نام ہی دیناریہ رکھ دیا۔

اس ناقدری کے بازار میں اسے اپنے ایک قصیدے میں یہ شعر شامل کرنا پڑا۔

''ناقدری کے بازار میں اشعار بیچ کر کب تک میں اپنے کو بلند مراتب کے حصول سے باز رکھوں گا۔''

بعض نے اسے انعام واکرام سے نوازا بھی، متنبی نے ایسے ممدوحین کی تعریف بھی دل کھول کر کی مثلاً حسین بن علی الہمدانی کی تعریف میں کہتا ہے۔

''میں نے اس سے پہلے اس کے والد کی تعریف کی تھی جس کے دیدار سے لوگوں کی بیمار آنکھوں کو شفا بخشی جاتی ہے۔ اس نے میرے ہاتھوں کو افلاس کی بیماری سے نجات بخشی۔

اس ناقدری کے ماحول میں اس کی شاعری کیا ترقی کرتی۔ جیل سے رہائی کے بعد سے انطا کیہ میں قیام تک اس کی شاعری کچھ ترقی نہ کر سکی۔ اس عرصے میں بے شک اس نے زمانے کی بے مہریوں اور اس کی تلخیوں پر بے بہا اشعار کہے ہیں اور غم واندوہ کے ایسے راگ گائے ہیں جس سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

وہ فرصت کے ان دنوں میں بدوی قبائل کی طرف نکل جاتا اور کئی کئی دن وہاں قیام کر کے ان سے عربی محاورے سیکھتا تھا۔

اس کے نقادوں نے صحیح لکھا کہ متنبی بادیہ نشیں قبائل کے ساتھ رہا اور چند سالوں میں خالص بدو بن گیا۔ اسے لغت وبیان پر ایسی قدرت حاصل ہو گئی کہ معرفت لغت میں کوئی مشہور شاعر اس کا ہم پلہ نہیں کہلا سکتا۔ اس کو عربی زبان ولغت پر اس قدر عبور تھا کہ جب اس سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ فوراً کلام عرب سے شہادت پیش کرتا۔ اس کے دشمن تک یہ کہنے پر مجبور تھے۔

علم لغت میں تم سب سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ کوئی شخص بھی تم سے زیادہ اس بات کا مستحق نہیں جس سے غریب لغات کے بارے میں دریافت کیا جائے۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

علم لغت میں مہارت ایک ایسی تیاری تھی جو آیندہ اس کے کام آنے والی تھی۔ اسے ایسے ممدوحین میسر آنے والے تھے جو ایسی ہی خالص زبان میں مخاطب کرنے کے لائق تھے۔

آیندہ کیا ہوگا یہ تو تاریخ جانتی تھی فی الحال تو وہ صحرا نوردی اور بے نوائی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ شمالی شام میں امراء کی مدح سرائی کرتا اور اپنی فکر شعری کو جائے پناہ کی تلاش میں کساد بازاری کی نذر کرتا رہا۔ نہ وہ اپنے رنگ شاعری میں کوئی اضافہ کرسکا نہ اس میں کوئی جدت اور ندرت پیدا کرسکا۔ اس تمام عرصے میں وہ صرف شعرا کے متقدین کی تقلید کرتا رہا۔ اس کو وہ امن وسکون نصیب نہیں تھا جو حوصلہ بڑھاتی ہے اور حوصلہ شاعری کو فروغ دیتا ہے۔ وہ دن رات یا تو کسبِ معاش کے چکر میں رہتا تھا یا دشمنوں سے محفوظ رہنے کی فکر کرتا رہتا تھا۔ اس کا سارا زور اہلِ زمانہ کی شکایت اور مذمت پر صرف ہو رہا تھا۔ اسے ان لوگوں کی جھوٹی مدح کرنی پڑ رہی تھی جو اس مدح کے لائق نہیں تھے لیکن اب بھی وہ حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

”موت میری عذر خواہ ہے اور صبر مجھ جیسے بہادر کے لیے زیب دیتا ہے۔ دشت وصحرا میرے لیے بڑی وسیع جولانگاہ ہے اور دنیا اسی کے لیے ہے جو لڑ بھڑ کر اس پر غالب آجائے۔“

بالآخر اس کا صبر اس کے کام آیا۔ اس کو جنوبی شام میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ طبریہ روانہ ہوگیا۔

ابھی وہ طبریہ پہنچا ہی تھا کہ جبال لبنان کو عبور کرتے ہی اس کی ملاقات ابوعلی ہارون سے ہوئی۔ یہ شخص صوفی منش تھا۔ متنبی کی شہرت سن چکا تھا۔ اب جو اسے اپنے قریب دیکھا تو اس کے آگے دستر خوان کی طرح بچھ گیا۔ متنبی کی ایسی آؤ بھگت کی کہ وہ ابوعلی کی شان میں قصیدہ لکھنے پر مجبور ہوگیا۔

متنبی نے اس کی دل کھول کر تعریف کی اور ایسا زوردار قصیدہ لکھا جو جان بلاغت کہلانے کا مستحق تھا۔ شاعری کا وہ شعلہ جو شمالی شام میں رہ کر بجھ گیا تھا اس قصیدے میں پوری طاقت سے بھڑکا۔ اس قصیدے میں اس کا رنگ شاعری اس وقت سے قطعی مختلف تھا جب وہ شمالی شام میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔

اس حوصلے کی بنیادی وجہ صرف اتنی تھی کہ اس عرصے میں رخشیدی حکومت کا تختہ الٹا جاچکا تھا۔ اسی رخشیدی حکومت کے ہاتھوں اسے قید و بند کی سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ یہ اس کی زبردست فتح تھی۔ اب وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد پھر سے بحال ہوگیا۔ اب اس کے کلام میں پھر وہ زور پیدا ہوگیا جو قید و بند کے بعد شمالی شام میں ہرگز نہ تھا۔

جس امیر حمص ابن کیغلغ نے متنبی کو قید کیا تھا رخشیدی حکومت کا نمائندہ تھا۔ جب اس کے حریف بدر بن عمار نے امیر حمص پر غلبہ حاصل کرلیا تو ابوعلی ہارون نے متنبی کو بدر بن عمار کے دربار میں پہنچا دیا۔ اس دربار میں پہنچتے ہی اس کو زندگی کا چین بھی نصیب ہوا اور وہ پُرسکون ماحول بھی جو ایک شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چند ہی مہینوں میں اس کی شاعری ترقی کے اس بلند مقام پر پہنچ گئی جہاں اس سے پہلے وہ پانچ سال میں نہ پہنچ سکی تھی۔

یہ کیسا انقلاب ہوا کہ وہی بدر بن عمار جس کی وہ ہجو کر چکا تھا۔

”وہ بدر بن عمار اپنی فوج کے ساتھ ایسا بھاگا جیسے بکری شیر کی آواز محسوس کرکے بھاگے۔“ (یہ اس وقت کی بات ہے جب متنبی بدر بن عمار کے حریف ابن کیغلغ کے رحم و کرم پر تھا)۔

اب اسی بدر بن عمار کی تعریف ان الفاظ میں کر رہا تھا۔

”کیا ہم خواب دیکھ رہے ہیں یا زمانہ ہی ایسا آگیا ہے کہ تمام مخلوق کی خوبیاں ایک زندہ شخص یعنی بدر بن عمار میں پھر جمع کردی گئی ہیں۔“

اب ابن کیغلغ کا تختہ الٹا جاچکا تھا لہٰذا متنبی خوشی سے جھوم جھوم کر بدر بن عمار کی تعریف کر رہا تھا۔

”وہ ایسا سخی ہے جو اس بات میں بخیل ہے کہ سخاوت نہ کرے۔“

وہ بدر بن عمار سے ایسا خوش ہوا کہ یکے بعد دیگرے کئی قصیدے اس کی خدمت میں پیش کیے اور دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی۔

متنبی نے ان قصائد میں وہ شاعرانہ جوہر دکھائے کہ بدر اس کے گرویدہ ہوگیا اور حال یہ ہوگیا کہ وہ جلوت و خلوت میں اس کا مقرب بن گیا۔

متنبی کی پذیرائی دیکھ کر درباریوں کے دل رشک و حسد سے جلنے لگے۔ پھر وہی ہوا جو ان درباروں میں ہوتا رہتا ہے۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بنے جانے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

لگے۔ ان سازشوں کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح وہ بدر بن عمار کی نظروں سے گر جائے۔ درباریوں کے سازشی ذہن کوشش ضرور کر رہے تھے لیکن ان کی ہر کوشش ہوا برد ہو رہی تھی۔ پھر اچانک متنبی کی بدقسمتی نے اس کے حاسدوں کو یہ موقع فراہم کر دیا۔

بدر بن عمار کے حدود امارات میں کچھ اور سواحل شام کا اضافہ ہوا۔ جب وہ ان پر تسلط جمانے کے لیے جانے لگا تو متنبی بعض وجوہ کی بنا پر ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے بدر کے خوب کان بھرے۔ بدر اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اب وہ ساتھ جانے سے معذرت کر رہا تھا اوپر سے حاسدوں نے اسے خوب بھڑکایا۔ بدر کے دل میں اس کی طرف سے بال آگیا۔ اس نے کہا تو کچھ نہیں اور روانہ ہو گیا لیکن بعض لوگوں سے وہ ایسی باتیں کہہ گیا جن سے مخالفت کی بُو آتی تھی۔ متنبی کو معلوم ہوا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس نے کچھ اشعار کہہ کر رکھ لیے کہ جب بدر لوٹے گا تو وہ اس کی خدمت میں پیش کرے گا۔

جب بدر، طبریہ لوٹ کر آیا تو اس نے یہ اشعار اس کی خدمت میں پیش کیے۔

میں نے اس سفر میں تجھ سے جدا رہ کر جو غلطی کی ہے اس کو میرا دل اچھی طرح سمجھ گیا ہے اور تیرے ساتھ نہ جا کر جس خدمت کو میں نے چھوڑ دیا ہے اس سے بھی میں غافل نہیں ہوں۔

میں تجھ پر قربان ہو جاؤں تو میری غلطی معاف کر دے اور اس کے بعد بھی مجھ پر انعام کرتا کہ تو مجھ کو ایسی بخششوں سے مخصوص کرے جس میں سے خود میری ذات بھی ہے۔

اور جو شخص میرے بارے میں تجھ کو غلط مشورہ دیتا ہے اس کو منع کر۔ چغل خوروں کی باتیں مت سن یہ ہمیشہ شریف آدمی کے دشمن ہوتے ہیں۔

شعرا کی عداوت میرا ذخیرہ ہے کیونکہ وہ ہجو کہہ کر ساری دنیا میں بدنام کر دیتے ہیں۔

بدر عمار نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ پہلے کی طرح پھر اس سے خوش نظر آنے لگا۔ یہ وہ موقع تھا کہ متنبی کو ٹھوکر کھا کر سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن بعض معاملات میں وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ بے حد خود پسند واقع ہوا تھا۔ اپنی برتری کا خیال اس حد تک تھا کہ وہ خود کو شعرا کے مرتبے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا دل بادشاہوں جیسا ہے اگرچہ میری زبان شعرا جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہی احساس برتری کہ وہ امراء اور بادشاہوں سے اس طرح خطاب کرتا تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے کرتا ہے یا کوئی عاشق اپنے محبوب سے کرتا ہے۔ بدوی قبائل میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ایک قسم کی سختی اور دوسروں کو کچھ نہ سمجھنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ صرف خیال پیدا نہیں ہو گیا تھا بلکہ وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتا تھا۔

میں کس بلند رتبہ پر ترقی کروں؟ اور کس بڑے شخص سے ڈروں حالانکہ دنیا میں جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں اور جو نہیں پیدا کی ہیں وہ سب میرے عزم وارادہ کے مقابلے میں ایسی حقیر ہیں جیسے میری مانگ کا ایک بال۔

اس کی یہی شیخیاں تھیں جو اسے بار بار مصیبت میں ڈال دیتی تھیں۔ اس پر نبوت کے دعوے کا الزام لگنا بھی غالباً انہی شیخیوں اور خود کو دوسروں سے بلند سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنے اتنے دشمن پیدا کر لیے تھے جو اسے کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ مصلحت کا تو جیسے وہ قائل ہی نہیں تھا۔ بے باکی کا ایسا ہی ایک واقعہ بدر بن عمار کے دربار میں پیش آیا۔ برسر دربار شراب کا دور چل رہا تھا۔ متنبی شراب نوشی سے سخت نفرت کرتا تھا اس لیے ان محفلوں سے بچتا رہتا تھا لیکن اس روز بدر بن عمار کے اصرار پر اسے بیٹھنا پڑا۔ بدر بن عمار کے حاشیہ بردار واقف تھے کہ متنبی شراب نہیں پیتا بلکہ پینے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ انہوں نے یہ سب جانتے ہوئے بھی متنبی کی طرف شراب کا جام بڑھا دیا اس نے انکار کیا۔ اس کے انکار کو دیکھتے ہوئے بدر بن عمار نے بھی اصرار کیا۔ اس کے حاسدوں کو یقین تھا کہ وہ بدر کو منع نہیں کر سکے گا اور بعد میں ہم اسے مذاق کا نشانہ بنائیں گے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے بدر کو بھی انکار کر دیا۔

''آقائے نعمت! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں شراب نہیں پیتا۔''

''ہمیں معلوم ہے لیکن اس وقت ہم پیش کر رہے ہیں۔''

''مجھے پھر بھی انکار ہوگا۔''

یہ سنتے ہی بدر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی درباری اس کے حکم سے انحراف کرے۔ متنبی نے اس انکار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آداب مجلس کا خیال کیے بغیر فی البدیہہ یہ اشعار بھی پڑھ دیے۔

میں نے شراب کو عقل پر غالب ہونے والی چیز

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پایا۔ وہ دل کے شوق کو برانگیختہ کرتی ہے یعنی خواہشات نفسانی کو ابھارتی ہے۔ وہ انسان کے قول و فعل میں اس کی تہذیب کو بگاڑ دیتی ہے لیکن وہ سخاوت اور شجاعت جیسے اخلاق کو بہتر بنا دیتی ہے۔

”انسان کی تمام چیزوں میں نفیس ترین چیز اس کی عقل ہے۔ عقلمند اس کو ضائع کرنا اور کھو دینا برا سمجھتا ہے۔“

بدر کے حاشیہ بردار اس کے کان پہلے ہی بھر چکے تھے۔ متنبی کے یہ اشعار سن کر وہ برہم ہو گیا۔ اس نے متنبی کو اس محفل سے اٹھ جانے کا حکم دے دیا۔

”اگر تو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے تو ہمارے درمیان تیرا کیا کام۔“

متنبی سمجھ گیا کہ اب اس دربار میں اس کی خیر نہیں۔ عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کی جائے۔ بدر بن عمار کے پاس آکر وہ یہ سمجھا تھا کہ اسے مصیبتوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی لیکن ایک مرتبہ اضطراب اور بے چینی کی زندگی پر قناعت کرنی پڑی۔ دربدری پھر اس کا مقدر بن گئی۔ وہ شمالی شام میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور مختلف لوگوں کی تعریف میں قصائد کہتا پھرا۔

☆.....☆

خلافت عباسیہ کا آفتاب ڈھل رہا تھا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ عمال حکومت نے مرکز کو اپنے مقبوضہ صوبوں کے خراج سے محروم کر دیا۔ خلیفہ راضی باللہ نے فوراً ابوبکر محمد بن رائق کو جو ”واسط“ کا گورنر تھا اس شرط پر عنان وزارت اور سپہ سالاری افواج سپرد کی کہ وہ تمام مالی بدانتظامیوں کو درست کر دے۔ اس کو امیر الامرا کے ایک نئے عہدے پر فائز کیا جس کے قبضے میں تمام شاہی حقوق پہنچ گئے۔

ابن رائق جس وقت بہ حیثیت امیر الامرا دارالخلافہ بغداد آیا۔ سلطنت عباسیہ کا شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا۔ بغداد اور اس کے ملحقہ صوبوں کے علاوہ باقی تمام صوبے خلیفہ کے عملی اقتدار سے آزاد ہو چکے تھے۔ امیر الامرا بننے کے بعد ابن رائق کو مختلف امرا سے مقابلہ کرنا پڑا بالآخر وہ بھاگ کر امداد حاصل کرنے سیف اللہ کے بھائی ناصر الدولہ کے پاس پہنچا۔ (سیف الدولہ اس وقت ”واسط“ پر حکومت کرتا تھا)۔ ناصر الدولہ اس وقت موصل کا فرمانروا تھا۔ ناصر الدولہ نے اس کا پرتپاک استقبال کیا لیکن واپسی میں اسے قتل کرا دیا۔

یہ سیف الدولہ کا ترقی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد اس نے شمالی شام میں ”حلب“ کا علاقہ زخشیدہ حکومت سے چھین لیا۔ پھر دمشق اور رملہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر تو وہ دنیائے اسلام میں مجاہد اعظم بن کر ابھرا رومیوں کے خلاف جنگوں میں اس نے کافی شہرت حاصل کی۔

سیف الدولہ کے جدامجد حمدان بن حمدون روسائے بنی تغلب میں سے ایک سردار تھا جس کے نام سے حمدانی قبیلہ منسوب ہے۔ اس نے 260ھ میں سیاسی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی اولادیں بعد میں حکومتوں میں شامل ہوتی گئیں۔ دولت عباسیہ میں اس خاندان نے خوب ترقی کی۔ سیف الدولہ اسی خاندان کا فرد تھا جو گورنری سے بادشاہت تک پہنچا اور بادشاہ بھی ایسا جسے غازی بادشاہ کہا جاتا تھا جس نے فتوحات میں خلفائے اسلام کی یاد تازہ کر دی تھی۔

اس عرصے میں متنبی، رملہ، طرابلس اور دمشق وغیرہ مختلف مقامات میں امراء اور دوسرے اہلِ ثروت کی مدح سرائی کر کے پیٹ پالتا رہا۔

وہ سیاسی حالات پر بغور نظر رکھے ہوئے تھا۔ شمالی شام میں ایسا انتشار پھیلا ہوا تھا کہ اس کے قدم کہیں ٹکنے والے نہیں تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ اس کے سابق مربی ابوالعشائر کے قدم انطاکیہ میں جم چکے ہیں تو وہ فوراً ابوالعشائر کے پاس جا پہنچا۔

”مجھے کیا ہو گیا کہ میں ابوالعشائر حسین بن علی کی تعریف نہیں کرتا اور اس سے ویسی محبت کا برتاؤ نہیں کرتا جیسی محبت اس نے مجھ سے کی ہے۔“

ابھی ابوالعشائر اس قصیدے سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے دوسرا قصیدہ اس سے بھی بڑھ کر پیش کر دیا۔

لوگ جب تک تجھ کو نہ دیکھیں ایک جیسے ہیں لیکن تجھے دیکھنے کے بعد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ سب ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ تو بے نظیر ہے۔

جود و سخاوت بہ منزلہ آنکھ کے ہے اور تو اسے دیکھنے والا یعنی نور چشم اور بہادری اور دبدبہ بہ منزلہ ہاتھ کے ہے اور تو اس کا دست راست ہے یعنی تو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔

میں اس بہادر پر قربان جاؤں جس سے ہر تنگ اور

غبار آلود میدان میں جنگ کرنے والے شہسوار بچے ہیں یعنی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اس وقت تک وہ ایک پختہ کلام شاعر بن چکا تھا۔ وہ دنیائے شاعری کا واحد شاعر تھا جس نے اپنے آپ کو صرف قصائد کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس نے کسی دوسری صنف میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ اسی صنف سخن میں دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس لیے اس کے اشعار زبانوں پر ایسے چڑھے کہ فضائیں گونج اٹھیں۔ اس کے کلام میں جادو تھا اس کے نغمات نے کانوں کو ایسا مسحور کیا کہ لوگ ان میں کھو کر رہ گئے۔ جلد ہی اس نے یہ اعزاز حاصل کر لیا کہ وہ سرزمین عرب کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ اس نے اپنے قصائد میں تمام فنی خوبیاں یکجا کر دیں۔ الفاظ کی کثرت، تشبیہ کی بلاغت، استعارہ و تمثیل کی لطافت، مضمون کی گہرائی، طرز ادا کی دلکشی جدت طرازی اور مبالغہ آرائی جو قصائد کی جان سمجھی جاتی ہے اس کے کلام میں ایک خاص ساحرانہ انداز میں جمع ہو گئی۔

اس نے قصیدہ گوئی کو اوج کمال پر پہنچا دیا۔ اس بلندی پر پہنچا دیا کہ مزید آگے بڑھنے کی گنجائش ہی ختم ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ اس کی بدولت، قصیدہ اور کاسہ گدائی ایک ہی چیز کے دو نام بن گئے۔

اسے عربی زبان پر شاہانہ فرماں روائی حاصل تھی۔ وہ ایک خودسر جابر بادشاہ کی طرح تھا جو اپنے گرد و پیش سے جو چاہتا زبردستی چھین لیتا۔ لغت کا امام سمجھا جاتا تھا۔ جس لفظ کو جب چاہتا اور جس طرح چاہتا گھٹنوں کے بل اپنے قدموں پر جھکا لیتا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ایک تو اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اعراب اور بادیہ نشیں قبائل میں پل کر پروان چڑھا تھا۔ اس نے عہد شباب انہی کی صحبتوں میں رہ کر گزارا تھا۔ لہٰذا زبان، محاورات اور الفاظ کی ہیئت ترکیبی پر پورا عبور تھا۔ اسے لغت پر ایسا عبور ہو گیا تھا کہ اس نے قواعد، حرف و نحو کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ اہل زبان کے شواہد ہوتے تھے۔

شعرا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زبان کو محفوظ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو زبان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ زبان کو آگے بڑھانے والوں کی اہمیت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ متنبی اسی گروہ کا سرخیل ہے۔ اس نے جو کچھ کہا صنائع بدائع کی خاطر نہیں کہا بلکہ اختراع معانی کی صناعی سے ایک نیا پیکر خیال پیش کیا یا پھر طرز ادا کی جدت سے پرانے خیال کو بھی نیا بنا دیا۔

اس باب میں متنبی کے بعد بھی زمانے نے اس کا کوئی ہمسر پیدا نہیں کیا۔

☆......☆

وہ انطاکیہ میں ابوالعشائر کے پاس تھا اور عیش و آرام کے دن گزار رہا تھا۔ ابوالعشائر بھی اس کے کمالات فن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس بے فکری نے اس کے قصائد میں نیا جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔

وہ شاید یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ قدر دانی اور پزیرائی میں انطاکیہ اس کی آخری منزل ہے لیکن جس طرح اس کی شاعری برابر ترقی کرتی جا رہی تھی اس کی منزلیں بھی تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

سیف الدولہ کی دھوم ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ اس نے حلب پر قبضہ کر لیا تھا۔ دمشق اور رملہ بھی اس کے تصرف میں آ چکے تھے۔ اس کی ذات سے یہ اُمید کی جا رہی تھی کہ اس کی فتوحات سیلاب کی طرح آگے بڑھتی جائیں گی۔ متنبی بھی اس سے ناآشنا نہیں تھا چنانچہ جب سیف الدولہ اپنے ابن عم ابوالعشائر سے ملنے انطاکیہ آیا تو متنبی بھی اس سے ملنے پہنچا۔ متنبی کسی بادشاہ سے ملنے جائے اور قصیدے کے بغیر ہی چلا جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے سیف الدولہ کے شایان شان قصیدہ پیش کیا۔

میں نے حوادث زمانہ کو عبور کیا یہاں تک کہ ممدوح سے آملا۔ ایک ایسے عزم کی پشت پر سوار ہو کر جس کے پاؤں مضبوط ہیں۔

''جب میں ممدوح کے پاس پہنچا تو میں نے ایسے ماہِ کامل کو دیکھا جس کا نظیر خود چاند نے دیکھا نہ ہوگا اور ایسے دریائے سخاوت سے باتیں کیں جس کا کنارہ کسی تیرنے والے نے نہیں دیکھا۔ ممدوح سے ملنے کے لیے جب میں نے دور دراز مقام کا ارادہ کیا تو میں رات میں چل پڑا گویا میں ایک راز تھا جس کو رات کی تاریکی چھپائے ہوئے تھی۔''

سیف الدولہ نے قصیدہ سنا تو پھڑک اٹھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور ناقد بھی۔ اشعار کے حسن و قبح اس پر ظاہر رہتے تھے۔ صنعت شعری کو پرکھنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اچھے شعر اور نادر ادب پاروں پر جان دیتا تھا۔ ان کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی میں فیاضی اور دریا دلی سے کام لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دربار جلیل القدر علماء قادر الکلام اور برجستہ گو شعرا کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کہا

جاتا تھا کہ خلفائے اسلام کے بعد اتنے اہل علم اور اہل قلم کسی بادشاہ یا میر کے دربار میں جمع نہیں ہوئے جتنے سیف الدولہ کے دربار میں جمع ہیں۔

اس نے پہلی ہی نظر میں متنبی کے جوہر کو پہچان لیا۔ متنبی بھی اس کے اندر چھپے ہوئے قدر دان کو شناخت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پے در پے دو اور قصیدے اس کی خدمت میں پیش کیے۔ ایک قصیدے میں تو اس نے تعریف اور خوشامد کی حد کر دی۔

''کاش ایسا ہوتا کہ جب تو سفر کرتا تو ہم شدائد سفر برداشت کرنے کے لیے تیری سواری بن جاتے اور جب تو کہیں فروکش ہوتا تو ہم تیرے آرام کے لیے خیمہ بن جاتے۔''

یہ قصیدہ اس وقت پیش کیا گیا جب سیف الدولہ انطاکیہ سے رخصت ہونے والا تھا۔ اس قصیدے میں اس سفر ہی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''کاش ایسا ہوتا کہ جب تو سفر کرتا تو ہم شدائد سفر برداشت کرنے کے لیے تیری سواری بن جاتے۔''

سیف الدولہ اس حسنِ طلب کو سمجھے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے تو یہ شاعر اس ہیرے کی طرح معلوم ہوا جو بادشاہوں کے خزانے کی زینت ہوتے ہیں۔ اس نے اس نایاب ہیرے کو طلب کر لیا۔ ابوالعشائر تو اس کا تابعدار تھا انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے متنبی کو بطور تحفہ سیف الدولہ کے ساتھ کر دیا۔

سیف الدولہ اسے لے کر حلب کی طرف چل دیا۔

متنبی حلب پہنچا ہی تھا کہ سیف الدولہ کی والدہ کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اسے سیف الدولہ کے مزید قریب آنے کا موقع میسر آ گیا۔ اس نے اس حادثہ جانکاہ پر بڑا دردانگیز مرثیہ لکھا۔

سیف الدولہ کی والدہ کا انتقال ایسی بڑی مصیبت ہے کہ گویا اس سے پہلے موت نے کسی شخص کو دردمند نہیں کیا نہ کسی مخلوق کے دل میں ایسی مصیبت کا خیال آیا۔

اگر تمام عورتیں عقل و فراست میں ایسی ہی ہوتیں جیسی ہم نے گم کی ہیں تو عورتوں کو مردوں پر فوقیت دی جاتی۔

سیف الدولہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے بار بار ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونا پڑتا تھا۔ متنبی کی خوبی یہ تھی کہ وہ ان مواقع پر ایسے قصائد پیش کرتا تھا کہ سیف الدولہ کے ہاتھ اپنی تلوار پر اور زیادہ مضبوطی سے جم جاتے تھے۔ یہ قصائد اتنے ولولہ انگیز اور پُرجوش تھے کہ سیف الدولہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی فتوحات میں متنبی کی شاعری کا بھی بڑا دخل ہے۔

بلند مرتبہ سلطنت وہ ہے جس کی بنیاد نیزوں پر ہو۔ اس سے محبت رکھنے والوں کے نزدیک نیزہ بازی بوسۂ محبوب کی طرح لذیذ ہے۔

تلواریں جب تک دشمنوں کے سروں میں دیر تک حرکت میں نہ آئیں اس وقت تک وہ اپنے حدود سلطنت میں اطمینان سے نہیں رہتیں۔

سیف الدولہ جیسے بہادر شخص نے اپنے بھائی کی امداد کا ارادہ کیا تو طویل نیزوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے دست و بازو نے منزل مقصود سے اس کو قریب کر دیا۔

وہ ایسا بہادر ہے جو بخل کو بزدلی سمجھتا ہے اور وہ ایسا سخی ہے جو نامردی کو بخیلی کی ایک قسم خیال کرتا ہے۔

وہ ہر فتح کے بعد بغیر کسی غرور اور فخر کے لوٹتا ہے۔

''ہر آنکھ تجھ جیسے بہادر کو دیکھ کر عظمت و جلال سے پُر ہو جاتی ہے۔''

بنو قیس کے قبائل سرکشی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیف الدولہ نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کی سرکوبی کرنے کے بعد ان کے ساتھ بھی سیف الدولہ نے وہی سلوک کیا جو بنو کلاب کے ساتھ کیا تھا۔ اس واقعے پر بھی متنبی نے قصیدہ پیش کیا۔

''وہ طویل نیزے جن سے تو نیزہ بازی کرتا ہے دشمنوں کو مجروح کرنے میں چھوٹے نیزوں کی طرح کام دیتے ہیں اور بخشش اور جنگ میں تیرا ایک قطرے کے برابر بھی حصہ لینا دریا اور سمندر کے برابر ہے۔''

بنو کلاب کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ سیف الدولہ شروع شروع میں ان پر بڑا مہربان تھا۔ ان کی ہر طرح دل جوئی کرتا تھا اس لیے وہ بڑی ترقی کر گئے اور لوگوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر وہ سرکشی پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سیف الدولہ کو خبر ہوئی تو وہ تیزی سے ان پر جا پڑا اور انہیں کچل کر رکھ دیا۔ متنبی نے اس موقع پر بھی اس کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تھا۔

اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن رومی تھے لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مسلمان سیف الدولہ کی دشمنی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میں ان رومیوں کی مدد کر رہے تھے۔

سیف الدولہ کو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک تو اس کے ملک کے سرکش باغی مسلمان تھے اور دوسرے رومی بلکہ اصلی دشمن یہی رومی تھے۔ اس نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ یہی وہ جنگیں تھیں جنہوں نے سیف الدولہ کا نام تاریخ اسلام میں محفوظ کر دیا۔ متنبی کا نام بھی اسی لیے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا کہ وہ رومیوں کے خلاف ان جنگوں میں سیف الدولہ کے ساتھ رہا اور اپنے رجز ناموں سے مسلمانوں کا لہو گرماتا رہا۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو شعرائے عرب میں کسی کو حاصل نہیں۔

یہ جنگیں اس تواتر سے ہو رہی تھیں کہ اسے ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر جانا پڑ رہا تھا۔ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ یہاں تک کہ سیف الدولہ کو کہنا پڑا۔

”تو ساری عمر رومیوں سے جہاد کرتا رہے گا۔ اب دارالحکومت لوٹنے کا کب ارادہ ہے۔“

رومیوں سے ویسے تو جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں لیکن 339ھ میں ایک سخت معرکہ ہوا۔ متنبی بھی شریک تھا۔ ایک مخصوص خیمے میں بیٹھ کر جنگ کا مشاہدہ کر رہا تھا تاکہ جب قصیدہ لکھنا ہو تو جنگ کے حالات اسے ازبر ہوں۔ حملے سے پہلے اس نے قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

”کل کے بعد والے دن یقینی پرسوں، مژدہ فتح کی ہر طرف خوشبو ہوگی اور دشمن کے گھروں میں جلتی آگ ہوگی جس کا شعلہ بلند ہوگا۔“

اس معرکے میں سیف الدولہ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ وہ روم کی سرحدوں کو عبور کر کے دور تک شہروں میں گھس گیا۔ اتنا زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اسے سمیٹنا غازیوں کے لیے مصیبت بن گیا۔ دشمن گھات میں تھے۔ مسلمان جیسے ہی مال غنیمت لوٹنے میں مشغول ہوئے انہوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ سیف الدولہ کی ساری فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے مدافعت کی لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ اس موقع پر قصیدہ کہنا بہت مشکل تھا۔ سیف الدولہ کی بہادری کی لاج بھی رکھنی تھی اور حقائق بھی بیان کرنے تھے۔ یہ متنبی کے تخیل کا امتحان تھا۔ اسے بیک وقت سیف الدولہ کی بہادری کی مدح بھی کرنی تھی اور دشمن کی بزدلی کا مذاق بھی اڑانا تھا۔ اس نے ایک طویل قصیدہ لکھا۔

”دمشتق سے کہہ دو کہ وہ مسلمان جو تمہارے ہاتھوں مارے گئے یا قید ہوئے انہوں نے امیر یعنی سیف الدولہ کے حکم کی نافرمانی کی اس لیے خدا نے ان کو ان کے کیے کی سزا دی۔

تم نے ان کو اپنے مقتولوں کے خون میں سوتا ہوا پایا، گویا تمہارے مقتولوں سے ان کو ہمدردی تھی اور وہ ان کی وجہ سے دردمند ہوئے تھے۔ اس غداری کی سزا خدا نے انہیں دی۔

ان لوگوں کے بارے میں جن کو تم نے قید کیا ہے یہ مت خیال کرو کہ وہ زندہ تھے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ”بجو“ صرف مردار کھاتا ہے۔ تم بھی بجوں کی طرح ہو جو بے جانوں کو مارتے اور قید کرتے ہو۔

تم کیوں نہ جمے رہے۔ ان گھاٹیوں میں جب کہ ممدوح کے شیر دل بہادر اس پر چڑھ گئے تھے جو تنہا چل رہے تھے جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل رہے تھے۔

اب جو جہاد بھی اس کے بعد ہوگا ممدوح کے حق میں ہوگا اور ہر غازی سیف الدولہ کا فرماں بردار ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف الدولہ اگلے ہی سال رومیوں سے انتقام لینے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمان ابھی تک رومیوں کی زبردست طاقت سے خائف تھے۔ ان کا خوف دور کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھانے کی ضرورت تھی۔ یہ کام اس نے متنبی کے سپرد کیا۔

”کچھ ایسے اشعار کہو کہ مسلمانوں کا خوف دور ہو اور انہیں جہاد پر آمادہ کرو۔“ متنبی کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔ اس نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی اس نے ایک ولولہ انگیز قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔

”ہم اس دیار میں جا رہے ہیں جہاں ہم رہنا پسند نہیں کرتے اور وہاں کے باشندوں سے نہیں سیف الدولہ سے وہاں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔“

متنبی نے یہ قصیدہ مجمع عام میں پڑھا۔ قصیدہ ایسا پرشوکت تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں دلیری کے جذبات ابھر گئے۔ وہ پرجوش نعرے بلند کرنے لگے۔ شوق جہاد نے انہیں بے قابو کر دیا تھا۔ وہ صفیں توڑ کر باہر نکل رہے تھے اور سیف الدولہ سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ رومیوں پر چڑھائی کر دے۔

سیف الدولہ نے ان کا جذبۂ جہاد دیکھا تو بپھرے ہوئے طوفان کی طرح رومیوں پر چڑھ دوڑا اور دشمن کے چالیس ہزار لشکر جرار کو تہس نہس کر ڈالا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

رومیوں کے صدر مقام خوشتہ تک پہنچ جائے۔ اس وقت یہ اس کے لیے مشکل بھی نہیں تھا لیکن برفباری نے اس کا راستہ روک لیا۔ اسے واپس آنا پڑا لیکن اب وہ ظفر مند تھا۔ پھریرے اڑاتا چلا آتا تھا۔

متنبی نے تہنیتی قصیدہ پیش کیا۔

''خدا کے شہروں میں سب سے بدنصیب شہر وہ ہے جس کے باشندے رومی ہیں اور ان میں کوئی ایسا نہیں جو تیرے شرف کا منکر ہو۔''

سیف الدولہ کی فتوحات سمندر کی لہروں کی طرح مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک سال آرام کرنے کے بعد وہ 341ھ میں ''مرعش'' پر حملہ آور ہوا اور رومیوں کو وہاں سے نکال کر قلعے پر قبضہ کرلیا۔

اسی سال شاہ روم کی طرف سے ایک وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے بارے میں بات کرنے آیا۔ سیف الدولہ کی اب ایسی حیثیت تھی کہ اس نے اس وفد سے کھلے اجلاس میں ملاقات کی اور اس طرح کہ اس کے سامنے ایک مری ہوئی شیرنی اور تین زندہ بچے پڑے ہوئے تھے اور وفد کا سربراہ کسی سائل کی طرح اپنے قیدیوں کی زندگی مانگ رہا تھا۔

اس موقع پر متنبی نے دربار عام میں یہ قصیدہ پڑھا۔

روم کے بادشاہ نے کرم و بخشش سے تجھے خوش ہوتے دیکھا اس لیے وہ ایک چاپلوسی کرنے والے سائل کی جگہ آکھڑا ہوا۔

اور ذلیل ہوکر اس نے نیزوں کو چھوڑ دیا اور ایک ایسے شخص (سیف اللہ) کے مقابلے میں جو نیزہ بازی میں اس سے زیادہ ماہر ہے۔

اس کا قاصد اسی راستے سے آیا جو تیری طرف آتا ہے۔ وہ ان کھوپڑیوں پر چلا جو تیری تلوار سے پھاڑی گئی تھیں۔

☆......☆

اگلے سال 342ھ میں اس نے ''مغستاب'' کی جانب سے روم پر حملہ کردیا۔ اس نے رومی حدود کو عبور کیا اور کئی علاقوں کو تاراج کرڈالا۔ وہ واپس آرہا تھا کہ شاہ روم کے بیٹے سے ملاقات ہوگئی۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت سخت خطرے میں تھی آگے دشمن تھا پیچھے برفباری سے راستہ بند۔ معرکہ ایسا تھا کہ شکست یقینی تھی لیکن سیف الدولہ نے ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بڑے بڑے سورما موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شاہ روم کا بیٹا گرفتار ہوگیا۔ سیف الدولہ کامیابی کا جھنڈا لہراتا ہوا لوٹ آیا۔

متنبی اس جہاد میں بھی سیف الدولہ کے ساتھ تھا۔

اس موقع پر بھی اس نے ایک طویل مدحیہ قصیدہ پیش کیا۔

میں سیف الدولہ کی وجہ سے اس رتبے کو پہنچ گیا ہوں جس کی وجہ سے میں نے مشرق سے مغرب تک ساری دنیا کو روشن کردیا ہے۔

اہلِ روم نے جب سیف الدولہ کو اپنے لشکر سے آگے تنہا دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ وہی کافی ہے باقی سب بے کار ہیں اور یہ کہ خطی نیزے ممدوح تک نہیں پہنچ سکتے اور ہندی تلوار اس کے مقابلے میں کند ہے۔

ایک ایسے نوجوان نے ان کو اپنے گھوڑے کے سینے اور اپنی تلوار کے سامنے رکھ لیا جس کی ہیبت اور دبدبہ اس کی بخشش کی طرح بڑا ہے۔

☆......☆

شاہ روم اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لشکر جرار لے کر شام و روم کی سرحد پر سیف الدولہ کے بنوائے ہوئے قلعے پر حملہ کردیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ مسلمانوں کا گھبرا جانا لازمی تھا۔ اس موقع پر سیف الدولہ نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ وہ صفوں کو چیرتا ہوا شاہ روم پر جا پڑا۔ شاہ روم کے اوسان ایسے خطا ہوئے کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگتے ہی اس کا لشکر بھی تتر بتر ہوگیا۔ سیف الدولہ نے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

اس موقع پر بھی متنبی نے ایک زوردار مدحیہ قصیدہ کہا۔

''وہ وقت کیسا اچھا تھا جب کہ لڑائی کی آگ نے کھوٹے ہتھیاروں اور ناقص لوگوں کو ختم کردیا۔ پھر میدانِ جنگ میں یا تو قاطع تلوار باقی رہی یا شیر دل بہادر۔

جو تلوار زرہ اور نیزوں کو نہیں کاٹ سکتی تھی وہ خود ٹوٹ گئی اور شہسواروں میں سے جو دشمن کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اے سیف الدولہ تو ایسے وقت میں ثابت قدمی سے کھڑا رہا جب کہ کھڑے رہنے والے کو موت میں کچھ شبہ نہیں تھا گویا تو موت کی پلکوں میں تھا اور موت غافل ہورہی تھی۔

بہت سے بہادر زخمی اور شکست خوردہ ہوکر بھاگے جارہے تھے مگر تیرا چہرہ شگفتہ تھا اور تیرے دانت مسکرا رہے تھے۔''

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ایک مرتبہ سیف الدولہ کو معلوم ہوا کہ رومی اس کے شہر "آمد" پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً اس طرف روانہ ہوا۔ رومیوں کو جیسے ہی اس کے آنے کی خبر ہوئی وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سیف الدولہ نے ان کا تعاقب کیا اور ایک مقام پر جاکر انہیں گھیر لیا۔ سخت معرکہ ہوا۔ سیف الدولہ نے انہیں شکست دے دی اور ان کے قلعوں اور محلوں کو تاراج کر ڈالا۔

متنبی اس معرکے میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک طویل مدحیہ قصیدہ پیش کیا جس میں وہ سیف الدولہ کی فوج کشی اور جنگی کارناموں کا ذکر اور پہاڑی دروں پر سیف الدولہ کی بے نظیر کامیابیوں کا بیان کیا۔

جب ہم روم کی گھاٹیوں پر تھے۔ لوٹنے میں ذلت و رسوائی تھی اور آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ راستے دشمنوں کے نیزوں کی وجہ سے تنگ اور دشوار گزار تھے اور کفر، دین اسلام کے مقابلے میں اپنی پوری قوت سے ڈٹا ہوا تھا۔

ایسے نازک وقت میں رومیوں نے مسلمانوں کو دیکھا جو ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی وجہ سے پارہ ہائے آہن معلوم ہو رہے تھے اور عقاب جیسے برق رفتار گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے مسلمان شہسواروں کو دیکھا جن کو موت زندہ کرتی ہے گویا وہ جانداروں میں سے نہیں ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ شہادت کے بعد ان کو نئی زندگی ملتی ہے۔

ممدوح کی تلواروں نے رومیوں کو قتل زیادہ کیا ہے گرفتار کم۔

ایک شائستہ انسان نے موت کو ان کے بارے میں حکم دیا جس کو انہوں نے خدا کا حکم سمجھ کر قبول کرلیا۔

"اے سیف الدولہ جب میں تیری بہادری اور شجاعت کے کارناموں کو دیکھتا ہوں، تیرے دیدار سے پہلے ہی میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور جب میں تعریف کرتا ہوں تو میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔"

☆......☆

سیف الدولہ کے پاس آنے سے قبل متنبی بہت غریب تھا۔ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ معمولی لوگوں کی روح میں اپنی شاعری کا جوہر لٹا رہا تھا۔ اس نے ایک دینار کے عوض تک قصیدہ لکھا لیکن سیف الدولہ کے پاس آتے ہی اس کے دن بدل گئے۔ وہ سونے چاندی کے سکوں سے کھیلنے لگا۔ بلا مبالغہ سونے چاندی کے برتنوں میں

جولائی 2016ء کے شمارے کی دلنوازی

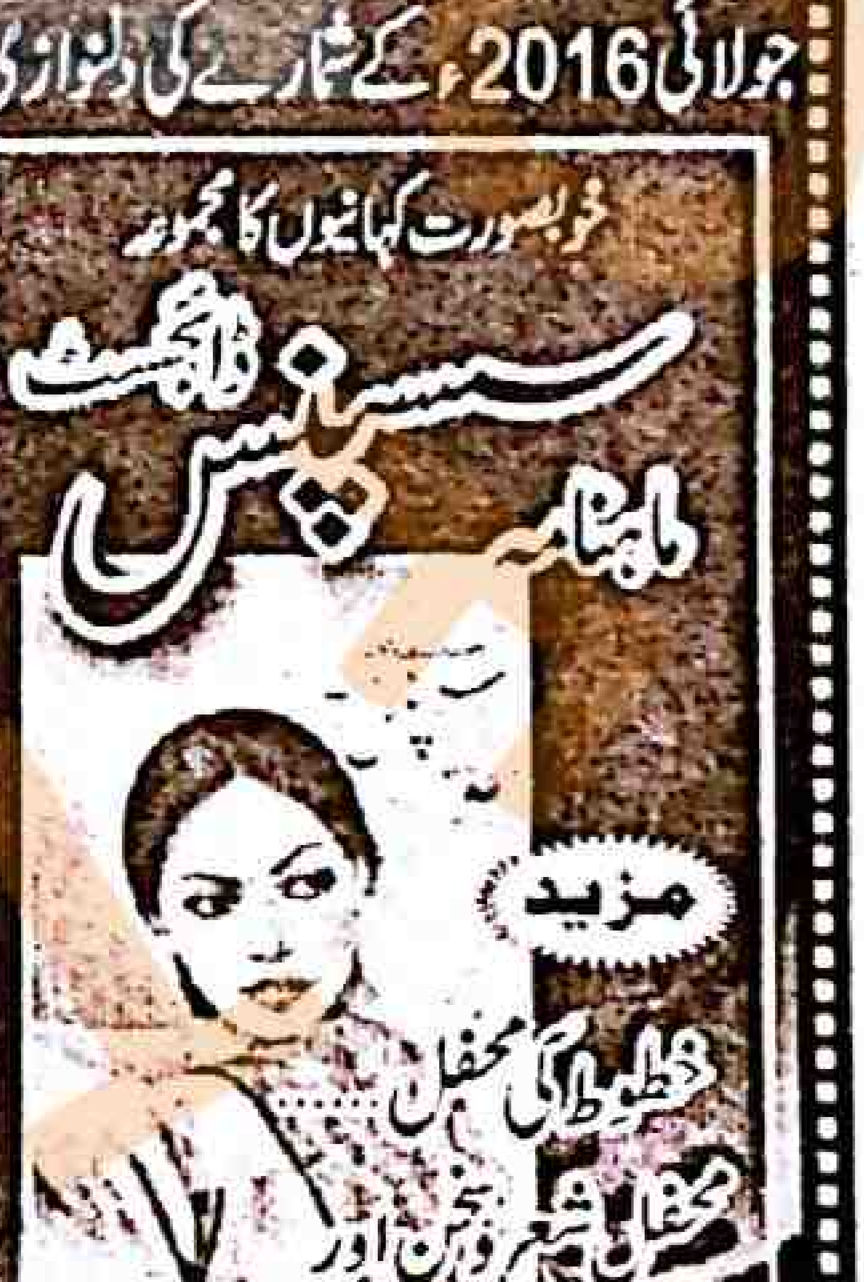

اس کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد زبیر سلیمانی، ابراهیم جمالی اور علی اختر کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

حکایت سود و زیاں

محبتوں کے سودے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ خسارے کے خوف سے باہر...... زر ورت میں بھی گلابی ساعتوں کی آس......

آخری صفحات پر **ناہید سلطانہ اختر** کی یادگار تحریر

بهشت زار

کچھ تو میں اپنے قول و فعل کے حوالے سے اس سرزمین کے کچھ خطوں میں اپنی مخصوص پہچان قائم کر گئیں **الیاس سیتا پوری** کے قلم سے انہی یادگار تاریخی لمحات کا اعادہ

شیش محل

دل کے نازک تاروں کی مدھر موسیقی...... اور کٹھن حالات کا راگ......

اسما قادری کے قلم سے تلخ و شیریں حالات کے نشیب و فراز کا احوال

ماروی

پچھلی رفاقتوں کی بھول...... نئے رشتوں کی دھول...... دلچسپ واقعات کا آغاز...... **محی الدین نواب** کے قلم کی سحر انگیزی

محبت اور فاصلے

رومانوی داستان کے رنگین و سنگین مناظر اور تپتی دھوپ میں لمبا سفر کرنے والے مسافروں کا دلچسپ قصہ...... **طاہر جاوید مغل** کا دلربا انداز

کھانے لگا۔ اسے فی قصیدہ ایک ہزار دینار تک ملنے لگا تھا۔ دولت و ثروت کی فراوانی تو رہی ایک طرف سیف الدولہ اس کے ساتھ برابری کا سلوک کر رہا تھا۔ خلوت و جلوت میں اپنے ساتھ رکھ رہا تھا۔ اس کے آتے ہی درباری شعرا کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ ہر ایک اپنی جگہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ سیف الدولہ کی نظروں سے اتر گیا۔ اس کی قدر و منزلت کسی بادشاہ کی طرح ہو رہی تھی۔

جب یہ سب کچھ حاصل ہو گیا تو متنبی کا دل فخر و غرور سے بھر گیا۔ وہ ہر قصیدے میں کسی نہ کسی بہانے اپنی تعریف کر بیٹھتا تھا۔

''زمانہ میرے ہی قصائد پڑھتا رہتا ہے۔ جب میں کوئی شعر پڑھتا ہوں تو لوگ اسی کو گانے لگتے ہیں جو بدذوق ہیں وہ بھی اسے لے اڑتے ہیں۔ جو کبھی نہیں گاتے وہ بھی گانے لگتے ہیں۔''

''اے سیف الدولہ! تجھے جب کوئی شعر سنایا جائے تو انعام مجھے ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ میرے ہی اشعار کے مضامین کو دوسرے شعرا الٹ پلٹ کر بیان کرتے رہتے ہیں۔''

''میرے علاوہ تو دوسروں کی آواز سننا چھوڑ دے اس لیے کہ میں ہی وہ پرندہ ہوں جس کی آواز کی نقل کی جاتی ہے۔''

ایک قصیدے میں اس نے یہاں تک کہہ دیا۔

شعر و شاعری کی دنیا میں میرے شعر فرشتوں کی طرح بلند مرتبہ ہیں۔ وہ اس فلک دنیا کا چمکتا ہوا سورج ہیں۔

خدا نے ہمارے درمیان صحیح تقسیم کی ہے۔ مجھے یہ شاندار الفاظ عطا فرمائے ہیں اور تیری قسمت میں تعریف کیا جانا لکھا ہے۔

ان تعلیوں اور اس کی بے پناہ قدر و منزلت کا یہ اثر ہونا لازمی تھا کہ اس کے دوست کم اور حاسد زیادہ پیدا ہو جائیں۔ یہی ہوا بھی درباری شعرا اور عام درباریوں میں شاید ہی کوئی ہو جو حسد کی آگ میں نہ جلنے لگا ہو اور بالآخر سب نے متحد ہو کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس آگ کو مزید بھڑکا دیا۔

سیف الدولہ کی طرف سے ہونے والی عزت افزائی نے اسے ایسا بے باک کر دیا کہ اس نے اس سازش کو محسوس کرتے ہی اپنے ہمعصروں پر چوٹیں شروع کر دیں۔

''شاعر تو درحقیقت میں ہوں۔ باقی شعرا جھوٹے دعوے دار ہیں۔''

میرے اشعار صحیح معنوں میں شعر کہے جانے کے قابل ہیں باقی دوسرے شعرا کی کوشش اس بارے میں ایک سعی بے فائدہ ہے۔

جس طرح تلواریں بہت ہیں لیکن زمانے میں سیف الدولہ ایک ہی ہے اسی طرح دنیا میں تک بندی کرنے والے بہت ہیں لیکن شاعر بس ایک ہے اور وہ میں ہوں۔

کبھی وہ ان شعرا کے بارے میں جن کا چراغ اس کے شاعرانہ کمال کے سامنے بجھ کر رہ گیا تھا پھر وہ اس کے منہ آتے تھے تنگ آ کر کہتا۔

''یہ خود ساختہ شاعر جن کو چاہوں تو میں بغل میں دبا لوں روزانہ میرا مقابلہ کرتے رہیں گے اور چھوٹے ہونے کے باوجود رتبے کی بلندی میں میری برابری کرتے رہیں گے۔ میری زبان باوجود قوت گویائی کے ان کی ہجو کہنے سے خاموش ہے اور میرا دل باوجود خاموشی کے ان کی حماقت پر ہنستا ہے۔''

اس کی یہ بے باکی بڑھتی ہی گئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیف الدولہ اس سے محبت کرتا ہے لہٰذا کوئی اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس کی زبان کی تیزی صرف شعرا تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے ان بڑے بڑے فوجی افسروں کی بھی مذمت کر ڈالی جو رومیوں سے جہاد میں سیف الدولہ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فوجی افسر بھی اس کے خلاف ہو گئے۔

شعرا کے ساتھ فوجی افسر بھی شامل ہو گئے اور ان دونوں طبقوں نے مل کر سیف الدولہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔

متنبی اس موقع پر یہ بھول گیا تھا کہ بادشاہ کسی کے وفادار نہیں ہوتے بلکہ خوشامدیوں کے بہکاوے میں بہت جلد آ جاتے ہیں۔

سیف الدولہ بھی رفتہ رفتہ ان سازشیوں کے چنگل میں پھنستا چلا گیا۔ متنبی ان حالات سے بے خبر نہ رہ سکا اور اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ ایسے ذہنی انتشار کا شکار ہوا کہ کئی مہینے تک سیف الدولہ کی خدمت میں کوئی قصیدہ پیش نہ کر سکا۔ مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ سیف الدولہ کو اس کے خلاف بھڑکائیں۔ انہوں نے متنبی کی غیر

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

حاضری کو اس کے غرور سے تعبیر کیا۔

''آپ کی مہربانیوں سے وہ اتنا خود سر ہو گیا ہے کہ اب آپ کی مدح کرنا بھی کسرِ شان سمجھتا ہے۔ اب تو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر مصر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔''

سیف الدولہ کے دربار کا دوسرا بڑا شاعر ابو فراس، متنبی کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ اس نے سیف الدولہ کو ایک انوکھی پیش کش کر ڈالی۔

''یہ باچھیں پھاڑ پھاڑ کر شعر پڑھنے والا متنبی آپ سے بڑے نخرے کرتا ہے حالانکہ آپ اس کو تین قصیدوں پر تین دینار دیتے ہیں اگر آپ دو سو دینار بیس شعرا پر تقسیم کر دیں وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے اشعار آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔''

سیف الدولہ کو یہ تجویز پسند بھی آ گئی۔ اس نے اس وقت عمل بھی کر دکھایا جب متنبی کو یہ قصہ معلوم ہوا اور اس نے سیف الدولہ کے پاس پہنچ کر یہ قصیدہ پڑھا۔

''سیف الدولہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آج مجھ سے ناراض ہے۔ دنیا اس پر قربان ہو جائے وہ شمشیر زنی میں سب سے زیادہ تیز دھار اور قاطع تلوار والا ہے۔''

متنبی قصیدہ پڑھ رہا تھا اور سیف الدولہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے متنبی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

سیف الدولہ کے اس رویے سے متنبی کو سخت افسوس ہوا۔ اس نے دریافت حال کے لیے چند اشعار لکھے اور سیف الدولہ کی خدمت میں بھیج دیے۔

''میں اس قربت کا خیال کر رہا ہوں جو پہلے مجھے حاصل تھی اور اب انحراف سے تبدیل ہو گئی ہے اور طویل ملاقاتیں جواب مختصر ہو گئی ہیں۔

تو نے آج مجھے ایسا شرمندہ کیا جسے یاد کر کے کبھی میں مرتا ہوں کبھی جیتا ہوں۔

اب شرم سے میں تجھ کو نظر چرا کر دیکھتا ہوں اور گھوڑوں میں اپنے بچھیرے کو شرم کی وجہ سے چھپ کر ہنکاتا ہوں۔ اس نے آگے چل کر اس بات پر معذرت بھی کی کہ وہ تین ماہ تک کوئی قصیدہ پیش نہ کر سکا۔ اس نے بتایا کہ اس کی شعر گوئی کو ایک ایسے شدید غم نے روک دیا جس نے کچھ روز کے لیے میری آنکھوں سے نیند اچاٹ دی۔''

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور معذرت بھی کی لیکن سیف الدولہ پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ سیف الدولہ کی اس بے اعتنائی پر متنبی نے طے کر لیا کہ وہ اپنے دشمنوں سے خود نمٹے گا۔ ایک دن وہ پوری تیاری سے دربار میں آیا۔ اس وقت تمام درباری شعرا جمع تھے۔ اس نے مدحیہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا۔

''ہائے افسوس میرے دل کی سوزش اس شخص کی محبت میں جو مجھ سے سرد مہری برتتا ہے اور جس کی وجہ سے میرا جسم اور حال دونوں سقیم ہیں۔''

اسی قصیدے میں آگے چل کر اس نے اپنے حریفوں پر ایسی چوٹ کی کہ وہ بلبلا اٹھے۔ اس نے سیف الدولہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں تیری محبت کو چھپاتا ہوں جس نے میرے جسم کو گھلا کر لاغر کر دیا ہے مگر جو لوگ تیری محبت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا حال اس کے برعکس ہے۔''

اس سے آگے ایک دو شعروں کے بعد اس نے جب یہ شعر پڑھا۔

''میں تیری حقیقت شناس نظروں کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تو پھولے ہوئے ورم والے شخص کو چربی والا فربہ سمجھے یعنی کھوٹے کو کھرا اور گھٹیا درجہ کے شاعروں کو مجھ جیسا بلند رتبہ شاعر سمجھے۔''

اس نے نام نہیں لیا تھا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا اسے سن کر درباری شاعر ابو فراس سمجھ گیا کہ وہ اس پر چوٹ کر رہا ہے۔ وہ چپ نہ رہ سکا تڑخ کر بولا۔

''تو کون ہے اے کندہ کے جھوٹے دعویدار۔''

متنبی نے سنی ان سنی کی اور شعر پڑھتا رہا۔ وہ اس شعر پر پہنچا۔

''گھوڑے، راتوں کا سفر، دشت و بیاباں، تلوار، نیزے اور کاغذ و قلم مجھے خوب پہچانتے ہیں۔ میں صاحب سیف اور صاحبِ قلم ہوں۔''

ابو فراس اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''تو نے اپنے کو شجاعت و فصاحت، ریاست و سخاوت سب ہی اوصاف سے مستفید کر ڈالا۔ سیف الدولہ کے لیے کیا چھوڑا، انعامات سیف الدولہ سے حاصل کرتا ہے اور تعریف اپنی کرتا ہے۔''

متنبی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

اس کے بعد یہ قصیدہ مسلسل تنقید کا نشانہ بنتا رہا۔ ابو فراس اس کے ہر شعر پر اعتراض اٹھاتا رہا۔ کبھی اس میں

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

غلطیاں نکالتا کبھی اسے "سرقہ" بتاتا۔

سیف الدولہ کو ابو فراس کی یہ دخل اندازی قطعی پسند نہیں آئی۔ اسے اتنا غصہ آیا کہ سامنے رکھی ہوئی دوات ابو فراس کو کھینچ ماری۔

جب متنبی قصیدہ ختم کر چکا تو سیف الدولہ نے اسے اپنے قریب بلایا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور ایک ہزار دینار فوراً ایک ہزار بعد میں عطا فرمائے۔

جب متنبی دربار سے چلا گیا تو درباریوں نے اس پر سخت نکتہ چینی کی اور ان میں شدید برہمی پھیل گئی۔

اس برہمی کا افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ لوگ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور موقع دیکھ کر اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ متنبی نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اور بھاگ کر اپنے ایک دوست کے گھر پناہ لی۔

اس نے سیف الدولہ کو تمام ماجرا لکھ بھیجا۔

"اگر قتل ہی کرنا ہے تو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالیے اس لیے کہ شریف کے ہاتھوں مارا جانا بھی عزت کی بات ہے۔"

سیف الدولہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت فکر مند ہوا۔ اسے کہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مصر جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جائے لہٰذا وہ ہر طرح سے اس کی دلداری کر رہا تھا۔ اس موقع پر بھی اس نے معاملہ رفع دفع کر دیا اور متنبی کو اپنی امان میں لے لیا۔

چند مہینے آرام سے گزر گئے لیکن جب دلوں میں نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ یہی اس وقت بھی ہوا۔ معمولی سی چنگاری شعلہ بن گئی۔

ایک دن دربار میں ابوعبداللہ بن خالویہ نحوی اور ابوالطیب لغوی کے درمیان کسی مسئلے پر بحث چل پڑی۔ متنبی خاموشی سے سن رہا تھا۔ سیف الدولہ نے متنبی کو بھی بولنے کا حکم دیا جو بہت دیر سے خاموش تھا۔

متنبی نے ابوالطیب کی دلیل کے حق میں فیصلہ دیا۔

ابن خالویہ کو جو سیف الدولہ کا استاد بھی تھا غصہ آ گیا۔ وہ اس سے الجھ پڑا اور اس کو برا بھلا کہنے لگا۔ متنبی کہاں خاموش رہنے والا تھا اس نے بھی ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش! تو عجمی ہے اور خوزستانی نسل کا ہے۔ تجھے عربی سے کیا واسطہ۔"

یہ سن کر ابن خالویہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنی آستین سے چابیوں کا گچھا نکالا اور متنبی کے منہ پر دے مارا۔ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ سیف الدولہ بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔ نہ زبان سے کچھ کہا نہ عملاً اس کی مدد کی۔ متنبی کو سخت صدمہ ہوا۔

وہ سیف الدولہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ اس وقت تو خاموشی سے چلا آیا لیکن بعد میں اس نے رخصت کی درخواست دی اور ایک مقام معرۃ النعمان جہاں اس کی کچھ جائیداد تھی چلا گیا۔

سیف الدولہ نے بھی یہ سوچ کر اسے اجازت دے دی کہ اچھا ہے کچھ دن آرام کر لے گا لیکن متنبی کے دل میں کچھ اور تھا۔ اس نے کچھ دن اپنے زخموں کے مندمل ہونے کا انتظار کیا اور پھر مصر کی طرف فرار ہو گیا جہاں کے حکمران "اخشیدی" کہلاتے تھے جہاں اس وقت ابوالمسک کافور اخشیدی حکومت کر رہا تھا۔

کافور بن عبداللہ سیاہ فام، گداز بدن خواجہ سرا تھا جسے والی مصر ابوبکر محمد بن طغج نے بعض روسائے مصر سے خرید کر اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا تھا۔ پھر محمد بن طغج نے اس کو آزاد کر کے فن سپہ گری میں ایسا ماہر بنایا کہ اس کا شمار سپہ سالاروں میں ہونے لگا۔ شام کی لڑائیوں میں عباسی افواج کی قیادت اسی نے کی تھی۔ سیف الدولہ سے جنگوں کے بعد یہ ہو گیا تھا کہ حلب سیف الدولہ کے پاس رہے اور دمشق اخشیدی کی حکومت کے زیر نگیں رہے۔

مختلف حکمرانوں کے انتقال کے بعد عمائدین سلطنت نے کافور کو اپنا امیر تسلیم کر لیا تھا اسی طرح کافور مصر، شام اور حجاز پر حکومت کرنے لگا۔

جب متنبی کافور کے پاس پہنچا تو وہ اس عظیم شاعر کو اپنے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے رہنے کے لیے ایک مکان کا بندوبست کیا اور چند نوکر مقرر کر دیے اور اسی انتظار میں رہا کہ متنبی اس کی خدمت میں مدحیہ قصائد پیش کرے گا لیکن متنبی اپنے ممدوح سیف الدولہ کو ابھی تک بھلا نہیں سکا تھا۔ کافور سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سیف الدولہ کے پاس سے محض اس کے مصاحبوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بھاگا تھا اور کافور کے پاس اس لالچ میں آ گیا تھا کہ اسے کسی صوبے کا گورنر بنا دیا جائے گا۔

وہ کافور کے پاس آنے کے بعد بہت دن تک خاموش رہا لیکن جب کافور کی طرف سے نوازشیں بڑھنے لگیں تو اس نے مدحیہ قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے وہ قصائد پیش کرتا رہا۔ ان قصائد کے ذریعے وہ کوشش کرتا رہا کہ کافور کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کر لے مگر ایسا

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

نہ ہوسکا۔

کافور نے اس کی بے دلی کو دیکھتے ہوئے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے کسی صوبے کا حکمران بنا دے گا۔ متنبی اس لالچ میں کافور کی خوب خوب تعریفیں کرتا رہا لیکن وقت گزرتا رہا۔ وعدہ وفا نہ ہوا۔ اسے یہاں آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ کافور کی شان میں 9 قصیدے تحریر کر چکا تھا۔ پھر جب وہ تنگ آگیا اور مقصد براری نہیں ہوئی تو اس نے ایک قصیدے میں صاف صاف کہہ دیا۔

''تجھ کو میرے بارے میں شک و شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی تلوار کے قاطع ہونے میں شبہ ہو اسے آزما کر دیکھ لو، اگر وہ ناکارہ ہو تو اس کو پھینک دو اور کارآمد ہو تو اسے اپنے بچاؤ کے لیے رکھ لو۔''

مطلب یہ کہ تو مجھے آزما کر دیکھ لے۔ اگر میں تیرے لیے مفید مطلب ہوں تو اپنا وعدہ پورا کر ورنہ پھر صاف انکار کر دے۔

اس کے بعد بھی مطلب براری نہیں ہوئی تو اس نے شاعری کا شاہکار یہ شعر کہا۔

''اے ابوالمسکا! تیرے جام میں کچھ باقی ہو تو میں پی جاؤں۔ میں بہت دیر سے تیری تعریف کے گیت گائے جا رہا ہوں اور تو جام پر جام پیے جا رہا ہے۔''

اس صاف گوئی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے کافور سے واپسی کی اجازت چاہی۔ کافور کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے۔

اب متنبی سمجھ چکا تھا کہ اسے محض سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک قصیدہ کافور کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ اس کا کافور کے دربار میں آخری قصیدہ ثابت ہوا۔ اس قصیدے میں سراپا مایوس بن کر کافور سے فریاد کرتا ہے۔

''خدارا! میری آرزو پوری کر کے مجھے اس قابل بنا کہ میں اپنے دشمنوں کو منہ دکھا سکوں ورنہ میں ان سے کیا کہوں گا کہ ان کو چھوڑ کر میں تیرے پاس آنے میں حق بہ جانب تھا؟''

اس دردناک نوحے کے بعد بھی اس کی جائزنہ درخواست قبول نہ ہوئی۔ متنبی بھی اس قدر مایوس ہوا کہ اس کے بعد وہ تقریباً ڈیڑھ سال مصر میں ٹھہرا رہا لیکن اس دوران اس نے ایک شعر بھی کافور کی مدح یا ہجو میں نہیں کہا۔

کافور متنبی کی شاعرانہ حیثیت کا قائل تھا لیکن وہ متنبی کی فرمائش پر اسے کسی صوبے کی عنانِ حکومت دے کر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں کٹوا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے خطرناک آدمی سمجھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے درباریوں سے کہا بھی تھا۔

''لوگو! جس شخص نے رسول خدا صلی اللہ و آلہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہو، کیا وہ کافور کے مقابلے میں سلطنت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

متنبی اب ایک معتوب شخص کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے قید نہیں کیا گیا تھا لیکن اس کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔

متنبی بھی جانتا تھا کہ کافور اسے اس خوف سے آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں وہ بھاگ کر سیف الدولہ کے پاس نہ چلا جائے۔ متنبی کی بدولت سیف الدولہ کی شہرت آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ اسے سیف الدولہ کے دربار میں بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔

متنبی یہاں سے فرار ہونے کا مکمل عزم کر چکا تھا لیکن اس کی نگرانی کی جارہی تھی لیکن عین اس وقت جب کافور اور اس کے درباری عیدالاضحیٰ کی سرمستیوں میں مدہوش تھے متنبی بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ پیدل چلنے کا عادی تھا۔ راستوں سے واقف بھی تھا اور سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کافور کے آدمی اس کا تعاقب کریں گے۔ اس نے معروف راستوں کو چھوڑ دیا۔ اس نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو مصر سے عراق کی طرف جاتا تھا۔ نہ وہ مصر سے شام جانے والے راستے پر چلا اور نہ ہی دمشق ہو کر کوفہ جانے والے راستے پر گیا۔ اس نے مصر چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

''کافور بڑا پیٹو ہے۔ وہ میرے توشہ سے کھاتا ہے پھر بھی مجھے روک رکھا ہے تاکہ کہا جاوے کہ کافور بڑا بلند رتبہ ہے جس کے پاس متنبی جیسا عظیم المرتبت شاعر رہنا چاہتا ہے۔''

اب سوچ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ کوفہ یا بغداد پہنچ گیا تو کافور کی ایسی ہجو لکھے گا کہ تاریخ میں وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس نے ہر وہ راستہ چھوڑ دیا جو معروف تھا بلکہ وہ غیر معروف قبائل، ناقابلِ عبور خطرناک دشت و صحرا اور نامعلوم وادی اور چشموں پر سے گزرتا ہوا تین ماہ میں کوفہ پہنچا۔

تین ماہ کے سفر کے بعد وہ کوفہ پہنچا تو اس کا دل غصے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اور نفرت سے بھر چکا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے اپنے تحفظ کا احساس ہوا اسے یاد آیا کہ جب وہ کافور کے پاس گیا تھا تو اس کی مدح میں قصیدہ کہا تھا۔ اس نے اسی قصیدے کے ردیف قوافی میں اشعار کہے لیکن یہ اشعار مدح کے نہیں ہجو کے تھے۔

''اگر میرا دل کسی بات کو چھپا سکتا تو میں تجھ کو اپنی خوشنودی اور رضا مندی دکھاتا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں تیرے پاس آکر نہ اپنی ذات سے خوش ہوا نہ تجھ سے۔ کیا تو جھوٹ، بدعہدی، غداری، کنجوسی اور بزدلی کرتے ہوئے شرماتا نہیں، کیا تو میرے لیے انسانی حلیہ میں ظاہر ہوا ہے یا پیکر رسوائی بن کر میرے سامنے نمودار ہوا ہے۔ تو میری مسکراہٹوں کو اُمید اور قابلِ رشک خوشی سمجھتا ہے حالانکہ میں اپنی صرف ان امیدوں پر ہنستا رہا ہوں جو میں نے تجھ جیسے نالائق سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

تیرے دونوں پاؤں جوتوں میں دیکھ کر مجھے تعجب میں ڈالتے ہیں اس لیے کہ جب تو ننگے پاؤں ہوتا ہے جب بھی میں تجھ کو جوتا پہنے ہوئے دیکھتا ہوں یعنی پاؤں کی کھال اس قدر سخت ہے کہ اگر تو ننگے پاؤں ہو جب بھی نقش پوش معلوم ہوتا ہے۔

اور تو جہالت کی وجہ سے یہ بھی نہیں جانتا کہ تیرا رنگ کالا ہے یا اب سفید ہو گیا ہے۔''

اس قدر ہجو سے بھی اس کا دل نہیں بھرا۔ آگے چل کر اس نے اس کی ذات کو براہِ راست نشانہ بنایا۔

''اے کافور! کرم اور شرف تیرے جیسے غلام کے پاس کس راستے سے آئے۔ تیرے آلات حجامت اور قینچی کہاں گئی۔

وہ لوگ اپنے مرتبے سے آگے بڑھ گئے جن پر تیرے دونوں ہاتھ مالک ہو گئے ہیں۔ تیرے ان پر مسلط ہونے سے ان کو یہ بات بتائی گئی ہے کہ کتا بھی ان سے بہتر ہے تمام لوگوں کے سردار انہی میں سے ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کے سردار ذلیل غلام ہوتے ہیں۔

کیا تم میں کوئی ایسا نوجوان نہیں ہے جو ہندی تلوار اس کی کھوپڑی میں داخل کر دے تاکہ لوگوں کے شکوک دور ہو جائیں۔''

یہ ایک طویل ''ہجو'' تھی جس میں اس نے کافور کی خوب خبر لی۔ اپنا جتنا غصہ تھا اس نے اس ہجو میں اتار دیا۔

ہجو نگاری اس کے کلام کی امتیازی خصوصیت نہیں تھی لیکن اس نے یہ ہجو اس خوبی سے کہی کہ ایسی تیزی اور گرمی کلام جو اس کے کلام میں ہے کسی دوسرے کے کلام میں مشکل سے پائی جائے گی۔

اس نے کافور کی ہجو میں اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا۔ کافور کی مدح میں بھی وہ زور پیدا نہیں ہوا جو ہجو میں ہو گیا۔

اس نے کچھ عرصہ کوفہ میں گزارا اور پھر وہ بغداد چلا گیا۔ اس کی بے چین طبیعت نے اسے یہاں بھی نہیں رہنے دیا اور ایک سال بعد ہی دوبارہ کوفہ آگیا۔

ابھی وہ آیندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کر ہی رہا تھا کہ اس کے دروازے پر خوش قسمتی نے دستک دی۔ سیف الدولہ نے تحائف بھیجے تھے اور اسے حلب طلب کیا تھا۔

وہ سیف الدولہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا سنہرا دور اس کے دربار میں گزرا تھا۔ اس کے بعد ایک ٹھوکر کی طرح کافور اس کے راستے میں آگیا۔ متنبی نے اس ٹھوکر سے سبق بھی سیکھ لیا تھا لیکن وہ سیف الدولہ کے درباریوں کی طرف سے اس کے دل میں ابھی تک غبار تھا اس لیے وہ سیف الدولہ کے بلاوے پر ''حلب'' تو نہیں گیا لیکن اظہارِ تشکر کے طور پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر روانہ کر دیا۔

''اے سیف الدولہ! تیرے علاوہ کوئی ایسا بارعب بادشاہ نہیں جس کی تلوار ہی اس کی آبرو کی محافظ ہو۔

عراق اور مصر کیوں نہ محفوظ ہوں جب کہ تیرا لشکر اور تیرے شہسواران سے پہلے بیچ میں حائل ہوں۔

اگر تو دشمنوں کے درمیان سے ہٹ جائے تو وہ اپنے گھوڑے مصر و عراق کے درختوں سے آکر باندھ لیں۔

مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو مجھ پر سخاوت اور بخشش کرے اور زمانہ اس بارے میں بخل کرے کہ میں تجھ کو دیکھ سکوں۔

تجھ سے دوری نے عطایا کو بے مزہ کر دیا ہے۔ ان عطایا کی وجہ سے میری چراگاہ سرسبز ہے لیکن تیری جدائی کی وجہ سے میرا جسم لاغر ہے۔

اگر میں اپنی اس دنیا کے علاوہ کہیں اور جا کر رہوں اور وہاں میرے پاس کہیں سے بخشش آوے تو میں بھی سمجھوں گا کہ دینے والا تو ہی۔

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ''خولہ'' کا انتقال ہو گیا۔ متنبی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

سیف الدولہ کے پاس بھیجا۔
اس مرتبہ شکر گزار ہونے کا موقع سیف الدولہ کا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر متنبی کو بھیجا۔ اس خط میں اس نے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے پاس واپس آجائے۔
اس کے جواب میں بھی وہ خود نہیں گیا بلکہ ایک اور قصیدہ تحریر کر کے روانہ کر دیا۔ اس قصیدے میں اس نے زیادہ کھل کر اپنے نہ آنے کی وجہ بیان کی اور کھل کر کہہ دیا کہ وہ اس کے چغل خور درباریوں کی وجہ سے آنے سے قاصر ہے۔
میں اس خط کے مضمون کو سمجھا جو تمام خطوط میں بہتر ہے۔ میرا سر تسلیم امیر عرب یعنی سیف الدولہ کے حکم کے سامنے خم ہے۔
مجھے اس حکم کی اطاعت کرنا چاہیے مجھے اس سے بے انتہا مسرت ہے اگرچہ میرا عمل اس چیز سے جو مجھ پر واجب ہے قاصر ہے۔
سوائے چغل خوروں کے خوف کے کسی چیز نے مجھ کو تعمیل ارشاد سے نہیں روکا اور بے شک چغلیاں جھوٹ کی راہیں پیدا کرتی ہیں۔
بے شک ممدوح کے کان ان کی چغلیاں سننے لگے تھے مگر ممدوح کا دل اور اس کی شرافت میری مدد کرتی تھی وہ دل سے میری طرف مائل تھا۔
کاش تیری تلواریں ان حاسدوں کے سینوں میں پیوست ہو جائیں جو اس بات سے رنجیدہ ہوتے ہیں کہ تو دشمنان اسلام پر غالب ہے۔

☆......☆

متنبی بغداد میں بڑی شان و شوکت سے رہ رہا تھا اور اس انداز سے رہ رہا تھا جیسے اقلیم شعر کا وہ تنہا بادشاہ ہو۔ بغداد کے دوسرے شعرا کو وہ طفل مکتب سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس کے فطری غرور نے تمام شعرا کو اس سے بدظن کر دیا۔
اسی اثناء میں ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ معز الدولہ کے وزیر حسن بن محمد المہلبی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وزیر موصوف ایک ذی علم، ادیب، شاعر اور نہایت سخی آدمی تھا۔ اس نے متنبی سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کی مدح میں قصیدہ کہے۔ انعام کی امید بھی تھی اور المہلبی ذی علم بھی تھا لیکن متنبی اب غریب نہیں رہا تھا کہ معمولی انعام کے لیے قصیدے لکھتا رہے۔ وہ خود مختار بادشاہوں کے علاوہ کسی امیر وزیر کی مدح سرائی سے پرہیز کرتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر کو لامحالہ یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے تمام شعرائے بغداد کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ متنبی کی ہجو کہیں۔ وہ شعرا پہلے ہی متنبی سے بدظن تھے۔ انہیں وزیر کی پشت پناہی حاصل ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس کے ہجوئیں کہیں اور اسے سنا سنا کر اسے خوب شرمندہ کیا۔ اس نے ان میں سے کسی کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا یا اپنی توہین سمجھی کہ ان معمولی شعرا کو جواب دیا جائے البتہ یہ ضرور کہا۔
''میں خود ساختہ شاعروں کو دیکھتا ہوں کہ وہ میری مذمت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کون شخص لاعلاج مرض کی تعریف کرتا ہے یعنی میں ان کے لیے بلائے بے درماں ہوں۔ میری وجہ سے ان کی شاعری ماند پڑ گئی ہے۔
جس مریض کے منہ کا مزہ کڑوا ہو وہ آب شیریں کو بھی تلخ ہی سمجھتا ہے۔ پھر جھنجلاہٹ میں وہ میرے اچھے اشعار کو برا سمجھتے ہیں تو ان کا کیا قصور۔
وزیر موصوف نے جب دیکھا کہ متنبی کے جواب نہ دینے کی وجہ سے مناقشے کی فضا پیدا نہ ہو سکی تو اس نے متنبی کو لاجواب کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ اس نے شیخ ابو علی حاتمی کو اس کے مکان پر بھیجا تا کہ وہ اس سے مناظرہ کرے اور اسے اس کی حیثیت یاد دلائے۔ ابو علی حاتمی نہایت پائے کا عالم تھا۔ ادب و شعر پر اس کی معلومات کا یہ عالم تھا جیسے دریا موتیوں سے بھرا ہوا ہو۔
ابو علی حاتمی متنبی کے مکان پر پہنچا اور اجازت لے کر بیٹھ گیا۔ متنبی اس وقت چند لوگوں سے محو گفتگو تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے حاتمی کے علمی مراتب کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن اس نے بے اعتنائی برتی۔ بڑی دیر بعد متنبی نے منہ پھیرا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ''کیسے آنا ہوا۔''
''میری بدنصیبی نے مجھے تم جیسے آدمی کے پاس آنے پر مجبور کیا۔ خدا تمہیں معاف کرے۔ یہ تو بتاؤ وہ کون سا نسبی شرف تمہیں حاصل ہے جس نے تکبر اور غرور پر تمہیں مجبور کیا۔'' حاتمی نے کہا۔
''ایک بلند حوصلہ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نسب پر فخر کرتا پھرے اور اس کے سہارے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرے۔ جب میں اپنے ذاتی فضائل کی وجہ سے اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کر سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت

www.urdusoftbooks.com

ہے کہ میں اپنے بزرگوں کا سہارا لوں۔"

"ذرا میں بھی سنوں کہ تمہارے ذاتی فضائل کیا ہیں۔" حاتمی نے پھر جل کر جواب دیا۔

"میرے ذاتی فضائل سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ ورنہ میرے پاس کیوں آتے۔ میں وہ ہوں جس نے سیف الدولہ جیسے بادشاہ کو حیاتِ جاوداں بخش دی۔ میں وہ ہوں جس نے عربی قصائد کو اس منزل تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ آج کوئی ایسا انشا پرداز نہیں جو میرے اشعار سے مدد نہ لیتا ہو۔ میری شاعری نے لوگوں کو دوسرے شعرا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں آج سرزمین عرب کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہوں۔"

"اس کے باوجود تمہیں غرور زیب نہیں دیتا۔"

"اگر تمہیں میری بے نیازی پر غرور کا شبہ ہوا ہے تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں پھر پوچھتا ہوں کیسے آنا ہوا۔"

"مجھے تمہارے کچھ اشعار میں شکوک ہے۔ میں ان کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا ہیں۔"

حاتمی نے ایک ایک کر کے کچھ اشعار ایسے پڑھے جو حاتمی کے مطابق پست درجہ کے تھے یعنی موضوع کی مناسبت سے الفاظ ادا نہیں کیے گئے تھے۔

متنبی خاموشی سے سنتا رہا اور پھر بڑی متانت سے کہا۔ "آپ کا میرے ان اشعار کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

اس نے اپنے چند اشعار سنائے اور کہا۔ "کیا ان اشعار کی بلاغت اور خوبی تم کو میرے شاعرانہ کمال کی طرف سے مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں؟"

"میں تو تمہارے ان شعروں میں بھی کوئی خوبی نہیں پاتا۔ یہ وہ اشعار ہیں جو تم نے دوسرے شاعروں سے سرقہ کیا ہے۔"

حاتمی نے اس کے کئی شعروں کو دوسرے شعرا کا چربہ بتا کر اس کی خوبی سے انکار کیا۔

اب متنبی کے بولنے کی باری تھی۔

"اے حاتمی! میں نے تو تیرے علم کی بڑی شہرت سنی تھی لیکن اب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یا تو وہ شہرت جھوٹی تھی یا جس نے تجھے بھیجا ہے تو اس کا وکیل بن کر آیا ہے لہٰذا مجھے سورج بھی چراغ معلوم ہو رہا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ سرقہ اور توارد میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک شاعر بالکل اسی مفہوم کو اپنے انداز میں نظم کر دیتا ہے جسے دوسرا شاعر اس سے پہلے نظم کر چکا تھا۔ اگر تو اسے بھی سرقہ کہتا ہے تو یاد رہے سرقہ مذموم بھی ہوتا ہے اور مستحسن بھی۔ کسی شخص پر محض سرقہ کا (چوری کا) الزام اس کے کلام کے مذموم ہونے کی دلیل نہیں، شعر ایک ایسا راستہ ہے جس میں ایک قدم دوسرے قدم پر پڑتا رہتا ہے۔ پھر اس نے وزیر ابو محمد المہلبی کے کئی اشعار ایسے پڑھ ڈالے جو اس نے متنبی کے کلام سے سرقہ کیے تھے۔"

"اے حاتمی! اگر تو سرقہ کا الزام لگا کر میرے کلام کو مذموم کہتا ہے تو اپنے ممدوح وزیر پر بھی یہی الزام لگا اور اسے مذموم قرار دے۔ تجھے یہ بھی معلوم ہوگا کہ تنقید کرنا الگ بات ہے کسی کی پگڑی اچھالنا الگ بات ہے۔ میں تیرے علم کا قائل ہوں لیکن تو خلوص سے عاری ہے۔ اپنے ممدوح کے اکسانے پر یہاں چلا آیا اور اپنی آبرو گنوا بیٹھا۔ اپنے ممدوح سے کہہ دینا متنبی کے پاس حاتمی کی دلیلوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اس کا سر جھک گیا۔ وہ بہت خوش ہوگا۔ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں عنقریب بغداد سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔ یہ میرا اس سے انتقام ہوگا۔ تاریخ اسے طعنے دیتی رہے گی کہ تیرے حسد نے ایک عظیم شاعر کو بغداد میں نہیں رہنے دیا۔"

شام میں سیف الدولہ تھا اور مصر میں کافور۔ وہ ان میں سے کہیں بھی جانے کا آرزومند نہیں تھا۔ اب وہ اپنی آرزوؤں کا مرکز مشرقی اسلامی ممالک کو بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ابن العمید سے جو رکن الدولہ کا وزیر تھا روابط بڑھائے تاکہ وہ اس کے ذریعے رکن الدولہ (حاکم بغداد) یا اس کے بیٹے عضد الدولہ حاکم شیراز کے پاس پہنچ جائے۔

اس وقت بغداد پر معتز الدولہ حکومت کر رہا تھا۔ عراق پر رکن الدولہ اور ایران پر رکن الدولہ حاکم عراق کا بیٹا عقید الدولہ حکمرانی کر رہا تھا۔

متنبی یہ آرزو لے کر "ارجان" (عراق) روانہ ہو گیا جہاں ابن العمید (وزیر رکن الدولہ) مقیم تھا۔ وہ خود ایک بڑا ادیب و انشا پرداز تھا لہٰذا متنبی کا استقبال نہایت گرم جوشی سے ہوا۔ شاعری کی محفلیں برپا ہوئیں اور متنبی کو انعامات سے نوازا گیا۔

متنبی نے مدحیہ قصیدہ پیش کیا۔

"مجھے کبھی ایسا اتفاق پیش نہیں آیا کہ میں نے

ابوالفضل بن الحمید جیسا سخن فہم اور سخن سنج شخص دیکھا ہو اور یہ مدحیہ اشعار جو اس کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں حسبِ عادت معمولی ہیں۔
بے شک اس شخص کے لیے جو موجوں میں ڈوبا ہوا ہو اس بات کا ایک واضح عذر ہے کہ وہ موجوں کی تعداد نہ گن سکا یعنی ممدوح کے اوصاف اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔
اس کی سخاوت کو میرے مدحیہ اشعار پر سبقت حاصل ہے اس لیے کہ وہ بہت زیادہ ہیں۔
متنبی اپنے ساتھیوں اور نوکروں کے ساتھ تقریباً دو مہینے ابن العمید کے پاس پورے عزت واحترام کے ساتھ رہا اور پھر اسے پیش کش کی کہ وہ رکن الدولہ کے بیٹے عضدالدولہ کے پاس چلا جائے۔
عضدالدولہ خود شاعر تھا اور عربی ادب میں بڑی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے متنبی کی بڑی شہرت سنی تھی اور اسے متنبی سے ملنے کا شدید اشتیاق تھا۔

☆......☆

عضدالدولہ ایک باغ میں گل گشت کر رہا تھا۔ عمائدین سلطنت اس کے ساتھ تھے۔ اس کے ایک رکن سلطنت عبدالعزیز بن یوسف الحکاری چند خوب صورت پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس عہد کے دو شاعروں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔
''کاش اس وقت ابو تمام اور بحتری میں سے کوئی ایک ہمارے ساتھ ہوتا۔'' عضدالدولہ نے بات کو آگے بڑھایا۔
''اگر متنبی ہوتا تو ان دونوں کا قائم مقام ہوتا۔''
''اس کا ہونا کون سا مشکل ہے۔'' ایک درباری نے کہا۔ ''اس وقت وہ آپ کے چچازاد بھائی ابن الحمید کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ آپ اسے اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔'' یہ سن کر عضدالدولہ خوش ہو گیا۔ اسی وقت کاتب کو بلوایا اور نامہ تحریر کرادیا۔
یہ 354ھ کی ایک چمکیلی صبح تھی جب عرب کا یہ ''بدو'' مرغزاروں کی سرزمین ایران پر اترا اور شیراز کے ایک عجمی بادشاہ کی شان میں مدح سرا ہوا۔
اس نے جب پہلا قصیدہ عضدالدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو عضدالدولہ نے اس پر انعامات کی بارش کردی۔ عود و عنبر و مشک، قیمتی ریشمی چادریں، مشکی گھوڑا، تقریباً پانچ سو دینار کا ایک عمامہ اور ایک ہندی قیمتی تلوار جس کا دستہ سونے کا تھا قصیدے کے صلے میں بھیجا۔ ان سب اشیاء کی قیمت دو لاکھ دینار سے کم نہیں تھی۔
سرزمین ایران کی ''شعب بوان'' جو دنیا کی جنتوں میں سے ایک خیال کی جاتی تھی، عضدالدولہ کی فرمائش پر اس کی تعریف یوں کی۔
ہم یہاں صبح اس طرح کرتے ہیں کہ درختوں کی ٹہنیاں گھوڑوں کے ایال پر موتی کے دانے جیسے شبنم کے قطرے گراتی رہتی ہیں۔
میں ان ٹہنیوں کے زیرِ سایہ اس طرح چلا کہ وہ مجھے گرمی کی شدت سے بچاتی تھیں اور اتنی روشنی مجھ کو دیتی تھیں جو میرے چلنے کے لیے کافی تھیں۔
اور آفتاب کی شعاعیں میرے کپڑوں پر ایسے دینار بکھیرتی تھیں جو انگلی لگانے سے بھاگتے ہیں۔
ان درختوں پر ایسے پھل لگے ہوئے ہیں جو رس اور شربت سے بھرے ہوئے ہیں اور جو بغیر کسی ظرف کے اس میں قائم ہیں۔
جگہ جگہ اس تیزی سے پانی گرتا ہے کہ ان کے نیچے پڑی ہوئی کنکریاں ایسے دلکش طریقے پر کھنکناتی ہیں جیسے خوب صورت عورتوں کی کلائیوں کے زیور چھن چھناتے ہیں۔

منگلا ڈیم

پاکستان کا دوسرا بڑا بند۔ یہ دینہ (جہلم) سے میرپور (آزاد کشمیر) جانے والی شاہراہ پر دینہ سے صرف گیارہ میل یا 18 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ ڈیم 1967ء میں دریائے جہلم پر بند باندھ کر تعمیر کیا گیا۔ یہ کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ سطح زمین سے اس کی بلندی تین سو اسی فٹ ہے اور یہ 10300 فٹ لمبا ہے۔ اس میں پچاس لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس کی جھیل ایک سو مربع میل رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر پر 3199.73 ملین روپے لاگت آئی۔ یہاں پر بجلی گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے جس سے 1000 میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔

مرسلہ: زویا برکاتی۔ کراچی

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کاش یہ تفریح گاہ دمشق میں ہوتی اور کوئی شخص میرے گھوڑے کی لگام کو اپنی طرف موڑ لیتا۔

ایک دوسرے قصیدے میں تشبیہات کے عجیب و غریب جوہر دکھائے۔

"یہ ایسے منازل ہیں کہ اس میں جب کوئی خاکستری رنگ کی کبوتری گاتی ہے تو گانے والی خوب صورت دوشیزائیں ان کو جواب دیتی ہیں۔

شعب بوان پہنچنے پر میرا گھوڑا کہتا ہے کہ کیا ایسی دلکش سیر گاہ سے نیزہ بازی کے لیے کوچ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اس سے کہا جب تو ابوشجاع عضدالدولہ کو دیکھے گا تو سب لوگوں کو اور اس دلکش جگہ کو بھول جائے گا۔

بے شک انسان اور دنیا کی تمام چیزیں اس شخص تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں جس کا ثانی دنیا میں نہیں۔

متنبی عضدالدولہ کے پاس صرف تین ماہ ٹھہرا۔ اس قلیل عرصے میں اس نے چھ قصیدے اس کی خدمت میں پیش کیے اور قصائد بھی ایسے کہ جو اس کی کل شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔

اس کے دورِ شاعری میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اس نے اس کثرت سے شعر کہے۔

عضدالدولہ کے پاس آ کر اس کی شاعری میں آزادی اور نشاط کی جو لہر آ گئی تھی وہ اس حد تک آگے بڑھی کہ اب نہ وہ اصول لغت اور قواعد کی پروا کرتا ہے نہ ہجو کی۔ اس کا سارا زور ادائے مطلب پر تھا۔

فن شاعری میں یہ بحث ہمیشہ رہی کہ شعر میں مقصود بالغات معانی ہیں یا الفاظ۔ معنی آفرینی اصل شاعری ہے یا زبان و بیان کا اسلوب قدیم۔ عربی شاعری زبان و بیان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس نے اختراع معانی اور جدت ادا کو جانِ شاعری سمجھا وہ تخیل کی بلند پروازی کے مقابلے میں الفاظ کی پروا نہیں کرتا۔ متنبی کی اس جدت پسندی نے عربی شاعری میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور ایک طرزِ جدید کی بنیاد ڈال دی۔

☆......☆

ابونصر محمد جبلی کے لیے فاتک بن ابی الجہل اسدی اجنبی نہیں تھا۔ دونوں میں خوب دوستی تھی۔ فاتک اکثر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ فاتک کو یہ بھی معلوم تھا کہ ابونصر کی دوستی متنبی سے بھی ہے۔ اس لیے ہر ملاقات میں وہ اس سے متنبی کے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ متنبی آج کہاں ہے؟ کیا وہ کبھی عراق بھی آئے گا؟ آیا تو تمہارے خیال میں وہ کس راستے سے گزرے گا؟ عموماً اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوتے ہیں؟ وہ اگر کبھی ادھر سے گزرے اور تمہیں معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا وغیرہ وغیرہ۔

ابونصر نے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس وقت جب اس نے یہی باتیں چھیڑ دیں تو ابونصر نے پوچھ ہی لیا، تم متنبی کے بارے میں کیوں پوچھتے رہتے ہو۔

"اس لیے کہ میں اس کی تاک میں لگا ہوا ہوں اگر میرا اس کا سامنا ہو گیا تو میں اس کا خون بہائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایسا کیا کر دیا اس نے۔"

"کیا تمہیں واقعی کچھ نہیں معلوم۔"

"مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک معصوم شاعر ہے۔ ہر طرف اس کی شاعری کی دھوم ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔"

"معصوم وہ نہیں تم ہو کہ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔ ایسا کیا کر دیا اس نے۔"

"اس نے میرے بھانجے "ضبہ" کی نہایت بے ہودہ ہجو کی ہے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ شعرا ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ شاعروں نے تو بادشاہوں تک کی ہجو کہہ ڈالی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شاعر محض ہجو کی وجہ سے قتل کر دیا گیا ہو۔"

"اگر وہ صرف ضبہ تک محدود رہتا تو میں اسے معاف کر دیتا لیکن اس نے ضبہ کے ساتھ اس کی ماں یعنی میری بہن کے بارے میں بھی بکواس کی ہے۔ اس نے میری بہن کو طوائف سے بھی بدتر الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس نے میرے بھانجے کو کتیا کا بیٹا کہا ہے جس کے بہت سے باپ ہیں۔"

"یہ واقعی اس نے بہت برا کیا۔ وہ کبھی آیا تو میں اسے سمجھاؤں گا۔"

"تم سمجھاتے رہو۔ اب تو جو خدا چاہے گا وہی ہو گا۔" فاتک نے کہا اور نہایت غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک لڑائی میں عراق کے کچھ لوگوں نے ضبہ کے باپ یزید العتبی کو قتل کر دیا اور اس کی ماں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

اس وقت سے ضبہ عراقیوں کی تاک میں رہتا تھا۔ جب کوئی عراقی ادھر سے گزرتا تو وہ اس کے ساتھ بڑی بدسلوکی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ متنبی اور اس کے ساتھ کوفہ کے کچھ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اشراف ضبہ کے قبیلے کے پاس سے گزرے۔ ضبہ ان کے ساتھ بڑی بدسلوکی سے پیش آیا اور انہیں فحش گالیاں دیں۔ انہوں نے متنبّی سے درخواست کی کہ وہ اس کی گالیوں کے جواب میں ویسے ہی فحش لفظوں میں اس کی ہجو کہہ دے۔ متنبّی ایک مہذب انسان تھا پھر بھی اس نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے ضبہ کی بہت ہی فحش ہجو کہہ ڈالی اور اس کی ماں کو بھی اسی لفظوں میں یاد کیا۔ فاتک بن ابی الجہل اسدی، ضبہ کا ماموں تھا۔ اس نے جب سے یہ رکیک اور بے ہودہ اشعار سنے تھے وہ اور اس کے بنی اعمال متنبّی کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ہر آنے والے سے متنبّی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔

☆......☆

متنبّی نے عضد الدولہ کے دربار سے رخصت ہونے سے قبل آخری قصیدہ لکھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس قصیدے میں اس کی زبان سے بغیر کسی ارادے کے کئی شعر ایسے نکل گئے جو بدفالی اور بدشگونی سمجھے جاتے ہیں اس نے اس قصیدے میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ عضد الدولہ کے پاس پھر واپس آئے گا لیکن ساتھ ہی یہ الفاظ بھی لکھ گیا۔

''تیرے پاس آنے کا شوق فراق سے پہلے ہی تلوار کا کام کر رہا ہے۔ میں اس شمشیر فراق سے ابھی مارا نہیں گیا ہوں پھر بھی اس نے ابھی سے مجھے قتل کر دیا ہے۔'' پھر آگے چل کر شوقِ واپسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

''اے دور میں وطن! تو میری سواریوں کے سامنے سے ہٹ جا اس لیے کہ وہ تیز رفتاری کی وجہ سے تجھ سے اس طرح تیزی سے گزر جائیں گی جیسے تیر، شکم چیر کر پار ہو جاتا ہے یعنی میری سواریاں بڑی تیز رفتار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد واپس آ جاؤں اور بعد وطن اس میں حائل نہ ہو۔''

پھر کہتا ہے۔

''اے وطن جانے والے راستے تیرا جو جی چاہے کر مجھے جلد واپس آنا ہے چاہے تو اذیت پہنچائے نجات دلائے یا مجھے ہلاک کر دے۔''

ایک جملہ یہ بھی اس کے قلم سے نکل گیا تھا۔

''میرا وطن جا کر واپس لوٹنا اس تیر کی طرح ہے جو فضا میں چلایا جائے۔''

اسی قصیدے کا آخری شعر اس کی زندگی کا آخری شعر ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس نے کوئی شعر نہیں کہا۔ اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنی موت کی خبر سنا رہا تھا۔

''مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ وہ مجھے اس حال میں دیکھے کہ میں تیرے گھر اور تیری محبت سے مفارقت اختیار کر رہا ہوں۔''

ایک بات یہ بھی خوب ہوئی کہ عضد الدولہ نے اسے رکنے پر مجبور نہیں کیا۔ جھوٹے منہ بھی یہ نہیں کہا کہ کچھ دن شیراز میں رہ جائیے حالانکہ یہاں آئے اس صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ عضد الدولہ نے بڑے ارمانوں سے اسے یہاں بلایا تھا اور بڑی آسانی سے رخصت کر رہا تھا۔ اس کے بہ حفاظت عراق پہنچنے کا انتظام بھی نہیں کیا۔

متنبّی رخصت ہو کر عراق کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ رمضان 354ھ میں شہر واسط پہنچا اور اپنے دوست ابونصر محمد جبلی کے پاس ٹھہرا۔ متنبّی کے ساتھ اس وقت چھ لوگ تھے جن میں اس کا بیٹا بھی تھا۔

ابونصر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا لیکن فوراً ہی اس کے چہرے پر ملال کی سی کیفیت ابھر آئی۔

''کیا بات ہے ابونصر، تم مجھے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے۔''

''نہیں، یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ بہت دن بعد تجھے دیکھ رہا ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہے میں ایک اچھا قیافہ شناس ہوں۔ کوئی بات ضرور ہے جو تم پریشان ہو۔''

''تم اندر آؤ تو میں بتاؤں۔''

مکان میں پہنچے اور خاطر تواضع کے بعد ابونصر نے فاتک کی آمد کے بارے میں اسے بتایا۔

''اس کے اور اس کے قبیلے والوں کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ تمہارے پاس قیمتی سامان بھی ہے اور قیمتی جانیں بھی اور تمہارا گزر بنو اعمام کی طرف سے ہوگا۔ تمہیں احتیاط کرنی ہوگی۔''

شام کے وقت جب متنبّی نے کوچ کا ارادہ کیا تو ابونصر نے ایک مرتبہ پھر اسے خبردار کیا۔

''کچھ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے لو جو اس طرف کے خطرناک راستوں سے واقف ہوں۔''

''تلوار کے سوا مجھے کسی نگہبان کی ضرورت نہیں۔'' متنبّی نے کہا اور سوار ہو گیا۔

کچھ آگے چل کر اس کے غلام نے بھی مشورہ دیا۔

''ابونصر ٹھیک کہتے تھے آپ کو کچھ لوگوں کو ساتھ لے لینا چاہیے تھا۔''

متنبّی نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ مجھے راستے کی حفاظت کے لیے کسی نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میری تلوار کافی ہے۔

فاتک بن ابی الجہل کو معلوم ہو گیا تھا کہ متنبی مع ساز و سامان شہر واسط سے روانہ ہوا ہے۔ وہ اپنی فطری بہادری کی وجہ سے زیادہ آدمی اپنے ساتھ نہیں لایا ہے۔ یوں بھی وہ جنگ کے ارادے سے نہیں نکلا ہے لہٰذا اس کے ساتھی معمولی ہتھیاروں کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اس نے بدویوں کی ایک جماعت کو ساتھ لیا اور ایک مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایسا مقام تھا کہ متنبی کوئی بھی راستہ اختیار کرتا اس مقام سے گزرے بغیر حدودِ عراق میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ متنبی اور اس کے ساتھی قیمتی سامان کے چھکڑوں کے ساتھ آتے دکھائی دیے۔ یہ تعداد میں چھ یا سات سے زیادہ نہیں تھے جب کہ فاتک کے ساتھ ستر آدمیوں کی جماعت تھی۔ وہ سب دائرے کی شکل میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

متنبی اپنے آراستہ گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے اس کا غلام تھا۔ وہ جیسے ہی دشمنوں کے نرغے میں پہنچا چاروں طرف سے اس پر حملہ ہو گیا۔ وہ نہایت بہادر اور نڈر تھا۔ سیف الدولہ کے ساتھ کئی جہادوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اس قسم کے معرکوں سے نمٹنا خوب جانتا تھا لیکن یہ حملہ نہایت اچانک ہوا تھا اور پھر دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ وہ کچھ دیر تو لڑتا رہا لیکن پھر خود کو مغلوب دیکھ کر اس نے بھاگنا چاہا لیکن اس کے غلام نے اسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔

”میں صاحبِ سیف و قلم ہوں۔ مجھے گھوڑے، رات اور جنگل خوب پہچانتے ہیں۔ مجھے تلوار، نیزہ اور قلم اچھی طرح جانتے ہیں۔“

متنبی کی غیرت نے جوش مارا اور وہ بھاگتے بھاگتے پلٹ آیا اور لڑتے لڑتے قتل ہو گیا۔ اس کا بیٹا محمد اور تمام ساتھی بھی مارے گئے۔

ایک راوی علی بن حمزہ بصری کی روایت کے مطابق 28 رمضان 354ھ کا ہے۔

متنبی 303ھ میں پیدا ہوا اور 354ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اس حساب سے وہ صرف 53 سال اس دنیائے آب و گل میں رہ سکا۔

کسے معلوم تھا کہ وہ شخص جس کے نغمات سے فضائے عالم گونج اٹھے، تنہا وادیٔ غربت میں اس طرح اس کی آواز گم ہو جائے گی کہ کوئی اس پر دو آنسو بہانے والا بھی نہ ہو گا۔

ابو نصر محمد جبلی کو اس کے قتل کی خبر ملی تو وہ فوراً وہاں پہنچا اور اس کے بیٹے اور غلاموں کو دفن کیا۔ اس کا قیمتی سامان پہلے ہی لوٹا جا چکا تھا۔

ابو نصر اس کے مدفن پر کھڑا تھا اور زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ ذات جس نے سیادت و ولایت حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، ناکام و نامراد دنیا سے اٹھ گئی اور اپنی نامرادی میں ہزار ہا عبرتیں دنیا کے لیے چھوڑ گئی جس کو زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔“

☆......☆

اس کے قتل کے بعد بہت سے شعراء نے اس کے بہت سے دردناک مرثیے لکھے، ایک مرثیہ بہت ہی مشہور ہوا جس کے چند شعر یہ تھے

خدا اس زمانے کے لوگوں کی حفاظت نہ کرے جب کہ انہوں نے ہمارے اسی شیریں زماں شاعر کو قتل کر کے ہم کو مصیبت میں ڈال دیا۔

لوگوں نے متنبی کا ثانی نہیں دیکھا۔ زمانہ جدید کا ایسا بے نظیر شاعر کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ لشکر میں ایک عظیم المرتبت شخصیت کا مالک نظر آتا تھا اور عظمتِ شان اور بڑائی میں بلند حوصلہ بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔

وہ شعر گوئی میں ایک معجز بیان نبی تھا لیکن اس کے معجزات نادر معانی اور بلند مطالب کی سحر بیانی سے ظاہر ہوئے۔

ابن ہارون نامی شاعر نے عضد الدولہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ متنبی کا قصاص لے لیکن عضد الدولہ نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

ابن ہارون نے اپنے قصیدے میں کہا۔

”یہی ہیں جنہوں نے تیرے مہمان پر حملہ کر کے تیرے عطایا کو لوٹ لیا جس کا وہ خوش قسمتی سے مالک ہو گیا تھا۔ اے بلند رتبہ بادشاہ متنبی تجھ سے پھر واپس آنے کا عہد کر کے گیا تھا۔ اس ارادے کی وجہ سے اس کا تجھ پر حق ہے تو اس عہد و پیماں کا خیال کر اور اپنے مہمان کا حصہ قصاص طلب کر۔“

عضد الدولہ نے اس مطالبے پر توجہ نہیں دی۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ یہ قتل عضد الدولہ کے ایماء سے ہوا تھا۔

ماخذ:
ابو الطیب متنبی
پروفیسر سید جلیل الرحمن اعظمی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

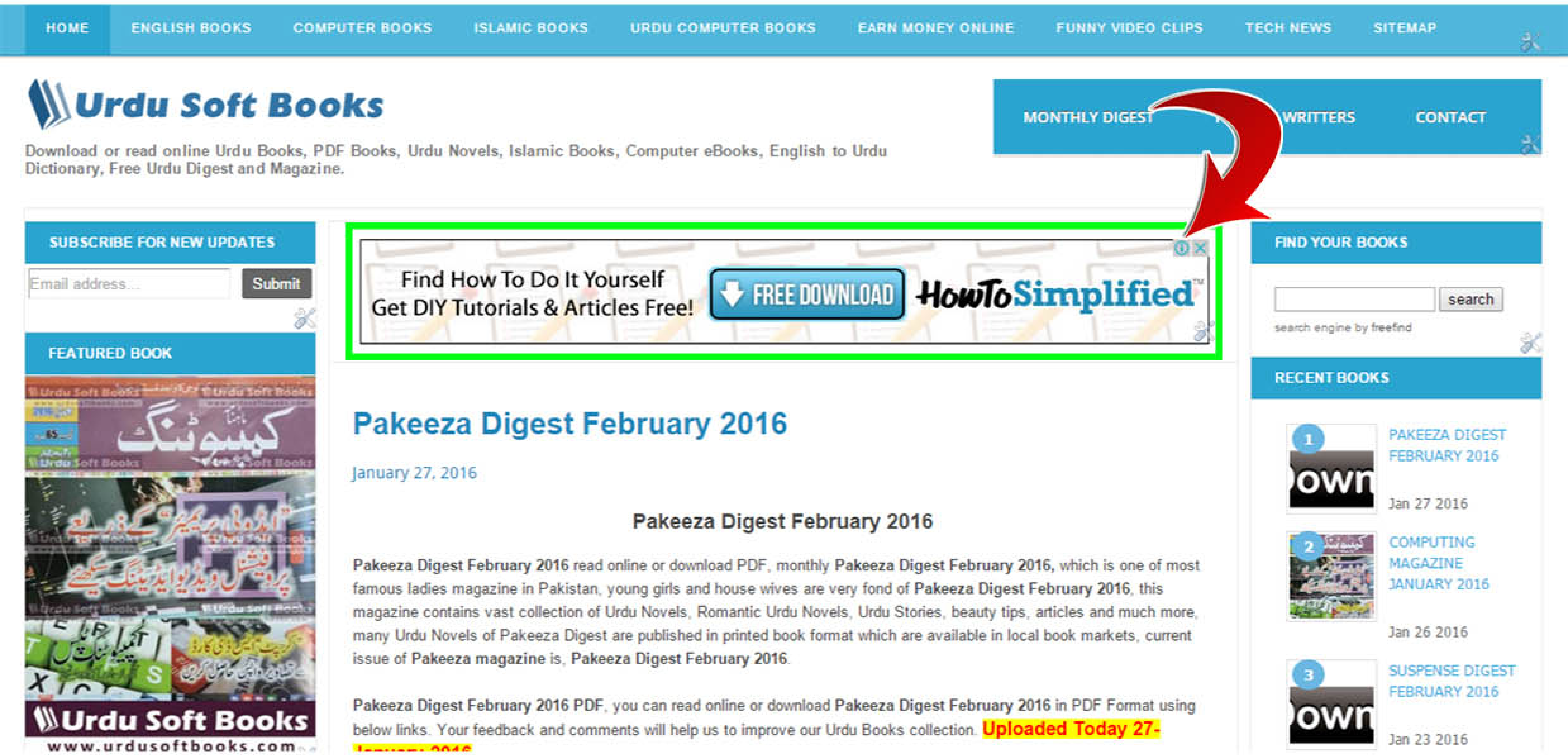

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کرکے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اس نے بغداد کی فضائوں میں لڑکپن گزارا پھر جب وہ پاکستان کے اس حصے میں آیا جہاں ہر طرف گنگناتی ندیاں لہلہاتے سرسبز کھیت اور ہریالی بکھیرتے درختوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا نظر آتا تھا۔ ایسے سہانے منظر اس کے اندر موسیقی کی تانیں اٹھاتے اور وہ گنگنانے لگتا پھر اس کی زندگی میں ایک حسن کی شہزادی آگئی تو اس کی زندگی گویا مکمل ہو گئی اور تب اس نے راگ راگنیوں کا جو میلا سجایا تو لوگ اسے سراہے بنا نہ رہ سکے۔

پاکستان کے ایک بڑے موسیقار کی جیون کتھا

لازوال

اس کا جنم بغداد میں ہوا تھا مگر وہ عربی نہیں تھا۔ ہند کے انتہائی مشرقی علاقے کا باشندہ تھا۔ اس کے والد ایس ایم گھوش برطانوی فوجیوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ وہ سرسبز میدانی علاقے کے تھے۔ اس لیے انہیں بغداد کی تپش گوارا نہ تھی۔ مگر ملازمت کی وجہ سے ٹکے ہوئے تھے۔ اب جب انہیں اطمینان ہوا کہ ان کے وطن میں جس طوفان نے ہزاروں گھر اجاڑ دیے تھے۔ لوگ پاگل ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے تھے۔ وہ قتل عام بند ہو چکا ہے ہر طرح سے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

امن وامان ہو چکا ہے تو وہ اپنے والد کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔
جب اس کے والد اپنی سرسبز دھرتی پر پہنچے تو ان کے ساتھ بیوی اور بچے بھی تھے۔ ان سب کو اپنا وطن بہت پیارا لگا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس نے اور اس کے بھائی بہنوں نے پہلی بار ایسی ہریالی دیکھی تھی۔ بہتے پانیوں کا سرگم سنا تھا۔ ندی نالوں کی یہ سرزمین ہے ہی ایسی کہ دل و دماغ پر سحر طاری کر دے۔
یہ اس سحر زدہ ماحول کا اثر تھا کہ ایس پی گھوش کے بچوں پر موسیقیت کا جادو چڑھنے لگا۔ تمام بچوں میں روبن زیادہ باشعور تھا جبکہ ابھی وہ صرف چھ سال کا بچہ تھا۔ مگر راگ راگنی کی پہچان ہو چکی تھی۔ یہ شوق اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا گیا تھا۔ اس دور کے جو نغمے اسے اچھے لگتے وہ اسے نہ صرف بار بار سنتا بلکہ اپنے طور پر گانے کی بھی کوشش کرتا۔ پھر اسے یہ شوق چرایا کہ وہ خود بھی گائے اور اپنی آواز کے جادو سے دوسروں کو بھی مسحر کرے۔
اس دور میں ریڈیو ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سے فن کی آبیاری ہوتی تھی۔ موسیقار، گلوکار اور سازندے اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے تھے۔ لہٰذا وہ بھی ریڈیو اسٹیشن کے طواف کرنے لگا۔ اسی دوران اس کی ملاقات کیپٹن احتشام سے ہوئی۔ احتشام ان دنوں اپنی پہلی فلم ''اے دیش تمار آمار'' (یہ وطن تمہارا ہمارا) بنا رہے تھے۔ واضح رہے کہ احتشام اور ان کے بھائی مستفیض کا ایک تقسیم کار ادارہ لیو فلمز تھا۔ اب وہ اس کے بینر تلے اپنی ذاتی فلم پروڈیوس کر رہے تھے۔ اس کے گانوں کے لیے انہیں گلوکاروں کی ضرورت تھی اور اسی مقصد سے وہ ریڈیو اسٹیشن آئے تھے۔ روبن سے مل کر اور اس سے گفتگو کر کے وہ متاثر ہوئے تھے۔ مگر اس کی صلاحیتوں سے ابھی نا آشنا تھے اس لیے فی الحال اس سے کوئی سولو سانگ نہیں گوا سکتے تھے۔ پھر بھی اسے چانس دینا چاہتے تھے۔
''تم میرے دفتر آؤ۔ میں تمہیں چانس دوں گا۔''
اور جب وہ ڈھیر سارے خواب سجائے لیو فلمز کے دفتر پہنچا اور ہدایت کار احتشام سے ملا تو انہوں نے کہا۔ ''دیکھو بھئی! ہم تمہیں اپنی فلم کے ایک کورس گانے میں ساتھی گلوکار کے طور پر چانس دیں گے۔''
ہدایت کار احتشام کی بات سن کر اس کے خوابوں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں دیکھ کر ''اے دیش تمار آمار'' کے موسیقار خان عطاء الرحمان نے کہا۔ ''ارے یار! اس چانس کو بھی غنیمت جانو۔ فی الحال فلموں کی موسیقی میں تمہاری یہ شمولیت تمہارے آنے والے دنوں کے لیے بہت اہم ہے۔'' خان عطاء الرحمان نے بلڈنگ کے اوپر منزل پر جانے والے زینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''جس طرح نیچے سے اوپر جانے کے لیے ہمیں ایک ایک قدم پر چل کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک ایک قدم چل کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ آج تم کورس سانگ میں حصہ لو گے تو کل تمہیں سولو سانگ میں بھی موقع ملے گا۔ بشرطیکہ تمہاری پرفارمنس متاثر کن ہو۔''
نوجوان کو پختہ کار موسیقار کی باتوں نے بڑا حوصلہ دیا۔ اس نے اپنی مایوسی کو پرے دھکیل کر اپنی فنی سفر کا آغاز ایک کورس گیت سے کیا۔ ساتھی گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں اس کی بہن رینا نے بھی حصہ لیا۔ کیونکہ اس کی بہن کو بھی گانے کا شوق تھا اسی نے اپنی بہن کو شامل کرنے پر موسیقار کو رضامند کیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس فلم سے اداکارہ شبنم کو بھی اپنی فنی زندگی شروع کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی نام جھرنا بوس کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس فلم میں اس کی حیثیت ایک ایکسٹرا گرل کی تھی۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان دنوں ڈھاکے کی فلمی صنعت بہت محدود تھی۔ فن کے جو متوالے تھے وہی گھوم پھر کر فلموں میں کسی نہ کسی عنوان سے شمولیت کرتے تھے۔ جھرنا بلبل اکیڈمی آف فائن آرٹ کی طالبہ تھی اور وہاں رقص کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔
وہ نوجوان جب ''اے دیش تمار آمار'' کے ایک کورس گیت کے سہارے فلم والوں سے گھلنے ملنے لگا تو اس کے شوق کو دیکھ کر کسی نے اسے مشورہ دیا۔ ''اگر تمہیں اس فیلڈ میں کچھ کرنے کا شوق ہے۔ آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ تو تمہیں اس کی تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ کسی استاد سے اس فن کی تربیت اور تعلیم حاصل کرو۔''
بات اچھی تھی۔ مشورہ مناسب تھا۔ اس نے پہلے استاد یوسف قریشی کی شاگردی حاصل کی۔ پھر کچھ دنوں تک استاد عبداللطیف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ سرسنگیت کے بھید بھاؤ جاننے کے بعد اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ گلوکار کی بجائے اسے موسیقار کی حیثیت سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرنی چاہیے۔ لہٰذا اسی رخ پر وہ سوچنے لگا۔ موسیقاروں کے کام کو غور سے دیکھنے لگا۔ توجہ دینے لگا۔ شاید مولا کریم

بھی اس پر مہربان تھا اور اس کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ہدایت کار احتشام نے اپنی پہلی فلم کی کامیابی کے بعد دوسری فلم ''راجدھانیر بوکے'' (راجدھانی کے قلب میں) شروع کی تو اس نے کہا۔ ''یار تم گلوکاری کے چکر میں کب تک خوار ہوتے رہو گے۔''

''جی ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ......''

''گڈ۔ تم ایک ٹیلنٹڈ نوجوان ہو۔ اپنے مستقبل کے لیے زیادہ روشن راستہ اختیار کرو۔''

''سر جی! آپ کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل رہی تو یقیناً میں اس راستے پر چل پڑوں گا۔''

''میں نے سوچا ہے۔'' احتشام نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''تم میری آنے والی فلم ''راجدھانیر بوکے'' کی موسیقی ترتیب دو۔''

نوجوان کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ پھنسا۔ مگر اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ پہلے احتشام کا شکریہ ادا کیا۔ پھر بولا۔ ''سر جی میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔''

''ہنہ، معیار......'' کیپٹن نے کہا۔ ''اس وقت یہاں معیار کو کون دیکھتا ہے؟''

اور یہ بات سچ بھی تھی ڈھاکے کی فلمی صنعت اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ جس طرح بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لیے جو دال دلیہ مل جائے اسی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس دور میں جو فلمیں بن رہی تھیں تماشائی اسی پر صد شکر کے ساتھ گزارا کر رہے تھے۔ احتشام اور اس کے بھائی مستفیض کا اصل مقصد بس پیسے بچانا تھا۔ کم سے کم خرچ میں فلم بنانا تھا۔ اس نے اپنی پہلی فلم میں موسیقار کی حیثیت سے بہت محنت کی۔ اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر کام کیا۔ ہر قدم پر احتشام اور مستفیض نے اس کے کام کی تعریف کی۔ وہ بہت خوش تھا۔ مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کے کریڈٹ پر اپنے ساتھ فردوس بیگم کا نام دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ فردوسی بیگم نے اس فلم میں کئی گیت گائے تھے۔ اور ایک اچھی گلوکارہ کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر بھی اس کا نام بطور موسیقار دیا گیا تھا۔ اس دکھ کو اس نے اپنے اندر رکھ لیا۔

اپنے جذبے کا اظہار کسی سے نہیں کیا۔ نہ ہی فلمساز ادارے اور اس کے کرتا دھرتاؤں سے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ فلمساز و ہدایت کار نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ روبن بالکل نئے تھے۔ اور فردوسی بیگم نامور لوک گلوکار عباس الدین کی صاحبزادی اور مدھر آواز کی گلوکارہ تھی یہ حرکت احتشام نے اپنی پہلی اردو فلم ''چندا'' میں بھی کی تھی۔ فردوسی کا نام شریک موسیقار کی حیثیت سے دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں دکھائی جانے والی پرنٹ میں فردوسی بیگم کا نام زیادہ فلش کیا گیا تھا۔

''راجدھانیر بوکے'' کے بعد مستفیض نے اپنی بنگالی فلم ''ہارانو دن'' (گمشدہ ایام) شروع کی تو اس میں بھی روبن کو میوزک ڈائریکٹر منتخب کیا۔ مگر اپنے بھائی کی طرح اس نے اس نوجوان کی حق تلفی نہیں کی۔ اس فلم میں اسے سولو موسیقار کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اور اس حیثیت سے یہ اس کی پہلی فلم تھی۔

''راجدھانیر بوکے'' کے گانوں کی دھنیں اس نے بڑی دلکش اور میلوڈینس بنائی تھیں۔ بلکہ اس کی اس بات نے بھی اس فلم کی مقبولیت میں اضافہ کیا تھا کہ اس کے دو گیت بھارت کے نامور گلوکار طلعت محمود سے بھی گوائے گئے تھے۔ جن میں سے ایک گانا یہ تھا۔ ''تو مارے لگیے جھے اتو جے بھالو چاند بوجھی تا جانے''

یہ نغمہ بہت پاپولر ہوا جس کا کریڈٹ ان کو ملا۔ ملنا بھی چاہیے تھا کہ انہوں نے بھارت جا کر یہ گیت ریکارڈ کرایا تھا۔ چندا نے زبردست کامیابی حاصل کر لی تھی اور اس کا نام ہر جانب کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا تھا۔

بطور موسیقار ڈھاکے کی اردو فلموں کے نغمات کا انتخاب

فلم	آواز	گیت کے بول
چندا	فردوسی بیگم	اکھیاں توری راہ نہاریں او پردیسیا آجا
......	......	رنگ روپ جوانی، دیکھو رت ساون سہانی
......	فردوسی بیگم، نجم الہدیٰ	موت کی ہے پکار، دیپ بجھادو
......	انجمن آراء	چاندنی بھیگی بھیگی، انجانے میں کہاں دل کھو گیا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"چندا" کی زبردست کامیابی کے بعد ڈھاکے میں اردو فلموں کا گویا سیلاب آ گیا۔ تلاش، پیسے، چکوری، بندھن اور بھیا وغیرہ میں بھی اس کو پہلی ترجیح کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ اس دوران بنگلہ زبان کی پروڈکشن بہت کم ہو گئی تھی۔ سقوط ڈھاکا سے قبل بطور موسیقار اس کی دو بنگالی فلمیں "ناچیر پوتل" (ناچنے والی گڑیا) اور "پیچ ڈھالا پوتھ" (کولتار سے بنائی گئی سڑک) ریلیز ہوئی تھی۔

وہ سر سنگیت کی سدھ بدھ رکھنے والے موسیقار تھے۔ اس لیے ابتدا ہی سے .... اچھی آواز کی تلاش میں رہتے تھے۔ "تلاش" میں انہوں نے گلوکار بشیر احمد کو متعارف کرایا۔ جس نے آگے چل کر نغمہ نگار اور موسیقار کی حیثیت سے بھی آپ اپنے کو پیش کیا اور کامیاب رہا۔ اور پھر جب مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں موسیقار کی حیثیت سے اس کے سنہری دور کا آغاز ہوا تو لاہور میں بھی اس نے بہت سی خوبصورت آوازوں کو سامنے لانے کی بڑی مستحسن کوشش کی۔ ایسے گلوکاروں میں اخلاق احمد کا نام سرفہرست ہے۔ جبکہ نیرہ نور کو بھی اس نے اپنی فلموں میں خصوصی طور پر پیش کیا۔ اس سے پہلے فلم والوں نے نیرہ نور کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اپنی فلموں کے لیے اس کی آواز میں گانے ریکارڈ کرائیں۔ اس دور میں زیادہ تر موسیقار ملکہ ترنم مادام نور جہاں ہی سے اپنی فلموں کے زیادہ سے زیادہ گانے ریکارڈ کراتے تھے۔ مگر اس نے مادام کی آواز کا سہارا کبھی نہیں لیا۔ اپنی کسی فلم میں ان سے ایک گیت بھی ریکارڈ نہیں کروایا۔ اچھی آوازیں اسے جہاں کبھی نظر آئیں انہیں اپنی فلم میں گانے کا موقع دیا۔ اب وہ مستند مانا جانے لگا تھا۔ لوگ ادب سے نام لینے لگے تھے۔ رونا لیلیٰ، ناہید نیازی، نجم نیازی، مہناز، روبینہ بدر، آئرن پروین، شبنم مجید، انجمن آراء، مالا اور گلوکاروں میں عالمگیر، مسعود رانا، مجیب عالم، نجم الہدیٰ، اے نیئر، غلام عباس، عبدالجبار کے علاوہ اس دور کی مستند آوازوں مہدی حسن اور احمد رشدی کی آوازوں سے بھی اپنے گیتوں کو سجایا۔ وہ گانے والوں کی قدر و قیمت کو جانتے تھے۔ کہانی اور سچویشن کے پیشِ نظر جہاں جس کو مناسب سمجھتے تھے۔ اس کی آواز میں گانا ریکارڈ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کمپوزیشن میں تخلیق پانے والے گیت انگوٹھی میں نگینے کی طرح ہوتے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن وہ بخوبی اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔ احمد رشدی کی آواز کے وہ ابتداء سے ہی اسیر تھے۔ مگر اس سے وہی گیت گواتے جہاں اس کی آواز کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے "بندش" کا گانا۔ "نہ سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جان من تجھ کو میں دے سکوں گا" اخلاق احمد سے ریکارڈ کروایا۔ احمد رشدی یا مہدی حسن سے نہیں جو یقیناً اخلاق احمد سے زیادہ منجھے ہوئے اور مستند گلوکار تھے۔ فلم کی ضرورت کے لحاظ سے وہ اخلاق احمد کو زیادہ مناسب گلوکار سمجھتے تھے۔ یہ گیت فلم کا سپرہٹ سانگ ہے۔ نغمہ نگار سعید گیلانی نے یہ گانا لکھا بھی بڑے عجیب انداز سے ہے۔ اس میں عام گیتوں کی طرح نہ کوئی قافیہ ہے نہ ردیف۔ اس کی کیفیت نثری نظم جیسی ہے۔ ایسے کسی نغمہ کو کمپوز کرنا بھی ہنرمندی کا کمال ہے۔

انہوں نے مادام نور جہاں اور ناہید اختر جیسی منجھی ہوئی اور پختہ گلوکاراؤں سے ایک بھی گیت نہیں گوایا۔ اس کی وجہ ان سے کوئی ناراضگی یا دشمنی نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر موسیقار یہ سمجھ کر ان سے اپنی فلموں کے گیت ریکارڈ کرواتے تھے کہ ان کے خیال کے مطابق ان دونوں میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ ہر ٹائپ، ہر قسم کے گیت گا سکتی تھیں۔ روبن ایسی سہل پسندی کے قائل نہیں تھے۔ وہ فلم کے سبجیکٹ، فلموں کی کہانی کی سچویشن کو سامنے رکھ کر موسیقی کمپوز کرتے تھے اور جس گلوکار یا گلوکارہ کی آواز کو بہترین تصور کرتے تھے اسی کی آواز میں گیت ریکارڈ کرتے تھے۔ دراصل یہ ان کی اس تربیت کا نتیجہ تھا جو اس نے ابتدائی دور میں حاصل کی تھی۔

یوں تو انہوں نے موسیقی کا پہلا سبق استاد یوسف قریشی اور استاد عبداللطیف سے لیا تھا لیکن جب وہ موسیقار کی حیثیت سے فلموں کی موسیقی ترتیب دینے لگے تو خیال آیا کہ اس فیلڈ میں جو مستند لوگ ہیں ان سے بھی کچھ سیکھنا چاہیے۔ لہٰذا وہ کلکتہ گئے اور موسیقار سلیل چوہدری سے مل کر مدعا بیان کیا۔ "گرو دیو! میں آپ سے فلمی موسیقی کے بارے میں تربیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

چوہدری صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ بیس بائیس سال کا چھریرے بدن کا ایک نوجوان ان کے سامنے موجود تھا۔ اپنے لباس اور اندازِ گفتگو سے وہ کسی اچھے خاندان کا لگتا تھا۔ "کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کیا کرتے ہو؟"

نوجوان نے انکسار کے ساتھ بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

''ٹھیک ہے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا تمہیں بتا اور سکھاؤں گا۔''

سلیل چوہدری بنگالی موسیقاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ فلموں کی میوزک ڈائریکشن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ ان کا شمار ہندوستان کے عظیم بنگالی موسیقار ایس ڈی برمن اور ہیمنت کمار جیسے فنکاروں میں ہوتا تھا۔ جن کی فلمی دھنوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ جن کی عظمت اور شہرت کے ڈنکے آج بھی بج رہے ہیں۔ ایسے موسیقار کا شاگرد ہونا ہی بڑے اعزاز اور فخر کی بات تھی۔

روبن نے ان سے فلمی موسیقی کے بھید بھاؤ ہی نہیں سیکھے دیگر اچھی اور سود مند باتوں کی بھی تعلیم حاصل کی۔ انہی باتوں میں سے یہ بات بھی تھی کہ وہ گلوکار، یا گلوکارہ جو بہت زیادہ پاپولر ہو اس سے گانے ریکارڈ کرواؤ گے تو گانے کی مقبولیت کا سارا کریڈیٹ گانے والے کے کھاتے میں جائے گا۔

''تو پھر کیسے گانے والوں کو اپنی فلم کے لیے منتخب کیا جائے؟''

''اچھے موسیقار کی یہ خوبی ہونی چاہیے کہ فلم کی کہانی اور سچویشن کے مطابق فیصلہ کرے کہ کس کی آواز کردار پر پوری اترے گی۔''

''استادِ محترم! وہ لوگ جو لتا جی اور محمد رفیع سے ہی اپنے گانے ریکارڈ کرواتے ہیں کیا ان کا ایسا کرنا درست نہیں ؟''

نہیں بالکل درست نہیں، لتا، محمد رفیع، کشور کمار اور کئی سنگر ایسے ہیں جو ہر طرح کے گیت گانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے گائے ہوئے گانے ہٹ ہوتے ہیں تو گانے والے کو اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ موسیقی کی دھنیں کمپوز کرنے والے موسیقار کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ تمہیں اچھا میوزک ڈائریکٹر بننا ہے تو بڑی اور مستند آوازوں کا سہارا نہ لو۔ فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق جس کی آواز مناسب ہو، اس سے گانے ریکارڈ کرواؤ خواہ وہ کتنی ہی غیر معروف اور نئی آواز ہو۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں اس نے سلیل چوہدری کے زیرِ سایہ رہ کر سیکھیں۔ موسیقی کے بنیادی اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی جو اس کے بعد کے کیریئر میں ہمیشہ اس کے کام آئی۔ یہ تجربہ اس کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ ایک موسیقار گلوکاری کی صلاحیت سے کس طرح بہتر سے بہتر اور زیادہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ ہنر اس نے سلیل

روبن گھوش نے جب ڈھاکے میں میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو اسے کئی پرانے اور پختہ کار موسیقاروں کے علاوہ کچھ نئے میوزک ڈائریکٹروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ پختہ موسیقاروں میں خان عطاء الرحمان، سبل داس، مصلح الدین اور دھیر علی منصور موجود تھے جبکہ نئے موسیقاروں میں جنہوں نے اس کے ساتھ یا بعد میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا ان میں کریم شہاب الدین، بشیر احمد، علی حسین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن روبن گھوش نے نہ پرانوں کی موجودگی سے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کیا، نہ ہی نئے مدمقابل کو خاطر میں لایا۔ بس اپنے کام سے کام رکھا۔ اپنے گیتوں کی دھنوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے پر توجہ دی۔ کسی تعصب یا کاروباری رقابت سے بالا ہو کر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی موسیقی میں نکھار آتا گیا۔ اس کی صلاحیتوں اور فنی خوبیوں کی خوشبو مغربی پاکستان تک جا پہنچی اور جب وہ یہاں آیا اور کراچی، لاہور میں اپنے کیریئر کا نیا دور شروع کیا تو یہاں بھی اسے ٹف ٹائم ملا۔ یہاں مشرقی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ مہان کلاکاروں کی حکمرانی تھی۔ خواجہ خورشید انور، دیبو بھٹا چاریہ، جی اے چشتی، سہیل رعنا، حسن لطیف، فیروز نظامی، ایم اشرف، عنایت حسین بھٹی، ماسٹر عبداللہ، کمال احمد، نذیر علی، صفدر حسین، تصدق حسین، رفیق غزنوی اور ماسٹر غلام حیدر جیسے موسیقاروں کا فلم انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے اور جواں سال کمپوزر کا ٹکنا اور اپنی فنی صلاحیتوں کا چراغ جلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس کے استادوں نے اسے کامیابی حاصل کرنے کا جو سبق پڑھایا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنی ہر فلم پر جو موسیقی ترتیب دی۔ اس نے نہ صرف اس کے گیتوں کو مقبولِ عام بنایا بلکہ فلم کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

چوہدری کی شاگردی میں رہ کر سیکھا۔

یہ سلیل چوہدری نے جنہوں نے طلعت محمود جیسے منفرد گلوکار کے جوہر کو پرکھا اور اپنی فلم کے ذریعہ متعارف کروایا۔ یہ بات بھی روبن کو چوہدری سلیل کی شاگردی کی دوران معلوم ہوئی اور انہوں نے اسی زمانے میں یہ سوچ لیا کہ وہ بھی اپنے استاد کی طرح نئی اور ابھرتی ہوئی آوازوں کو اپنی موسیقی کے ذریعے شہرت کی بلندیوں تک پہنچائے گا۔

ڈھاکا واپس آنے کے بعد انہوں نے ڈھاکے میں موجود بنگالی موسیقار مصلح الدین سے بھی رابطہ کیا۔ مصلح الدین اردو فلم ''ہمسفر'' کی موسیقی ترتیب دے کر خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے دو گانے ہیمنت کمار اور سندھیا مکھرجی کی آوازوں میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ یہ فلم 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی اور خاصی پسند کی گئی تھی۔ اس کو مصلح الدین کے بارے میں یہ جانکاری کلکتے ہی میں ہوئی تھی۔ واپس ڈھاکے آکر پہلی فرصت میں ان سے ملا اور اکتساب فن حاصل کیا۔ مصلح الدین نے انہیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی مستند آوازوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ مگر موسیقار کو اس وقت عزت اور شہرت حاصل ہوتی ہے جب وہ ابھرتی ہوئی آوازوں کو جلا بخشتے ہیں۔ ناہید نیازی اور نجمہ نیازی اس کی مثالیں ہیں۔ مصلح الدین نے جنہیں اپنی فلموں کے ذریعے شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

روبن کے خمیر میں ابتدا ہی سے موسیقی رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ جب اس میدان میں اترے تو شروع ہی سے انہوں نے موسیقی کی تعلیم و تربیت کو اہمیت دی۔ جس کے نتیجے میں وہ استادوں کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے۔ مستند آوازوں کا سہارا لینے کی بجائے ان آوازوں سے کام لیا جنہیں سہارے کی ضرورت تھی۔ ندیم اور عالمگیر اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ندیم کو ندیم بننے سے پہلے جب وہ نذیر بیگ تھے گانے کا موقع دیا۔ اور عالمگیر جب وہ کراچی ٹیلی ویژن کا ایک سنگر تھا۔ اسی طرح شہناز بیگم کو بھی انہوں نے فلمی گیت گانے کا موقع دیا جو اسٹیج پر یا تقریبات میں گاتی تھیں۔

بشیر احمد، نیرہ نور اور اخلاق احمد کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ انہوں نے ہی انہیں گمنامی کے اندھیرے سے نکال کر شہرت کے آسمان پر چاند سورج بنایا تھا۔ فریحہ پرویز کو بھی اخلاق احمد کے ساتھ فلم ''گھونگھٹ'' میں گانے کا اس وقت موقع دیا جب وہ غیر معروف تھی اور اس نے ''پتنگ باز سجناں سے'' گا کر شہرت حاصل نہیں کی تھی۔ اسی طرح گمنام گلوکار محمد علی شہکی کو بھی اپنی فلم ''انمول محبت'' میں گانے کا موقع دیا جو صرف اسٹیج کی حد تک جانا پہچانا جاتا تھا۔

جب کہ سارے میوزک ڈائریکٹر اس بات کے متمنی ہوتے تھے کہ ملکہ ترنم مادام نور جہاں ان کی فلم میں گانے پر رضامند ہو جائیں۔ روبن نے اس دور میں بھی فردوسی بیگم، رونا لیلیٰ، مہناز، ناہید نیازی اور نیرہ نور جیسی جونیئر گلوکاراؤں کی آوازوں سے اپنے گیتوں کو سجایا اپنی موسیقی کو کامیاب بنایا۔

گویا اس کے ذکر کے بغیر پاکستانی فلمی موسیقی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ رتبہ یہ مقام ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ جنہیں نصیب ہوتا ہے انہیں بھی ایک دن میں نہیں ملتا۔ انہوں نے بھی اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت اسٹرگل کیا ہے۔ بڑی جدوجہد کی ہے۔ اب تو آپ پہچان ہی گئے ہوں گے کہ ہم کس کا ذکر کر رہے ہیں جی ہاں روبن گھوش کا جس کے انتقال کو ابھی کچھ ہی دن گزرے ہیں۔

بے بی اسلام کی اردو فلم ''تنہا'' بہت کم لوگوں نے دیکھی ہے۔ جن لوگوں نے دیکھی ہے انہوں نے روبن گھوش کو اس فلم کے ایک منظر میں جو کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ کا تھا اس میں ایک ٹیبل کے گرد یقیناً بیٹھا ہوا دیکھا ہوگا۔ ''تنہا'' چندا سے پہلے بننے والی اردو فلم تھی۔ جسے احتشام نے سنسر بورڈ کے چکر میں پھنسا کر اپنی فلم چندا پہلے ریلیز کر دی تھی۔ یہ ایک طویل کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ روبن گھوش نے ایک ایکسٹرا اداکار کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح انہیں اداکاری کا شوق تو نہیں تھا لیکن ضرورت اور وقت کے تقاضے کے تحت انہوں نے اداکاری بھی کی۔ قاضی ظہیر کی فلم ''بندھن'' اور رحمان کی ''درشن'' میں بھی وہ مہمان اداکار کی حیثیت سے نظر آئے۔ اور گیسٹ آرٹسٹ کے طور پر روبن گھوش کا نام ٹائٹل پر بھی موجود ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ ایک موسیقار کی حیثیت سے اسٹیبلش ہو چکے تھے۔ وہ ابتداء ہی سے خوش پوش تھے اس لیے کسی ہیرو سے کم نظر نہیں آتے تھے۔

جھرنا بھی ایک مدت تک ایکسٹرا اداکارہ کے طور پر فلموں میں کام کرتی رہی تھی۔ جسے ''چندا'' میں پہلی بار ایک مکمل اداکارہ کے طور پر اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا /

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

موقع ملا۔ احتشام نے اسے جھرنا سے شبنم بنا دیا۔ اس فلم کی ہیروئن سلطانہ زمان تھی مگر چندا کی نمائش کے بعد شبنم کے کام کو زیادہ سراہا گیا۔ مستفیض نے تلاش بنائی تو شبنم کی اسی عوامی مقبولیت کو سامنے رکھ کر اسے رحمان کے مقابل لیڈنگ رول میں پیش کیا اور حسبِ توقع اس نے فلم دیکھنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ تلاش فنی لحاظ سے چندا سے بہتر فلم تھی۔ کہانی کے علاوہ اداکاری اور اپنے گیتوں کی وجہ سے بھی اس فلم نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ فلم 3 مئی 1963ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں روبن گھوش کی موسیقی نے اس کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے۔ روبن گھوش نے بشیر احمد کو تلاش میں متعارف کرایا اور اس نئے گلوکار سے ایسے گیت ریکارڈ کرائے کہ وہ مستند گلوکاروں کی صف میں شامل ہوگیا۔ ''کچھ اپنی کہیے۔ کچھ میری سنیئے۔ یہ شام یہ تنہائی۔ یوں چپ تو نہ رہیے۔'' اس گیت کو بشیر احمد اور شبنم یاسمین نے الگ الگ گایا تھا جبکہ ''میں رکشا والا متوالہ۔ رنگ برنگے شہر کے کونے کونے کا رکھوالا۔'' اسی طرح اس کا دوسرا سولو گیت۔ ''میں نے آج پی لی تو کیا ہوا۔ تھوڑا تھوڑا ہوش میں تو ہوں۔'' دیگر گانوں میں فردوسی بیگم، نینا، ملکہ پروین اور حیوتی مرزا کی آوازوں میں کورس گیت۔ ''جان گئی رے، چپکے سے دل میں تیرے کون آیا رے'' نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔ روبن گھوش نے اس فلم کے لیے دس گیت کمپوز کیے تھے جو سب کے سب سرور بارہ بنکوی نے لکھے تھے۔ روبن گھوش کو اس فلم کی عمدہ موسیقی کے صلے میں 1963ء کے بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ جو کسی موسیقار کی دوسری ہی فلم میں حاصل کرنا بڑے اعزاز کی بات تھی۔

جب کوئی فلم ہٹ ہوتی ہے۔ اس کے ماتھے پر عوامی مقبولیت کا جھومر جگمگاتا ہے تو اس میں بہترین پرفارم کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ ''تلاش'' کی کامیابی سے نہ صرف مستفیض کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی بلکہ روبن گھوش کو بھی ایک باصلاحیت موسیقار کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ نئے گلوکار بشیر احمد کو بھی زبردست عوامی مقبولیت ملی۔ جبکہ رحمان اور شبنم کی جوڑی کو بھی بہترین سمجھا گیا۔ اب روبن گھوش کے آگے کھلا راستہ تھا جس پر چل کر اس نے اپنی فلمی جولانیوں کا مظاہرہ کیا۔ ''پیسے''۔ ''بندھن''۔ ''تم میرے ہو''۔ ''کارواں''۔ ''بھیا''۔ ''چکوری'' ایک سے بڑھ کر ایک فلم کی موسیقی ترتیب دے کر اس نے اپنے لیے

☆ ہدایتکار حسن عسکری کی فلم ''ہم اور تم'' جو 27 دسمبر 1985ء کو ریلیز ہوئی تھی جس کے موسیقار روبن گھوش تھے۔ سلمٰی آغا کی خواہش تھی کہ وہ اس فلم میں پلے بیک سنگر بنے مگر روبن گھوش یہ نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مہناز سے اس فلم کے گیت گنوائے۔ مگر سلمٰی آغا نے جانے کیسے ان نغمات کو بیرون ملک لے جا کر مہناز کی جگہ اپنی آواز ڈب کروائی، مہناز کے گائے ہوئے گیت ''اس موسم میں دل نہیں بھرتا کبھی کبھی'' کی ریکارڈنگ اپنی آواز میں کروائی، مگر سلمٰی آغا کی آواز میں گایا ہوا یہ گیت فلم میں شامل نہ ہوسکا۔ جبکہ دیگر چار سولو اور ایک دوگانا فلم میں شامل تو ہوئے مگر کوئی تاثر نہ چھوڑ سکے۔

☆☆☆

☆ روبن گھوش کو دلوں کو چھو لینے والی موسیقی ترتیب دے کر فلموں کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے صلہ کے طور پر تلاش، چکوری، چاہت، آئینہ، امبر اور دوریاں میں بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ جبکہ دیگر ایوارڈز سے بھی اس کی فنی عظمت کا اظہار کیا گیا۔

☆☆☆

☆ 1976ء میں ایک فلم ''پیاس'' کے لیے روبن گھوش نے 7 نغمے ریکارڈ کروائے تھے۔ لیکن یہ فلم کسی وجہ سے ریلیز نہ ہوسکی۔ اسی طرح 1987ء میں ایک فلم جانے انجانے کے نام سے بنائی گئی۔ جس کی موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی۔ بنگلہ دیش کے ساتھ کو پروڈکشن تھی۔ یہ فلم بنگلہ دیش میں بنگالی زبان 'اپوش' کے نام سے ریلیز کی گئی مگر پاکستان میں اردو ورژن ''جانے انجانے'' کے نام سے ریلیز نہ ہوسکی۔''

☆ محمد جاوید فاضل کی فلم ''آہٹ'' کے پانچ نغمات کی موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 1982ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم ''آہٹ'' کے دو نغمے بعد میں 1995ء میں فلم ''آوارگی'' میں بھی شامل کیے گئے۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پاکستانی فلمی صنعت میں ایک ممتاز اور مستحکم مقام حاصل کرلیا۔

چونکہ روبن گھوش ایک جینوئن موسیقار تھا۔ اس لیے اس نے اپنی مقبولیت میں کبھی کسی نغمہ نگار یا گلوکار کا سہارا نہیں لیا۔ کسی کو یہ کہنے کو موقع نہیں دیا کہ چندا اور تلاش میں اس کے گانے اس لیے مقبول ہوئے کہ وہ سرور صاحب جیسے بڑے شاعر نے لکھے تھے۔ ''پیسے'' شاعر صدیقی کے چار، قاضی ریاض کا ایک، فیاض ہاشمی کے تین اور بی اے دیپ (بشیر احمد) ایک گیت شامل تھا۔ 'کارواں' کے گیت شاعر صدیقی اور بی اے دیپ نے لکھے تھے۔ ''بے گانہ'' کے نغمہ نگار شاعر صدیقی تھے۔ ''بھیا'' کے گیت شاعر صدیقی اور عشرت کلکتوی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔ اسی طرح ''چکوری'' کے آٹھوں گیتوں کا خالق بالکل ایک نیا شاعر اختر یوسف تھا۔ مگر دیکھیے چکوری کے یہ گانے کس قدر مقبول ہوئے ''کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں''۔ ''وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں''۔ ''کبھی تو تم کو یاد آئیں گی، وہ بہاریں وہ سماں''۔ ''کارواں'' کے گیتوں میں سلیم رضا کا گایا ہوا گیت ''تیری تصویر بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں۔'' اور بشیر احمد کا لکھا ہوا اور گایا ہوا گیت ''جب تم اکیلے ہوگے ہم یاد آئیں گے۔'' اور فلم ''بھیا'' کے لیے شاعر صدیقی کی لکھی ہوئی یہ قوالی۔

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا

نے عوامی مقبولیت کی سند حاصل کی۔ یہ سارے نغمے وہ ہیں جو آج بھی کل کی طرح مقبول ہیں اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں دستور یہ ہے کہ فلمساز و ہدایتکار فنکاروں اور دیگر ہنرمندوں کی طرح نغمہ نگاروں کا انتخاب بھی خود کرتے ہیں اور موسیقار سے یہ کہتے ہیں کہ آپ اپنی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں ان سے گیت لکھوائیں۔ روبن گھوش کو جب جہاں اور جو گیت نگار ملا اس نے اسی سے اپنے من پسند گیت لکھوائے۔ جس کی کامیابی میں اس کی کمپوزیشن کا بڑا حصہ ہوتا تھا۔

روبن گھوش نے ڈھاکے کی فلموں ہی سے اپنی شہرت کے ڈنکے بجوا دیے تھے۔ مگر جب اس نے کراچی اور لاہور کی فلموں کی موسیقی ترتیب دینی شروع کی تو اس کی فنی خوبیاں سرچڑھ کر بولنے لگیں۔ یہاں پہلے سے ایک سے بڑھ کر ایک موسیقار تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے آنے والے کا قدم جمانا آسان نہ تھا۔ لیکن روبن گھوش کو اللہ اور اپنی خداداد صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے کام پر توجہ دی اور محنت اور لگن کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ اس لیے یہاں بھی بڑی سے بڑی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

یہاں آنے کی تفصیل سے پہلے ڈھاکے موجودگی میں ہونے والی کچھ باتوں کا ذکر ہوجائے۔ جن میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر بات ان کی شادی ہے۔ سابقہ جھرنا اور موجودہ شبنم کے ساتھ ان کی شادی خانہ آبادی 21 دسمبر 1965ء کو ہوئی۔ شبنم نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو اسے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ جو لڑکیاں ایکسٹرا کے طور پر اپنی فنی زندگی کا آغاز کرتی ہیں انہیں کامیاب اداکارہ بننے کے لیے بہت کٹھن اور دشوار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ڈھاکے کی فلمی صنعت چونکہ ان دنوں ابتدائی مرحلے میں اور بہت محدود تھی۔ اس لیے جھرنا یا اس جیسی دیگر لڑکیوں کو بہت زیادہ دشواریاں نہیں جھیلنا پڑیں۔ اردو فلموں کی شروعات اور ان کی کامیابی سے انڈسٹری میں وسعت آئی تو چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ جھرنا کو بھی چندا میں بڑا کردار ملا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر وہ آگے بڑھتی رہی۔ فلم انڈسٹری میں اس کا سپورٹر اور سہارا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اس نے روبن گھوش سے جو دوسرے فلم والوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور شائستہ تھا دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ روبن کو اندازہ تھا کہ اگر یہ غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تو ایک ابھرتی ہوئی باصلاحیت اداکار کا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔ اس سوچ نے روبن کو شبنم کے قریب کردیا۔ اب وہ فلم اور فلم والوں کے بہت سے معاملات میں اس سے مشورے کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی دوستی محبت میں بدل گئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی بنالیا۔

ان کی شادی کی تقریب ڈھاکا فلم انڈسٹری کی بہت بڑی اور بے حد شاندار تقریب تھی۔ اس سے پہلے کسی فلمی فنکار یا شخصیت کی شادی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہوئی تھی۔ روبن گھوش نے اس تقریب میں پوری فلم انڈسٹری ہی کو مدعو نہیں کیا تھا بلکہ عمائدین شہر اور سرکاری اور تجارتی شخصیتوں کو بھی دعوت دی تھی۔ صحافیوں کو بھی ان خصوصی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

سے بالاتر ہوکر کہ اس کا تعلق شوبز سے ہے یا نہیں سب کو بلایا تھا۔ شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے باوجود بڑے نظم وضبط کے ساتھ یہ پُروقار اور شاندار تقریب اختتام پذیر ہوئی تھی۔

شادی کی دوسری بڑی تقریب جوڑھا کے میں ہوئی تھی وہ ندیم اور فرزانہ کی شادی کی تقریب تھی۔ مگر شنید ہے کہ یہ بن بلائے مہمانوں کی وجہ سے بدنظمی کا شکار ہوگئی۔ احتشام اور مستفیض نے بھی بڑا اہتمام کیا تھا اور شبنم اور روبن کی شادی کی تقریب سے بڑی تقریب کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ندیم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے چاہنے والوں نے وہ ہڑبونگ مچائی کہ تقریب کا سارا حسن ملیامیٹ ہوگیا۔ معزز مہمانوں کو بیٹھنے اور کھانے پینے کی سہولت بھی حاصل نہ ہوسکی اور اچھی خاصی تقریب کا ستیاناس ہوگیا۔

بات جب شبنم اور روبن گھوش کے ملن کی ہورہی ہے تو اس تناظر میں یہ بتانا ضروری ہوجاتا ہے کہ شبنم کو اس کی پہلی اردو فلم چندا ہی میں نگار ایوارڈ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوگیا تھا۔ چندا میں شبنم نے معاون اداکارہ کے طور پر کام کیا تھا۔ اس لیے اسے بہترین معاون اداکارہ کا ایوارڈ ملا۔ جبکہ روبن کو اس کی دوسری فلم تلاش میں بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ ملا۔

ان ابتدائی دو اردو فلموں سے مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے فلمی حلقوں میں یہ دونوں ابھرتے ہوئے فنکار نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ عوامی حلقوں میں بھی ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور وہ جو کہتے ہیں کہ بہترین صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو پھر روکا نہیں جاسکتا۔ تو ان دونوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شبنم نے اداکاری اور روبن گھوش نے موسیقی کے میدان میں ایسی کامیابیاں حاصل کیں کہ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

ہمارے ہاں فلم والوں کی آپس کی شادیاں تو بہت ہوتی ہیں مگر ان میں زیادہ دنوں تک تعلقات استوار نہیں رہتے۔ لیکن شبنم اور روبن کی جوڑی مثالی ثابت ہوئی۔ برے سے برے وقت میں بھی دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی رہے۔ لاہور میں ان کے گھر ڈکیتی اور زیادتی کے بعد بھی دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ برقرار رہا۔ اس موقع پر روبن گھوش نے شبنم کا جس طرح ساتھ دیا،

☆ پرویز ملک کی فلم ”جہاں تم وہاں ہم“ کی کامیاب موسیقی ترتیب کرنے کے باوجود کراچی یا لاہور کے کسی فلمساز نے روبن گھوش کو چار سال تک بطور موسیقار سائن نہیں کیا۔ چار سال کے بعد الیاس رشیدی نے اپنی فلم ”احساس“ کی موسیقی سے روبن گھوش سے کمپوز کروائی اس کے بعد روبن گھوش بطور موسیقار چل پڑے۔

☆☆☆

☆ روبن گھوش کے بطور موسیقار پاکستان میں آخری ایام بہت تلخ گزرے۔ 29 جنوری 1993ء کو ریلیز ہونے والی فلم ”رنجش“ اور 1993ء کو ریلیز ہونے والی فلم ”خواہش“ میں اس سے ان فلموں کا صرف بیک گراؤنڈ میوزک مرتب کروایا گیا۔ ہدایتکار اکبر رومی کی فلم رنجش کے موسیقار علاؤ الدین علی تھے جبکہ خواہش کے فلمساز معین الرحمان اور ہدایتکار نذر الاسلام تھے۔ موسیقی جاوید اللہ دتہ نے مرتب کی تھی۔

☆☆☆

☆ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ”جوڈر گیا وہ مرگیا“ روبن گھوش کی آخری فلم تھی۔ سنگیتا کی نکاح جو جون 1998ء میں ریلیز ہوئی تھی اس میں بھی روبن کا تیار کیا ہوا گیت موجود تھا اس لیے کچھ لوگ نکاح کو اس کی آخری فلم قرار دیتے ہیں۔ یہ قصہ کچھ یوں ہے کہ فلمساز و ہدایتکار شہزاد رفیق نے بہت پہلے اپنی فلم ”پرواز“ کے لیے روبن گھوش سے دو گانے کمپوز کروائے تھے۔ مگر یہ فلم بوجوہ بنائی نہ جاسکی۔ لہٰذا جب شہزاد رفیق نے سنگیتا سے اپنی فلم نکاح بنوائی تو اس میں سے ایک گیت شامل کردیا۔ ”یہ دل ہے سوہنے دلدار کا، پیاسا ہے پیار کا“ آواز اخلاق احمد کی تھی۔ اس فلم نے باکس آفس پر زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ ”پرواز“ کا دوسرا گیت 1996ء میں ریلیز ہونے والی فلم گھونگھٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ گیت فریحہ پرویز اور اخلاق احمد کی آواز میں تھا۔ جس کے بول تھے ”کیسے جیے تیرے بن، کیسے کٹے رات دن“ سید نور اس کے ہدایتکار تھے اور اس فلم نے گولڈن جوبلی کی تھی۔ اس کے فلمساز بھی شہزاد رفیق تھے۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اس کے زخموں پر اپنی محبت اور ہمدردی کا مرہم رکھا، اس کی دلجوئی کی اس سے روبن گھوش کی وسعت قلبی اور اخلاقی بلندی کا ثبوت ملتا ہے۔ دونوں کی اس کامیاب جوڑی کو موت ہی توڑ سکی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دونوں کی دوستی، محبت اور شادی میں ان کے مذہبی عقائد کبھی دیوار نہیں بنے۔ جھرنا بیساک (شبنم) ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی جبکہ روبن گھوش عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ دونوں نے شادی کے لیے دوسرے پر یہ دباؤ نہیں ڈالا کہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا مذہب اختیار کرلو۔ دونوں اپنے اپنے مذہب پر ہمیشہ برقرار رہے۔ کہتے ہیں کہ روبن کا خاندان بھی کبھی ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر روبن گھوش کے والد ایس ایم گھوش نے عیسائی مذہب اپنا لیا تھا۔ ان کے بعد ان کے بچوں نے بھی عیسائیت ہی کو مذہب کے طور پر اپنائے رکھا۔

ڈھاکے میں قیام کے دوران ان کی زندگی میں دوسرا خوشگوار وقوعہ اس وقت ہوا جب ان کی انگنائی میں ان دونوں کی محبت کا پھول کھلا۔ یہ رونی گھوش تھا ان کی نرینہ اولاد۔ 1966ء ان دونوں کے لیے اس لیے بہت اہم سال تھا کہ اس میں ان دونوں کی زندگی کا سرمایہ رونی کی شکل میں انہیں ملا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد جہاں روبن گھوش کی موسیقی میں اور نکھار آیا وہاں شبنم کی بے پناہ مسرت نے اس کے خدوخال میں انقلابی اضافہ کیا۔ ''درشن'' کی شوٹنگ کے دوران میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ شبنم نہیں تھی جو پہلے نظر آتی تھی۔ پہلے وہ دبلی پتلی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سوکھی ہوئی اور نسوانی کشش سے عاری نظر آتی تھی۔ مگر اب رحمان کے ساتھ اداکاری کرنے والی شبنم بھرے بھرے جسم کی مالک تھی۔ جسم کا ہر عضو سڈول اور تنا ہوا۔ نظریں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ میں نے وہاں موجود ایک صحافی دوست سے پوچھا۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

دوست نے کہا ''جس طرح غم انسان کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے اسی طرح خوشی زندگی کی کھیتی کو لہلہا دیتی ہے اور جب خوشی اندر کی ہو اور روحانی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں بننا عورت کی خوشی کی معراج ہے۔ اس خوشی اور اس کی تمانیت ہی نے اس کے بدن کی سوکھی شاخ کو ہرا بھرا کردیا ہے۔''

''ملن'' کے بعد رحمان کی کئی فلمیں باکس آفس پر کامیاب نہیں ہوسکی تھیں مگر ''درشن'' نے توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی میں جہاں دوسرے عوامل شامل تھے وہاں اس فلم کی ہیروئن شبنم کا پُرکشش اور پُرشباب سراپا بھی تھا۔ اس ذکر کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر فلم والے یہ سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد اداکاروں اور اداکاراؤں کی عوامی مقبولیت ختم ہوجاتی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر آرٹسٹ فنی خوبیوں سے مالا مال ہو تو اس کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہر اچھی فلم اسے پہلے سے زیادہ شہرت اور مقبولیت عطا کرتی ہے۔

قاضی ظہیر کی فلم ''بھیا'' میں وحید مراد کو ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ چترا اس فلم کی ہیروئن تھی جبکہ روبن گھوش اس کے موسیقار تھے۔ اس فلم کے دوران وحید مراد شبنم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنی فلم میں کام کرنے کے دعوت دے دی۔ اگرچہ وہ ''بھیا'' کی کاسٹ میں شامل نہیں۔ یہ پیش کش انہوں نے روبن گھوش کے توسط سے کی تھی۔

''ٹھیک ہے، ہم سوچ کر جواب دیں گے۔'' دونوں میاں بیوی نے اس مسئلے پر غور کیا۔ کچھ مخلص احباب سے مشورہ کیا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ وحید مراد کی آفر قبول کرلی جائے۔ پہلے دونوں کو اس بات پر تشویش تھی کہ نئی جگہ نئے ماحول میں ہم نئے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ بھی کرسکیں گے؟ بہرحال دونوں میاں بیوی 1967ء کے وسط میں کراچی پہنچ گئے اور ''سمندر'' سائن کرلی پھر وحید مراد نے اس کی شوٹنگ کا آغاز کردیا۔ معروف ہدایت کار پرویز ملک نے وحید مراد کی وساطت سے روبن گھوش سے رابطہ کرکے ذاتی فلم ''جہاں تم وہاں ہم'' کے لیے بطور موسیقار معاہدہ کرلیا۔ اس طرح مغربی پاکستان میں روبن گھوش کی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ فلم جس کے ہیرو وحید مراد تھے 1968ء میں ریلیز ہوئی اور روبن گھوش کی دلکش دھنوں کی وجہ سے خاصی پسند کی گئی۔ مسرور انور نے تمام گیت لکھے تھے۔ جن میں یہ بہت مقبول ہوئے۔

☆ مجھے تلاش تھی جس کی وہ ہمسفر تم ہو۔ مرے حسین خیالوں کی رہگذر تم ہو (مالا احمد رشدی)

☆ اسے دیکھا، اسے چاہا اسے بھول گئے (احمد رشدی)

احمد رشدی روبن گھوش کے پسندیدہ گلوکار تھے۔ روبن چونکہ آوازوں کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کا ملکہ ر

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

رکھتے تھے۔ اس لیے احمد رشدی کی سدابہار آواز کے رسیا تھے۔ انہوں نے احمد رشدی کو پہلی بار جس فلم میں ریکارڈ کیا وہ ''پیسے'' تھی اور بطور موسیقار یہ ان کی تیسری فلم تھی۔
بی اے دیپ کے لکھے ہوئے پہلے گیت

اف اللہ یہ ترچھی چتون
اف اللہ یہ بن ٹھن
اف اللہ یہ حسن زن

احمد رشدی نے کچھ اس طرح گایا کہ گانے کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ ''پیسے'' مستفیض کی فلم تھی جو 1969 میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس کے بعد روبن کی تقریباً ہر اس فلم میں کوئی نہ کوئی رشدی کا گیت ضرور ہوتا تھا جس کی ضرورت ہوتی تھی۔

☆ محفل میں دو نظریں ٹکرا گئیں پھر کیا ہوا (بیگانہ۔ احمد رشدی)

☆ بہنا میری پیاری ہے۔ بچی ہے دلاری ہے
(بھیا۔ احمد رشدی)

☆ کبھی تو تم کو یاد آئیں گی وہ بہاریں وہ سماں
(چکوری۔ احمد رشدی)

☆ پیارے پیارے یار ہمارے ہاتھ دکھاتے جانا
(چکوری۔ احمد رشدی)

☆ ندیا بہتی جائے، بہتی جائے۔ آئے رے کوئی آئے (تم میرے ہو، احمد رشدی۔ آئرن پروین)

☆ تھوڑی سے پیاز ڈالو۔ تھوڑا تھوڑا گھی (بھول۔ احمد رشدی، نیرہ نور)

یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ روبن گھوش محض اپنی پسندیدہ آوازوں سے ہی کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ فلم کی ضرورت اور ڈیمانڈ کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ اس لیے نئی آوازوں کو بھی ان کی مناسب جگہ گانے کا موقع دیتے تھے۔ نذیر بیگ (ندیم) بشیر احمد، اخلاق احمد محمد علی صدیقی، عالمگیر محمد علی شہکی زندہ مثالیں ہیں۔

روبن گھوش نے موسیقار کی حیثیت سے اپنی 37 سالہ پیشہ وارانہ زندگی میں تقریباً 35 فلموں میں 150 گیتوں کی موسیقی ترتیب دی۔ جن میں سے چند ایک گیت ایسے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان کی فلمی موسیقی کی تاریخ میں روبن گھوش ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور کئی زمانوں تک ان کے بیچے گیتوں کی گونج سنی اور محسوس کی جائے گی۔
روبن گھوش کی مقبول ترین فلموں میں چندا، تلاش، بھیا، چکوری، جہاں تم وہاں ہم، احساس، چاہت، بھول، شرافت، آئینہ، امبر، بندش، نہیں ابھی نہیں، کرن اور کلی، دوریاں شامل ہیں۔ اس طرح روبن گھوش نے جن ہدایتکاروں کی فلموں کی موسیقی ترتیب دی ان میں احتشام، مستفیض، ایس ایم پرویز، پرویز ملک، نذرالاسلام، رحمان، ایس سلمان، شباب کیرانوی اور سرور بارہ بنکوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جبکہ وہ شعراء... جن کی شاعری کو لے کر روبن گھوش نے دھنیں کمپوز کیں اور گیت مقبول بھی ہوئے۔ ان میں سرور بارہ بنکوی، شاعر صدیقی، اختر یوسف، مسرور انور، خواجہ پرویز، فیاض ہاشمی، کلیم عثمانی، تسلیم فاضلی، ریاض الرحمان ساغر، سعید گیلانی اور بی اے دیپ شامل ہیں۔

روبن گھوش نے اپنے دور کی تقریباً تمام ان آوازوں کو اپنی دھنوں میں سمویا جن کو عوام پسند کرتے تھے۔ سوائے ملکہ ترنم نور جہاں اور ناہید اختر کے۔ ایسے گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں احمد رشدی، مہدی حسن، رونا لیلیٰ، مہناز، فردوسی بیگم، نجم نیازی، ناہید نیازی، نیرہ نور، بشیر احمد، اخلاق احمد، نذیر بیگ (ندیم)، اے نیئر، غلام عباس، عالمگیر، مسعود رانا، روبینہ بدر، آئرن پروین، شبنم مجید، عبدالجبار، محمد علی شہکی، فریحہ پرویز، مالا، سلیم رضا، مجیب عالم، انجمن آرا، محمد علی صدیقی شامل ہیں۔

☆ رونی گھوش جس کی پیدائش 1966ء میں ڈھاکے میں ہوئی تھی۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر چند مہینے کم پچاس کے قریب ہوگی۔ پاکستانی میڈیا میں اس کی جو تصویر ماں باپ کے ساتھ موجود ہے وہ اس کی کمسنی کی ہے۔ اس کے بعد کی کوئی تصویر یا کسی خبر کی ہمیں جانکاری نہیں، وہ برطانیہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کب ڈھاکے گیا۔ جانے کے بعد اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کس حیثیت سے کیا۔ اس کی شادی کب ہوئی، کب بال بچے دار ہوا۔ شوبز سے اس کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ ایسے کسی سوال کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ چونکہ ماں باپ دونوں ہی گوشہ گیر ہوگئے تھے شاید اس لیے بھی ڈھاکا میڈیا نے اس کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

www.urdusoftbooks.com

یوں تو روبن گھوش کی کامیاب فلموں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سلور جوبلی سے لے کر ڈائمنڈ جوبلی فلمیں بھی شامل ہیں۔ مگر ''آئینہ'' اس کی ایسی فلم ہے جس کی جادو بھری دھنوں نے اس کو شہرت کے آسمان تک پہنچا دیا۔ آئینہ کی مقبولیت نے عوامی پذیرائی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم کو روبن گھوش کے فنی کیریئر کی معراج کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ جس نے کراؤن جوبلی (401 ہفتے) کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کامیابی میں جہاں فلم کے تمام شعبے اپنی مثال آپ تھے۔ وہاں شعبۂ موسیقی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ روبن گھوش نے آئینہ کی کہانی اور کرداروں پر صد فیصد فٹ ہونے والے گیتوں کی ایسی دھنیں کمپوز کیں کہ فلم کی کامیابی کو چار چاند لگا دیئے۔ روبن گھوش نے یہ بات ثابت کردی کہ فلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

''آئینہ'' کے یہ گانے جنھوں نے اس کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا کل کی طرح آج بھی تروتازہ ہیں، سماعتوں میں شہد ٹپکاتے ہیں۔

☆ مجھے دل سے نہ بھلانا۔ چاہے روکے یہ زمانہ (مہناز۔عالمگیر)

☆ روٹھے ہو تم، تم کو کیسے مناؤں پیا۔ بولو نا (نیرہ نور)

☆ وعدہ کرو ساجنا (مہناز۔عالمگیر)

یہ بات بتانے والی ہے کہ کراچی میں روبن گھوش کی پہلی فلم پرویز ملک کی ''جہاں تم وہاں ہم'' جو 1968ء میں پیش کی گئی کامیابی کے باوجود دوسرے فلمسازوں اور ہدایتکاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ جبکہ اس کی شریکِ حیات شبنم کو سمندر کے بعد دوسری فلموں میں بھی تواتر سے کاسٹ کیا جاتا رہا۔ اس دوران روبن گھوش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی قسمت کے دروازے 1972ء میں اس وقت کھلے جب فلم 'احساس' کے لیے انہیں بطور موسیقار لیا گیا۔ یہ نگار اور نگار ایوارڈ کے بانی الیاس رشیدی کی فلم تھی۔ جن سے شبنم اور روبن گھوش کی پرانی دوستی تھی۔ شبنم اس فلم کی ہیروئن تھی اور نذر الاسلام ہدایت کار۔ اس فلم کے لیے روبن گھوش کی کمپوز کی گئی دلوں کو چھو لینے والی دھنوں نے اس کی قسمت کو گویا سوتے سے جگا دیا۔ پھر اس کے بعد یوں ہوا کہ مسلسل 13 سال تک نہ صرف اسے اچھی اور بڑی فلمیں ملتی رہیں بلکہ ان کی کامیابی اس کے قدم چومتی رہی۔ اس کی فنی عظمت کا پرچم لہراتی رہیں۔ ''چاہت، شرافت، دو ساتھی، جیو اور جینے دو، امبر، دوریاں، بندش اور آئینہ'' کی موسیقی نے روبن گھوش کو پاکستان کے صف اوّل کے موسیقاروں میں شامل کر دیا۔

اچھا کام ہی کامیابی کا سبب بنتا ہے۔ روبن گھوش میوزک کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ فلم کی کہانی اور سچویشن کو بھی اچھی طرح جانچتے اور پرکھتے تھے اور اس کے بعد کرداروں کے جذبات اور احساسات کو سامنے رکھنے کے بعد ہی موسیقی کی دھنیں ترتیب دیتے تھے۔ اتنی سوچ بچار ....کے بعد دھنوں کا تعین کرنا اور دھنیں بھی ایسی بنایا جو سماعت کے راستے دلوں میں اتر جائے۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے ان کے گیت لازوال ثابت ہوئے۔ پاکستانی فلموں کی کامیابی میں اس کے گیتوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے پاکستانی فلمی موسیقی میں اس کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روبن گھوش جس طرح سے اپنے گیتوں کو تیار کرتے اور اس کے لیے آوازوں کا انتخاب کرتے وہ کسی دوسرے میوزک کمپوزر کے بس کی بات نہیں تھی۔ دراصل یہ اس کی اس تربیت کا اثر تھا جو انہوں نے اپنے استادوں سے حاصل کی تھی۔

فلم کی کامیابی کے لیے کسی ایک آدمی سے توقعات وابستہ نہیں کی جائیں۔ کیونکہ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ فلم کے لیے ضروری ہے کہ اگر موسیقی اچھی ہے تو آوازیں اور شاعری بھی ویسی ہی اچھی ہو۔ اداکار اور ہدایت کار بھی اچھا ہو۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ فلم کو کامیاب بنانے میں موسیقی کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اگر شاعری، موسیقی، اداکاری، عکاسی سمیت تمام اچھے شعبوں کو روبن گھوش جیسا موسیقار میسر آجائے تو پھر بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ روبن گھوش کی ترتیب دی ہوئی موسیقی سے اداکاروں اور اداکاراؤں کو بہت زیادہ مدد ملتی تھی۔ اس کی دھنوں سے ہر کردار میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ جس پر اس کے گیت فلم بند کیے جاتے کیونکہ اس کی دھنوں میں بے پناہ میلوڈی تھی۔

نئی نسل کے وہ ابھرتے فنکار جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ

Urdu Soft Books

ایک دم شہرت کے آسمان کے چاند ستارے بن جائیں، انہیں روبن گھوش کی محنت، لگن اور جدوجہد سے سبق سیکھنا چاہیے۔ روبن کو جو مقام حاصل ہوا۔ وہ چند دنوں کی کہانی نہیں۔ اس کے پیچھے برسوں کی سچی لگن اور ایماندارانہ جدوجہد شامل ہے۔

''جب اکیلے ہوگے۔ ہم یاد آئیں گے'' ہدایت کار ایس ایم پرویز کی فلم ''کارواں'' کا یہ گیت جب روبن گھوش نے ترتیب دیا۔ اس کی دھنیں کمپوز کی تھیں تب شاید انہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ آنے والے دنوں میں ایسے سریلے نغمے مرتب کرلیں گے جو یادگار ہوں گے۔ انہوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دی۔ ہر فلم جس میں انہیں میوزک دینے کا موقع ملا۔ اس پر پہلے سے زیادہ محنت کی۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ ان کا کام جتنا اچھا ہوگا اس سے کیریئر کو اتنا ہی فائدہ پہنچے گا۔ انہوں نے کبھی اپنے کام سے بددیانتی نہیں کی۔ اپنے کام کو مزید بہتر بنانے کے لیے انہوں نے موسیقی کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ڈھاکے میں موجودہ اساتذہ سے اکتساب فن کو ہی انہوں نے کافی نہیں سمجھا۔ اس کے لیے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ واپس ڈھاکے آکر مصلح الدین سے بھی رابطہ کیا ان کے ساتھ کام کرکے موسیقی کی کچھ نئی باتیں سیکھیں۔

1962ء میں چندا، 1963 میں ''تلاش'' 1964ء میں ''بندھن'' اور ''پیسے'' 1966ء میں ''بے گانہ'' اور ''بھیا'' اور 1967ء میں ''چکوری'' ایسی فلمیں ہیں جن کی موسیقی سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن بتدریج آگے اور آگے کی جانب ہی گامزن رہا۔ مشرقی پاکستان کی ان فلموں کی موسیقی مغربی پاکستان تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ موسیقی کی روح کو جاننے اور سمجھنے والوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ تیزی سے ابھر کر سامنے آنے والا جواں سال موسیقار آنے والے دنوں میں نئے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔

1999ء کے وسطی مہینے کی بات ہے روبن گھوش نے اپنی اداکارہ شریک حیات شبنم کو ساتھ لے کر بڑی خاموشی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین کو خیرباد کہہ دیا۔ کسی کو کچھ بتایا نہ ہی اس ضمن میں کچھ اطلاع دی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اپنے یا بیوی کے ذمے کا کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑا۔ اس حال میں گئے کہ کسی سے کسی قسم کے لین دین کا کوئی حساب کتاب بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کا بیٹا رونی گھوش برطانیہ میں زیرتعلیم تھا۔ جس سے ملنے یہ دونوں میاں بیوی جاتے آتے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید دونوں بیٹے سے ملنے گئے ہیں۔ بعد میں یہ راز افشا ہوا کہ وہ ڈھاکے پہنچ گئے ہیں۔ یہاں پاکستان میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دونوں یہاں سے کیوں گئے؟ لوگوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق خیال آرائی کی۔ کسی نے کہا ان کے گھر ہونے والی ڈکیتی کے بعد سے اپنے آپ کو یہاں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اسی لیے اپنی جان اور عزت کی حفاظت کے لیے واپس چلے گئے۔ کسی نے خیال آرائی کی۔ ان کی شہرت، مقبولیت اور دولت نے شاید کچھ لوگوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ شاید دونوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب ان کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ جس کی سمجھ میں جو آیا اس کا اظہار کیا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اصل وجہ جو تھی یا تو اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا یا جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں کو اپنے زوال کا احساس ہوگیا تھا۔

1988ء سے 1995ء کا دور روبن گھوش کے لیے انتہائی مایوس کن رہا۔ اس دوران اس کی صرف تین فلمیں سینما اسکرین کی زینت بنیں۔ وہ بھی کامیابی کے لحاظ سے قابلِ ذکر نہیں تھیں وجہ یہ تھی کہ اب آئینہ، بندش، دوساتھی یا چاہت جیسی فلمیں نہیں بن رہی تھیں۔ کچھ نان ٹیکنیکل اور نان پروفیشنل قسم کے لوگوں نے فلمیں بنانا شروع کردی تھیں۔ جن سے فلموں کا معیار تیزی سے گرنا شروع ہوگیا تھا۔ اس طرح روبن گھوش جیسے لوگ گھر بیٹھ گئے۔

دوسری طرف شبنم کی ڈیمانڈ میں بھی کمی آتی جارہی تھی۔ ڈھلتی عمر کی وجہ سے اس کی دلکشی اور جاذبیت رخصت ہوگئی تھی۔ چہرے پر دانے نمودار ہوگئے تھے جو دبیز میک اپ کے بعد بھی چھپائے نہیں جاسکتے تھے۔ اب اس میں ہیروئن جیسی بات نہیں رہی تھی۔ جو لوگ اسے ماضی کی شہرت اور ورسٹائل اداکارہ کی وجہ سے اسے کاسٹ کررہے تھے تماشائی ایسی فلموں کو مسترد کردیتے تھے۔

روبن گھوش کی کمائی تو ہر دور میں شبنم سے کم رہی تھی۔ اب جب دونوں میاں بیوی کی مارکیٹ ویلیو برقرار نہیں رہی تو ان دونوں نے حقیقت پسندانہ فیصلہ کیا کہ ایسے حالات میں یہاں رہ کر مزید اپنی مٹی پلید کرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے کوچ کرلیا جائے۔ خاموشی سے اور رازداری سے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

راہ فرار اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو بتانے اور مطلع کرنے سے کہیں کچھ لوگ جانے نہ دیں۔ ضد کر کے روک لیں۔ جبکہ یہ دونوں اب کسی حالت میں یہاں رک کر اپنی مزید خرابی نہیں کروانا چاہتے تھے۔

ڈھاکے پہنچے تو روبن گھوش کے چھوٹے بھائی اشوک گھوش نے اپنی بنگالی فلم میں اپنی بھابی شبنم کو بطور ہیروئن پیش کیا۔ روبن جس دوران پاکستان میں تھے اشوک نے ڈھاکے میں ہدایتکاری شروع کر دی تھی۔ جب بھائی، بھاوج واپس آئے تو اس کی حیثیت مستند ہدایتکار تھی۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ اس کی بھاوج نے پاکستانی فلموں میں جو عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے اس کا کچھ فائدہ اٹھائے۔ مگر اس کی فلم ریلیز ہوئی تو اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنگلہ دیشی تماشائیوں نے بھی شبنم کو اس کی زائد عمری کی وجہ سے بطور ہیروئن قبول نہ کیا تھا۔ روبن گھوش کی موسیقی بھی ایک دو بنگالی فلموں سے آگے نہ جا سکی۔ حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ڈھاکے کی فلمی دنیا سے کٹ کر رہ گئے۔

کچھ لوگ اپنے بارے میں کچھ غلط فیصلے کرتے ہیں جن کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسے شبنم کا اپنی ڈھلتی عمر کے باوجود ہیروئن کا کردار ادا کرتے رہنے کا فیصلہ، شبنم بلا شبہ بڑی ٹیلنٹڈ اور زبردست فنی صلاحیتوں کی اداکارہ تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب وہ اولڈ ایج کیریکٹر کرنا شروع کر دیتی۔ جس طرح صبیحہ خانم، نیر سلطانہ یا اب نغمہ اور بہار بیگم کر رہی ہیں۔ صبیحہ خانم سے بڑی اور سپر ہیروئن ان کے دور میں کوئی اور نہیں تھی۔ مگر جب ان کی عمر ہیروئن کے کردار کے لیے مناسب نہیں رہی تو انہوں نے کیریکٹر رول ادا کرنا شروع کر دیے۔ جس کے بعد ان کے کریڈٹ پر ایسی فلمیں آئیں جو تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ ہیروئن کے طور پر اداکاری کر کے انہوں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ شہرت اور مقبولیت انہیں اولڈ کیریکٹر کر کے حاصل ہوئی۔ ان کی فنی صلاحیت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس طرح وہ بہت دنوں تک اور بہت دیر تک بطور اداکارہ کام کرتی رہیں۔ آج کل اس راستے پر ہمارے ہاں ندیم صاحب بھی عمل پیرا ہیں۔ اب وہ ہیرو کا کردار نہیں کرتے کہ ان کی عمر اس کے لیے موزوں نہیں رہی۔ کیریکٹر اداکاری کر کے اپنی صلاحیتوں سے فلم والوں اور خود کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

ہر ہوش مند اور حقیقت پسند فنکار یہی کرتا ہے۔

ایتابھ بچن کو ہی دیکھ لیجیے جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی عمر ہیرو بننے کے قابل نہیں رہی تو انہوں نے کیریکٹر رول کرنا شروع کر دیے اور اب بھی... وہ فیلڈ میں موجود ہیں اور ان کی گاڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔

شبنم اگر کریکٹر رول کرنا شروع کر دیتی تو ورسٹائل اداکارہ ہونے کی حیثیت سے ماں، بڑی بہن، یا نانی، دادی کے کرداروں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتی اور عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیتی۔ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا نہ پڑتا۔ اس طرح اس نے فلم انڈسٹری کو تو نقصان پہنچایا مگر اس کے ساتھ خود پر بھی ظلم کیا۔ وہ اداکارانہ صلاحیتیں جو اس کے اندر موجود تھیں۔ انہیں بھی باہر آنے کا موقع نہیں دیا۔

تماشائی مرد فنکاروں کو تو اوور ایج ہونے کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے برداشت کر لیتے ہیں۔ جیسے ماضی میں ہمارے ہاں لالہ سدھیر، سنتوش کمار، اور سلطان راہی وغیرہ اور حال میں اداکار شان اور بولی ووڈ میں شاہ رخ خان، سلمان خان، عامر خان، اکشے کمار، اجے دیوگن اور سنی دیول وغیرہ جو اپنی عمر کی نصف سنچری مکمل کر چکے ہیں مگر ان کے ہیرو بنے رہنے کا شوق اب تک پورا نہیں ہوا ہے۔

شبنم اور روبن گھوش پاکستان چھوڑ کر بنگلہ دیش چلے گئے مگر شبنم کی اداکاری اور روبن گھوش کی موسیقی سے پیار کرنے والے پاکستانی انہیں بھولے نہیں۔ ان کے دلوں میں دونوں کی محبت کے چراغ جلتے رہے۔ جہاں شبنم کی فلمیں پاکستانی فلمی صنعت کے سنہری دور کی ترجمان کی حیثیت سے یاد رہیں۔ وہیں روبن کی سدا بہار موسیقی سے سجے گیت اور گانے کو اس دور کی فلمی موسیقی کی کامیابی کا سبب گردانتے رہے۔ اور یہ پاکستانیوں کی اسی اٹوٹ محبت کا نتیجہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو 2012ء کو سرکاری طور پر پاکستان آنے کی دعوت دی گئی۔ دونوں مئی کے مہینے میں پی ٹی وی کی خصوصی دعوت پر کراچی پہنچے تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ ان دنوں اداکار لہری شدید علیل تھے۔ شبنم نے روبن گھوش کے ساتھ جا کر لہری کی عیادت کی۔ لہری، شبنم کے ساتھ بہت سی فلموں میں بطور کامیڈین کام کر چکے تھے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ان کے پرانے دوست اور ساتھی خود آ کر ان سے ملاقات کرتے رہے یا یہ خود جا کر ان سے ملتے رہے۔ دونوں معزز مہمانوں کو فائیو اسٹار ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر وہ دن/

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

بھی آیا جب ان کے اعزاز میں 10 مئی 2012ء کی شام کو ادارہ نگار اور آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے اشتراک سے ایک فقید المثال اور یادگار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو اپنے بچھڑے ہوئے پسندیدہ فنکاروں کو دیکھنے آیا تھا۔ اس تقریب میں جب سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے دونوں کو یادگار ایوارڈ دیا تو تالیوں کی گونج شبنم اور روبن گھوش کے سنہری دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ جب یہ جوڑی اپنی اپنی پرفارمنس سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیا کرتی تھی۔ اس موقع پر اس فنکار جوڑی نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنی احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لیے یہ بات انتہائی حیرانگی کی ہے کہ اتنے دنوں بعد بھی پاکستان میں ہمیں اس قدر محبت ملی ہے۔ ہم سے اس قدر پیار کا اظہار کیا جارہا ہے۔ لوگ تو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی کچھ دنوں بعد بھول جاتے ہیں۔ ہم یہاں سے جانے کے 13 سال بعد واپس آئے ہیں اس کے بعد ہم سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا جارہا ہے یہ ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔''

یہ قدرت کا نظام ہے آدمی جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔ شبنم اور روبن گھوش کو جو محبت جو پذیرائی ملی اس کے وہ مستحق تھے۔ پاکستان میں اپنے دوران قیام نہ صرف انہوں نے اپنا کام بے حد محنت اور دیانتداری کے ساتھ کیا بلکہ اس دوران اپنے اعلیٰ اخلاق سے بھی سب کو گرویدہ بنائے رکھا۔ کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا تو دور کی بات ہے۔ کسی کو اپنی کسی بات سے ناراض بھی نہیں کیا۔ بے شک یہاں سے خاموشی سے رخصت ہوئے مگر کسی کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا کہ میرا کام ادھورا چھوڑ کر چلے گئے یا ہمارا فلاں حساب چکتا کر کے نہیں گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان کو یاد رکھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی فنی خوبیوں سے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کو ناقابل فراموش فائدہ پہنچایا۔

روبن گھوش پاکستان کے صف اوّل کا موسیقار بن گئے۔ پھر بھی ان کی طبیعت کی عجز و انکساری پہلی جیسی ہی رہی۔ ہر ایک سے ہنس کر، مسکرا کر، محبت اور شفقت سے ملنا۔ خوش پوشی اور خوش لباسی میں بھی ایک منفرد حیثیت کے حامل انسان تھے۔ کس موقع پر یا کس نشست میں کس وقت کیا بات کرنی چاہیے۔ اس کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔ دوسروں کا خیال رکھنے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے شعبہ سے متعلق لوگوں، گلوکاروں اور سازندوں سے ہمیشہ نرم لہجے میں بات کرتے۔ انہوں نے بہت سے نئے گانے والوں اور والیوں کو متعارف کرایا۔ مگر سب کے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کیا۔ اس شفقت اور محبت سے پیش آئے کہ سب نے ہمیشہ ان کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف کی۔ بشیر احمد کو انہوں نے بطور گلوکار متعارف کرایا جو جلد ہی موسیقار کی حیثیت سے ان کے مدمقابل کھڑا ہوگیا مگر بشیر احمد کے ساتھ ہمیشہ ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ بشیر احمد نے بھی انہیں ہمیشہ اپنا محسن اور استاد سمجھا۔ اچھے فنکار تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر اچھے فنکار کے ساتھ اچھا انسان ہونا بہت بڑی بات ہے۔ روبن گھوش ایک بہت بڑے موسیقار ہی نہیں۔ اعلیٰ اخلاق و اطوار کا حامل ایک اچھا بلکہ بہت اچھے انسان بھی تھے۔

دل اور دماغ انسان کی زندگی میں بڑے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دل انسان کو اچھا اور چاہنے والا بناتا ہے اور دماغ اسے نمایاں کامیابی عطا کرتا ہے۔ شہرت، مقبولیت کے آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر یہی دماغ جب مضمحل ہوجاتا ہے۔ کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ مگر اس حالت میں بھی اس سے پہلے کی طرح کام کرنے پر جب مجبور کیا جاتا تو اس کی رگیں پھٹ جاتی ہیں۔ شاید روبن نے بھی اپنے بوڑھے اور تھکے ہوئے دماغ کو فعال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نتیجے میں کئی سال پہلے ان کا برین ہیمرج ہوگیا تھا۔ جس کے بعد وہ مسلسل ڈاکٹروں کے زیر علاج رہا ہے۔ مگر نرم خو اور صلح جو طبیعت کا حامل ہونے کی وجہ سے فرشتہ اجل سے کوئی مفاہمت نہ کرسکا۔ 13 فروری 2016 کو بڑی شرافت سے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کردی۔ بغداد میں جنم لینے والے، مشرقی پاکستان میں پروان چڑھنے والے، مغربی پاکستان میں فن موسیقی کی بلندیوں کو چھونے والے عظیم اور لافانی موسیقار کو بنگلہ دیش کی مٹی میں دفن کردیا گیا۔ بنگلہ دیش کے علاوہ پاکستان میں بھی صف ماتم بچھ گئی۔

خاکی جسم مٹی میں ضرور مل جاتا ہے مگر جانے والے نے جو اچھا اور بڑا کام کیا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ روبن گھوش بھی اپنی مدھر دھنوں اور رسیلے گیتوں کے سہارے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ فانی انسان تھا مگر اس کا فن لافانی ہے۔ ان کے نغمے ہمیشہ سماعتوں میں شہد ٹپکا کر اس کی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

محترم قارئین

اگر آپ کو ہماری یہ کتاب اچھی لگے تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے

Google پر جا کر Urdu Books سرچ کر کے ہماری ویب سائٹ

www.urdusoftbooks.com کو ایک مرتبہ وِزٹ کر لیں

اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ Google کے پہلے پیج پر نظر نہ آئے تو

دوسرے یا تیسرے پیج پر چیک کر لیں،

وہاں آپ کو مزید اچھی کُتب ڈاؤن لوڈ کرنے کو ملیں گی۔ شُکریہ

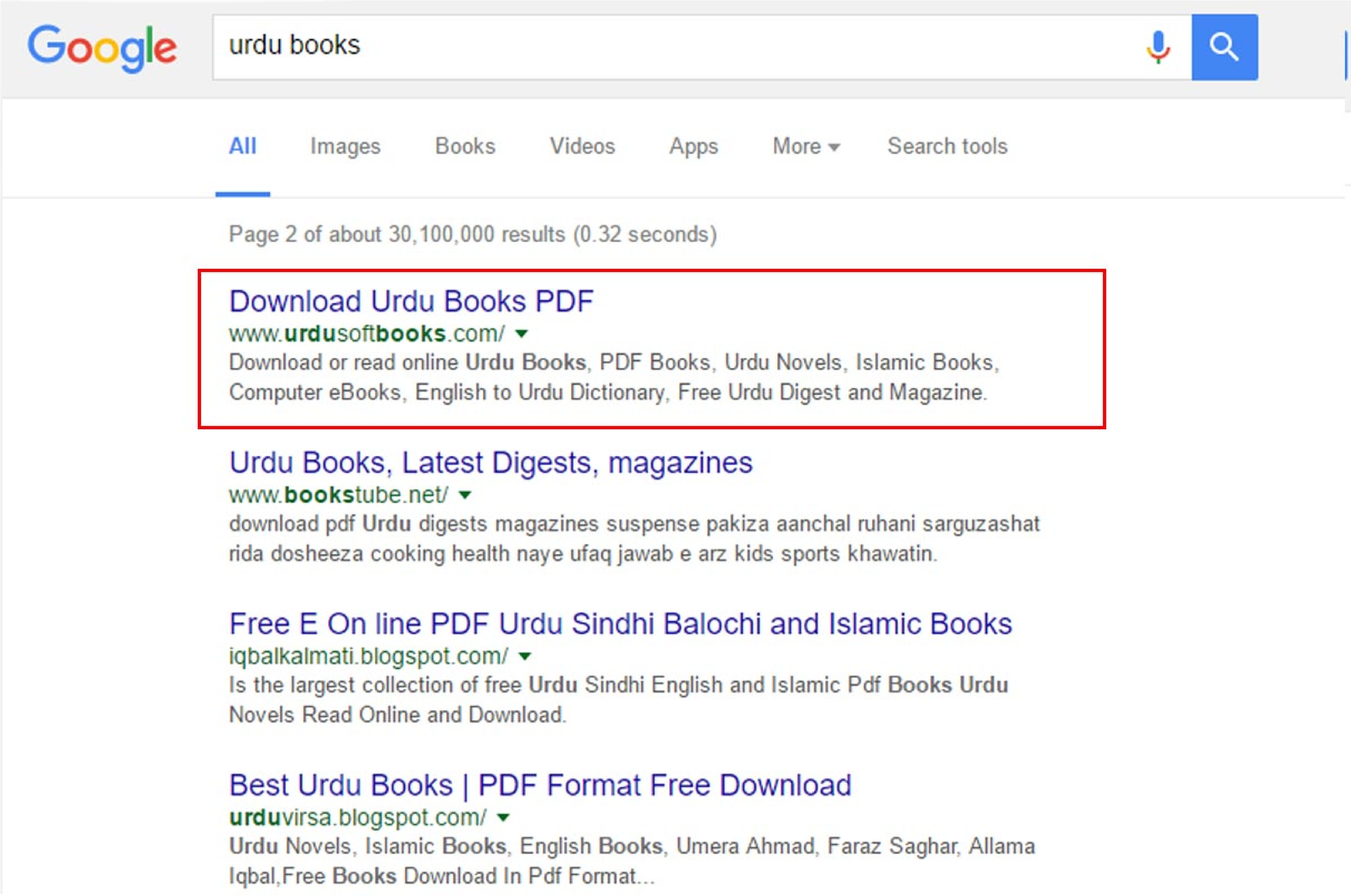

Urdu Soft Books

فخرِ انسانیت

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

زویا اعجاز

خدمتِ انساں سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں، یہ عبادت سے قریب تر جذبہ ہے۔ وہ لٹ پٹ کر ہجرت پر مجبور ہوئی تھی لیکن اس کے جذبے سرد نہیں ہوئے تھے۔ وہ بے سرو سامانی کے عالم میں بھی علم کی شمع جلانے میں کوشاں رہی۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں کو پائوں کی جوتی سمجھا جاتا تھا، تعلیم نسواں عام کرنے پر کمربستہ ہو گئی۔ یہ اسی کا جذبہ تھا کہ اس نے حالات کی سختی کو رد کرتے ہوئے اپنا وہ مقام بنا لیا کہ دنیا بھر میں واہ واہ ہونے لگی۔

بے سروسامانی میں ناممکن کو ممکن بنانے والی دوشیزہ کی سرگزشت

ارضی دنیا میں زندگی کی نمو تخلیقِ آدم ہی کا شاخسانہ ہے۔ رب کائنات نے جب آدم کی خلافت کا عندیہ دیا تو عرشی دنیا میں حیرت و خوف کی ملی جلی لہر دوڑ گئی۔ نوری مخلوق نے دست بستہ عرض کی۔ ”کیا تو ایسی مخلوق کو نائب بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی جبکہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تسبیح کرتے ہیں۔“
پروردگار نے حضرت آدم کو چند اشیا کے نام سکھائے پھر فرشتوں سے ان کے بیان کا حکم فرمایا۔ فرشتے اس حکم

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

کی تعمیل نہ کر سکے لیکن حضرت آدم نے بحکم الٰہی اپنا علم بیان فرما دیا۔ اللہ پاک نے ان سے فرمایا۔ ''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں باخبر ہوں اس سے جو تم نہیں جانتے۔'' (البقرہ)

نوری مخلوق نے خالق کی ایما پر خاک کے اس پتلے کو سجدہ کیا۔ کھڑکھڑاتی مٹی سے تخلیق کردہ یہ خاکی پتلا نوری و ناری مخلوق سے افضل قرار پایا اور اس فضیلت کی بنیاد ''علم'' تھی۔

اسی ضمن میں ''معلم'' کا مقام و مرتبہ بھی مسلمہ ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس کا درجہ والدین کے متوازی قرار پایا۔ والدین انسانی روح عرش سے فرش پر لانے کا موجب بنتے ہیں تو معلم اسے فرش سے عرش کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی اور اوج کمال معلمین ہی کی مرہون منت رہے ہیں۔ لیکن چند افراد ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی لگن، پیشہ وارانہ ذمہ داری اور جنون سے تاریخ میں اپنا نام امر کرلیا۔ عقیلہ آصفی کا شمار بھی انھی نایاب افراد میں ہوتا ہے۔ 49 سالہ افغانی نژاد اس معلمہ نے اپنے شب و روز فروغ تعلیم اور مہاجرین کی فلاح کے لیے مختص کر رکھے ہیں اور پچھلے 24 سال سے سینکڑوں طلبہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اس کی بے لوث خدمات بین الاقوامی سطح پر کافی مقبول ہو چکی ہیں یہ مقبولیت حادثاتی طور پر اسے نصیب نہیں ہوئی بلکہ دو دہائیوں تک عقیلہ کی انتھک جدوجہد کا ثمر ہیں۔

☆☆☆

عقیلہ آصفی کی پیدائش افغانستان کے مشہور تاریخی شہر کابل میں اس عہد میں ہوئی جب وہاں امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔ فضاؤں میں محبت و خلوص کی مہک رچی تھی اور اقدار و روایات کی تابناکی بشری زندگی کو منور کیے ہوئے تھی۔ عقیلہ کا بچپن خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزرا۔ زندگی کسی مصور کی شاہکار تصویر کی مانند کامل اور خوبصورتی کے تمام رنگوں سے مزین تھی۔ جان چھڑکنے والے والدین نے اولاد کو دنیا کی ہر نعمت سے مستفیض کیا۔ بچپن کی سہانی یادوں کے متعلق عقیلہ کا کہنا ہے۔ ''رب کائنات کی عطا کردہ اس زندگی اور نعمتوں کے شکرانے کا حق میں غالباً کبھی ادا نہیں کر سکتی۔ میں خود کو بہت خوش قسمت گردانتی ہوں کہ میری پیدائش ایک روشن خیال اور فراخ دل گھرانے میں ہوئی۔ ہمارے والدین ہم بہن بھائیوں کے لیے زندگی کے تمام تر امور میں بہت مددگار ثابت ہوتے تھے۔''

کابل کی حسین یادیں آج بھی اس کے دل و دماغ پر نقش ہیں۔ پچاس ہزار افراد کے قتل عام اور اسی فیصد شہر کی تباہی کی تلخ حقیقتیں اسے بے اختیار گم گشتہ سنہرے ماضی میں پہنچا دیتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے۔ ''کابل ایک خوشحال اور متمول شہر تھا جہاں جنسی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا۔ میں افغانستان کے تہذیبی عروج کی عینی شاہد ہوں۔ محبتوں اور چاہتوں سے گندھا وہ دور موجودہ وقت میں اکثریت کی سوچ و تصور سے بالاتر ہے۔''

عقیلہ کی زندگی کیف و سرور سے لبریز تھی حصول تعلیم اس کے لیے ایک مذہبی فریضہ تھا جسے وہ مکمل لگن سے سرانجام دیتی تھی۔ عام نوجوانوں کی مانند اس نے ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ بننے کے خواب آنکھوں میں کبھی بھی نہ سجائے تھے۔ وہ ایک معلمہ بن کر ''امتی'' ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین کی تدریس شروع کر دی۔ اپنے ایک بیان میں اس نے بتایا۔ ''مستقبل کے متعلق میری زندگی کا لائحہ عمل آغاز ہی سے طے شدہ تھا۔ شعور کی پہلی منزل پر پہنچتے ہی میں نے معلمہ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اپنے اساتذہ سے بے حد متاثر تھی اور انھی کی طرح فروغ تعلیم کے ذریعے چراغ در چراغ جلانے کی خواہاں تھی۔''

بحر حیات عقیلہ آصفی پر بہت مہربان تھی۔ ایک محبت کرنے والے شوہر کے بعد اولاد کی نعمت نے اس کی زندگی کی تکمیل کر دی تھی لیکن فلک کج رفتار کو اب کچھ اور ہی منظور تھا۔ نعمتوں پر شکرانے کے بعد اب مشکلات پر صبر کی آزمائش کا وقت آن پہنچا تھا۔

بیسویں صدی کا آخری عشرہ افغانستان میں کسی درویش کی بددعا ثابت ہوا۔ نفرتوں، سازشوں اور بے حسی کی باد سموم نے رواداری، اخوت و باہمی محبت کا گلشن خزاں رسیدہ کر دیا۔ 1992ء کی خانہ جنگی نے وہاں کے عوام کی زندگیوں کا رخ ہی تبدیل کر ڈالا۔ نجیب اللہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد طالبان تمام تر شعبۂ ہائے زندگی پر قابض ہو گئے اور عوام الناس کے لیے ایک کڑے وقت کا آغاز ہوا۔ عقیلہ آصفی کو بھی لامحالہ طور پر اپنے شوہر اور بچوں سمیت ہجرت کرنی پڑی۔ اس مشکل ترین وقت کی یاد آج بھی اسے آبدیدہ کر دیتی ہے۔ ''حکومت کے خاتمے کے بعد مجاہدین نے ملکی نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔ لیکن امن و محبت کا گہوارہ میرا وطن خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ ہر جانب انتشار کا دور دورہ تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور اپنے ہی اپنوں کا خون بہا رہے تھے انسانی خون انتہائی ارزاں ہو چکا تھا۔ جلاوطنی نا

www.urdusoftbooks.com

گزری تھی۔ مال و متاع اور اسباب زندگی سب وہیں کے وہیں دھرے رہے۔ جانے کیوں مجھے لگا کہ میرا اسکول میرے طلبہ اور میرا گھر سسک رہے تھے۔“

گھر اپنا گھر۔ کسی بھی عورت کی زندگی کا سب سے سہانا خواب ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی کی افزائش اس کی جبلت میں ودیعت شدہ ہے۔ عقیلہ آصفی کا وجود دہری آزمائش کے شکنجے میں جکڑا تھا۔ اپنے گھر اور وطن سے انخلا نے اس کی روح چھلنی کردی تھی۔ واپسی کی کسی معینہ مدت کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اس کا کہنا ہے۔ ”کابل میں تعمیر شدہ اس گھر کی تکمیل چھ سال کے عرصہ پر محیط تھی اور کوئی بھی سامان باندھے بغیر بے سروسامانی کی حالت میں ہمیں سب کچھ چھوڑ دینا پڑا۔ میرے لیے وہ وقت انتہائی کربناک تھا۔“

بقا کی جبلی خواہش اسے پاکستان لے آئی۔ پنجاب کے مشہور شہر میانوالی کے ایک پسماندہ گاؤں کوٹ چندن میں سکونت اس کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب برپا کرنے والی تھی، جس سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔ اس کی عمر اس وقت محض چھبیس سال تھی۔ عمر عزیز کا یہ دور کسی بھی انسان کے لیے امنگوں، خواہشوں اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے جذبات سے بھرپور ہوتا ہے۔ کابل جیسے متمول اور ترقی یافتہ شہر سے آمد کے بعد کوٹ چندن کی خاک اڑاتی ٹیڑھی میڑھی گلیاں اور کچے پکے راستے اس کے دل میں لامتناہی اداسی پیدا کرتے تھے۔ اپنے وطن اور گھر میں کسی ملکہ کی سی شان سے زندگی بسر کرنے والی عقیلہ کے لیے ایک پسماندہ گاؤں میں محتاجی کی زندگی بسر کرنا بہت کٹھن تھا۔ آبائی وطن کی کشش اسے بے حال رکھتی تھی۔ یہاں اسے انوکھے تجربات و حادثات کا سامنا کرنا پڑا جن کا تصور ہی کابل میں اس کے لیے بعید از قیاس تھا۔ وہ یہاں اکیلی مہاجر نہ تھی۔ کوٹ چندن نے اپنی بانہیں اَن گنت افغان مہاجرین کے لیے وا کی تھیں۔ غریب الوطن عقیلہ ایک عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ ہم وطنوں کی موجودگی بیک وقت باعث تقویت و آزار تھی۔ ان کی سوچ اور طرزِ عمل اس کے لیے کسی صدمہ سے کم نہ تھے۔ اپنے جذبات کی ترجمانی وہ کچھ یوں کرتی ہے۔ ”ہاں! ہم بھی افغان تھے۔ ہمارا خمیر ایک ہی وطن کی مٹی سے گندھا تھا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کابل میں بسر شدہ میری زندگی و سوچ افغانستان کے دیگر علاقہ جات کے ان رہائشیوں سے یکسر مختلف تھی۔“

کوٹ چندن میں رہائش پذیر ہونے کے بعد عقو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عید کی پُرمسرت ساعتیں
جولائی کے شمارے کی انوکھی کہانیاں

اولین سوغات
دغابازی اور فریب کاری کے جال میں الجھی ایک انوکھی داستان، ایچ اقبال کے قلم کی سوغات

انگارے
شریف آدمی کو بدمعاش بننے پر مجبور کردینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پائی....
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

پہلا رنگ
معصومیت اور پاکیزگی کو داغ دار بنادینے والے عوامل کی معاشرتی کہانی

دوسرا رنگ
جرم اور قانون کی پیروی میں آگے بڑھتی کہانی کے پیچ و خم

چیں بہ چیں
نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...
مشورے، محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

معطل جیسی زندگی گزارنے کا احساس عقیلہ آصفی کے لیے موت سے بھی بدتر تھا۔ اس نے اپنا ادھورا خواب مکمل کرنے کی ٹھان لی اور ایک بار پھر فروغِ تعلیم کے لیے کمر کس لی۔ لیکن آزمائشوں کا سلسلہ ابھی نہ تھما تھا۔ کوٹ چندن کے رہائشیوں کی زندگی کا کینوس نامکمل تھا۔ وہاں تعلیم نسواں کا سرے سے کوئی رواج ہی نہ تھا۔ لڑکے کبھی کبھار اسکول چلے جایا کرتے تھے لیکن اس نے کبھی کسی لڑکی کو اسکول جاتے نہ دیکھا۔ لڑکوں کے پاس بھی کتابیں یا نصاب نامی کوئی مواد نہ تھا۔ کابل کی سرکاری معلمہ کے لیے یہ امر حیران کن ہی نہیں افسوس ناک بھی تھا کہ بچے حکمتِ عملی یا تعلیمی منصوبہ بندی کے بغیر جہالت کے اندھیروں کے راہی بن رہے تھے۔ عقیلہ کا بیان ہے۔ ''لوگ بے حد مہربان، مہمان نواز، سخی لیکن انتہائی روایت پسند تھے۔ لڑکیاں گھر سے تنہا نکلنے اور حصول تعلیم کی مجاز نہ تھیں۔ مقامی خواتین اکثر شام کو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ جب میں نے ان سے لڑکیوں کی اسکول سے مستقل غیر حاضری کے متعلق استفسار کیا تو وہ کہنے لگیں۔ بہن! آپ یہاں نووارد ہیں اور ہمارے رسم و رواج سے واقف نہیں۔ آیندہ ایسی کوئی بات مت کیجیے گا۔ لڑکیاں کیونکر اسکول جاسکتی ہیں؟ یہ تو صرف لڑکوں کا حق ہے۔''

لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسے اپنے شوہر کی مکمل اعانت حاصل تھی۔ انہوں نے گاؤں کے سردار اور امام مسجد سے بارہا ملاقات کی اور انھیں اپنا ہمنوا بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مقامی آبادی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وہ کوٹ چندن کے ہر گھر میں گیے اور تعلیم نسواں کے لیے انھیں قائل کرنے کی جان توڑ کوششیں کیں۔ وہاں کے سادہ لوح عوام کے لیے عقیلہ آصفی ایک عجوبۂ روزگار تھی۔ ''خاتون معلمہ'' ان کے لیے ایک انوکھی اصطلاح تھی۔ بالآخر گاؤں کے سردار نے اسے لڑکیوں کو پڑھانے کی رضامندی دے دی اور ایک خیمہ مستعار دے دیا جسے عقیلہ نے اپنے گھر کے سامنے نصب کر کے ایک انقلابی قدم کا آغاز کیا۔ منزل دشوار تھی اور راستہ کٹھن تر۔ زادِ راہ کے طور پر صرف ہمت، حوصلہ اور لگن ہمراہ تھی۔

اس کے سفر کا آغاز انتہائی محتاط تھا۔ وہ ان کے معاشرتی رسوم و رواج کا احترام کرتی تھی اور ان کے متعلق کوئی بھی منفی اظہارِ خیال اس کے لیے احسان فراموشی تھی۔ کوٹ چندن نے اسے اور اس جیسے سینکڑوں مہاجرین کو پناہ دی تھی اور وہ انھیں رائی برابر بھی تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی لیکن خواتین کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اس کے نزدیک اخلاقی ہی نہیں بلکہ مذہبی فریضہ بھی تھا۔ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے جسے وہ بہر صورت انھیں دلوانا چاہتی تھی۔ عقیلہ آصفی کا کہنا ہے۔

''میں نے مہاجر کیمپ میں ایک چھوٹے سے مستعار شدہ خیمہ سے پڑھانے کا آغاز کیا۔ گاؤں کے معزز سردار نے مجھ سے تنخواہ کی بابت پوچھا لیکن میرے لیے یہی بہت تھا کہ انھوں نے مجھے اعتماد کی انمول دولت بخش دی تھی۔ میں ان کی اقدار اور روایات سے اب بخوبی واقف ہو چکی تھی اور انھیں کوئی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں نے ایسے موضوعات کی تعلیم کا آغاز کیا جو ان کے لیے بے ضرر اور غیر متنازعہ تھے۔ ابتدا میں والدین محض ایک ہفتے کے لیے بچیوں کو بھیجنے پر رضامند ہوئے۔ گھریلو امور کے انتظام و انصرام کے علاوہ حفظانِ صحت کے اصول اور بنیادی مذہبی تعلیم سے آشنا کروایا۔ میں ان کے سرپرستوں کو یہ شعور دینا چاہتی تھی کہ تعلیم ایک فطری عمل ہے اور فطرت کبھی خوفناک نہیں ہوتی۔ یہ حیاتِ انسانی کی از سرِ نو تزئین و آرائش کا ایک انمول وسیلہ ہے۔ تعلیم ایک بحر ہے جس کی روانی کہیں بھی نہیں روکی جاسکتی۔''

مہاجر کیمپ میں فروغِ تعلیم کا وہ سفر عقیلہ آصفی کے لیے خارزار ثابت ہوا تھا مشکلات کا ایک طوفان تھا جسے اس جیسی اولو العزم خاتون ہی برداشت کرنے کی متحمل تھی۔ والدین کی نیم رضامندی کا پڑاؤ طے ہونے کے بعد وسائل کی کمی کا مسئلہ جوں کا توں برقرار تھا۔ لڑکیاں سرے سے ہی ان وسائل کے وجود سے لاعلم تھیں۔ کتابیں، چاک اور تختہ سیاہ جیسی بنیادی ضروریات ناپید تھیں۔ لیکن چٹانی عزم و ہمت کی حامل عقیلہ نے زورِ بازو پر اکتفا کیا اور ذاتی کاوشوں سے متبادل ذرائع تخلیق کیے۔ اس خیمہ اسکول میں تختہ سیاہ کے لیے وہ رات کو کپڑوں کے ٹکڑے سلائی کرتی اور اگلے دن پڑھایا جانے والا سبق ان پر تحریر کر کے خیمہ کی دیوار کے ساتھ لٹکا کر طالبات کو حروف آشنا کرتی تھی۔ عالمی تاریخ میں یہ منفرد متعلمین تھے جنھوں نے حروف سازی اپنی خاک آلود زمین پر سیکھی تھی۔ ان کی انگلیاں پینسلیں اور فرش گویا کاپیاں تھیں۔

عقیلہ کی محنت و لگن رنگ لانے لگی، بستی کے مقامی افراد کے علاوہ مہاجر والدین بھی اپنی بچیوں کو بلاخوف و خطر اس کے پاس بھیجنے لگے۔ تین ماہ کے قلیل عرصے میں

Urdu Soft Books

طالبات کی تعداد چالیس سے متجاوز ہوگئی۔ تبدیلی کسی بادِ نسیم کی مانند کوٹ چندن کو معطر کرنے لگی تھی۔ پھر وہ لمحہ بھی آیا جب اس نے اپنا مرتب شدہ نصاب دو حصوں میں منقسم کر کے صبح اور شام میں پڑھانا شروع کیا۔ دسمبر 1996ء میں اس کا یہ نصاب ایک باقاعدہ اسکول کی شکل اختیار کر گیا اور اس کی طالبات کی تعداد 75 ہوگئی۔ نصاب کو باقاعدہ حکومتی توثیق و منظوری دلوائی گئی۔ حکومتی نمائندوں نے اس موقع پر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور انہیں باقاعدہ کتابیں اور کاپیاں بھیجی گئیں۔ اسکول میں طلبہ کی تعداد دھیرے دھیرے 170 ہو چکی تھی۔ بچیاں پہلے سے خوداعتماد تھیں۔ ایک طالبہ اس کی یادداشت کے نہاں خانوں سے کبھی محو نہ ہوئی۔ اس نے اپنے چچا کو مشورہ دیا کہ وہ اون کی خرید وفروخت کا حساب رکھنے کے لیے کاپی استعمال کریں۔ چچا نے اس کی بات کو بالکل سنجیدہ نہ لیا لیکن بعدازاں اسکول میں سیکھے گئے بنیادی حساب کتاب کے عمل کی مدد سے اس نے چچا کو کاروباری معاملات میں بھرپور اعانت دی۔ چچا اس ہونہار بھتیجی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنی بہو بنا لیا۔

اسکول سے فارغ التحصیل طالبات عقیلہ کے کارواں میں شریک ہوگئیں اور دیگر طلبہ کو تعلیم دینے لگیں۔ اس کی مثبت سوچ، جنون اور خلوص نیت اس کے طلبہ میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ خیمہ اسکول اب ایک مستقل عمارت بن گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی نے کوٹ چندن کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو والدین اسکول کے نام سے نابلد تھے وہ بخوشی اپنی بچیوں کو عقیلہ کے پاس بھیجنے لگے۔ ان کا طرزِ حیات یکسر بدل گیا۔ کھانا پکانے کے طریقے، سوچ، لائحہ عمل سب کچھ اب بدل چکا تھا۔ والدین اب بچیوں کی پڑھائی کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ وہ ان کی تعلیمی ترقی کے متعلق پوچھنے آتے اور اساتذہ کی طویل غیرحاضری پہ ناراضگی کا اظہار کرتے۔ ویکسینیشن کے عمل سے خائف اپنے بچوں کو چھپا دینے والے لوگ اب صاف ستھرے رہتے اور بچوں کی تمام تر طبی و تعلیمی ضروریات پوری کرنے لگے۔ گاؤں کے جس سردار نے اس خیمہ اسکول کی منظوری دی تھی اس کا کہنا ہے۔ ”میں اکثر خود پہ حیران ہوتا ہوں کہ میں نے لاعلمی اور جہالت کے اندھیروں میں زندگی کیونکر بسر کی؟ میں خود تو اس نعمت سے فیض یاب نہ ہو سکا لیکن مجھے خوشی ہے میں نے اپنی اولاد کو اس خزانے سے بے بہرہ نہ رکھا۔“

عقیلہ نے کبھی بھی تصور نہ کیا تھا کہ اس کی یہ کاوشیں اس معاشرے کو یکسر بدل کر ان کے ذہن روشن کر دیں گی۔ اس کی چند طالبات افغانستان واپس چلی گئیں اور ایک ماہ کے بعد ہی انھوں نے وہاں کے ایک گاؤں میں ایک درسگاہ قائم کی۔ اس کے قیام کو اب بارہ سال گزر چکے ہیں اور اس گاؤں کی ہر لڑکی وہیں پڑھتی ہے۔ ایک مقامی طالبہ بعدازاں قابل سرجن بنی۔ کمپیوٹر، سائنسی مضامین اور دیگر شعبوں میں گرانقدر خدمات سرانجام دینے والی ان طالبات پر عقیلہ کو بجا طور پر بہت فخر ہے۔

1992ء میں شروع ہونے والا سفر ربع صدی کی تکمیل کے قریب ہے لیکن اس کی لگن اور جذبہ آج بھی روزِ اوّل ہی کی طرح قائم و دائم ہے۔ دو دہائیوں قبل اس نے جن طالبات کو تعلیم دی اب ان کی بیٹیاں بھی اسی کے اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ دوسری نسل تک تعلیمی ورثے کی منتقلی اس کے لیے پروردگارِ دو عالم کا خصوصی انعام ہے۔ اس کی طالبات مکمل طور پر اسی کا پرتو ہیں۔ ان کا نظریۂ حیات و طرزِ عمل دیگر طلبہ سے بے حد مختلف ہیں عقیلہ ان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ایک بین الاقوامی صحافی ”للّی ماؤ“ نے اپنے جریدے کے مضمون کے لیے اس کے اسکول کا خصوصی دورہ کیا اور طلبا و اساتذہ کے تاثرات قلمبند کیے۔ وطن واپسی پر اس کا کہنا تھا۔ ”عقیلہ آصفی کی طالبات کی سوچ اور ذہنی معیار دیکھ کر میں انگشت بدنداں تھی ان بچیوں کے خواب و عزائم ہمالیہ سے بلندتر ہیں۔ ایک بچی عقیلہ ہی کی طرح معلمہ بن کر ناخواندگی کے اندھیرے مٹانے کے لیے پُرعزم تھی تو دوسری ایک قابل ڈاکٹر بن کر اپنی قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھی۔ اور ان کے آہنی ارادے بذاتِ خود ان کی کامیابیوں کے ضامن ہیں۔“

اس کامیاب سفر کے باوجود عقیلہ کے دل کا ایک گوشہ تاحال اداس، بے کل اور خون کے آنسو روتا ہے۔ اس کے وطن کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ افغانستان کا طویل بحران لاینحل ہے۔ 2.6 ملین سے زائد افغانی جلا وطنی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہر دو میں سے صرف ایک بچہ پرائمری اسکول میں پڑھنے کا سہولت کار ہے۔ سیکنڈری سطح پر یہ تناسب مزید تنزلی کا شکار ہے اور چار میں سے صرف ایک بچہ ہی تعلیم حاصل کر پا رہا ہے۔ پاکستان میں یہ صورتحال مزید ابتر ہے جہاں مقامی آبادی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے، مہاجرین کیونکر اس ”عیاشی“ سے مستفید ہوں۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سکتے ہیں۔

عقیلہ کی ان تھک جدوجہد کی بازگشت عالمی ایوانوں میں بھی گونجنے لگی ہے۔ 2015ء میں اسے اقوام متحدہ کی جانب سے UNHCR Nansen Refugee Award دیا گیا۔ یہ خصوصی ایوارڈ مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں افراد کو دیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر انٹونیو نے اسے میڈل اور 100000 امریکی ڈالرز عطا کیے۔ تقریب کے دوران اپنے بیان میں اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انٹونیو نے کہا۔ ”بہترین تعلیم تک محفوظ رسائی بچوں کے لیے ازحد ضروری ہے۔ یہی ایک وسیلہ ہے جس کی مدد سے وہ روزگار کے مواقع حاصل کرنے کے علاوہ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں موجودہ دور میں بچے عدم تحفظ، جسمانی و جنسی استحصال اور کشمکش کا شکار ہیں۔ عقیلہ آصفی جیسے نایاب افراد ہی اس امر سے آگاہ ہیں کہ مستقبل میں مہاجر بچوں کو معاشرے کا کارآمد شہری بننے کے لیے تعلیم کی اشد ضرورت ہے ان کی تمام تر کوششوں اور عظمت کو ہم سلام پیش کرتے ہیں۔“

UNHCR کے سفیر خالد حسینی نے اپنے بیان میں کہا۔ ”حصول تعلیم کے ذرائع تک باعزت رسائی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور لاکھوں کروڑوں مہاجر بچوں کے لیے تو اس کی قدر و قیمت مزید بڑھ جاتی ہے یہی ایک ذریعہ ہے جس کے توسط سے وہ اپنا مستقبل خود تعمیر کر سکتے ہیں۔ میں نے کتنے ہی نوجوان مہاجر دیکھے ہیں جو اپنے مدار سے جدا ہو کر بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ تعلیمی سرمایہ کاری ہی کے ذریعے انھیں اُمید اور حیات کی تعمیر نو کا ایک موقع فراہم کیا جاسکتا ہے۔“

اس ایوارڈ کا حصول عقیلہ آصفی کے لیے مسرت و انبساط کا ناقابلِ فراموش لمحہ تھا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”تعلیم یافتہ ماؤں کی موجودگی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی ضامن ہے۔ لڑکیوں کو علم دیا جائے تو نسل در نسل چراغاں رہے گا۔ میری ایک تشنہ آرزو ہے کہ مستقبل میں لوگ افغانستان کو خانہ جنگی کی بجائے معیاری تعلیمی نظام اور بہترین طلبہ کی بدولت یاد رکھیں۔ یہ ایوارڈ میرے عزم کو مزید تقویت بخشے گا۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ میری شناخت افغان مسلم خاتون اور بطور معلمہ اب مستند ہو چکی ہے۔

اگر عالمی حکمران ترقی پذیر ممالک کو خوشحالی کی راہوں پر گامزن کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ترجیحی بنیادوں پر کسی بھی جنسی امتیاز سے قطع نظر بہترین تعلیمی سہولیات فراہم کرنی چاہئیں۔ جب میں نے افغان لڑکیوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہ تھا کہ ایک دن اس ایوارڈ کی حقدار ٹھہروں گی۔ میری لگن کی اس قدر پذیرائی پر میری خوشی ناقابلِ بیان ہے۔“

عقیلہ مستقبل قریب میں افغانستان واپسی کی شدت سے متمنی ہے۔ 49 سال کی عمر میں بھی وہ اپنے تباہ حال ملک کی تشکیل نو میں نوجوانوں جیسی توانائی و جوش کے ساتھ ایک نئی تاریخ رقم کرنا چاہتی ہے۔ وہاں موجود اَن گنت بچوں کے لیے وہ ذاتی درسگاہیں قائم کرنے کی خواہشمند ہے۔

اقوام متحدہ نے اسے The Global Teacher Prize کے لیے بھی نامزد کیا۔ یہ خصوصی ایوارڈ دس بہترین عالمی اساتذہ میں سے کسی ایک کا مقسوم قرار پاتا ہے اور جیتنے والے کو ایک ملین ڈالرز کی خطیر رقم عطا کی جاتی ہے۔ پاکستانی نوبیل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے اس نامزدگی پر عقیلہ کو ذاتی طور پر مبارکباد دی۔ ملالہ کے والد ضیاالدین یوسف زئی نے مشہور سماجی ویب سائٹ ٹوئٹر پر ایک پیغام میں کہا۔ ”ملالہ اور میں عقیلہ آصفی کو دس بہترین عالمی اساتذہ میں شمولیت پر تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں ان کی تعلیمی خدمات لاجواب ہیں۔“

مارچ ۲۰۱۶ میں اس اعزاز کی حقدار فلسطینی معلمہ ”حنان الحروب“ قرار پائیں جن کی زندگی بذاتِ خود حوصلہ و برداشت کی ایک الگ داستان ہے۔

ایک خیمہ سے افزائش پانے والا اسکول اب 9 درسگاہوں پر محیط ہو چکا ہے لاتعداد خواتین وہاں بطور اساتذہ خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ فی الوقت اس کے زیرِ نگرانی 1500 طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں 900 لڑکیاں شامل ہیں۔ اس کے اسکول سے فارغ التحصیل 1000 طلبہ گریجویٹ بن چکے ہیں جن میں مقامی بچوں کے علاوہ افغان طلبہ کا تناسب زیادہ ہے یہ افغانی طلبہ اپنے وطن میں اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر، سرکاری ملازمین ہیں۔

اس کی لگن اور خدمتِ خلق کا جذبہ ان بھی میں ایک مشترک قدر ہے۔ اس کی تربیت یافتہ کئی طالبات آج اساتذہ کے مقدس عہدے پر فائز ہو کر تعلیمی چراغاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس دنیا سے جہالت اور لاعلمی کے اندھیرے مٹا کر تخلیق آدم بہترین حق ادا کر رہی ہیں۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ملکہ مارجوری

سلمیٰ اعوان

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ اور اس سے ہو انکار بھی شاید ہی کسی کو مگر تہذیبِ حاضر کے گرفتار کیا جانیں؟ وہ تو اپنی ملت پر بھی قیاس اقوامِ مغرب سے کرتے ہیں۔ انہیں تو یاد بھی نہ ہو کہ ہمارے پاس وہ گوہرِ بے بہا تھے جنہوں نے خدمت ملک و ملت ہی نہیں کی، انسانیت کو بھی دوام بخشا۔ ایسا ہی ایک کردار ہے ملکہ مارجوری کا جس نے وفا کی بھی مثال قائم کی۔ وہ یورپین تھی لیکن جب اس نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر محبوب کا ہاتھ تھاما اور کلمہ پڑھ کر اس کی زندگی میں آئی تو لوگ اس کی مثالیں دینے لگے۔ اس نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ یہ عشق نہیں آساں، ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ اس نے آگ کے دریا کو پار کیا کیونکہ اس کی سگی پھوپی اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر کے اس کا محبوب ہتھیانا چاہتی تھی۔

بلتستان کی ایک ملکہ کی وفا پرستی کا بیان

پندرہ اگست کی اس رات کا پہلا پہر حبس سے بھرپور تھا۔ میں نے ٹرین کی کھڑکی سے پلیٹ فارم پر نظریں دوڑائیں۔ گاڑی کی رفتار بہت آہستہ ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ آسانی سے پہچان میں آرہے تھے پر میرے جگر گوشے کہیں نہیں تھے۔ گاڑی رکی۔ میں جست لگا کر باہر کودی اور دیوانہ وار سیدھی بھاگنے لگی تھی۔ مجھے بہت دور سے اپنے چھوٹے بیٹے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ میرا کہیں تصور تو نہیں ہے کہ مجھے اِن عمروں کی ہر صورت

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پر اب ان کا گمان ہونے لگا ہے۔ پرنہیں وہ سچ مچ میرے بچے تھے جو اپنے باپ کے ساتھ مجھے لینے آئے تھے کیونکہ ان کی ماں شمالی علاقوں کی سیاحت سے کوئی بیس (20) دن بعد لوٹی تھی۔ چیختے چلاتے وہ سب مجھ سے لپٹ گئے تھے اور جب نصف ماہ سے زائد کی جدائی کا سوکھا پن اس ملاپ سے کچھ سیراب ہوا تب انہوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں ان کی نظروں کا مفہوم پہچانتی تھی وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں ان کے لیے کیا لائی ہوں؟ میرے کندھے پر بیگ تھا جس میں فقط، میرے دو جوڑے کپڑوں کے اور غالباً دو تین سو روپے کی ریزگاری ہوگی۔

میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے گال چومے اور کہا۔

''میری جان اسکردو کے عنبری سیب ابھی کچے تھے۔ خوبانیوں کا موسم ختم ہوگیا تھا۔ توت تو مئی میں ہی مک مکا جاتے ہیں۔ چلو میں تمہیں راستے میں سے جو کہو گے خرید دیتی ہوں۔''

میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں ڈھیر سارا روپیا بلتستان کی وادیوں میں کرائے بھاڑوں میں ختم کرآئی ہوں اور اب بمشکل گھر تک پہنچی ہوں۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر میرے میاں نے پھل خریدا کہ گھر میں دیورانیوں کے بچے بھی انتظار میں تھے۔

''آخر آپ وہاں سے کیا لائی ہیں؟ اتنے وعدے کر کے گئی تھیں اور خالی ہاتھ آگئی ہیں۔'' بڑا بیٹا چیخا۔

''دیکھو بہت سی کہانیاں لائی ہوں۔ سچی، تاریخی، بے حد دلچسپ اور پیاری پیاری۔''

اس رات بیٹی نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ بیٹے سرہانے پالتی بیٹھ گئے۔ ''چلو اب سناؤ جو لائی ہو۔''

اور میں نے ان روح پرور نظاروں اور رنگا رنگ کہانیوں کے دامن میں جھانکا اور یوں گویا ہوئی۔

بس تو من و عن وہی نظارہ تھا۔ شام کے گھنے بادلوں میں جب دفعتاً بجلی چمکتی ہے اور اردگرد کا سارا ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں خپلو بالا میں پرانے محل کی بیرونی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی اس کچی جگہ آکر ٹھہری تھی جس کے مشرقی طرف نیا محل اور اس سے ملحقہ چھوٹا باغیچہ، مغربی سمت بڑے باغ اور بیگم فتح علی خاں کے کمروں کی طرف جانے کا راستہ، جنوب میں پرانا محل اور شمال میں مزید سیڑھیاں اور شکستہ کمرے تھے۔ بس اسی کچی جگہ پر جو مجھ سے کوئی چار فٹ کے فاصلے پر تھی کڑکتی بجلی لشکارے پر لشکارے مار رہی تھی۔

میں پٹر پٹر آنکھوں کے پٹ پھاڑے اسے دیکھتی تھی جس کے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال کانوں کے پاس دو چوٹیوں کی صورت تیز گلابی پشم کے پراندوں میں گندھے کمر اور سینے پر جھول رہے تھے۔ تائیوان کا مہندی رنگا چھوٹے چھوٹے پھولوں والا خوبصورت چمکتا سوٹ جس کی شلوار کے پائنچوں تلے ایرانی پلاسٹک کا جوتا گورے گورے گداز پاؤں کو مقید کیے کھڑا تھا۔ میں ہیروں کی بہت سی اقسام سے شناسائی حاصل کر بیٹھی ہوں۔ اسی لیے حق بجانب ہوں کہ کہوں ان آنکھوں سے پھوٹتی کرنیں ہیروں کی چمک لیے ہوئے تھیں۔

''کون ہیں آپ؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں ایک سیاح ہوں جسے وطن کی دلکش وادیاں اپنے نظاروں سے محظوظ کرنے کے لیے کھینچ لائی ہیں۔ اور آپ؟''

میں نے استفہامیہ نظریں اس پر گاڑ دیں۔

''شاہ جہاں۔ خپلو کے شاہی یبگو خاندان کی بہورانی۔''

میں نے دیکھا تھا اس کی تنی گردن جواب دیتے ہوئے کچھ اور تن گئی تھی میں ہنسی اور بولی۔ ''لگتا ہے آپ کا نام بہت عجلت میں رکھا گیا یا پھر کسی نے غور ہی نہیں کیا؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''بھئی آپ تو نور جہاں ہیں۔''

اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسی اور میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔ ''تو آیئے پھر آپ کو چائے پلواتے اور راجا فیملی سے ملواتے ہیں۔''

میرے ساتھ اس وقت خپلو سول اسپتال کے ڈاکٹر اسماعیل کا چھوٹا بھائی یوسف تھا۔ شاہ جہاں نے یوسف سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ جائے اور یہ کہ ان کا نوکر مجھے چھوڑ آئے گا۔

یوسف نے میری طرف دیکھا۔ مجھے کچھ خفت سی محسوس ہوئی۔ بے چارے کو گائیڈ بنا کر ساتھ لائی تھی۔ اب راستے ہی سے وداع کر رہی تھی۔ مجبوری تھی۔ میں نے عاجزی سے کہا۔ ''یوسف میں مغرب تک آجاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب کو بتا دینا۔''

ساری راجا فیملی بڑے کمرے میں جمع ہوگئی تھی۔ راجا کھرمنگ کی والدہ فاطمہ بیگم بھی کھرمنگ سے ایک شادی کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ بھتیجے بھتیجیوں اور بھاوج نے روک لیا تھا۔

حسین ماضی مہارانی کھرمنگ کی آنکھوں سے چھلک

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

چھلک پڑتا تھا۔ شاہ جہاں کی ساس مہارانی نچلو بھی پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔

"جاگیرداری ختم ہونے سے کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

لہجے میں زمانے کا درد سمٹ آیا تھا۔

"حال تو بہت تکلیف دہ ہے۔ خیر اب عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ درد کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے آخر کار دوا بن جاتا ہے۔"

شاہ جہاں پلیٹ میں امعبہ خوبانیاں لائی، سفید، رسیلی خوبانیاں۔ زبان پر رکھو اور گھلتی ہوئی حلق میں اتر جائیں۔

میں کھاتی گئی اور فاطمہ بیگم کی باتیں سنتی گئی۔ پھر چائے آگئی۔ نمکین سبز چائے۔ باہر شام اتر رہی تھی مہارانی نچلو ایک مورت کی مانند بیٹھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ سے چائے پیتی تھی۔

اور جب شاہ جہاں گود کی بچی کو لیے میرے پاس آ کر بیٹھی اس نے کہا۔ "یہ ہماری چچی مارجوری بلز کی منجھلی بہو ہے۔" کمرے میں ایک نوعمر دلکش لڑکی داخل ہوئی تھی۔

"مارجوری بلز" یہ نام میں نے گلگت میں سنا۔ اس نام سے میرے کان ہنزہ میں آشنا ہوئے اور جب میں اسکردو آئی تو راجا افتخار علی خاں اور مارجوری بلز کے نام ایک بار پھر سماعت سے ٹکرائے اور جب میں نے کوہ ہندوکش اور کوہ قراقرم کی وادیوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تھا یہ نام وہاں بھی موجود تھا۔

شاہ جہاں کے ساتھ میں باہر نکل آئی تھی۔ چیڑ کی لکڑی کے تختوں سے بنی راہداری جس کے چوبی جنگلے پر کہنیاں ٹکائے میں اپنے سامنے جھاگ اڑاتے شفاف پانی کے چشمے کو شور مچاتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ پیلے رنگ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ناک میں گھس کر عجیب سی لطافت پیدا کرتی تھی۔

ان پھولوں کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ یہ کشمیر سے لا کر لگائے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پر سے آتی ہوائیں اب بہت خنک ہو گئی تھیں۔ تب میں نے کہا۔

"شاہ جہاں اپنی مرحوم چچی مارجوری بلز کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گی؟"

"سامنے دیکھو!" اس نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھ رہی ہوں۔ بولو۔" سینکڑوں فٹ اونچے اس پہاڑ پر میری نظریں جم گئی تھیں۔

اس پہاڑ پر نچلو کا تاریخی قلعہ اور محل ہے۔ یہ تھور سے کھر کہلاتا ہے۔ قلعہ تو کھنڈر بنا ہے پر مسجد جوں کی توں ہے۔ کل وہاں چلیں گے اور تمہیں میں وہیں وہ کہانی سناؤں گی جو سچی ہے اور تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔

میں نے سہم کر ایک بار پھر اپنے سامنے سر اٹھائے کھڑے اس پہاڑ کو دیکھا جو ایک دیو ہیکل جن کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا اور جس پر "تھور سے کھر" کا شکستہ قلعہ اور محل واقع تھا اور جہاں جا کر وہ بت طناز اس الف لیلوی داستان سنانے کا کہہ رہی تھی جسے سننے کی میں زبردست خواہش رکھتی تھی۔

"کمال ہے۔ تم فضا میں معلق ہوئے بغیر یہ کہانی نہیں سنا سکتی ہو۔"

"لو سچی اور افسانے سے زیادہ دلکش کہانی کی تم اتنی سی قیمت نہیں دے سکتی ہو کہ خود چل کر ان جگہوں کو دیکھو جو اسے بہت محبوب تھیں۔ پہاڑ کے پچھلی طرف ہماری زمینیں ہیں۔ چچی مارجوری ان دنوں اوپر جایا کرتی تھیں۔"

مغرب کی اذان نے گفتگو اور سوچوں کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ میں نے سر پر دوپٹا لیا اور نماز کے لیے چل دی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں نے اسے کہا۔

"سنو! ڈاکٹر اسماعیل میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ مجھے واپس بھجواؤ اب۔"

وہ پری جمال ایک ادا سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس اندھیری رات میں اس وقت تم نے باہر نکل کر کیا اپنے گٹے گوڈے تڑوانے ہیں۔ دوستی کر لی ہے میں نے تم سے، بھول جاؤ اب ڈاکٹر اسماعیل کو۔ جتنے دن نچلو میں رہو گی میرے پاس رہنا ہوگا۔ میرا بیٹا ڈاکٹر اسماعیل کو بتا آیا ہے۔"

رات کو نئے محل کے بڑے کمرے میں راگ و رنگ کی محفل جمی۔ شاہ جہاں بتا رہی تھی کہ ابھی پندرہ دن پہلے لاہور کالج کی پروفیسروں کا ایک گروپ نچلو آیا تھا اور اسی کمرے میں اس رات بھی ایسا ہی ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد میں رضائی میں دبک کر پھر سو گئی تھی۔ نو بجے کے قریب شاہ جہاں نے ریشمی رضائی میرے اوپر سے کھینچ کر کہا۔

"کچھ خوف خدا کرو۔ چلنا نہیں کیا؟ ڈیڑھ گھنٹا چڑھائی میں لگے گا۔ ادھر پار گاؤں میں بھی جانا ہے۔"

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

شاہ جہاں نے چھوٹی بیٹی کو کمبل میں لپیٹ کر چورونگ (تنکوں کی لمبی ٹوکری) میں لٹائی اور اسے کمر پر کس لیا۔ میں نے چائے کی بوتل، کپ، پراٹھے اور انڈے ٹوکری میں ڈالے اور اسے شاہ جہاں کی طرح کمر پر لادا اور جب وہ اس کی طنابیں درست کر رہی تھی میں نے کہا۔ ”شاہ جہاں تم نے یہ من پکا وزن بھی مجھ پر لادو دیا ہے۔ اگر کہیں میرا پاؤں رپٹ گیا تو یاد رکھنا میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔“

اس چلبلی نار نے تیکھی نظروں سے مجھے گھائل کرتے ہوئے کہا۔ ”اوکھلی میں سر دیتی ہو اور موسلوں سے بھی ڈرتی ہو۔ وطن کے دشوار گزار حصے دیکھنے اور ان کے بارے میں لکھنے کا شوق بھی ہے اور راستوں کی صعوبتوں سے خوفزدہ بھی ہو۔ چلو سیدھی طرح اور ہاں تمہارے کون سے مرنے کے دن ہیں؟ دنیا تھوڑی پڑی ہے اس نیک کام کے لیے۔“

شاہ جہاں ان لوگوں میں سے تھی جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

اس نے سارے فاصلے مٹانے میں صرف چند گھنٹے لیے تھے۔

فضا میں خفیف سی خنکی تھی۔ میرا جسم پسینا پسینا ہو رہا تھا۔ پہاڑ ایسا عمودی تھا کہ جب میں ذرا آنکھ کی خفیف سی جھری سے دائیں بائیں جھانکتی تو لمحے بھر کے لیے مجھے اپنا خون جیسے رگوں میں منجمد سا محسوس ہوتا۔ شاہ جہاں آگے آگے باتیں کیے جا رہی تھی۔

”تھور سے کھر“ پہنچ کر جب میں نے دیکھا تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جنھوں نے اسے بنایا انسان تھے یا جن۔ اللہ، منوں وزنی پتھر کیوں کے ان عمودی پہاڑوں پر لائے گئے ہوں گے؟

پھر اس نے چورونگ میں سے بٹی کو نکالا اور پتھروں کے پاس ایک ہموار سی جگہ پر لٹا دیا۔ وہ کم بخت ابھی تک سو رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا افیون کھلائی ہوئی تھی اسے۔ جب میں اور وہ دونوں اس نکھری اور روشن فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اٹھاتے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ سامنے دریائے شیوق چاندی کی طرح ایک لمبی لکیر کی مانند چمکتا تھا اور نیچے خپلو بالا اور خپلو پائن کے گھر گڑیوں کے گھروندوں کی مانند نظر آتے تھے۔

شاہ جہاں نے ماضی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ اس وقت بانکپن، وجاہت، دلآویزی اور حسن وجمال کے آخری زینے پر کھڑا تھا۔ سچی بات ہے راجا افتخار علی خاں خپلو کے یبگو خاندان کی انگوٹھی کا وہ بیش قیمت ہیرا تھا جس کے بغیر انگوٹھی دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ ترک نسل کی ساری خصوصیات اس کے وجود میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ سرینگر کی گلیوں کا ہار سنگار تھا۔ ایس۔ پی کالج سرینگر کا طالب علم جو کالج اور ہوسٹل ہر جگہ اپنے حسن و جوانی کی بنا پر غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔

یہ جاتی بہاروں کی ایک رنگین سی شام تھی۔ چناروں کے پیڑوں پر کھلے پھولوں نے فضاؤں اور دلوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ بارش ابھی ابھی برسی تھی اور فضا میں بادلوں کے ٹکڑے یوں تیرتے پھر رہے تھے جیسے جھیلوں کے نیلگوں پانیوں میں گلیشئر کے چھوٹے چھوٹے تودے۔

اس شام راجا افتخار اپنے جگری یار کے ساتھ اٹیلئین کیفے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چھ فٹ سے نکلتی قامت پر ڈارک بلیو سوٹ، سرخ نکٹائی اور سیاہ چم چم کرتے جوتے۔ دروازہ کھول کر وہ جس انداز میں اندر آیا تھا اور بیروں نے جس انداز میں اسے تعظیم دی تھی وہ پرنس آف ویلز نظر آتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ واقعی وادی خپلو کا شہزادہ تھا۔

مارجوری بلز ایک برطانوی دوشیزہ جو لندن سے سیر و سیاحت کے لیے ہندوستان اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ مدراس میں اپنی حقیقی خالہ کے پاس دو ماہ رہنے کے بعد وہ ابھی ایک ہفتہ ہوا اپنی پھپھی مسز ولیم کے پاس سرینگر آئی تھی اس وقت وہ کیفے کے ایک کونے میں بیٹھی کافی سے دل بہلاتی تھی۔ مسز ولیم جموں گئی ہوئی تھی۔

افتخار، غلام وزیر مہدی ممبر سابق مجلس شوریٰ اور سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر تینوں لنگوٹیئے یار ایک میز کے گرد بیٹھے تھے، بیروں نے چائے کی سروس دی۔ وہ کپ ہاتھوں میں تھامے باتیں کر رہے تھے جب مارجوری اپنی جگہ سے اٹھی ان کے پاس آئی اور افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ عظیم برطانیہ کے کس حصے سے ہیں؟“

افتخار بڑا شوخ و شنگ جوان تھا۔ ہنسی ہونٹوں میں دبا گیا تھا۔ چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت لاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو کہاں کا نظر آتا ہوں؟“

”اسکاٹ لینڈ۔“ مارجوری نے فوراً کہا۔

”بس تو ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ میں وہیں کا ہوں!“

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' مارجوری بولی۔

''ضرور ضرور شوق سے۔''

پر غلام وزیر مہدی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور یوں بھانڈا پھوٹ گیا۔

سلطان ڈوپشہ نے افتخار کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجیے گا محترمہ میں نے اسکاٹ لینڈ چھوڑ سارا انگلستان دیکھا ہے۔ اس جیسا انمول ہیرا تو وہاں ایک بھی نہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔''

''اوہ۔'' کہتے ہوئے مارجوری نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''میں نے ایسا حسین مرد آج تک نہیں دیکھا۔''

غلام وزیر نے بلتی زبان میں ہنس کر کہا۔ ''لو افتخار اب لونڈیا ہوئی عاشق۔''

مارجوری اس وقت بالی عمریا کے دور میں تھی۔ سبز آنکھیں شراب کے چھلکتے پیمانے تھے۔

اگلے دن جب افتخار پھر کیفے گیا۔ مارجوری اپنی پھپی مسز ولیم کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ مسز ولیم نے افتخار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہونٹوں کو گولائی میں لاتے ہوئے بولی۔ ''ہاؤ ڈیشنگ۔ مارجوری نے کل رات اور آج سارا دن تمہارا ذکر کر کے میرے جذبہ تجسس کو اتنا شدید کر دیا تھا کہ میں کیفے بھی وقت سے پہلے پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ مارجوری تعریف کرنے میں سو فیصد حق بجانب تھی۔''

اب ہوا یہ..... اس سے آگے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ جہاں کی بیٹی جاگ گئی تھی۔ اس نے اسے گود میں لٹایا اور دودھ پلانا شروع کر دیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے کپڑا پھیلایا۔ انڈے پراٹھے نکالے اور ہم دونوں نے کھانا شروع کر دیا۔ سر پر سورج چمک رہا تھا۔ جب ہم نیچے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ دیوتا ''تھور سے کھر'' کی چوٹی پر لٹکا ہوا ہے۔ وہاں پہنچیں گے تو ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیں گے۔ پر وہ اتنا ہی اونچا پھر تھا۔

اور جب اس نے کھانے کے بعد چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تب پھر بولی۔ ''اب ایک گھمبیر مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ خپلو کے اس حسین شہزادے کی محبت کے دو دعویدار پیدا ہو گئے تھے۔ بھتیجی کے ساتھ ساتھ اس کی سگی پھپی مسز ولیم جو افتخار کو سموچا نگل جانا چاہتی تھی۔ جو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹکے دیتی اور کہتی افتخار تم جان نہیں پاؤ گے کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں۔''

پر افتخار فلرٹ کرنے والا نوجوان نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسی باتوں کو پسند کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔

ایک دن جب مسز ولیم کسی اہم کام کے سلسلے میں جموں گئی ہوئی تھی مارجوری افتخار سے ملنے آئی۔ دونوں ایک پارک کے ویران سے گوشے میں بیٹھ گئے۔ مارجوری نمناک آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری صورتِ حال اس کے سامنے تھی۔ اس کی پھپی ایسی چنڈال اور بااثر شخصیت تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ افتخار کو اپنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دفعتاً آنسو اس کی سبز آنکھوں سے موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ افتخار نے انہیں اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا اور بولا۔

مارجوری تمہیں اس ترقی یافتہ آسائشوں سے پُر ماحول سے بہت دور ایک پس ماندہ علاقے میں جہاں زندگی کی بیشتر سہولتیں حاصل نہیں رہنا ہوگا۔ کیا تم رہ لوگی؟

مارجوری نے گیلی آنکھوں کو لانبی انگلیوں سے صاف کیا اور بچے جیسی معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''رہ لوں گی!''

جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں رہ لوں گی۔ افتخار کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے چہرے پر قندیلیں جل اٹھی ہوں۔

افتخار نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اپنے سینے سے لگایا اور پوچھا۔ ''مارجوری تمہیں اپنا مذہب تبدیل کرنا ہوگا۔ کروں گی؟''

اور اس نے اس کے سینے پر سر مارتے ہوئے کہا۔ ''میں کروں گی۔''

تب افتخار جھکا اس نے اس کے بالوں پر پیار کیا اور اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''مارجوری تمہیں پردہ کرنا ہوگا۔ کروں گی؟''

''سب کچھ کروں گی۔ تم کہو گے تو آگ میں کود جاؤں گی۔''

اور افتخار نے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''نہیں جانِ افتخار آگ میں نہیں خپلو کے محل میں کودنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

پر مارجوری ان سب کے باوجود فکر مند تھی۔ یہ فکر اس کی آنکھوں میں جھلملاتی تھی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ اس کی سوچوں میں نمایاں تھی۔

''افتخار تم مجھے کیسے حاصل کرو گے؟ یہ انگریز کا دورِ حکومت ہے۔کہیں تمہیں نہ کچھ ہو جائے!''
''ارے احمق! بھلا مجھے کیا ہوگا؟ گھبرایا مت کرو۔ سب ٹھیک ہوگا۔''
اور پھر مارجوری بلز اغوا ہوئی۔ پہلے اسے پنڈی پہنچایا گیا۔ چند دن بعد اسے سرینگر میں ایک ہاؤس بوٹ میں رکھا گیا۔ان دنوں غلام وزیر مہدی (ممبر سابق مجلسِ شوریٰ پاکستان) کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اسے ارکانِ اسلام سکھائے۔وہ ہر روز ہاؤس بوٹ میں پہنچتا اسے قرآن مجید پڑھاتا اور نماز کے بارے میں سمجھاتا۔
ایک دن جب وزیر مہدی اسے قرآن مجید پڑھا رہا تھا اس نے دفعتاً کہا۔''مارجوری، جب آپ چلو چلی جائیں گی تو ہم سے کیا پردہ کریں گی؟''
اور اس نو عمر دوشیزہ نے نہایت متانت سے کہا۔''اس کا انحصار تو افتخار کی مرضی پر ہوگا۔اب مارجوری بلز تو رہی نہیں۔فاطمہ صغریٰ ہے جو شوہر کی مرضی کے بغیر قدم نہیں اٹھائے گی۔''
پھر نکاح ہوا۔گواہوں میں سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر اور غلام وزیر مہدی تھے۔اسے سرخ لباس پہنایا گیا۔سرینگر کے ایک معزز گھر میں طعام و قیام کا بندوبست کیا گیا اور جب افتخار نے سرخ دوپٹا ہٹا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا وہاں آنسو چھلکتے تھے۔
''افتخار مجھے ڈر لگتا ہے میری پھوپی جموں سے آکر طوفان کھڑا کردے گی۔''
''اوہو! اسٹوپڈ۔'' افتخار نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔''تم کیوں ہلکان ہوتی ہو؟ یہ دردسری اب میری ہے کہ مجھے اس بلا سے کیسے نمٹنا ہے؟''
اور پندرہ بیس دن بعد جب مسز ولیم لوٹ کر آئی اور بھتیجی کو غائب پایا تو اس نے آفت مچادی۔اسے جیسے پختہ یقین تھا کہ اسے غائب کرنے میں افتخار کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں۔انگریز لڑکی غائب ہو جائے اور طوفان نہ آئے۔ طوفان آیا پر اس طوفان کے آنے سے پہلے ہی افتخار اسے سرینگر سے لے بھاگا۔جس شام انہیں سرینگر سے روانہ ہونا تھا مارجوری کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں دہشت و خوف کے سائے لرزیدہ تھے۔ وہ آزاد ماحول کی پروردہ لڑکی تھی پر افتخار کی محبت اور مسز ولیم کی دبنگ شخصیت نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔کہیں یہ پھپھی کا جملہ سن چکی تھی کہ میں اسے پاتال سے کھینچ لاؤں گی وہ جائے گی کہاں؟ میرے جیتے جی افتخار کے بازوؤں میں سوئے؟ ممکن ہی نہیں!''
پر مسز ولیم اور اس کے حواریوں کے کانوں میں اس گھوڑے کے سموں کی گرد اڑاتی ہوا کا ایک ننھا سا بگولہ بھی نہ پہنچا جس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ کارگل کے راستے کھرمنگ پہنچی تھی۔
کھرمنگ میں اسے انٹوک کھرمحل کے خوبصورت کمرے میں ٹھہرایا گیا۔
مسلسل گھوڑے کے سفر میں اس کی ٹانگیں خون اتر جانے کے باعث سوج گئی تھیں۔پر اسے تو جیسے کسی دکھ اور مصیبت کی پرواہ نہیں تھی۔وہ ہنستی تھی۔قہقہے لگاتی تھی اور اب اسے شاید یقین ہوگیا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔اس نے محبت کی بازی جیت لی ہے۔اس نے اپنے محبوب کو حاصل کرلیا ہے۔
وہ بھی کیسے دن تھے۔میری زیزی (بلتی زبان میں ماں) بتاتی تھیں۔بڑے راجا صاحب کو معلوم ہوگیا تھا کہ بیٹا ایک انگریز چھوکری بھگائے لارہا ہے۔پر وہ جوانی کے منہ زور گھوڑے پر پندونصائح کی کاٹھی ڈالنے کے خلاف تھے۔اب جب وہ اسے قبول کر بیٹھا تھا تو بلاوجہ ہنگامہ آرائی کرنے کا فائدہ۔پر دادی رانی ماں سخت غصے میں تھیں۔
''شاہ جہاں اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک پتھر کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔دھوپ نے اس کا چہرہ قندھاری انار کی مانند کر ڈالا تھا۔'' ان کا خیال تھا کہ خاندان کے لیے افتخار کا یہ قدم شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے۔اس صبح وہ راجا صاحب سے بھی الجھی تھیں کہ انہوں نے افتخار پر سختی نہیں کی۔بھلا اس ماحول میں ایک انگریز لڑکی کیونکر رہ سکتی ہے۔بھاگ جائے گی وہ چند مہینے رہ کر۔محبت کا سارا جنون صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔''
''دیکھو، محبت انسان کو قربانی دینا سکھاتی ہے۔اگر اسے افتخار سے سچا پیار ہوگا تو وہ نباہ کرے گی۔''
''خاک کرے گی۔'' دادی رانی ماں جھلا ہیں۔
''غصہ چھوڑو اور استقبال کی تیاریاں کرو۔''
شاہ جہاں نے اس وقت مجھے دیکھا اور کہا۔''آج میں سوچتی ہوں دادی رانی ماں کی سوچ کتنی غلط تھی؟''
ہاں تو پھر جاروق (محل میں راجا کے بیٹھنے کی جگہ) میں بیٹھے بیٹھے راجا صاحب نے اپنے ولی عہد یعنی میرے

www.urdusoftbooks.com

سسر راجا فتح علی خاں کو آواز دی۔ جب وہ آئے تو انہیں کہا۔
"جاؤ اپنی زیزی سے کہو کہ اس کے لیے بلتی لباس تیار کروایا جائے۔ یہ لباس انہیں کھرمنگ پہنچائے جائیں۔ میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اپنے لباس میں ہماری سرزمین پر قدم رکھے۔"
پھر بکسوں کی تہوں سے سرسراتے ریشمی کپڑے نکلے۔ ان کی کتر بیونت شروع ہوئی۔ سارا محل راگ و رنگ میں ڈھل گیا۔
مردوں نے محل کے سامنے چھوٹے لان میں تھین کار کی چھ دھنیں بجائیں اور دو دو آدمیوں نے مل کر رقص کیا۔
دونوں ابھی کھرمنگ اپنی پھپھی فاطمہ کے انٹھوک کھر میں ہی تھے۔ خپلو آنے کا اذن ابھی نہیں ملا تھا۔ وہ ہر روز پوچھتی۔ "افتخار ہم تمہارے گھر کب جائیں گے؟"
اور وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہتا۔ ارے بھئی چلے جائیں گے۔ کوئی باہر تھوڑی بیٹھے ہیں۔ باپ کا گھر نہ سہی باپ کی بہن کا سہی۔ پر وہ اندر سے کچھ پریشان بھی تھا۔ اسے تشویش تھی کہ کہیں باپ اور اماں پھڈا نہ ڈال بیٹھیں۔ جس سہ پہر فتح علی خاں نوکروں کے ساتھ پہنچا اور اس نے صورتِ حال واضح کی۔ تب کہیں جا کر ہمہ وقت ذہن میں کلبلاتے اندیشے ختم ہوئے۔
پھر مارجوری کہ جس کا اسلامی نام صغریٰ فاطمہ تھا نے بلتی لباس پہنا۔ بلتی گن مو (قمیص) جس کے کھلے بازوؤں کو وہ شوق بھری آنکھوں سے بار بار بازو اٹھا اٹھا کر دیکھتی تھی۔ اس نے گلے میں فلا اور سر پر بلتی ٹوپی جس پر طومار (منقش زیورات) سجے ہوئے تھے پہنے۔ سر پر چادر اوڑھی۔ افتخار اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔ جب وہ تیار ہو کر افتخار کی طرف مڑی اور بولی۔
"دیکھو تو میں کیسی لگتی ہوں؟"
اس نے سگار اپنے منہ سے نکالا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے نازک شانے دبائے اور بولا۔ "تم خپلو کی ملکہ نظر آتی ہو۔"
وہ ہنسی۔ پر اب افتخار نے سنجیدگی کا روپ دھار کر کہا۔
"مارجوری۔" وہ اسے مارجوری ہی کہتا تھا۔ "دیکھو میری ماں میرے اس قدم پر سخت ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس ماحول میں تم نباہ نہیں کر سکو گی اور ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ دیکھو مارجوری میں نے اپنے خاندان کی حسین ترین لڑکیاں روند کر تمہیں پسند کیا۔ تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر یہ احساس نہیں دلاتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ کرتے ہوئے اندھے جذبات سے کام لیا تھا۔"
مارجوری کا چہرہ پہلے دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑا، سکڑا، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اترے۔ "افتخار تمہاری ماں نے اگر ایسا سوچا تو وہ اپنی سوچ میں حق بجانب ہیں کہ وہ مجھے نہیں جانتیں پر تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ تمہیں میرا اور میرے اندر کے سارے جذبات کا علم ہے۔"
اور وہ اس شدت سے روئی کہ افتخار کو اسے سنبھالنا دوبھر ہو گیا۔ جب وہ اس کی گیلی آنکھوں کو خشک کر رہا تھا مارجوری نے کہا تھا۔
"افتخار۔۔۔ وفا کو تم مشرق کی میراث سمجھتے ہو۔ میں اس پر سے مشرق کی اجارہ داری کو ختم کر دوں گی۔"
پھر وہ پالکی میں بیٹھی اور کھرمنگ سے اس گلیشر کے راستے خپلو میں آئی۔ جو گنگ چھے کہلاتا ہے۔ سارا خپلو اس وقت پولو گراؤنڈ میں جمع تھا۔ رعایا نے ہاتھوں میں تھالیاں پکڑی ہوئی تھیں جن میں ان کی حیثیت کے مطابق نذرانے تھے۔
اس وقت سینو پا کی دھنیں بجنی شروع ہوئیں۔ سات مردوں کا تلوار کے ساتھ رقص کا آغاز ہوا اور کہاروں نے پالکی پولو گراؤنڈ کے سامنے لا کر رکھ دی۔
پردے اٹھائے گئے۔ وہ نکلی۔ پولو گراؤنڈ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس نے رعایا سے تحائف قبول کیے اور ان کی دعائیں لیں، افتخار اس کے ساتھ تھا۔
پھر وہ محل میں داخل ہوئی۔ سسرالی عزیزوں سے ملی اور جب افتخار کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی، وہ اس کے قدموں میں جھکی تھی اس نے اس کے پاؤں پر اپنے مرمریں ہاتھ رکھے اور گلوگیر آواز میں بولی تھی۔
"افتخار، یہ زندگی تمہارے نام رقم ہوئی۔"
اس وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ پینے کے لیے جو پانی ہم بوتل میں ڈال کر لائے تھے اس سے وضو کا ہونا بہت مشکل تھا۔ میں نے شاہجہاں سے پوچھا۔
"کہیں نزدیک پانی ہے؟"
وہ بولی۔
"چلو اس طرف "تھور سے کھر" کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا نیچے جہاں گندم پکی کھڑی تھی۔"
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کمبخت اب پھر مجھے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اترواۓ گی چڑھاۓ گی۔ باز آئی میں تیری زمینیں دیکھنے سے۔"

میں نے تیمم کیا۔ نماز پڑھی۔ یہ حقیقت ہے کہ نماز میں ایسی سپردگی اور ایسا جذب کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جیسا بلتستان، گلگلت، ہنزہ اور نگر کی وادیوں میں۔ شاید خدا کے وجود کا ایک بڑا ذرہ ننگا نظر آتا ہے یہاں۔ انسانی کاریگری اور شان کا فقدان ہی اس کے وجود کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ دعا مانگنے کے بعد میں نے کہا۔ "شاہ جہاں مارجوری بلز کی زندگی کا یہ ایک پہلو تو ختم ہوا۔ میرے خیال میں زوردار قسم کا عشق کرنا تو کوئی معرکے کی چیز نہیں۔ اصل چیز عشق کے بعد اس تعلق اور ناطے کو نباہنا ہے۔ مارجوری کا یہ پہلو بھی دکھاؤ۔"

شاہ جہاں نے بیٹی کو اٹھا کر چورونگ میں ڈالا۔ اسے کمر پر کسا اور بولی۔ "اس پہلو کے بارے میں میری ساس بہتر جانتی ہیں ان سے پوچھنا۔"

پھر ہم دھیرے دھیرے نیچے اتر آئیں۔ اترائی میں بہت دشواری محسوس ہوئی تھی۔ لڑھکنے والی کیفیت تھی۔

محل میں آکر میں نے وہ البم دیکھا جو اس کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ کہیں وہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ کہیں اپنی ساس اور جیٹھانیوں کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ کہیں افتخار کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اس کی وہ تصویر بھی تھی جس میں وہ سفید کفن پہنے سرخ پھولوں سے لدی پھندی خاک ہونے جا رہی تھی۔

میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں مجھے اپنے چاروں طرف اس پھول کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے صفحہ پلٹ دیا تھا۔ ایک اور تصویر ہنستی مسکراتی سبز آنکھوں سے محبت اور خلوص کی بارش کرتی ہوئی سامنے آگئی تھی۔

رات کو مہارانی سے باتیں ہوئیں۔ میں نے وہی سوال کیا تھا جس کے بارے میں شاہ جہاں نے کہا تھا۔

"میری ساس اس پہلو پر زیادہ بہتر بات کرسکتی ہیں۔"

پر ہوا یہ کہ مہارانی نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"بولو اگر تمہیں کسی سے عشق ہو جائے اور اس کے ساتھ کسی ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو بتاؤ رہ سکو گی؟"

میں سٹپٹا اٹھی تھی۔ پر چند لمحے سوچنے اور اپنے آپ میں ڈوبنے کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "میرا خیال ہے نہیں۔ یقیناً میں اتنی ایثار پسند ہو ہی نہیں سکتی۔"

"میری بچی، جو چلو تمہیں آج نظر آتا ہے اس چلو سے بہت مختلف ہے جب مارجوری یہاں آئی تھی۔ تب بجلی نہیں تھی، اسپتال نہیں تھے، سڑکیں نہیں تھیں، لوگ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ جاگیرداری روایات میں پلا ہوا گھرانا تھا جس کی عورتیں محلاتی سازشوں کا شکار تھیں۔ توڑ جوڑ جن کی فطرت تھی۔ وہ بہت غمگسار اور شفیق عورت تھی۔ اسے چلو آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا جب گھر کی ایک ملازمہ نے اس کے اس سوئیٹر کی بہت تعریف کی جو وہ پہنے ہوئے تھے اس نے اشارے سے پوچھا۔

"لوگی؟"

ملازمہ نے اشارہ سمجھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس نے سوئیٹر اتارا اور اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

اس واقعے کو بڑی مہارانی کے کانوں تک پہنچنے میں اتنی ہی دیر لگی تھی جتنی اسے اپنے کمرے میں پہنچنے میں۔ بڑی مہارانی آگ بگولہ تھی۔ فی الفور اسے طلب کیا۔ افتخار کے سامنے اسے وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ بیچاری ہونقوں کی طرح ان کی صورت دیکھتی رہی۔ پھر جب کمرے میں آئی تو افتخار نے پوچھا۔

"تم نے نوکرانی کو سوئیٹر کیوں دیا تھا؟" اور وہ حیرت زدہ سی بولی۔

"اس نے مانگا تھا۔ افتخار بھلا کیسے نہ دیتی؟"

"کل کوئی تم سے مجھے بھی مانگ سکتا ہے۔ دے دوگی مجھے؟"

"تمہیں کیوں؟ کون مانگے گا تمہیں مجھ سے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میری زیزی جو ادھار کھائے بیٹھی ہے۔" افتخار نے تلخی سے کہا۔

"مارجوری یاد رکھو یہاں رہنا ہے تو ہونٹوں کو سی لو اور کانوں کو کھول لو۔"

اور اس نے ہونٹوں کو سی لیا تھا اور کانوں کو کھول لیا تھا اور ساری زندگی اسی انداز میں اس گھر میں گزار دی تھی۔

"کیا کوئی لڑکی ایسا کرسکتی ہے؟ ارے خود ہماری بہو بیٹیاں ایسی نہیں۔"

میں مہارانی کی بات کا کیا جواب دیتی کہ خود مجھے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت تھی۔

Urdu Soft Books

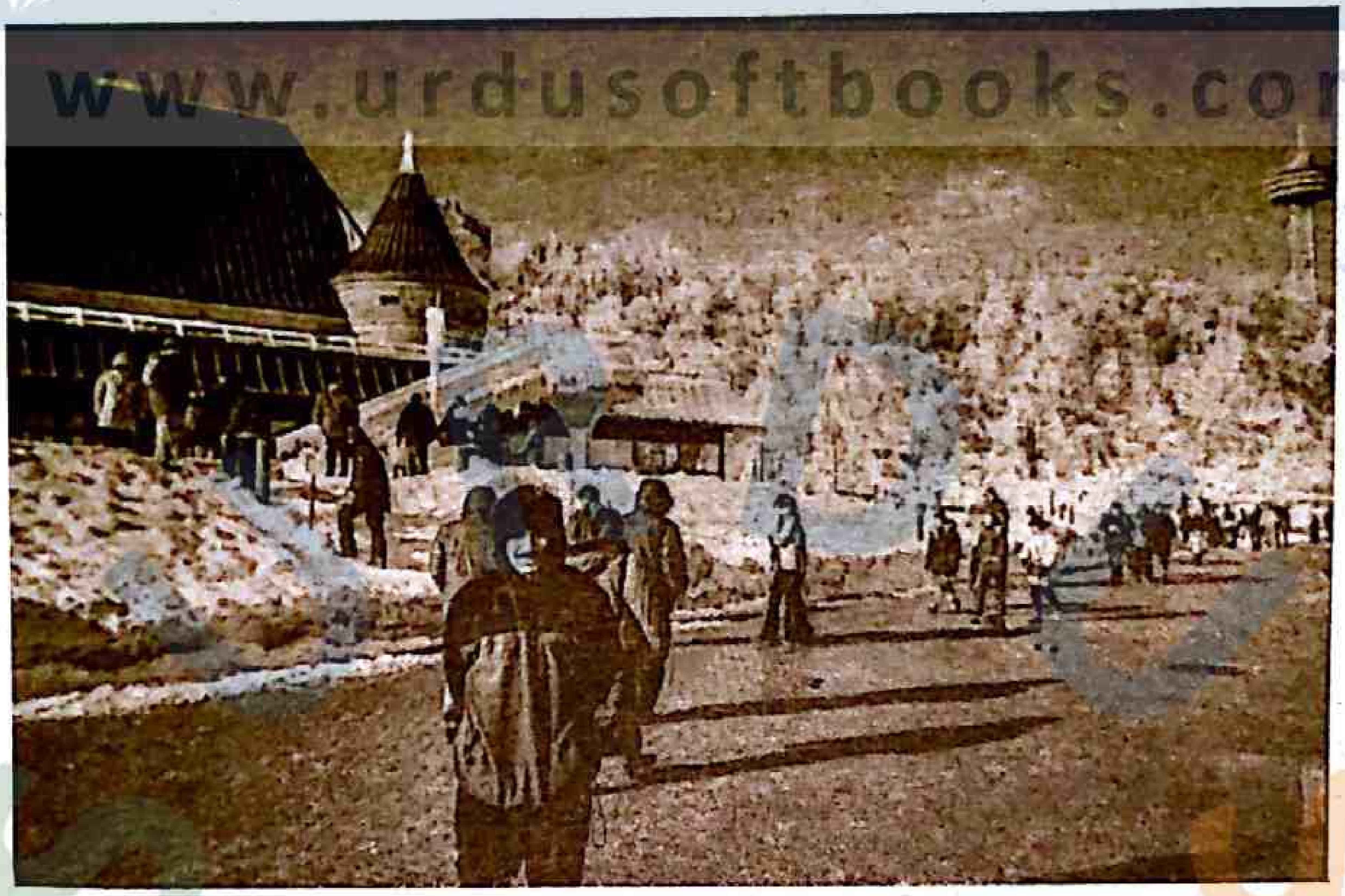

شمشال سے ٹورنٹو

www.urdusoftbooks.com

ندیم اقبال

انسان اگر خود پر غور کرے تو سمجھ آئے کہ وہ کیا نہیں ہے، ناخدا ہے، بحر ہے، کشتی ہے، ساحل ہے یہی نہیں مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساقی بھی ہے، محفل بھی ہے۔ اسی لیے اس نے سوچا کہ اب وہ راہ، رہرو، رہبر ہی نہیں منزل بھی بن کر دکھائے گا۔ اپنے اسی خواب کو تعبیر دینے کے لیے وہ ارضِ پاک سے نکلا، کہ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا، عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا، لیکن عزت کا تاج سر پر رکھنے کے لیے اسے وطن عزیز میں رہ کر جو عزت و شہرت ملی ہوئی تھی، اپنوں کی جو محبت و شفقت کا ہالہ اس کے گرد تھا اسے تیاگنے کے بعد دل کی حالت کیا ہوئی، کن کن مصائب کا سامنا رہا اسی جہدِ مسلسل کی لفظی تصویر۔

ایک الگ انداز کی سفر کہانی کا چوتھا حصہ

یہ خبر ایسی تھی کہ پورے ملک میں ہلچل مچ گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ نواز شریف نے اپنے آرمی جنرل پرویز مشرف کو ہٹا کر کسی اور کو چیف آف آرمی اسٹاف بنا دیا تھا۔ ٹی وی کی نشریات اس خبر کے چند گھنٹوں بعد بند ہو گئیں۔ وہ 12 اکتوبر کا دن تھا۔ ہم سب عجیب مخمصے میں پھنس گئے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ پورا شہر افواہوں کی زد میں آ گیا تھا اور ہر زبان پر نئی نئی خبریں تھیں مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ جس کو کانٹا سمجھ کر نکالا گیا ہے وہی نواز شریف کی حکومت کے تن میں پیوست ہو کر

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

چکا ہے۔
رات گئے خبر آئی کہ فوج نے نواز شریف کو ہٹا کر اقتدار سنبھال لیا ہے۔ میں کچھ دیر تک بے یقینی کا شکار رہا کہ کہیں میری فلائٹ اس سے متاثر نہ ہو جائے مگر میری فلائٹ میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا، اس لیے دل کو تسلی دے دی کہ جو ہونا ہے وہ دو چار دن میں ہو جائے گا۔ فلائٹ کی ڈیٹ تک حالات معمول پر آجائیں گے، اس لیے میں دوبارہ سے بے فکر ہو گیا تھا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آگیا۔ کہیں سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ زندگی اپنے معمول کے سفر پر بڑھتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب میرے ہاتھوں میں میری روانگی کا ٹکٹ آگیا۔

چھ سات مہینے کا میرا خرچ بھی زرمبادلہ کی شکل میں آچکا تھا اور اپنی عدم موجودگی میں فیملی کے لیے بھی میں نے انتظام کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب مجھے صرف اپنے اندر ہمت پیدا کرنی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کینیڈا میں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ بات یہاں تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ جو کسک میرے دل میں تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ میں اپنے بچوں سے کیسے دور رہوں گا۔ میں اپنی چار سالہ بیٹی قندیل کے بغیر ایک دن بھی نہ رہ سکتا تھا۔ وہ آدھی رات کو نیند کی حالت میں اپنے پنگھوڑے سے اپنا ننھا سا تکیہ اٹھا کر گرتی پڑتی میرے پاس آتی اور اپنا ایک ہاتھ میرے چہرے پر رکھ کر سو جاتی تھی۔ اریبہ ابھی چند ماہ کی تھی اور وہ اتنی مانوس نہ ہوئی تھی۔ اپنے کنبے سے جدا ہو کر ایک نامعلوم عرصے کے لیے وطن سے دور جانا ایک بڑا ہی مشکل فیصلہ تھا اور اب بھگتنا بھی مجھے ہی تھا۔

میری دوستی کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ میں نے سوچا کہ چند دنوں کے لیے جا کر اپنے دوستوں سے مل لوں۔ ملتان سے میں نے فارمیسی میں ایم فل کی ڈگری لی تھی اور بہت سے دوست بنائے تھے۔ ان سے ملنے میں ملتان گیا اور پھر لاہور آگیا۔ وہاں میری بہن کا گھر تھا۔ ادھر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ٹورنٹو میں چار سال رہ کر آئے تھے۔ میرے بہت سے سوالوں میں موسم کے سوال پر اس نے کہا۔ ”ٹورنٹو میں سردی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر آپ اپنا چہرہ ڈھانپ کر نہیں نکلتے تو آپ کی ناک کڑک کر نیچے گر سکتی ہے۔“

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ناک بھی کٹ سکتی ہے یا نہیں۔ گھر کی عزت پر حرف آنے سے ناک کٹنے کا سنا تو بہت تھا مگر سردی سے بھی ناک کٹ سکتی ہے۔ پہلی بار سنا تھا اس لیے خوف کی سرد لہر اسی وقت جسم میں دوڑتی محسوس کی اور اس کے سدباب کی تیاری پر کمربستہ ہو گیا۔ یوں بھی میں لکھنو کے بانکوں جیسا بہادر تو تھا نہیں شاید آپ نے بھی لکھنو کے بانکوں کے قصے سنے ہوں گے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں کوئی ایک بانکا نخاس کے چوراہے پر کھڑا ہو جاتا اور پھر آواز لگاتا ہے کوئی ہم سا پھر پانی کا مٹکا اٹھا کر نہانا شروع کر دیتا۔ جواب میں کسی اور محلے کا بانکا دو مٹکے سے نہا کر کہتا ہم ہیں تمہارا جواب۔ ایک نواب کے مصاحب کا بیٹا بانکا بن گیا۔ مصاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ بانک پن چھوڑ دے۔ نواب صاحب نے کہا اپنے بیٹے سے جا کر کہو کہ اگر اس نے روش ترک نہ کی تو میں نخاس میں کھڑا کر کے اس کی ناک کاٹ لوں گا۔ مصاحب نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا اٹھ کر باہر گیا اور کچھ دیر بعد گھر لوٹا۔ بند مٹھی باپ کے سامنے کھولی اور کہا۔ ”یہ رہی میری ناک۔ میں نے نخاس میں کھڑے ہو کر خود کاٹ دی۔“

میں نہ تو اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کاٹ سکتا تھا اور نہ ناک کٹوا سکتا تھا۔ اس لیے سمجھ گیا کہ سردی بلا کی ہوتی ہے اور اس کے سدباب کے اسباب جمع کرنے لگا۔ میرے پاس گرم کپڑوں میں ایک لیدر کی جیکٹ تھی۔ اتنی سردی میں یہ کسی کام کی نہ تھی۔ ہمارے کئی جاننے والے لیدر کی جیکٹ اور اونی جرسیاں لے جاتے ہیں.... جو وہاں کسی بھی موسم میں نہیں پہنی جا سکتی ہیں۔ اتنی بے پناہ سردی سے بچاؤ کے لیے میں نے لاہور کے لنڈا بازار سے ایک بڑا، لمبا اونی کوٹ خریدا۔ گھٹنوں تک آتی اونی جرابیں لیں اور کچھ اونی ٹوپیاں خرید لیں۔ میرا ایک سوٹ کیس تو انہی سے بھر گیا۔ وہ لمبا کوٹ تو میں نے کینیڈا میں ایک بار ہی پہنا اور پھر اس لیے اتار پھینکا کیونکہ جو دوست بھی دیکھتا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ اونی جرابیں مگر اس سردی میں کام آگئیں۔ پھر لاہور میں بہن سے مل کر اسلام آباد آیا، میری فلائٹ بھی اسلام آباد ہی سے تھی۔ لطیف نے کہا کہ وہ فلائٹ سے پہلے ڈیرہ آجائے گا اور کچھ دن اکٹھے گزاریں گے۔ ایک شام اپنی پسندیدہ جگہ جو فیصل مسجد کے پیچھے ہے، وہاں گزاری اور میں اپنی تر آنکھوں سے فیصل مسجد کے مینار دیکھتا رہا کہ یا نصیب یہ فرصت کے لمحات پھر سے لوٹ کر آئیں گے یا نہیں...... اور نہ پھر فرصت کے لمحات ملے اور نہ کبھی تصور جاناں کی مہلت مل سکی۔

وہاں سے پشاور آیا۔ مجھے فلائٹ سے پہلے بھی آنا تھا مگر مجھے اپنی ٹکٹ رشید علی زئی سے اٹھانی تھی۔ میں اس کی ٹریول ایجنسی کے دفتر میں بیٹھا پی آئی اے کے اس بڑے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پوسٹر کو دیکھ رہا تھا جس پر ٹورنٹو کے سی این ٹاور کی فوٹو تھی۔ اس ٹاور کی باتیں میں پہلے بھی سفرنامے میں پڑھ چکا تھا اور اب میں اس کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا۔ دفتر میں ایک صاحب بیٹھے تھے جو ایک بار ٹورنٹو جا چکے تھے۔ وہ مجھے وہاں کے کلب اور ریڈ ایریا کی باتیں بتانے لگے۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی رال بھی ٹپک رہی تھی۔ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا مگر مجھے ان چیزوں سے گھن آ رہی تھی۔ میرے خیال میں انسان کیچڑ میں پھسل سکتا ہے مگر کود نہیں سکتا۔ رشید صاحب نے میرا ٹکٹ مجھے تھما دیا۔ آج کل تو پی آئی اے کی فلائٹ پاکستان سے اڑتی ہے تو سیدھی ٹورنٹو جا اترتی ہے۔ 99ء میں ٹورنٹو کی فلائٹ پاکستان سے ایئر لینڈ کے شہر شینن (Shanon) میں ٹھہرتی ہوئی نیویارک جاتی ہے۔ وہاں کے مسافروں کو اتار کر بقیہ تیس چالیس مسافروں کو ٹورنٹو لے آتی۔ ان دنوں اتنے امیگرنٹس ابھی کینیڈا نہیں پہنچے تھے اور خال خال نظر آتے تھے۔ اب تو پاکستان سے تین فلائٹس ہر ہفتے سیدھا ٹورنٹو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قطر ایئر لائن، ترکش، اتحاد، ایمریٹس بھی ٹورنٹو سے پاکستانیوں کو بھر کر لا رہی ہیں اور لے بھی جا رہی ہیں۔

میں ٹکٹ لے کر ڈیرہ واپس آ گیا۔ ایک ماہ رہ گیا تھا میرے اگلے سفروں کو نکلنے میں۔ دن جیسے جیسے قریب آتے گئے اور میں کمزور پڑتا گیا۔ چند ماہ پہلے جو خوشی اور جذبہ میرے اندر تھا وہ اب مفقود ہو چکا تھا۔ میرا دوست لطیف کچھ دن میرے ساتھ گزارنے کے لیے ڈیرہ آ گیا تھا۔ اس کا گھر دریا سندھ کے کنارے پر تھا۔ ہم دونوں اکثر شام سے پہلے دریا کی ریت پر دور تک چلے جاتے اور جہاں دریا کے پانی ہمیں روکتے ہم وہیں بیٹھ جاتے سامنے مچھیروں کی کشتیاں ہوتیں اور وہاں کوئی بانسری بجا رہا ہوتا۔ وہیں بیٹھ کر ہم اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے لمحات کو یاد کرتے۔ ڈیرہ میں گزرے سب دکھ اور سکھ کے لمحات مجھ پر اترتے۔ کبھی باتیں ہوتیں اور کبھی ایک لمبی خاموشی جو میں آسمان کو تکتے گزارتا۔ میں ایک دو ماہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا۔ جب میں یہ سوچتا کہ کیا کوئی ملک اتنا بھی جاذب ہو سکتا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ کے لیے اپنی سرزمین کو چھوڑ دوں۔

گرمیوں کے دن گزر چکے تھے۔ سردیوں کی آمد تھی۔ مغرب سے سفروں کے مارے پرندے لمبی لمبی اڑان کے بعد دریا میں بنی جھیلوں پر اترتے تھے۔ ان پرندوں نے تو شکار ہو جانا تھا اور جو باقی بچتے وہ واپس لوٹ جاتے۔ میں کیسا پرندہ تھا جس کی منزل یکطرفہ تھی۔ میں شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ جانے کا ارادہ چھوڑتا تو بھی نہ چھوڑ سکتا تھا اور جانے سے بھی ہول سا اٹھتا تھا۔

انہی دنوں میں نے ابو بن ادھم کا ایک واقعہ پڑھا۔ وہ شام کو ہر روز مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ ایک شام ان کو ایک بندہ ملا جس نے بتایا کہ کل میں تجارت کے لیے دور کے سفروں پر نکل رہا ہوں، میرے لیے دعا کریں۔ دعا کی گئی اور وہ اگلے دن چلا گیا۔ تین چار دن بعد ابو بن ادھم نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو اسی شخص کو مسجد میں پایا۔ حیران ہوئے اور پوچھا تم تو ایک لمبے سفر پر تجارت کے لیے نکلے تھے اور واپس کیوں آ گئے؟ اس بندے نے کہا کہ میں جب سفر پر نکلا تو پہلا پڑاؤ شہر سے دور ایک بیابان ویرانے میں ہوا۔ میں نے اپنا اونٹ ایک درخت سے باندھا اور خیمہ لگایا۔ شام کا وقت تھا اور وطن کی یاد میں آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اتنے میں سامنے درخت پر دیکھتا ہوں کہ ایک بیمار چڑیا کا بچہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اڑنے کی سکت نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس کو اللہ کیسے رزق دیتا ہوگا؟ یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھا اور ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی۔ اس کی چونچ میں دانہ تھا۔ اس نے وہ دانہ اس بیمار چڑیا کے بچے کے منہ میں ڈالا اور پھر پھر اڑتی ہوئی کہیں دور چلی گئی۔ وہ بندہ حضرت ادھم سے کہنے لگا کہ میں نے سوچا کہ اگر ایک بیمار چڑیا کو اللہ اس کے گھونسلے میں رزق دے سکتا ہے تو مجھے کیا اپنے وطن میں نہیں دے سکتا؟ اور یہی سوچ کر میں واپس آ گیا۔ یہ سب سن کر حضرت ادھم نے اس سے کہا کہ تم اپنے آپ کو اس بیمار چڑیا کی جگہ کیوں رکھتے ہو؟ اس توانا چڑیا کی جگہ کیوں نہیں رکھتے جو کھلے آسمانوں میں اڑ کر اپنا رزق بھی تلاش کرتی ہے اور ناتواں اور بیمار چڑیا کا رزق بھی اللہ کے حکم سے اس کے منہ میں ڈالتی ہے۔ یہ سن کر وہ بندہ رونے لگا اور اگلے دن رزق کے لیے لمبے سفر پر نکل گیا۔

یہ پڑھ کر میرے اندر بھی کوئی احساس اترا اور دل و دماغ پر بیٹھ سا گیا۔ کیا معلوم میرا رب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ یہ سارے کام اس ذات نے ایک کمال سے پورے کیے ہیں تو یہی اس کی مصلحت ہے۔ اس سے میرا حوصلہ قدرے بہت بلند ہو گیا اور صرف بچوں سے جدا ہونے کی خلش دل میں رہ گئی۔

میرے جانے کے دن جیسے جیسے قریب ہوتے گئے، میں اتنا ہی اداس ہوتا گیا۔ انہی دنوں طارق نے نیویارک سے فون کر کے کہا کہ جمال بھی آج کل ٹورنٹو میں ہوتا ہے اور نو

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پھر اس کا فون نمبر بھی دے دیا۔ جمال ناصر سے میری دوستی کبھی نہ رہی تھی۔ وہ مجھ سے تین کلاسیں آگے تھا اور وہ دوسرے اسکول میں پڑھتا تھا مگر وہ اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کیپٹن تھا اور بعد میں جب میں فارمیسی کرنے کے لیے یونیورسٹی گیا تو وہ وہاں کی ٹیم کا کیپٹن بن چکا تھا۔ میں نے اسے زندگی میں کم ہی دیکھا تھا اور مجھے اس کی اتنی ہی شکل یاد تھی کہ سانولے رنگ کا لمبا سالڑکا جو ہمیشہ دوستوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس کے دوست بہت تھے اور ہمیشہ اونچی آواز میں بات کرتا تھا۔ کراچی کا رہنے والا ڈیرہ میں پلا بڑھا تھا اور مکمل ڈیرہ والا بن گیا تھا۔ سرائیکی بولنا اور وہ بھی ڈیرہ والے اسٹائل میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس زمین کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ معلوم نہیں کب پاکستان چھوڑ کر یورپ گھومتا رہا اور پھر امریکا میں جا بسا۔ اس کے ایک بھائی کے گردے ختم ہوگئے اور اس کا بھائی زندگی کی بازی ہارنے لگا۔ جمال نے لندن جاکر اپنے گردے کی قربانی دی مگر بھائی جانبر نہ ہوسکا۔ وہ امریکا آیا اور کینیڈا کی امیگریشن بھی لے لی۔ ایک دن امریکا میں جاب پر تھا کہ بے ہوش ہوگیا۔ لوگ اسپتال لے گئے اور ٹیسٹ ہوئے تو معلوم ہوکہ باقی ماندہ ایک گردے نے بھی کام کرنے سے جواب دے دیا ہے۔ امریکا میں اس کے پاس انشورنس نہ تھی۔ اللہ کا کرم تھا کہ کینیڈا کی امیگریشن موجود تھی۔ کینیڈا میں ہر شہری کو طبی سہولیات فری ملتی ہیں تو اس کو کینیڈا لایا گیا۔ زندگی سے جنگ کرتا رہا۔ نہایت دلیر انسان تھا اور اللہ کی مدد سے سنبھل گیا پر مکمل طور پر ڈائیلیسس (Dialysis) پر آگیا۔ میں جب کینیڈا پہنچا تو اس کے باتھ روم میں ڈائیلیسس کا سامان موجود تھا۔ پھر اسے کچھ انفیکشن ہوگیا مگر اللہ کے فضل سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گردے کی پیوند کاری کے لیے لائن میں تھا۔ جن دنوں میں کینیڈا پہنچا تھا تو اللہ نے اس کو ایک خوبصورت سی بیٹی کی خوشی بھی دی تھی۔ میں کینیڈا سے امریکا آگیا۔ جمال اپنی فیملی کے ساتھ میرے پاس آتا رہتا تھا اور ہم بھی ٹورنٹو اسی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ایک بار مجھے پاکستانی کرسچن سوسائٹی والوں نے فون کیا کہ انڈیا کا مشہور کامیڈین جانی اولیور آرہا ہے۔ چند لوگ ہیں اور آپ بھی تشریف لائیں۔ میں نے جمال کو بھی فون کر کے بلوالیا کہ میں اکیلے کیا کروں گا اور تم بھی آجاؤ تو وہ بھی آپہنچا۔ جانی بھائی نے کچھ آئٹم کیے اور خوب ہنسایا۔ پھر وہ اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے بتاتے یہ کہنے لگا کہ اللہ نے اس کی دعا میں بڑی شفا رکھی ہے۔ اس نے کچھ اپنے تجربات بتائے کہ کس طرح مریض مجھ سے ملے اور میں نے دعا کی اور وہ اللہ کے کرم سے شفایاب ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو عیسائی ہے۔ اس کی دعا اللہ کیسے سن سکتا ہے۔ ہم کوئی بیس پچیس لوگ جو خصوصی مہمان تھے وہ ڈنر کے لیے ایک اور کمرے میں آگئے۔ جمال بھی ساتھ تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ پچھلے پانچ سال سے اس انتظار میں ہے کہ کب اسے میچ کرتا گردہ ملے اور اس کا ٹرانسپلانٹ ہو۔ مجھے اپنی طرف سے ایک مذاق سوجھا اور میں نے جانی اولیور کو بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا اور بولا۔ ”جانی بھائی! اللہ نے آپ کی دعا میں تاثیر رکھی ہے اور میرے دوست کا یہ مسئلہ ہے۔ مہربانی کر کے اس کے لیے دعا کریں۔“

جانی بھائی نے کہا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

میں نے اشارے سے جمال کو بلوایا تو جانی نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھا۔ میں اور جمال ہنسی روکے کھڑے تھے۔ کچھ پڑھنے کے بعد جانی بولا۔ ”کام ہوگیا۔“

ہم نے کھانا کھایا، جانی بھائی کا شکریہ ادا کیا اور واپس قہقہے لگاتے گھر آگئے۔ جمال اگلے دن ٹورنٹو چلا گیا۔ دو دن بعد میں نے اسے فون کیا کہ معلوم تو کروں کہ خیریت سے پہنچ تو گئے ہیں۔ بھابی نے فون اٹھایا۔ میں نے پوچھا کہ جمال کہاں ہے تو کہنے لگیں۔ ”کل رات دو بجے اسپتال سے فون آیا تھا کہ کسی ایکسیڈنٹ کے ہلاک بندے کا گردہ جمال سے میچ کررہا ہے اور ابھی پہنچو اور اسی وقت جمال کو گردہ لگ گیا۔“

میں حیرت سے گنگ ہوگیا اور پھر مجھے قرآن پاک کی پہلی آیت یاد آئی۔ ”تعریف اس خدا کی جو سب جہانوں کا رب ہے۔“ وہ سب کیسے ہوا؟ اس کا جواب تو ایک ہی ہے کہ یہ اس رب کی ذات نے کیا جس کے ایک اشارے پر تمام کائنات چل رہی ہے اور کیا اس میں جانی اولیور کی دعا کا اثر نہیں تھا؟ یہ فیصلہ آپ لوگ خود کریں۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں اور توحید میرے ایمان کا حصہ ہے اگر میں کہوں کہ جانی بھائی کی دعا بھی لگی تھی تو اس میں میرے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔ یہاں جمال کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ میرا ایسا دوست بن گیا تھا کہ میں ذہنی دباؤ میں اسی کا سہارا لیتا تھا۔ آج کل بھی ہم ایک دوسرے سے فون پر یا مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ بات سے بات نکل رہی ہے اور یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ سب کردار ٹورنٹو کے سفرنامے میں آپ کو نظر آئیں گے۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا اور میرے دل کے موسم قابل اعتبار نہ رہے تھے۔ کبھی جوش اور ولولہ ابھر آتا اور کبھی افسردگی

www.urdusoftbooks.com

اتر آتی۔ میری ٹکٹ کنفرم ہوئی تو میں نے طارق کو نیویارک فون کر کے اطلاع کر دی تاکہ وہ ٹورنٹو میں سہیل مفتی کو بتا دے کہ میں 26 نومبر کو پہنچ رہا ہوں۔ میں نے ناتجربہ کاری سے ایسے سوٹ کیس لے لیے تھے جو اگر خالی بھی ہوتے تو آٹھ کلو وزن کے ہوتے۔ ایک میں میر النڈے سے خریدا لانگ کوٹ، لیدر کی دو جیکٹس اور تھوڑا بہت اور سامان آ گیا۔ دوسرے میں میرے چند کپڑے اور باقی تحائف سے ہی وہ سوٹ کیس فل ہو گیا۔ میری فلائٹ میں دو تین ہفتے رہ گئے تھے میری فلائٹ میں اور میں دن کو لوگوں کی مبارکبادیں وصول کرتا اور رات کو سوچوں میں گم ہو جاتا۔ بچوں کو اپنے ساتھ رکھتا۔ در و دیوار کو تکتا، تکیے میں منہ چھپا کر چپکے سے آنسو بہا لیتا، بچوں کو اپنے سے لپٹائے رکھتا تھا۔

ایک دن لطیف مجھے اور نانگا پربت کے ساتھی شاہ جی کو دریا پر لے گیا۔ دریا کی لہریں مدھم پڑ گئی تھیں اور بہاؤ کم ہو گیا تھا اور دریا اپنے کناروں سے دور کہیں پرے ہو کر بہہ رہا تھا۔ لطیف اور شاہ جی نے باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ کوئلے، انگیٹھی، پانی اور مسالا لگا گوشت اور سب سے خوبصورت چیز دور ایک ویرانے میں جنگلی گھاس سے بنا دریا کے پانیوں سے کچھ پہلے ریت کے ٹاپو میں ایک خالی جھونپڑا جو سوکھے دریا کی ریت میں کسی مقبرے کی طرح اکیلا اور خالی کھڑا تھا۔ بادل گھر آئے تھے اور ہم اس جھونپڑے کے اندر بیٹھے دور بہتے پانیوں اور اس پر تیرتی مچھیروں کی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے اور شاہ جی باربی کیو تیار کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا بادلوں کو گھیر کر ہمارے جھونپڑے کے آسمان پر لے آئی تھی اور ان کے پانی مینہ کی صورت برسنے لگے۔

دور دور تک کسی جاندار کا وجود نہ تھا۔ شاہ جی میرے اتنی دور جانے کے خلاف تھے۔ وہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی پر تکوں کی سیخیں پلٹاتے ہوئے ناراضگی سے میری جانب اشارہ کر کے کہہ رہے تھے۔ ”میں اسے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کیا دھرا ہے فرنگیوں کے ملک میں، پھر سے کسی اور کے ٹو پر چڑھتے ہیں۔ خیمے لگاؤں گا اور میں خود باربی کیو بھی اس کے لیے کروں گا...... مگر یہ کہتا ہے کہ میں فرنگیوں کو اسلام کی تعلیم دوں گا اور دنیا بھی دیکھنی ہے اور انگریزوں کو اسکول میں بھی پڑھانا ہے۔“

اگر شاہ جی کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں تبلیغ کے لیے نہیں یا کسی اسکول میں پڑھانے نہیں بلکہ صرف اللہ کی کائنات دیکھنے جا رہا ہوں تو وہ میرے ارادے کے آگے سیسہ پلائی دیوار

نت نئے کرداروں کو الفاظ کے حسین قالب میں ڈھالتی پُراثر اور حساس تحریروں کی خالق

ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی

مایہ ناز مصنفہ محترمہ

رفعت سراج

کے مشّاق قلم کا ایک اور شاہکار ناول

عظیم شاعر مرزا اسد اللہ غالب

کی لازوال شاعری کے ایک

قطعے سے مستعار لیا عنوان

یہ......

کہاں بچیں کہ دل ہے

انشاء اللہ بہت جلد پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

بن جاتے...... پھر کہنے لگے۔ "یہ اپنے ارادے سے باز نہیں آتا جب ٹھان لے تو اڑ جاتا ہے۔ ہم سب فیری میڈو جانے کے مخالف تھے مگر یہ ہی ہمیں لے گیا۔" اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاہ جی بولے۔ "اس کا تو میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا کہ اس نے مجھے دنیا کے خوب صورت مناظر دکھائے۔

یہ شہر کتنا چھوٹا اور کتنا خوبصورت ہے اس کا اندازہ میں آج کرتا ہوں۔ ہم چادروں میں لپٹے کوئلوں کی آگ سے اپنے آپ کو گرم رکھتے اور باربی کیو گوشت کی مہک دھوئیں کے ساتھ نتھنوں میں اترتی تھی۔ اس دن بارش بہت زور سے برسی اور میں خاموش بیٹھے سامنے ریت میں جذب ہوتے پانی دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ ماحول، یہ مخلص دوست اور یہ محفلیں دوبارہ میرے نصیب کی کتاب کے کسی دوسرے صفحے پر لکھی ہیں یا نہیں؟

بارش برستی رہی اور میں یادوں میں بھیگتا رہا۔ شام اتری اور بارش تھم گئی۔ جب ہم واپس گیلی ریت پر چلتے آرہے تھے تو میں اندر سے بھیگ چکا تھا۔ اتنا سارا پانی میرے اندر جذب ہوگیا تھا جتنا اس ریت نے بھی جذب نہ کیا ہوگا۔ میں نے یہ پانی سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ جب میں کہیں تنہا اور افسردہ ہوں گا تو یہی پانی میرے اندر سلگتی یادوں کی تپش کو کم کرنے میں میری مدد کریں گے۔

ایک دن میرا کزن کہنے لگا کہ ہمارے واپڈا کا ایک ایکسیئن (En_Ex) بھی اگلے ماہ امیگریشن لے کر ٹورنٹو جارہا ہے اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اتنی بڑی پوسٹ پر فائز ایک ایکسیئن کیوں جانا چاہتا ہے؟ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ دوسرے دن ایک پرانی موٹر سائیکل پر سوار ایکسیئن صاحب ملنے آئے۔ اس سے ان کی ایمانداری کا اندازہ ہوا تھا۔ میرے سامنے عجز وانکساری کا پیکر بنے بیٹھے تھے۔ انتہائی شریف النفس انسان دکھتے تھے۔ ایسے بیٹھے تھے کہ جیسے مجھ سے ادھار مانگنے آئے ہوں۔ اور میری کسی بات پر نظریں اٹھا کر ایک لمحے کو میری جانب دیکھتے اور پھر سمٹ کر نظریں جھکا دیتے۔ دبلے پتلے، چھوٹی جسامت کے شاہد صاحب کہتے تھے۔ "سر جی! سنا ہے آپ ٹورنٹو جارہے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے ملاقات کرلوں کیونکہ میں بھی اگلے ماہ ٹورنٹو جارہا ہوں۔"

سر جی ان کا تکیہ کلام تھا، ہر ایک کو سر جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں ٹھہریں گے۔" تو فرمانے لگے۔ "سر جی! میری سالی کے خاوند نیو یارک میں بہت بڑا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ ٹورنٹو مجھے لینے آئیں گے اور میں ان کے ساتھ نیو یارک چلا جاؤں گا اور وہیں کاروبار کروں گا۔ مجھے ٹورنٹو میں نہیں رکنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو آپ کے لیے بہت اچھا ہوجائے گا۔" پھر میں نے سہیل مفتی کے گھر کا فون نمبر انہیں دے دیا اور کہا کہ میں اسی نمبر پر ہوں گا اور رابطے میں رہنا۔ زندگی میں کئی اتفاق ایسے بھی ہوتے ہیں جو بعد میں آپ پر بہت زیادہ اثر چھوڑتے ہیں۔ شاہد صاحب کے ساتھ بعد میں جو کچھ ہوا وہ بہت سے لوگوں کے لیے سبق آموز بھی ہوگا اور آنکھیں کھولنے کے لیے اس میں بہت سے پیغام بھی پوشیدہ ہوں گے۔ یہ میں وقت آنے پر آپ لوگوں کو بتاؤں گا بس تھوڑا سا انتظار کریں اور پھر یہی سر جی میرے دوست بن گئے اور ہم نے بہت سے سفر اکٹھے کیے۔

میری ہجرت کے دن قریب آرہے تھے۔ میری بیوی سمیہ مجھے کم دیکھتی تھی تاکہ اس کی آنکھوں میں اترے آنسو کہیں میں دیکھ نہ لوں۔ قندیل کو کچھ معلوم نہ تھا کہ بابا اسے چھوڑ کر دور بہت دور جانے والے ہیں اور وہ توتلی زبان میں مجھ سے لپٹی کچھ نہ کچھ ہمیشہ کی طرح کہتی رہتی تھی۔ اریبہ پنگھوڑے میں پڑی مجھے پہچاننے کی کوشش کرتی تھی اور پھر وہ دن آگیا جب صبح میری فلائٹ ڈیرہ اسماعیل خان سے پشاور کو جانی تھی۔ وہاں سے اگلے روز اسلام آباد اور پھر سات سمندروں پار......

رات مجھے نیند نہ آسکی۔ سمیہ بھی اداس تھی کیونکہ میں اس کو کوئی ٹائم فریم نہ دے سکتا تھا کہ کب انہیں اپنے پاس بلوا سکوں گا۔ میں کتنا ان کو فون کرسکوں گا۔ ان دنوں فون کے چارجز بہت زیادہ تھے۔ دو ڈالر میں ایک منٹ بات ہوتی تھی، نہ آج کل کی طرح فیس بک تھی اور نہ وایبر تھا۔ آپ نارتھ امریکا گئے تو پاکستان کی ہر چیز سے کٹ جاتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ ان حالات میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں دور جا بسنا۔

صبح اداسی سے بھرپور تھی۔ گھر میں سب خاندان کے لوگ مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع تھے۔ قندیل اتنے سارے لوگ اکٹھے دیکھ کر خوشی سے چہک رہی تھی اور میرے لیے یہ مشکل تھا کہ میں کس طرح اپنی بیٹی کو گلے لگا کر اس سے رخصت ہوں گا۔ سب لوگ دعائیں دے رہے تھے اور پھر دو کاروں میں ایک قافلہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے ر

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

نکلا۔ ایئرپورٹ پر سب ایک جانب اداس کھڑے تھے اور میں پھیکی ہنسی سجائے سب سے مل رہا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آ گیا۔ دل رنجیدہ تھا جیسے مجھ سے بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ قندیل کو میں نے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس معصوم کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو بہت پیار کیا اور پھر گود سے اتارا اور بورڈنگ کارڈ لے کر آگے بڑھا۔ قندیل نے اچانک مجھے جاتے دیکھا تو میرے پیچھے دوڑی۔ میرے بھائی نے پکڑ کر اسے اٹھا لیا۔ وہ دونوں بازو میری جانب پھیلا کر رونے لگی اور میں اندر ہی اندر سسکتا ہوا ویٹنگ روم میں آ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ یہ میری زندگی کا بہت بھاری اور کمزور لمحہ تھا جسے میں مصنوعی طور پر طاقت ور بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاز نے پرواز کی تو میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ جو گاڑی مجھے چھوڑنے آئی تھی وہ رن وے کے ساتھ والی سڑک پر کھڑی ہے۔ سب ہاتھ ہلا ہلا کر اس جہاز کو الوداع کر رہے ہیں اور قندیل کار کے بونٹ پر بیٹھی دونوں ہاتھ جہاز کی جانب بڑھائے رو رہی ہے اور اتنے میں جہاز نے رخ بدلا اور پشاور کی جانب پرواز کر گیا۔

چالیس منٹ کی فلائٹ کے گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میں اپنے اندر ایک تلاطم لیے پشاور اترا۔ بہن کا گھر ایئرپورٹ کے ساتھ تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی سعید جان بھی ملنے آئے ہوئے تھے۔ سعید جان پشاور میں کسی انشورنس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میری طرح گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور کئی بار یورپ، امریکا اور کینیڈا جا چکے تھے۔ ان کا ذکر بھی اس داستان میں آئے گا کیونکہ ان سے جڑی کئی کھٹی میٹھی یادیں ہیں، وہ دس سال میں پانچ مرتبہ میرے پاس کینیڈا اور امریکا آ چکے ہیں۔

پشاور کی وہ شام اداسی کے اندھیرے لیے اتر آئی تھی۔ لوگ، گلیاں، سڑکیں اور آسمان...... سب مجھ سے زیادہ افسردہ تھے۔ سفر تو مجھ میں ولولہ بھرتے تھے مگر یہ کیسا سفر تھا جو میری چاروں جانب افسردگی بھر رہا تھا۔ حالانکہ ابھی میں پاکستان میں تھا مگر سوچوں کے دائرے اپنے گھر کی جانب تیرتے جاتے تھے۔ میں بہن کے گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے گھر بات کرنی تھی اور میں اپنے اندر کے درد کو ظاہر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ ایک پی سی او سے گھر فون کیا تو سمیہ نے اٹھایا۔ بچوں کا پوچھا تو بتایا کہ قندیل روتے روتے سو گئی ہے۔ میرے بھتیجے فہد نے اپنے آپ کو ڈرائنگ روم میں بند کر لیا تھا اور وہاں سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں بیوی کو تسلی دیتا رہا اور وہ میری ہمت بڑھاتی رہی، ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ سب جھوٹی تسلیاں ہیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا اور گلی میں ویرانگی پھر رہی تھی جب میں گھر واپس آیا۔ کل صبح میری پشاور سے اسلام آباد کی فلائٹ تھی اور پھر رات ایک بجے اسلام آباد سے ٹورنٹو۔

دراصل میں نے سفرنامے اتنے زیادہ پڑھ لیے تھے جس میں چمکتے ایئرپورٹ، صاف ستھرے اور خوشبوؤں سے لپٹیں لڑکیاں، مہذب دنیا، اشیاء سے بھرے بڑے بڑے اسٹور مختلف مزاج کے لوگ جو ہر بات پر مسکرا کر آپ سے پیش آتے ہیں۔ میں یہ سب پڑھ پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی یہ سب دیکھنا تھا۔ میں بھی ان سب چیزوں کو دیکھ کر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی لوگوں کے مزاج، نظام کی افادیت، کھلے موسم، رنگین نظارے، شفاف جھیلیں اور آرام دہ زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا اور یہی اشتیاق مجھے پاکستان سے باہر لے کر جا رہا تھا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ میرے باہر جانے میں پیسے کمانے کی رتی برابر بھی تمنا نہ تھی۔ بس صرف یہی کہ ایک چھوٹا سا خوبصورت سفر ناموں والا گھر اور ایک گاڑی اور گھر کے خرچ چلانے کے لیے مناسب پیسے ملتے رہیں تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ میں اپنا پرانا ٹینٹ بھی ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ یہ وہی ٹینٹ تھا جو کئی ٹریک میں ہمسفر رہا تھا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میرا اپنا سامان بہت کم تھا۔ مجھے اس ٹینٹ میں کیمپنگ کرنی تھی اور میں نے بعد میں کی بھی۔ جب میں نے امریکا میں اپنا گھر لے لیا تو اس ٹینٹ کو خوب استعمال کیا۔ جب کیمپنگ کو نہ جا سکتا تو گھر کے پیچھے لان میں ٹینٹ لگا لیتا اور گھر کو لاک کر دیتا کہ کوئی گھر میں واش روم کی ضرورت کے علاوہ نہیں جائے گا۔ پھر ٹینٹ میں لالٹین روشن کر کے ہم اپنی کیمپنگ کرتے۔ باہر فولڈنگ کرسیاں رکھتا۔ کوئی بچہ کتاب پڑھ رہا ہے اور کوئی کھیل رہا اور بیوی غصے سے گھور رہی ہے۔ ایک دلچسپ زندگی ہو جاتی۔

رات پشاور میں نیند اور جاگ کی کیفیت سے دوچار رہا۔ صبح جلدی اٹھ کر نماز ادا کی۔ بارہ بجے فلائٹ تھی۔ سعید جان بھی مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے آ گیا۔ سب سے مل کر میں پشاور ایئرپورٹ پر بیٹھا اپنی اسلام آباد کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاز میں بیٹھا تو میرے اندر کا سفرنامہ نگار بیدار ہو گیا تھا۔ میں مسافروں کی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا

www.urdusoftbooks.com

تھا۔ ان کی نفسیات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور باقاعدہ ایک ادیب سا بنا بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ ایک صاحب بیٹھے تھے۔ میرے علاوہ سارا جہاز ٹی وی کے اداکاروں سے بھرا تھا۔ یہ سب اپنے ایوارڈ لینے اسلام آباد کی کسی تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ ٹی وی کا ایک نامور اداکار بیٹھا تھا۔ نام نہیں بتاؤں گا۔ اس نے میرا نام پوچھا اور پھر جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکال کر میرا نام لکھا اور ساتھ ہی دن، تاریخ اور ٹائم لکھا۔ میں حیرت سے یہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور کاغذ پر اس ڈرنک کا نام لکھا اور ساتھ میں وقت، مقام اور تاریخ لکھی۔ پھر کہنے لگا۔ ”میرے ایک دوست نے بھی لاہور سے آنا تھا مگر اس کی فلائٹ مس ہوگئی۔“ پھر مشروب کی چسکی بھرتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید اس کی قسمت میں یہ مشروب نہیں تھا۔“ میں اپنے لمبے سفر کا درد ایک طرح سے بھول کر اس کی حرکتیں دیکھتا اور سنتا رہا۔ اگر پچیس منٹ میں اسلام آباد نہ آتا تو وہ فنکار معلوم نہیں اپنے فن کے کیا کیا جوہر دکھا چکا ہوتا۔

اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اترا تو ابھی میری ٹورنٹو کی فلائٹ میں بارہ گھنٹے باقی تھے۔ ایئرلائن والوں نے مجھے مرینا ہوٹل میں ایک کمرا لے دیا۔ میرا اسٹوڈنٹ مسعود بھی ایئرپورٹ آیا ہوا تھا۔ سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھا تو اتنے میں میرے فیری میڈو کے ٹرپ کا ساتھی اشفاق آگیا۔ ان دونوں نے مجھے باہر جانے کی میری خواہش پوری ہونے پر مبارک باد دی اور میں نے تحمل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جناح سپر سے میں نے ڈھیر ساری ڈی وی ڈیز خریدیں جن میں بیشتر فلمیں تھیں۔ آج بھی میرے پاس وہ سب اپنے اوریجنل پیک میں پڑی ہیں جنہیں آج تک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

پھر میں اور مسعود لطیف کے گھر آئے۔ وہاں اس کی بیوی نے میرے کپڑے استری کیے۔ میں نے غسل کیا۔ لطیف بہت اداس تھا۔ وہ بھی ڈیرہ کا رہنے والا تھا اور جب بھی چھٹیوں میں ڈیرہ آتا تو سارا دن ہم اکٹھے رہتے۔ عید کے دن ہم گھر سے باہر نکلتے تو رات ایک بجے گھروں کو لوٹتے تھے ہمارا ٹھکانہ عید کی رونقیں دیکھنے کے بعد دریا سندھ کا کنارہ ہوتا یا ہم اپنے دوست شاہ جی کی دکان پر بیٹھ کر لوگوں کو عید کی خریداری کرتے دیکھتے۔ چاند رات کو دو بجے رات تک ہم وہیں بیٹھے رہتے۔ لطیف اسلام آباد چلا جاتا تو پھر میں اور شاہ جی ہر شام کو دریا کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرتے جس میں، میں ہی زیادہ بولتا تھا۔ کبھی نانگا پربت اور کبھی شمشال اور اکثر کینیڈا کا ذکر ہوتا۔ آج لطیف خفا تھا کیونکہ دو ماہ بعد چھوٹی عید آنے والی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ بیس سالوں کے معمول کو وہ کیسے تبدیل کر پائے گا۔ مجھے بھی یہی یادیں ناگ کی طرح ڈستی تھیں۔ لطیف کی باتیں سن کر میں کمزور پڑ رہا تھا۔ آج کے بعد میری زندگی میں کئی نئے موڑ آنے والے تھے۔ میں سوچتا کہ یہ نشیب و فراز میں کیسے عبور کر پاؤں گا۔ یہاں میری زندگی ایک ڈگر پر گزر رہی تھی۔ گزارہ اچھا ہو رہا تھا۔ سوچتا یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں کہ ایک لگے لگائے معمول کو توڑ کر ایک انجانی دنیا کے سمندر میں چھلانگ لگانے جا رہا ہوں۔ مجھے تو اس نئی دنیا کے سمندر کی تیراکی بھی نہیں آتی تھی۔ ایک اللہ کی مدد کا سہارا تھا جو میں یہ قدم اٹھا بیٹھا تھا۔

لطیف کے گھر رات کا کھانا کھایا مگر نوالے مشکل سے حلق میں اتر رہے تھے۔ لطیف سے جب گلے مل رہا تھا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیا پتا یہ مخلص دوست دوبارہ کب ملے۔ یہی سوچتا ہوا میں مسعود کی گاڑی میں آ بیٹھا جس کو وہ اسٹارٹ کیے میرا انتظار کر رہا تھا۔

ہم وہاں سے مرینا ہوٹل واپس آئے۔ میں سارے راستے خاموش رہا۔ پنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں کو دیکھتا رہا۔ فیض آباد سے گزرا تو مجھے چند سال پہلے کے وہ لمحات یاد آگئے جب کینیڈا ایمبیسی نے میرا وزٹ ویزا لینے کی درخواست مسترد کر دی تھی اور میں ایک پاگل پن میں فیض آباد کی چھپر مارکیٹ میں خالی دماغ گھوم رہا تھا۔ اس کے بعد امریکا والوں نے بھی ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دن ایسے تھے کہ جیسے خدانخواستہ میری دنیا لٹ گئی ہو اور آج اسی کینیڈا نے مجھے مستقل رہنے کی اجازت دے دی تھی اور آج میں کینیڈا جانے پر مغموم تھا۔ انسان کسی بھی حالت میں شکر گزار نہیں رہ سکتا۔

ابھی فلائٹ کے جانے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ مسعود واپس آنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔ میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر بیڈ پر سیدھا دراز ہو کر سوچوں میں گم ہوگیا۔ میں تو بڑے باعزت طریقے سے کینیڈا جا رہا تھا اور اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ لوگ کیسے غیر قانونی طور پر سات سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ کس طرح وہاں دھکے کھاتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں تو ہولڈنگ سینٹر اور جیلوں میں رہتے ہیں۔ ان کی اولادیں اور والدین آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ بیٹا کب اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کرے گا۔ یہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب میں کینیڈا میں امیگریشن ہولڈنگ

Urdu Soft Books

سینٹر میں سیکیورٹی کی جاب کرتا تھا۔ پاکستانی، انڈین، مشرقی یورپ، ساؤتھ امریکا اور روس کے لوگ کس طرح جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے بھی بچے ہوتے ہیں مگر کس طرح وہ ان سے بے پروا ہو کر ایک جدوجہد میں زندگی کے قیمتی لمحات کو غرق کررہے ہوتے ہیں اور حاصل کیا ہوتا ہے کہ فیکٹریوں میں کوئی سخت مزدوری کررہے ہوتے ہیں۔

مسعود اپنی گاڑی لے کر آیا تو ساتھ پی آئی اے کی گاڑی بھی مجھے لاد کر لے جانے کے لیے آ پہنچی۔ سامان ایئر لائن کی گاڑی میں رکھا اور ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں اشفاق بھی آیا ہوا تھا۔ میں اپنا سامان زمین پر رکھے اس گیٹ کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سے واپسی کا کچھ پتا نہ تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے اپنی بیوی سے بات کرنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت جاگ رہی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ میری فلائٹ کچھ گھنٹوں بعد ہے۔ موبائل فون عام نہ تھا۔ اشفاق ایک کالنگ کارڈ لے آیا۔ میں نے وہاں سے اسے فون کیا اور دوسری بیل پر اس نے اٹھالیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی میں ایئر پورٹ کے اندر جارہا ہوں۔ وہ رونے لگی۔ میں اداس ہوگیا۔ قندیل کا پوچھا تو بتایا کہ وہ سوگئی ہے اور سونے سے پہلے بابابابا کررہی تھی۔ اریبہ تو ابھی چھ ماہ کی تھی۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کا باپ انہیں چھوڑ کر کہیں جارہا ہے۔ مجھ سے کوئی اور بات نہ ہورہی تھی۔ مسعود اور اشفاق دور ہوگئے۔ میں نے فون بند کیا تو غم سے نڈھال تھا۔ میں ابھی تک اس لمحے کو نہیں بھول سکا جب میں فون بند کرکے ایئر پورٹ کے ستون سے لپٹ کر کھڑا تھا۔

میں اپنے دوستوں سے گلے مل کر جلدی جلدی اپنے سامان کی ٹرالی گھسیٹتا بین الاقوامی پرواز کے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ ایک جم غفیر تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ کچھ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رورہی تھیں۔ اس جہاز پر امریکا اور کینیڈا کے سب مسافر ایک ساتھ تھے۔ پہلے بھی لکھا ہے کہ اس جہاز نے آئرلینڈ کے شہر شینن سے نیویارک اور وہاں سے ٹورنٹو جانا تھا۔ کل ملا کر بائیس چوبیس گھنٹے کا سفر بنتا تھا۔

ایک دو سیکیورٹی پوائنٹ سے گزر کر آگے ایک اور کسٹم کے افسر کے ہاتھ لگ گیا۔ میں پہلی بار باہر کا سفر کررہا تھا۔ تھوڑا سا نروس بھی تھا۔ جنرل مشرف نے عنان حکومت سنبھال لی تھی۔ ایئر پورٹ کے اندر بھی فوجی کھڑے تھے۔ ایک کسٹم افسر نے پوچھا کہ کیا کام کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ فارماسسٹ ہوں۔ وہ یہ سمجھا کہ میں کینیڈا میں فارماسسٹ ہوں۔ اس نے میرے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ تمہارا سامان چیک نہیں کروں گا بس تم بھی اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ ڈالر بیگ میں رکھ دو اور میں تلاشی کے بہانے بیگ میں ہاتھ ڈال کر نکال لوں گا اور پھر کہنے لگا کہ دھیان کرنا کہ سامنے کھڑے فوجی کی نظر نہ پڑے۔ میں نے سامنے کھڑے چاق و چوبند فوجی کو دیکھا اور پھر کسٹم افسر سے کہا کہ ایک ڈالر بھی نہیں دوں گا، تم میرا سامان چیک کرو۔ اس نے میرے تیور دیکھے تو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے مجھے جانے کو کہا۔

ایک ہنگامہ تھا جو ہر جانب برپا تھا۔ میں اس سے لطف اندوز بھی ہورہا تھا اور اس کے درمیان اپنا راستہ بھی تلاش کررہا تھا۔ پہلے میں ان لوگوں کو دیکھا کرتا تھا جو یورپ یا امریکا سے پاکستان اپنی چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو ہمارے محلے میں ایک صاحب جو امریکا میں رہائش پذیر تھے، وہ ایک جاپانی لڑکی کو بیاہ کر لائے تھے۔ میں نے ایک دن کالج میں پہلے ایک دو پیریڈ لیے اور گھات لگا کر ان کے گھر کے باہر گلی میں بیٹھ گیا۔ سوچا اگر گڑیا جاپانی نظر نہ آئی تو وہ شکل تو دیکھ لوں جو امریکا میں ہوتی ہے جو ایک جاپانی کو ساتھ لائی ہے۔ یہ اور بات کہ میں کئی گھنٹے بیٹھا رہا مگر کوئی اپنے درشن کرانے باہر نہ نکلا۔ اس کے علاوہ جب میرے خاندان سے لوگ امریکا جاتے تھے تو واپسی پر میں ان کی باتیں سنتا، سوالات کرتا، اندازے لگاتا اور سوچتا کہ انہوں نے اس دنیا کو کیسے دیکھا ہوگا، کیا تاثرات ان کے چہرے پر ہوں گے جب وہ یورپ یا امریکا یا کینیڈا میں اترے ہوں گے اور آج میں ان لوگوں میں تھا جو نارتھ امریکا جارہے تھے۔ میں تو اب تک صرف امریکا پلٹ مہذب اور ذہین فتیں پاکستانیوں سے ملا تھا اور آج انہیں امریکا اور کینیڈا جاتے ہوئے دیکھ کر ششدر تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا میں تصور کرتا تھا۔ ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ بہت سے مسافروں نے اپنے الاؤنس سے زیادہ سامان اٹھایا ہوا تھا۔ ان کے مقابلے میں میرا سامان تو بہت ہی کم تھا۔ اپنے زیادہ سامان پر شرمندگی کی جگہ ان کے بگڑے تیور تھے۔ کوئی قلیوں سے الجھ رہا تھا اور کوئی بچوں کو ڈانٹ رہا تھا اور کوئی ایئر لائن کے اسٹاف پر چڑھ دوڑا رہا تھا۔ صرف امیگریشن پر وہ بہت مؤدب ہوگئے تھے کیونکہ اب وہاں فوجی وردیوں میں ملبوس جوان بیٹھے پاسپورٹ چیک کررہے تھے۔ میرا سامان بک ہوگیا اور پھر امیگریشن کا مرحلہ

www.urdusoftbooks.com

آیا جو جلد ہی نمٹ گیا۔ تین جگہ تو مجھے اسکین کیا گیا۔ اب میرے پاس ایک ہینڈ بیگ تھا۔ سب سے فارغ ہو کر کچھ زینے چڑھا تو ایک گورا امریکی کھڑا مجھ سے پاسپورٹ مانگ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی ادب سے پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے کر سر جھکا لیا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اس نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے پھر مجھے دیکھا اور سر کے اشارے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ میں نے پہلی اور آخری مرتبہ کسی امریکی افسر کو سر کے اشارے سے اپنی بات سمجھاتے دیکھا۔ اپنی زمین پر وہ نہایت ہی مہذب انداز سے بات کرتے ہیں۔ ایک بار میں بینکاک سے براستہ ٹوکیو امریکا آرہا تھا۔ بینکاک پر امیگریشن اور سیکیورٹی سے ایک بار گزرا۔ امریکا نے ہر ایئرپورٹ پر اپنا ایک علیحدہ نظام بنایا ہوا ہے۔ آپ ایئرپورٹ کی سیکیورٹی سے گزر کے ایک بار پھر سے امریکا کے حصار میں داخل ہو کر اپنا سب کچھ چیک کرواتے ہیں۔ یہ میں بہت سے ملکوں کے ایئرپورٹ پر دیکھ چکا ہوں۔ میں جب بنکاک میں امریکن سیکیورٹی کے حصار میں داخل ہوا تو میری نازک طبیعت پر یہ ناگوار گزرا کہ یہ دو بار تلاشی اور امیگریشن کا کیا مطلب ہے؟ اور میں نے اپنی ناراضگی کا کھل کر اظہار کیا۔ وہاں ایک تھائی آفیسر نے ادب سے میرا پاسپورٹ لیا، ایک کاؤنٹر پر گیا اور بڑی تمیز سے واپس کر دیا۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ میرے احتجاج نے کام جلدی کروا دیا۔ پھر جہاز نے پرواز بھری اور ٹوکیو جا ٹھہرا۔ وہاں بھی امریکا کے لیے دوبارہ سے یہ سب مراحل طے کرنے پڑے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور پھر ایک بڑی تھکا دینے والی فلائٹ کے بعد امریکا آ پہنچا۔ امیگریشن آفیسر کے پاس پہنچا۔ اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔ ”سفر کیسا گزرا۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”بہت تھک گیا ہوں اور جلدی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔“ اس نے میرا پاسپورٹ اور امیگریشن کا فارم مجھے دے دیا جس پر کوئی کوڈ سا لکھا تھا۔ پھر میں کسٹم سے جب گزر رہا تھا تو ایک آفیسر آیا اور مجھے علیحدہ لے گیا۔ پھر جو میرے سامان اور کاغذات کی تلاشی ہوئی وہ میرے لیے ایک بڑی پریشانی بن گئی۔ میرے بٹوے تک کو کھنگالا گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جو ہوشیاری میں نے بنکاک ایئرپورٹ پر دکھائی تھی اور جو سہولت میں نے یہاں کے امیگریشن آفیسر سے مانگی تھی کہ میں تھکا ہوا ہوں اور جلد گھر پہنچنا چاہتا ہوں، یہ سب اسی کا خمیازہ ہے۔ دو گھنٹے کی سخت آزمائش کے بعد انہوں نے مجھے کلیئر کیا۔ پھر وہ سوری کرتا رہا کہ آپ کا قیمتی وقت ہم نے لے لیا۔ پھر ایک آفیسر میرا سامان اٹھا کر مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے بعد میں نے یہ سبق سیکھا کہ جتنی بات کی جائے ہاں یا ناں میں جواب دو اور فالتو کی سہولت کے طالب گار کبھی نہ بنو۔

بات کہیں اور نکل گئی ہے اور واپس اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر آتا ہوں۔ جب میں اس گورے کے سر کے اشارے کو سمجھتے ہوئے روانگی کے لاؤنج میں آ بیٹھا تو یہاں میری ملاقات احمد شانی سے ہوئی۔ وہ مرینا ہوٹل میں میرے ساتھ تھا۔ میں بھی ان دنوں ہر ایک سے بے تکلف ہو کر معلومات لیتا رہا اور اب میں احمد شانی سے بات کر رہا تھا۔ فلائٹ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے باقی تھے۔ احمد شانی بلوچستان کا ایک قبائلی سردار تھا۔ باپ اور دو بھائی قبائلی دشمنی میں مارے گئے تھے اور خود اس دشمنی سے تنگ آ کر امریکا جا بسا تھا اور گاڑیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور کہا کہ گاڑی لینی ہو تو مجھے بتانا میں اچھی اور سستی گاڑی دلوا دوں گا۔ میں نے نمبر سنبھال کر رکھ لیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ میں تو کینیڈا جا رہا ہوں اور یہ امریکا میں کاروبار کرتا ہے۔ میرے لیے کینیڈا اور امریکا ایک طرح سے ایک ہی ملک کے دو حصے تھے۔ ان دنوں آپ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھلا کر ایک دوسرے کی سرحد پار کر جاتے تھے مگر آج کینیڈا کے پاسپورٹ ہولڈر تک واپس کر دیے جاتے ہیں۔ امریکا نے خود کو ایک مضبوط قلعے میں بدل لیا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ تمام مسافر لائن میں لگ کر رینگتے رینگتے طیارے میں سوار ہو گئے۔ میں ان دنوں اسموکنگ کرتا تھا اور اس لیے مجھے سب سے پیچھے اسموکنگ والے حصے میں سیٹ ملی تھی، آجکل تو اسموکنگ بند ہے مگر ان دنوں جہازوں میں سگریٹ نوشی ممنوع نہ تھی۔ میرے ساتھ اٹاوہ میں رہنے والا ایک افغانی بیٹھا تھا اور اس کا نام سلطان تھا اور وہ بتاتا تھا کہ وہ اکیلا جا رہا ہے اور اٹاوہ میں ایک اسٹور چلاتا ہے۔ میں نے اس سے کھلنے ملنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے کوئی لفٹ نہ کرائی۔ احمد شانی بھی کہیں آس پاس آ بیٹھا تھا۔ میں راہداری کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسری جانب سیٹ پر ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ جہاز کھچا کھچ بھرا تھا۔ کچھ دیر ہنگامہ سا رہا۔ میں پُر جوش تھا۔ ایک مسرت کا عالم تھا۔ بیوی اور بچے یاد آرہے تھے مگر کینیڈا کی اڑان میرے دماغ پر حاوی ہو رہی تھی۔ پھر کچھ اعلانات ہوئے، تلاوت کی گئی اور پھر جہاز رن وے پر رینگنے لگا۔ کچھ لمحوں میں اس کے پہیوں نے پاکستانی

Urdu Soft Books

سرزمین کو خدا حافظ کہا اور آسمان میں بلند ہوتا چلا گیا۔

پہلے جہاز میں کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ اب رات کے دو بجے کیا بھوک لگتی مگر یہ رسم چل پڑی تھی اور میں نے بھی سب کے ساتھ نبھائی۔ ہر سیٹ کے سامنے ایک اسکرین تھی جہاں فلمیں، موسیقی، ڈرامے دکھائے جا رہے تھے۔ میرے لیے ان دنوں جہاز میں ٹی وی کا ہونا نئی بات تھی۔ مختلف چینل پر مختلف پروگرام لگے تھے۔ ایک چینل پر جہاز کی پوزیشن رفتار اور بلندی کے علاوہ آئرلینڈ کے شہر شینن پر اترنے کا ٹائم بھی نظر آرہا تھا۔ میں اسی جی۔ پی۔ ایس کو دیکھ رہا تھا اور کچھ دیر بعد ہمارا جہاز پاکستانی سرحدوں سے نکل کر افغانستان میں داخل ہو گیا۔ میرا پاکستان سے باہر جانے کا خواب اسی طرح پورا ہو رہا تھا اور میں اب کہہ سکتا تھا کہ میں نے بھی غیر ملکی سفر کیا ہے۔ پہلا تجربہ ہمیشہ پُرجوش ہوتا ہے اور میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد اپنی سگریٹ سلگائی تو ساتھ میں بیٹھے بزرگ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ یہ نان اسموکنگ ایریا ہے۔ میں ان دنوں مہذب نہ ہوا تھا اسی لیے میں بھی اڑ گیا۔ ایئر ہوسٹس کو بلایا گیا اور اس نے میرے موقف کی تائید کی اور میں دوسروں کی تکلیف کے احساس سے بے نیاز سگریٹ نوشی کرتا رہا اور آج میں اپنے اس رویے پر بہت نادم ہوں۔

سلطان کے برابر ایک خاتون اپنے بچوں سمیت بیٹھی تھیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنے بچے یاد آرہے تھے اور آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ آس پاس کے مسافر اونگھنے لگے اور میں اپنے مختلف قسم کے سفر کی وجہ سے نیند سے کافی دور تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جب جہاز مشرقی یورپ کے اوپر پرواز کر رہا تھا تو میں اپنے آپ کو یورپ میں محسوس کر رہا تھا۔ ہم رات ایک بجے اندھیرے میں روانہ ہوئے تھے اور چھ گھنٹے گزارنے کے باوجود جہاز کی کھڑکیوں سے باہر ابھی تاریکی تھی۔ یہ مسلسل تاریکی مجھے بے چین کر رہی تھی۔ آٹھ گھنٹے گزرے تو اعلان ہوا کہ ہم شینن (Shanon) میں اترنے والے ہیں۔ سوئے مسافر بیدار ہونا شروع ہو گئے۔ جہاز آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا۔ باہر ابھی اندھیرا تھا اور کھڑکی سے شہر کی روشنیاں جگ مگ کرتی نظر آئیں تو میں پہلو بدلنے لگا۔ کسی یورپ کے شہر کی روشنیاں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں کسی بچے کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھے سلطان کو جھنجھوڑا اور کہا۔ ”یورپ کے شہر کی روشنیاں تو دیکھو۔ کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں۔“

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور یقیناً یہی سوچ رہا ہوگا کہ یہ تو مجھ سے بھی بڑا پینڈو ہے۔

جہاز لینڈ کر رہا تھا تو میں بچوں کی طرح ایئرپورٹ کی عمارت دور سے دیکھ رہا تھا۔ اللہ مغفرت کرے علی سفیان آفاقی صاحب کی۔ یہ لت ان کی لگائی ہوئی تھی۔ ہر ایئرپورٹ اور شہر کا تذکرہ اس دلچسپی سے کرتے رہے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ اسی جگہ پہنچ جاتا تھا اور اس دن بھی میں اسی قسم کے خوش کن خیالات کی زد میں گھرا، ایئرپورٹ کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ٹیوب کے ساتھ جہاز جا لگا اور ٹیوب سے جہاز میں سے آنا بھی کوئی عجیب سا مزا دیتا تھا۔ وہاں سے نکلا اور سیدھا ایئرپورٹ کی عمارت میں آ گیا۔

میں اسلام آباد ایئرپورٹ سے یہاں اترا تھا۔ پہلا تجربہ کسی پہلے پیار کی طرح ہوتا ہے جس میں کوئی بھی کسی سرسراتی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ میں اپنے اس تجربے کو دیکھنے سے زیادہ محسوس کرتا تھا۔ چمکتے فرش، آرام دہ نشستیں، سجی سجائی دکانیں جو اشیاء سے بھری تھیں۔ کرسمس اگلے ماہ تھی اور پورے ایئرپورٹ پر جا بجا کرسمس کے درخت اپنے گرد لپٹے قمقموں کی روشنی میں جگ مگ کر رہے تھے۔ میں ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پورا ٹرمینل روشنیوں سے نہایا ہوا تھا اگر میں موازنہ اسلام آباد ایئرپورٹ سے کرتا تو کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔

ڈیوٹی فری شاپس تھیں جو معلوم نہیں کن کن اشیا سے بھری پڑی تھیں۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ شراب کی کئی اقسام کی بوتلیں تھیں جو سینکڑوں کے حساب سے سجی تھیں۔ یہ میرے لیے انوکھی چیز تھی۔ میں شراب کی بوتل پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ یہ چیز سرعام بکتی ہوئی مجھے حیران کر رہی تھی۔ کافی شاپس، ریسٹورانٹ، گفٹ شاپس پر رونقیں۔ یہ سب مجھے ششدر کر رہی تھیں۔

ایک کونے میں اسموکنگ ایریا تھا۔ میں وہاں آ بیٹھا۔ ایک انڈیا کا گجراتی بیٹھا دھویں اڑا رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا کہ میں، عزیز ہوں، میں عزیز کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں ایک بزرگ پاکستانی بھی ساتھ آ بیٹھے۔ ہر ایک سے سوال کرنا میرا مشغلہ تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے امریکا جا رہے تھے۔ ان کا بیٹا وہیں رہتا تھا۔ میری امیگریشن کا ان کو معلوم ہوا تو مجھے مبارک دینے لگے اور ظاہر ہے کہ میں نے ...سب انھیں بتایا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ان کے ہاتھ میں ڈیوٹی فری شاپ کا بیگ تھا۔ پھر اس میں سے شراب کی بوتلیں نکال کر خوشی خوشی بتلا رہے تھے کہ بہت سستی مل گئی ہے اور قیمت صرف چار ڈالر ہے۔ ایک مسلمان کو ہاتھ میں شراب پکڑ کر اتراتے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اور سونے پر سہاگہ کہ وہ سستی خریدنے پر خوش بھی نظر آ رہے تھے۔ مسلمان پیتے تو ہیں مگر گناہ سمجھ کر۔ اور اسی لیے چھپ چھپا کر جام لنڈھاتے ہیں اور اس حرکت پر پردہ بھی رکھتے ہیں مگر یہاں ایک بزرگ سے یہ سن کر میں ششدر رہ تھا۔ میں سالوں سے باہر کے ملکوں میں پھر رہا ہوں مگر اس کے بعد کسی بھی پاکستانی کو شراب نوشی پر ناز کرتے نہیں دیکھا۔ میں ان دنوں ایک نئے تجربات اور مشاہدات سے گزر رہا تھا۔ اتنے سارے واقعات متواتر ہو رہے تھے جو مجھے حیران کر رہے تھے۔

میں پچھلے کئی گھنٹوں سے تاریکی دیکھ رہا تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی مگر اندر حرارت کی وجہ سے باہر کے موسم کی سختی کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ یہاں سے ہماری پرواز نیویارک کی تھی اور پھر نیویارک سے ٹورنٹو جانا تھا۔ اب پرواز سات گھنٹے بحر اوقیانوس پر تھی اور میرے ذہن میں ٹائی ٹینک آ گیا جو اسی سمندر میں غرق ہوا تھا۔ اندر ہی اندر کسی خوف سے میں لرز گیا۔ سوچا اتنے گھنٹے میں ایک سمندر کے اوپر سے گزروں گا؟ اگر خدا نخواستہ یہ سمندر میں گر گیا تو میری کیا حالت ہوگی؟

کچھ دیر میں ہم دوبارہ جہاز میں سوار ہوئے۔ مسافر بیٹھ رہے تھے اور کچھ دیر بعد جہاز نے دوبارہ اڑان بھری اور اب رخ نیویارک کی جانب تھا۔ میری سیٹ کے پیچھے ایک پاکستانی نوجوان شراب کی بوتل کو منہ لگائے غٹا غٹ پی رہا تھا۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ وہ بہک رہا تھا اور مسلسل کہہ رہا تھا۔ ''پاکستان میں میری بڑی عزت ہوتی ہے کیونکہ میرے پاس سالا گرین کارڈ ہے۔ ورنہ میرے خاندان والے پہلے مجھے پوچھتے ہی نہ تھے۔ اب جاتا ہوں تو سب آگے پیچھے پھرتے ہیں۔'' پھر دو چار گھونٹ چڑھاتا اور پھر شروع ہو جاتا۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ بے سدھ ہو کر اپنی سیٹ پر گر گیا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب تک رہا تھا۔

مجھے مسلسل تاریکی اور اس میں لگاتار سفر مضطرب کر رہا تھا۔ میں واش روم گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہلکی سی روشنی تھی مگر سورج نظر نہ آتا تھا۔ ہم زمین سے دس کلومیٹر بلند ہو کر پرواز کر رہے تھے۔ باہر درجۂ حرارت منفی پچاس تھا اور جہاز کی رفتار نو سو کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ اب میں باقاعدہ بے آرام ہو رہا تھا۔ مسلسل چودہ گھنٹوں کی تاریکی اور اتنا لمبا سفر۔ ایک دہلا دینے والا احساس میرے اندر آ بیٹھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کہیں میں زمین سے کٹ تو نہیں گیا۔ میرے اپنے لوگ، میرا گھر میرے دن رات کہیں کھو تو نہیں گئے۔ کیا میں اپنوں سے بہت دور آ نکلا ہوں اور واپسی کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ کوئی اور ہیں، میرے نہیں۔ میرے بچے اور رشتہ دار کہیں کھو گئے ہیں اور میں تنہا ہو چکا ہوں۔ اسی پریشانی میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ سب مسافر نیند میں تھے۔ شراب پینے والا اپنی سیٹ پر اوندھا پڑا تھا۔ میں کیا کرتا؟ ایک بے چینی مجھے ستاتی اور رلاتی تھی۔

کچھ دیر بعد افق پر کوئی آتشیں روشنی سی ابھری اور آہستہ آہستہ واضح ہوتی گئی...... کچھ دیر بعد سورج ایک آتشی گولے کی طرح چمکتا ہوا نمودار ہوا اور اب اس پر نظر نہ ٹکتی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکا تھا۔ اردگرد کے مسافر بیدار ہونے لگے۔ کچھ ہل چل پیدا ہوئی۔ ایک ازبک خاندان جس میں زیادہ عورتیں تھیں۔ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ ویڈیو بنا رہے تھے۔ بھڑکیلے لباس میں ملبوس عورتیں اپنے ساتھ کے کسی نہ کسی مرد سے لپٹتی جا رہی تھیں۔ سب مسافر ناپسندیدہ نظروں سے ان کی جانب دیکھ کر منہ پھیر لیتے مگر لپٹنے والوں کو کوئی پروا نہ تھی۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا تو تاحد نظر برفیں ہی برفیں نظر آتی تھیں۔ جہاز اپنی رفتار سے اڑتا جا رہا تھا، سب مسافروں کو ناشتا دیا گیا۔ انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ فرائی آلو اور جوس، چائے اور پھل دیے گئے۔ نیویارک قریب آنے لگا اور اب ہم سمندر کے اوپر تھے۔ طیارہ نیچے ہوتا گیا اور میرے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ ہوا کا دباؤ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

جہاز نیویارک ایئرپورٹ پر اترا اور رن وے سے ہو کر ٹرمنل سے کہیں دور جا کھڑا ہوا۔ میں پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ ایئرپورٹ سے طارق کو فون کر کے بتاؤں گا کہ میں امریکا سے بات کر رہا ہوں۔ نیویارک اور امریکا جسے میں سالوں سے اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھا۔ میں کھڑکی سے چاروں طرف مجسمہ آزادی دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ جس کی تصویریں میں نے ایئرلائن کے دفاتر میں دیکھی تھیں وہ مجھے دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی اچھا لگتا تھا کہ میں امریکا کی زمین پر سے امریکا کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

ہے کہ پڑھنے والے شاید مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ مگر میں جو محسوس کررہا تھا وہی بتانا چاہتا ہوں۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ میں کینیڈا سے امریکا آ گیا۔ کئی بار نیو یارک گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں بار بار گیا۔ کینیڈا اور امریکا کے طول و عرض میں پھرا مگر جو احساسات پہلے تجربے کے ہوتے ہیں ان کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے جو مجھے آج بھی بھلا لگتا ہے۔

ہمارے طیارے کے اردگرد سیکیورٹی والوں اور پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سیڑھی لگی اور نیو یارک اترنے والوں کے کاغذات چیک کیے گئے اور انھیں بس کے ذریعے ٹرمنل لے جایا گیا۔ ہم جہاز میں بیٹھے تھے۔ امیگریشن پولیس جہاز کے دروازوں پر مستعد کھڑی تھی کہ کوئی بغیر ویزے کے نیو یارک میں سلپ نہ ہو جائے۔ صفائی والے آئے۔ سب سیاہ فام تھے۔ جہاز کی صفائی کی گئی اور پھر سب ایک ایک کر کے اتر گئے۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ ہم کچھ دیر میں ٹورنٹو کے لیے پرواز کرنے والے ہیں۔ آدھے سے زیادہ جہاز خالی ہو گیا تھا۔ ازبک خاندان بھی ٹورنٹو جا رہا تھا۔ میرے ساتھ۔۔۔۔ افغانی سلطان بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ احمد شاہی اتر چکا تھا اور جس طرح ہم ملے تھے اور فون نمبر ایک دوسرے کو دیے تھے اب وہ نمبر اور چہرہ پھر بھول بھال گیا ہوں۔ ازبک خاندان نے شور مچا مچا کر ناک میں دم کر دیا تھا۔ جہاز اڑا اور عورتوں کے میک اپ باکس کھل گئے۔ لپ سٹک، کریمیں، مسکارے لگائے جانے لگے۔ ایک نے تو بے ہودگی کی انتہا کر دی۔ پرفیوم کی بوتل نکالی، گریبان کے بٹن کھولے اور خوشبو کا چھڑکاؤ ہونے لگا۔ میں بھی علی سفیان آفاقی کی طرح ایک ایک چیز کا کن انکھیوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ لوگوں کی نفسیات اور عادات دیکھ رہا تھا۔ یہ عادات دیکھتے دیکھتے ایک گھنٹے میں ٹورنٹو قریب آ گیا۔

میں نے خالی جہاز میں کھڑکی کے ساتھ سیٹ سنبھال لی۔ جہاز نیچا ہوا تو دیکھا ٹورنٹو میں بارش ہے اور گھنے بادل چھائے تھے۔ بادلوں کے نیچے سے طیارہ جب نکلا تو ہائی وے اونچی عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں اور ان پر دوڑتی سینکڑوں گاڑیاں۔ یہ سب دیکھ کر میں ایک خواب میں ڈوبتا چلا گیا۔ یقین نہ آتا تھا کہ اسی شہر میں اب مجھے رہنا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک عیش و آرام کی زندگی میں یہ جہاز اتر رہا ہے۔ جیسے میں اس سرزمین پر قدم رکھوں گا تو دنیا کی بہت ساری نعمتیں میرے انتظار میں کھڑی ہوں گی۔ میں اس وقت دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تھا۔ بس ایک خلش اور چبھن کہیں دل میں تھی۔ وہ یہ کہ یورپ سے نیو یارک اور پھر ٹورنٹو کے سفر نے یہ احساس دل میں بٹھا دیا تھا کہ پاکستان اب کہیں ۔۔۔۔ بہت دور ہے اور اب وہ میری پہنچ میں نہیں رہا۔ میرے بچے اب شاید چاند پر بستے ہیں یا میں زمین سے مریخ پر اترا ہوں۔ اس وقت تو میں جہاز کی کھڑکی سے چپکا ایئرپورٹ کے اردگرد کی عمارتیں اور سڑکیں دیکھ رہا تھا۔ بڑے بڑے ہوٹل تھے اور اوپر نیچے بل کھاتی سڑکیں تھیں جہاں گاڑیاں تیزی سے دوڑتی تھیں۔ ایک بہت اونچی اپارٹمنٹس کی بلڈنگ دور سے نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اسی بلڈنگ میں اپنی زندگی کے چار سال رہوں گا۔

جہاز ٹیوب کے ساتھ لگ کر رک گیا۔ میں اپنا دستی سامان لے کر جہاز کے دروازے سے نکلا تو امیگریشن والے کھڑے تھے۔ ایک نے مجھے روک کر مجھ سے کاغذات مانگے۔ میں نے نکال کر دیے۔ وہ الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ طویل راہداریوں سے گزرتے گزرتے میں اس مقام تک آ پہنچا جہاں بہت سے کاؤنٹر بنے تھے اور ان کے پیچھے امیگریشن کے افسر بیٹھے ایک ایک کو بلا کر ان کے پاسپورٹ اور کاغذات دیکھتے تھے۔ ہر کاؤنٹر کے آگے لمبی لائن لگی تھی اور میں بھی ایک لائن میں کھڑا ہو گیا۔ صاف ستھرا اور سجا سجایا ماحول تھا۔ ہر جگہ کرسمس کے مصنوعی درخت رکھے تھے اور ان پر قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ایک دیسی عورت کا بچہ فرش پر کھیل رہا تھا اور کھیلتے کھیلتے ایک درخت کے پاس گیا اور جھٹ سے اس کے پتے توڑ ڈالے۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک آفیسر اٹھی، وہ پتے اٹھائے اور ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ مجھے سمجھ آرہی تھی کہ میں نے یہاں کیسے رہنا ہے اور کیا باتیں پسند اور ناپسند کی جاتی ہیں۔

میرا نمبر آیا اور میں منہ اٹھائے آفیسر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کسٹم فارم کہاں ہے۔ میں بولا کہ وہ تو نہیں ہے۔ کہا کہ واپس جاؤ اور فارم بھر کر لے آو۔ پھر معلوم ہوا کہ لائن میں لگنے سے پہلے کسٹم فارم پُر کیا جاتا ہے۔ ایک دیوار کے ساتھ میزیں لگی تھیں اور لوگ کوئی فارم اٹھا کر پُر کرتے تھے۔ میں نے بھی فارم اٹھایا اور دیکھا دیکھی اپنی طرف سے اسے بھرنے لگا اور دوبارہ ایک اور لائن میں جا کھڑا ہوا۔ وہاں میرے کاغذات چیک ہوئے اور مجھے کسی اور لائن میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سے مجھے کسی کیبن میں بیٹھے آفیسر کے حوالے کر دیا گیا۔ میں گھبرا رہا تھا کہ اب یہاں کیا معاملہ ہو گا۔ اس نے پہلے مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر مجھے کچھ فارم دیے

www.urdusoftbooks.com

کہ پہلے اپنا سوشل انشورنس نمبر (SIN) لینا ہوگا تب ہی کوئی نوکری کر سکوں گا، یہ نمبر میری شناخت تھی۔ پھر پوچھا کہ رقم کتنی ہے۔ میں نے بتائی تو اس نے گن کر میرے کاغذات پر درج کر لی اور کہا کہ اپنا بینک اکاؤنٹ کھلانا تو یہ کاغذات دکھلا دینا ورنہ اتنے کیش پر کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں کھولے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ اور مجھے ہدایات دیں اور آخر میں کہا کہ کوئی سوال ہے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

اب میں اس جگہ موجود تھا جہاں بہت سی برقی بیلٹ چلتی تھیں اور یہیں سے اپنے بیگ وصول کیے جاتے تھے۔ جہاں پی آئی اے لکھا تھا میں وہاں اپنے سامان کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا سامان آیا تو ایک قلی بھی آ گیا۔ وہ مجھ سے یہ دو بیگ باہر لے جانے کے بیس ڈالر مانگ رہا تھا اور میں اتنی رقم دینے سے انکاری تھا۔ وہاں ایک دیسی قلی نظر آیا۔ نام مجید تھا۔ اس نے کہا کہ صرف دو بیگ ہیں، انہیں ٹرالی میں ڈال کر خود لے جاؤ۔ ٹرالی لینے کے لیے ایک ڈالر کا سکہ مشین میں ڈالنا پڑتا تھا۔ میرے پاس امریکن ڈالر تھے۔ اس نے مجھ سے ایک امریکن ڈالر لے کر کینیڈین ڈالر کا سکہ تھما دیا۔ میں نے ٹرالی نکالی، سامان اس پر رکھا اور ایک کاؤنٹر پر اپنا کسٹم کارڈ دیا اور باہر کی طرف چلا آیا۔

سارا ماحول، لوگ، زبان، ایئرپورٹ کی عمارت۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ میں خود یہاں اجنبی تھا اور ایک ایک قدم پر کسی نئے تجربے سے روشناس ہو رہا تھا۔ مجھے لینے سہیل مفتی کو آنا تھا جس سے میں آج تک ملا نہ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں اسے یا وہ مجھے کیسے پہچانے گا؟ اسی اثنا میں میں باہر آ گیا۔ بہت سے لوگ اپنے مہمانوں یا رشتہ داروں کو وصول کرنے کے لیے کھڑے تھے اور ہر نکلنے والے کا چہرہ دیکھتے تھے۔ ایک عجیب منظر تھا کہ آپ کئی نگاہوں کی زد میں ہوتے ہیں اور آپ کی نظر.... کسی ایک چہرے کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں۔ ایک ریلنگ کے ساتھ لگا کوئی مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ میں نے بھی اپنی باچھیں کھول دیں۔ میں نے نام پوچھا تو وہی سہیل مفتی تھا۔ گورا چٹا، قدرے فربہ سا سہیل مفتی، جو بعد میں مفتی کہلوایا جاتا تھا، مجھ سے گلے مل رہا تھا۔ میری ٹرالی پکڑی اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ قدرے موٹا سا، جس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ نمایاں تھی، مفتی نے تعارف کروایا کہ یہ شہباز فخری ہے۔ نامور اداکار جمیل فخری کا بیٹا، جو تین دن پہلے امیگریشن لے کر ٹورنٹو پہنچا تھا اور مفتی کے ساتھ آ ٹھہرا تھا۔

ہم اسی تعارف میں باہر آ کر کھڑے تھے، جہاں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک یخ اور نامانوس ہوا کا جھونکا مجھ سے ٹکرایا اور میں کپکپا گیا۔ یا اللہ یہ کیسی سردی ہے جس سے میں پہلے کبھی آشنا نہ تھا۔ ہر فضا اپنے اندر ایک علیحدہ احساس رکھتی ہے۔ ہوا سونگھ کر آپ کسی شہر یا علاقے میں زندگی کے چال چلن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہاں ٹورنٹو کی فضا میں جیسے برف کی دیواریں میرے آس پاس ایستادہ تھیں۔ ہوا منجمد ہو کر ٹھہر سی گئی تھی اور اس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہ تھا کہ زندگی یہاں خاص طور پر سردیوں میں کٹھن ہوگی۔ بادل، بارش اور برفیلی ہوائیں جو آپ کو چیر پھاڑ دیں گی۔

شہباز نے ایک ٹیکسی کی ڈگی میں سامان رکھا اور بولا۔ ”بہت برے حالات ہیں، کوئی نوکری نہیں، نرا سیاپا ہے۔“

میرے پوچھنے پر کہا تین دن پہلے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ سیٹل ہونے کے لیے تو کئی ماہ لگ جاتے ہیں اور آپ تو تین دن میں گھبرا رہے ہیں۔ میں بہت پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ مفتی میری اس ہمت اور جرأت کی داد دیتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری حالت دو ہی دنوں میں پنکچر ہونے والی تھی۔

ٹیکسی ایک گورا چلا رہا تھا۔ بھیگی ہوئی صاف ستھری سڑکوں پر ہماری ٹیکسی دوڑ رہی تھی، سڑکوں کا ایک جال تھا۔ چار رویا ہائی وے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ میں ادھر ادھر دیکھتا کہ شاید سی-این ٹاور نظر آ جائے۔ مجھے ہر وہ عمارت پہلی نظر میں دیکھنی تھی جو میں پی آئی اے کے آفس میں دیکھ چکا تھا۔ مفتی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور شہباز میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر ایک پریشان زدہ اور پسینے سے بھرے چہرے سمیت بیٹھا۔ کینیڈا کو گالیاں دیتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا پسینا کسی موسمی تغیر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اندر کے مدوجزر سے نکلتا ہے۔ بادل بہت نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ آس پاس بلند عمارتیں، ہوٹل اور دفاتر تھے۔ ہم دس پندرہ منٹ میں ایک آٹھ منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے شیشے والے گیٹ کے باہر آ رکے۔ سفید اور سرخ رنگوں سے پینٹ کی گئی یہ عمارت تھی اور اس کی ہو بہو نقل اس کے سامنے بھی تھی۔ دو ایک طرح کی بلڈنگز کے درمیان میں ایک بڑا سا لان تھا جس میں چنار کے درخت لگے تھے۔ سامنے والی بلڈنگ کے پیچھے بیس بیس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ سر اٹھائے سردی میں خاموش اور اداس کھڑی نظر آتی تھیں۔

Urdu Soft Books

میں آس پاس کا جائزہ لے کر ٹیکسی سے نکلا اور اتنے میں ڈرائیور نے گاڑی کی ڈگی سے میرا سامان نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کیا پتھر رکھ کر لائے ہو۔''

ظاہر ہے کہ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا اور مجھ سے کوئی جواب انگریزی میں نہ بن پڑا اور میں ''میں میں'' کرنے لگا۔

مفتی نے اس کو کرایہ ادا کیا اور شہباز میرے ایک سوٹ کیس گھسیٹتا شیشے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا کیونکہ باہر بلا کی ٹھنڈ تھی اور میں کپکپا رہا تھا۔ دوسرا سوٹ کیس مفتی نے سنبھالا اور ہم اس گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم گیٹ سے گزر کر لابی میں کھڑے ہوئے تو یہاں حرارت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ دیواروں اور چھت میں لگی ڈکس سے گرم ہوا باہر آ رہی تھی۔ اس لابی کے آگے ایک اور شیشے کی دیوار تھی جس میں ایک دروازہ لاک تھا۔ بائیں جانب دیوار پر ایک بورڈ دیوار میں تھا اور فون کا ریسیور بھی لگا تھا۔ بورڈ پر اپارٹمنٹ کے نمبر لکھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان آتا ہے اور اس کے پاس دروازے کی چابی نہیں ہوتی تو وہ ریسیور اٹھا کر اپارٹمنٹ کا نمبر دباتا ہے تو اپارٹمنٹ میں فون بج اٹھتا ہے۔ جب آپ کو فون پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا کوئی دوست یا مہمان ہے تو آپ فون پر زیرو کا نمبر دباتے ہیں اور دروازہ ایک چر کی آواز سے کھل جاتا ہے۔

مفتی کے پاس تو چابی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم ایک راہداری میں آ کھڑے ہوئے۔ زمین پر مخمل کی طرح سرخ رنگ کا کارپٹ بچھا تھا۔ سامنے دو لفٹیں تھیں مگر ہم بائیں جانب مڑے تو پہلا دروازہ مفتی کے اپارٹمنٹ کا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر 101 نمبر اپارٹمنٹ اگلے آٹھ ماہ میرا ٹھکانا رہا۔ مفتی نے ایک چابی نکالی، دروازہ کھولا اور میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔

دروازہ کھولتے ہی سیدھے ہاتھ پر کچن تھا اور سامنے لیونگ روم تھا۔ جہاں بائیں جانب دیوار سے لگی ایک بڑی میز رکھی تھی اور اس پر ایک پرانا کمپیوٹر تھا اور ساتھ ہی فون رکھا تھا۔ میز کے ساتھ گھومنے والی دو کرسیاں رکھی تھیں۔ لیونگ روم میں دائیں ہاتھ پر سامنے والی دیوار سے لگا ایک بڑا میٹرس پڑا تھا اور ساتھ میں کوئی بیس انچ کا پرانا ٹی وی ایک نائٹ ٹیبل پر رکھا تھا اور بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے باہر کی جانب پوری دیوار شیشے کی تھی جس پر دبیز پردے لٹکے تھے۔ یہ مفتی کا بیڈ روم بھی تھا، ہمارا یہ ڈائننگ روم بھی تھا اور فارغ وقت میں لیونگ روم بھی تھا۔ اس لیونگ روم کے پیچھے ایک بیڈ روم تھا اور ساتھ باتھ روم تھا۔ باتھ روم سے باہر سیدھے ہاتھ پر ایک بڑی الماری تھی جس میں میرے دونوں سوٹ کیس آسانی سے سما گئے تھے اور وہاں شہباز کا سوٹ کیس بھی پڑا تھا۔ اس میں سب کے کپڑے لٹکے تھے۔ یہ ایک صاف ستھرا اپارٹمنٹ تھا جس کو مفتی ہر وقت صاف ستھرا رکھتا تھا۔

میرا سامان رکھ دیا گیا اور میں میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا تھا۔ شہباز کہتا تھا کہ غلطی کر لی جو لاہور میں دوائیوں کی کمپنی میں اچھی بھلی جاب چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ مفتی کی فیملی پاکستان میں تھی اور ایک بار آ کر واپس پاکستان میں بیٹھی دوبارہ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ شہباز غیر شادی شدہ تھا اور ٹھیٹ پنجابی میں بات کرتا تھا۔ میرے لیے مفتی نے چائے بنائی اور میں انہیں اپنے سفر کے بارے میں بتانے لگا جس میں ان دونوں کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اتنے میں بیڈ روم سے لمبا تڑنگا شخص آنکھیں ملتا برآمد ہوا۔ اس نے سیکیورٹی گارڈ کی وردی پہنی ہوئی تھی اور شاید اسی میں آ کر سو گیا تھا۔ ابھی دوپہر کے تین بجے تھے اور وہ، خان قیصر، رات کو سیکیورٹی کی جاب کر کے تھکا ہارا اپنی یونیفارم میں ہی سو گیا ہوگا اور اب شور سن کر باہر آ گیا تھا۔ اس سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی فارماسسٹ ہے اور چھ ماہ سے آیا ہوا ہے اور سیکیورٹی گارڈ کی جاب کرتا ہے۔

شہباز کہنے لگا۔ ''کم بخت ہمیں تو سیکیورٹی گارڈ کی جاب بھی نہیں ملتی۔'' اور پھر بولا۔ ''بہت برے حالات ہیں۔''

خان قیصر کی فیملی بھی پاکستان میں تھی اور اس نے انہیں اسپانسر کیا ہوا تھا اور اسے اُمید تھی کہ ایک ماہ میں بچے آ جائیں گے۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا سیکیورٹی گارڈ کی جاب میں اتنا بن جاتا ہے کہ بندہ فیملی ساتھ رکھ سکے۔''

وہ بولا۔ ''تنخواہ کے علاوہ بچوں کا الاونس بھی مل جاتا ہے تو گزارہ ہو جائے گا۔''

خان قیصر کچن میں گھس گیا اور کہا کہ وہ میرے لیے مرغ کڑاہی بنائے گا۔ کچن سے ایک بڑی کھڑکی لیونگ روم میں کھلتی تھی اور وہ وہیں کڑاہی گوشت تیار کرتا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''فیملی تو ہے ناں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ہنس کر کہنے لگا کہ انہیں کب بلواؤ گے؟

میں نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور کہا۔ ''ابھی میری

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پلاننگ بلیں یہ نہیں ہے۔ پہلے میں اپنے آپ کو سیٹ کروں گا کوئی اچھی نوکری ڈھونڈوں گا اور پھر انہیں سپانسر کروں گا۔"

اس نے یہ سن کر وہیں سے دل کھول کر ایک قہقہہ بلند کیا۔"اچھا نوکری، سیٹ ہوؤں گا۔ ہاں اور کیا کہا۔" یہ کہہ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔"ابھی ایک گھنٹا پہلے پہنچے ہو ناں۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جب بچے یاد آئیں گے تو نہ چین سے بیٹھ سکو گے اور نہ سو سکو گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے کھی کھی ہنسنے لگا۔

مفتی اس تمام عرصے میں خاموش اور ناراض سا بیٹھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں میں کچھ چپقلش چل رہی ہے۔

میں اب خود بھی شہباز اور خان قیصر کے حالات سن کر تھوڑا سا نروس ہو رہا تھا۔ خان ایک زندہ دل اور دل کا بادشاہ لگتا تھا۔ ہر بات قہقہے سے شروع ہو کر قہقہے پر ہی ختم کرتا۔ میں نے اسے ایک لمحے کے لیے بھی پریشان نہ دیکھا۔ پنجابی کے علاوہ کوئی اور بولی اس کے ساتھ جچتی بھی نہ تھی۔ ان میں صرف مفتی تھا جو ایک اچھی جاب کرتا تھا اور اس لیے وہ سب کی نظر میں بڑا خوش قسمت تھا۔ خان پھر مجھ سے میری ڈگریاں اور تجربہ پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں فارماسیوٹیکل کیمسٹری پڑھاتا تھا اور انڈسٹری کا بھی چار سال کا تجربہ ہے تو وہ وہیں کچن سے بولا"پروفیسر صاحب۔ بس آپ کو تو فوراً جاب مل جائے گی۔ ابھی مجھ سے لکھوا لو۔" اس کے الفاظ سے میری کچھ تسلی ہوئی مگر اتنے میں منہ بسورتا شہباز بولا۔

"یہاں بہت برے حالات ہیں۔" یہ شہباز کا ایک تکیہ کلام سا تھا جو میں ایک دو گھنٹوں میں درجنوں بار سن چکا تھا اور ان دو گھنٹوں میں خان نے میرا نام پروفیسر رکھ دیا تھا اور آج پندرہ سال ہو گئے ہیں اور مجھے آج بھی پروفیسر کہتا ہے۔ جب اس نے یہ کہا کہ آپ کو جاب جلد مل جائے گی تو وہ آج تک یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس نے کہا تھا کہ تمہیں تو جاب جلد مل جائے گی اور تم تین مہینوں میں مفتی کے ساتھ اچھی جاب پر آ گئے تھے۔

خان واقعی ایک بہترین دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے میری ہمت بڑھائے رکھی تھی۔ آج بھی جب بات ہوتی ہے تو وہی قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ تم کس طرح سگریٹ کے کش لے کر کہتے تھے کہ ابھی میری پلاننگ مختلف ہے...... مجھے وہ دن یاد آتے ہیں تو مفتی اور خان قیصر کی دوستی اور محبت یاد آتی ہے۔ میں خوش قسمت تھا کہ مجھے آتے ہی اچھے دوست مل گئے۔ ان دو کے علاوہ بھی بہت سے پُرخلوص دوست اللہ پاک نے دے دیے تھے اور اللہ کی مدد سے میں پھر آگے بڑھتا گیا۔ سب دوست یہی کہتے تھے کہ کینیڈا نے صحیح طریقے سے تم کو خوش آمدید کیا ہے۔ وہ سب اس کتاب کا ذکر کرتے تھے جو کاغذات ملنے پر کینیڈا کی ایمبیسی سب کو دیتی ہے۔"ویل کم ٹو کینیڈا......"

شہباز پاکستان کا پوچھتا کہ وہ کیسا ہے، حالات کیسے ہیں؟ حالانکہ وہ تین دن پہلے ہی پہنچا تھا۔ مفتی کو پاکستان سے کوئی غرض نہ تھی اور نہ وہ پوچھتا تھا۔ مفتی کی بہن کئی سالوں سے یہاں ٹورنٹو میں مقیم تھیں اور وہ کم ہی بہن کے ہاں جاتا تھا۔ وہ اپنی ایک علیحدہ دنیا میں رہتا تھا۔ اس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ سب سے کٹ کر رہنے والا آدمی تھا۔ ایک فاصلے پر اپنے آپ کو رکھتا تھا۔ اور خان ہر ایک کے ساتھ دوستی بنا لیتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خان کی میرے ساتھ بے تکلفی اسے پسند نہیں آ رہی تھی اور شہباز اپنے بھاری بھر کم وجود کو کارپٹ پر ڈھیر کیے بڑبڑا رہا تھا۔

باہر سردی تھی اور اندر لیونگ روم کی بیس فٹ لمبی اور زمین سے چھت تک بڑی کھڑکی کے نیچے ڈکس لگی تھیں جہاں سے گرم ہوا اندر کے ماحول کو گرم رکھتی تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار پھینکی تھی۔ مرغ کڑاہی تیار ہوئی اور دسترخوان بچھایا گیا۔ فریج سے روٹیوں کا پیکٹ نکالا گیا اور اس میں سے خمیر لگی روٹیوں کو اوون میں رکھ کر گرم کیا گیا۔ ان روٹیوں میں کوئی عجیب سی باس اٹھتی تھی۔ میرے پوچھنے پر مفتی نے بتایا کہ یہاں یہی روٹیاں ملتی ہیں۔ مجھے ایک دم سے اپنی بیوی یاد آ گئی جو میرے گھر آنے پر توے پر گرم روٹیاں گندم کی مہک لیے میرے لیے بنا کر لاتی تھی۔ مجھ سے آج دو نوالے بھی نہ نگلے گئے اور میں ایک مایوسی میں گرتا چلا گیا کہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں نہ کوئی دوست ہے اور نہ غمخوار۔ بلکہ سب ہی ڈپریشن میں لگتے ہیں۔ اور تو اور نہ بھوک میں ٹھیک سے کھانا ملتا ہے۔

میری عادت رہی ہے کہ کھانے میں مجھے تازہ اور گرم روٹی چاہیے ہوتی ہے۔ پکی پکائی، پلاسٹک کے لفافوں میں بند روٹیاں مجھ سے کبھی نہیں کھائی گئیں۔ اور مجھے دونوں وقت تازہ سالن بھی چاہیے ہوتا تھا۔ یہ عادت تو یہاں کے حالات نے بدل ڈالی ہے مگر روٹی کا معاملہ ابھی تک پھنسا ہوا ہے۔

اتنی دیر میں شہباز کا رشتے میں ایک ماموں آیا۔ وہ آئی ٹی ایکسپرٹ ہوں بہت اچھی جاب پر فائز تھا۔ اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی مگر قباحت یہ تھی کہ وہ اس خود اعتمادی میں بہت زیادہ

www.urdusoftbooks.com

اور اونچا بولتا تھا۔ مگر میں اسے بڑی حسرت سے دیکھتا تھا کیونکہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ آتے ہی وہ شہباز کو تسلیاں دینے لگا۔ "تم گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟ میں ہوں ناں اور جاب کوئی مسلہ ہی نہیں ہے۔" پھر اپنا موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔ یہ ماموں خورشید تھے۔ ان دنوں کینیڈا میں موبائل فون کم ہی تھا اور اس کا ہونا ایک بڑی حیثیت کی نشان دہی کرتا تھا۔ فون پر اپنے دوستوں سے بات کرتا تھا کہ میرا ایک بھانجا ٹورنٹو میں آیا ہے اور اس کے لیے جلد سے جلد جاب کا انتظام کرنا ہے۔ وہ فون کرتا اور شہباز کو تسلی بھری نظروں سے دیکھتا اور پھر ہماری جانب ستائشی نظروں سے دیکھ کر اپنی بات جاری رکھتا۔ میں شہباز کی قسمت پر رشک کرتا کہ اس کا ماموں تو یہاں ہے جو اس کے لیے اتنا تردد کر رہا ہے اور ساتھ ہی دلاسہ بھی دے رہا ہے۔ مجھے ایسے نہیں سوچنا چاہیے تھا کیونکہ میں ابھی تو پہنچا تھا۔ مگر اتنی لمبی پرواز کے بعد میں اپنے آپ کو بہت دور اور تنہا محسوس کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ اڑ کر واپس چلا جاؤں۔ پھر اس نے شہباز سے کہا کہ تم مجھے پریشان لگتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ دو چار دن میرے ساتھ میرے گھر پر رہو گے تو تمھارے زرد چہرے کا رنگ پھر سے نکھر آئے گا۔

کل ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا اور وہ شہباز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جاتے جاتے شہباز یہی بڑبڑا رہا تھا "یہاں بڑا سیاپا ہے۔ بہت برے حالات ہیں۔"

خان قیصر بھی دوبارہ سے تیار ہو کر اپنی رات کی سیکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی دینے کے لیے تیاری پکڑنے لگا۔ میں تھکاوٹ اور نیند سے بے حال تھا۔ خان چلا گیا تو مفتی کہنے لگا کہ خان کچھ دنوں میں یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اور شہباز اس کمرے میں رہو گے۔ وہ مجھے بیڈ روم دکھا رہا تھا۔ بارہ ضرب چودہ کا کمرا تھا جس میں باہر کی جانب پوری دیوار میں ایک شیشے کی کھڑکی تھی اور جس میں ایک سلائیڈنگ دروازہ بھی تھا۔ کمرے میں ایک میٹرس پڑا تھا۔ کمرا حرارت کی وجہ سے تندور کی طرح کھول رہا تھا۔ مفتی نے مجھے ایک کالنگ کارڈ دیا اور پھر کہا کہ پاکستان اپنے پہنچنے کی اطلاع کر دوں۔ ابھی تو وہاں صبح بھی نہ ہوئی ہوگی، اسی لیے میں نے کارڈ شکریے کے ساتھ رکھ لیا۔ اتنے میں طارق کا نیویارک سے فون آگیا۔ اس نے مجھے بہت تسلی دی۔ تمنا بھابی نے میری ہمت بڑھائی۔ ان دونوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا جو میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

میں نے کمرے میں آ کر باہر کا دروازہ تھوڑا سا کھولا کیونکہ اندر کی گرمی سے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ جیٹ لاگ میں تھا۔ معمول پر آنے کے لیے کچھ دن چاہیے تھے۔ میرا جسم ابھی پاکستان کے وقت کے مطابق چل رہا تھا، جس میں دن کو نیند آتی اور رات کو بیداری کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن میں پچھلے تیس گھنٹے سے سویا نہ تھا اور اسی لیے بستر پر جاتے ہی سو گیا۔ سونے سے پہلے مفتی نے مجھے باتھ روم کا نظام سمجھایا کہ نل کیسے کھلتا ہے۔ پانی باتھ روم کے فرش پر نہیں آنا چاہیے۔ ٹب میں نہاتے وقت گرم اور ٹھنڈے پانی کی نسبت کس طرح برقرار رکھی جاتی ہے۔ میں ہر لمحے کچھ نہ کچھ سیکھ رہا تھا۔ یہاں مفتی نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔

کچھ دیر ہی سویا تھا کہ اٹھ بیٹھا۔ خموشی اور سناٹا تھا اور ساتھ ہی گھپ اندھیرا جیسے شاید قبر میں ہوتا ہوگا۔ پہلے تو کچھ دیر سوچتا رہا کہ میں کہاں ہوں اور یہ میرا بستر تو نہیں ہے۔ محسوس کیا کہ قندیل کیوں آج میرے پاس آ کر نہیں سوئی۔ ٹٹولا تو وہ نہیں تھی۔ پھر دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو معلوم پڑا کہ میں چھبیس گھنٹے کا سفر کر کے دنیا کے اس کونے میں آ گیا ہوں جہاں سے واپسی کے سب راستے بند ہیں۔ میں پچھتانے لگا۔ یا اللہ یہ میں کیا کر بیٹھا کہ اپنے شوق میں بچوں تک کو چھوڑ آیا۔ میں دل شکستگی اور ذہنی دباؤ میں آتا چلا گیا۔ یہاں تو سب اجنبی ہیں۔ مفتی اور خان سے میں پہلی بار ملا ہوں اور میرا غمگسار کوئی نہیں ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں سسک سسک کر رونے لگا۔ میں اتنا کمزور تو کبھی نہ تھا اور آج مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میں اپنا رونا دباتا تھا کہ کوئی سن نہ لے مجھے پاکستان میں اپنے گھر کا کمرا اور اس کا ایک ایک کونہ یاد آنے لگا تھا۔ سمیہ، قندیل اور اریبہ یاد آنے لگی۔ جتنا سوچتا تو اتنا ہی زیادہ رونے لگتا۔ یہ سوچتا کہ یہاں میں کیا کروں گا؟ جتنے لوگ بھی مجھے آج ملے وہ مہینوں تک بے روزگار رہے ہیں۔ سب اپنے بچوں، والدین اور دوستوں سے دور ہیں۔ ایک متوازن زندگی چھوڑ کر میں کہاں آ گیا ہوں؟ وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ شدید پریشانی میں پڑا تھا۔ میں نے لائٹ جلائی۔ یہاں بٹن اوپر کریں تو لائٹ جلتی ہے اور پاکستان میں بٹن نیچے کریں تو کمرا روشن ہوتا ہے۔ مجھے یہاں ہر چیز الٹی نظر آنے لگی۔ میں تو کسی اور دنیا کا رہنے والا تھا اور یہاں کی دنیا میری نہ تھی۔

میں نے حساب لگایا کہ ابھی پاکستان میں دن کے

گیارہ بجے ہوں گے۔ میں نے فون ملایا تو سمیہ نے فون اٹھایا۔ میری آواز سنتے ہی اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کب پہنچے، کیسے ہیں، سفر کیسا گزرا؟ جواب دیتے ہوئے میں روہانسا ہو گیا۔ میری آواز پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ میں اپنی حالت اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اپنی آواز پر قابو پانا بھی مشکل تھا۔ وہ بھانپ گئی کہ میں کس مشکل سے دوچار ہوں۔ دس منٹ کا کالنگ کارڈ تھا۔ سمیہ اور قندیل سے بات ہوئی۔ قندیل پوچھتی کہ بابا آپ کب آئیں گے؟ میں اس کے سوال پر پھر رو پڑا۔ سمیہ مجھے تسلی دینے لگی۔

ان سے بات کر کے میرا دل ہلکا ہو گیا۔ دس منٹ ایک لمحے میں گزر گئے۔ میں اٹھا اور گرم پانی سے غسل کیا۔ شاور سے پانی ایک تیز رفتاری سے برس رہا تھا۔ ساری کسلمندی دور ہو گئی۔ جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ لیونگ روم میں جھانک کر دیکھا تو مفتی خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے تہجد پڑھی اور اپنے بستر پر آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دوبارہ سو گیا۔

دیر تک سوتا رہا تھا۔ بیدار ہوا تو دیکھا کہ خان کارپٹ پر پڑا بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کے بستر پر میں سویا ہوا تھا۔ وہ رات کسی وقت اپنی ڈیوٹی کر کے پہنچا ہو گا اور اپنے بستر پر مجھے سوتا دیکھ کر کارپٹ پر ہی سو گیا تھا۔

ٹائم دیکھا تو دن کے نو بج رہے تھے۔ باہر لیونگ روم میں آیا تو مفتی ٹی وی کے سامنے بیٹھا کوئی شو دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں پاکستانی ٹی وی ابھی امریکا یا کینیڈا میں نہیں آیا تھا۔ پاکستانی نجی چینل ابھی شروع نہیں ہوئے تھے اور وہاں کی کوئی خبر ہمیں نہ ملتی تھی۔ انٹرنیٹ ابھی شروع ہو رہا تھا۔ فون کے ساتھ لنک ہو کر انٹرنیٹ چلتا تھا اور ہمارے پاس کمپیوٹر تو تھا مگر انٹرنیٹ کا نظام نہ تھا۔ ہفتے اور اتوار کو آدھے گھنٹے کے لیے ایک انڈین شو ہوتا تھا۔ جس میں پاکستان کی بھی بات کر لیتے تھے۔ ہم پورا ہفتہ اسی شو کا انتظار کرتے تھے۔ فون بھی بہت مہنگا تھا۔ دس ڈالر میں آٹھ منٹ بات ہوتی تھی۔ نہ کوئی فیس بک اور نہ اسکائپ اور نہ کوئی وائبر قسم کی کوئی چیز تھی اس لیے دور ہونے کا احساس بہت ہی زیادہ تھا۔ ہم پاکستان خط لکھا کرتے تھے اور روزانہ ہمیں خطوں کا انتظار ہوتا تھا۔ آجکل تو دوری تو دوری ہی نہ رہی۔ کسی بھی وقت چاہا اور اپنے موبائل فون سے بات کر لی۔ کہاں ایک ڈالر میں ایک منٹ بات ہوتی تھی اور اب ایک سینٹ میں ایک منٹ بات ہوتی ہے۔ ٹی وی کے سارے چینل براہِ راست آتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ہر اخبار اور اپ ڈیٹس چوبیس گھنٹے ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں سمندر پار پاکستانی اپنے ملک سے مکمل طور پر کٹ کر رہتے تھے۔ جو لوگ ستر اور اسی یا نوے کی دہائی میں آئے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ ہم تو صرف عید پر پاکستان فون کرتے تھے۔ آپریٹر یہاں سے لندن کی لائن لیتا، وہاں سے ترکی اور پھر کراچی کے آپریٹر سے بات ہوتی اور وہ پھر پاکستان کے کسی شہر میں وہاں کے آپریٹر سے رابطہ کرتا۔ یہاں اور پاکستان میں لوگ پورا دن ایک دوسرے کی آواز سننے کے لیے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی لیے جو ان دنوں یہاں پیدا ہوئے وہ پاکستان سے مکمل طور پر کٹ گئے تھے۔ نہ پاکستان کے ماحول کا پتا اور نہ مذہب کی خبر تھی۔ حلال گوشت لینے کے لیے یہاں میلوں دور جانا پڑتا تھا۔ ان دنوں کے بچے اپنے ماں باپ کے علاوہ پاکستان میں اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں پہچانتے تھے اور اگر کبھی وہ پاکستان جاتے تو ان کے چہروں پر اجنبیت ہوتی تھی۔

اب حالات بدل گئے ہیں۔ مواصلاتی رابطے آسان تر ہو گئے ہیں اور بچے اپنے رشتہ داروں کو جانتے ہیں۔ ہر روز فیس بک پر رابطہ ہوتا ہے۔ مذہب کے بارے میں سب چیز انٹرنیٹ پر ہے۔ یہاں بیٹھ کر پاکستان کا ٹی وی دیکھتے ہیں۔ مسجدیں ہر جگہ بن چکی ہیں۔ حلال ریسٹورنٹ ہر کونے پر موجود ہے۔ اب کسی کا کوئی یہ بہانا بھی نہیں ہے کہ مذہب حلال فوڈ یا اپنی تہذیب سکھانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ مذہبی آزادی یہاں کے ملکوں میں پاکستان سے بھی زیادہ ہے۔ رمضان میں مسجدیں بھری ہوتی ہیں۔ چاند رات منائی جاتی ہیں۔ عید ملیے ہوتے ہیں۔ عبادتیں مکمل آزادی سے ہوتی ہیں۔ اب تو اللہ کا بہت شکر ہے۔ میں اس کو پاکستان کا نعمل بدل نہیں کہہ رہا۔ اس کا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں صرف اب اور پہلے سے موازنہ کر رہا ہوں۔

میں اٹھ کر باہر آیا تو مفتی نے رات گزرنے اور نیند کا پوچھا۔ میرے بتانے پر بولا کہ کچھ دن میں سب معمول بن جائے گا۔

مفتی جب گھر میں ہوتا تو اپنے میٹرس پر ہی پایا جاتا تھا۔ یا سویا ہوا ہے یا تکیے سے ٹیک لگائے ٹی وی دیکھ رہا ہو تو ملے۔ پڑا رہتا اپنے میٹرس پر۔ اس سے نیچے اترنے کے لیے اس کو ایک جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ میٹرس پر رہنے کے علاوہ میں نے اسے کچھ کرتے نہیں دیکھا۔ کچن میں بوجہ مجبوری جاتا تھا۔ ابھی بھی ٹیک لگائے ٹی وی کے سامنے انڈین شو دیکھ رہا تھا۔ آج سنیچر کا دن تھا اور آج مفتی کی چھٹی تھی۔ مجھے کہا کہ تیار ہو جاؤ اور آج سب وے چلتے ہیں۔

www.urdusoftbooks.com

سب وے یہاں زیرِ زمین ریلوے کے نظام کو کہتے ہیں۔ لندن میں ٹیوب اور نیویارک میں میٹرو اور پیرس میں بھی میٹرو کہلاتی ہے۔ ٹورنٹو کی سب۔وے مجھے ان تمام سے چھوٹی لگی۔ لندن اور نیویارک میں تو اس کا بہت بڑا جال زمین کے نیچے بچھا ہوا ہے۔ میں بھی مفتی کے سامنے سعادت مندی دکھا رہا تھا کیونکہ وہ میری بہت زیادہ مدد کر رہا تھا۔

میں نے گرم پانیوں کا شاندار شاور لیا۔ آپ پورا دن بھی شاور کے نیچے کھڑے رہیں تو بھی گرم پانی نہ کم ہوگا اور نہ ہی اس کی رفتار پر کوئی اثر پڑے گا۔ پانی ایسی رفتار سے نکلتا ہے جیسے کوئی ٹیوب ویل کھول دیا گیا ہو۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ہر بلڈنگ کے نیچے تہہ خانے میں بوائلر لگے ہیں اور نیچے لانڈری کرنے کے لیے بڑی بڑی واشنگ مشینیں رکھی ہیں اور ڈرائر بھی وہیں رکھے ہیں۔ آپ ایک یا دو ڈالر کا سکہ ڈالیں اور لانڈری کر کے کپڑوں کو سکھا کر اوپر لے آئیں۔ مجھے جو چیز سب سے زیادہ متاثر کر رہی تھی وہ یہاں اپارٹمنٹ کو اتنی کڑکتی سردی میں گرم رکھنے کا نظام تھا۔ باہر منفی چالیس کا درجہ حرارت ہے۔ دو منٹ باہر کھڑے رہیں تو آپ کی رگوں میں خون جم سکتا ہے اور آپ اسپتال پہنچ جاتے ہیں مگر اپنے اپارٹمنٹ میں صرف ایک شرٹ میں بیٹھے باہر برف باری دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ نظام نہ ہو تو یہاں زندگی کا چلنا بھی بہت مشکل ہو جائے۔

میں نے کپڑے تبدیل کیے۔ اپنی طرف سے سردی سے بچاؤ کے لیے لیدر کی جیکٹ پہنی۔ سر پر گرم ٹوپی رکھی۔ مفتی کچن میں کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔ میں بھی پہلی بار کچن میں داخل ہوا۔ کچن کا وہی سائز تھا جو بیڈ روم کا تھا۔ خاصا کشادہ تھا۔ داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ کو ایک بڑا فریج پڑا تھا۔ وہیں سے کچن کے کاونٹر شروع ہو جاتے، ایک دیوار کے ساتھ ساتھ جاتے اور پھر گھوم کر سامنے والی دیوار کو بھی گھیر ے میں لے لیتے۔ سامنے دیوار کے بائیں کونے میں اوون تھا جس پر چار چولہے بجلی سے چلتے تھے۔ اوون کے دائیں ہاتھ پر سنک تھا جہاں گرم اور سرد پانی آتا اور ہم برتن دھوتے تھے۔ کاونٹر کے نیچے الماریاں تھیں۔ پہلے مجھے مفتی نے چولہا آن اور آف کرنا سکھایا۔ پھر سینک پر لگی پانی کی ٹوٹی کو استعمال کرنا سکھایا۔ ایک ہی ٹوٹی سے کھینچ کر دائیں جانب گھماؤ تو ٹھنڈا اور بائیں جانب گھماؤ تو گرم کھولتا ہوا پانی نکلتا تھا۔ آپ یہ پڑھ کر میرا مذاق نہ اڑائیں کیونکہ میں یہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ پھر بتایا کہ کچرا کیسے پلاسٹک کے تھیلوں میں رکھ کر باہر کہاں پھینکتے ہیں۔ بلڈنگ کے پیچھے ایک دروازہ کھول کر جاتے ہیں اور لوہے کے دو دو دس فٹ لمبے کنٹینر رکھے ہیں، جن میں یہ کچرا جاتا ہے۔ ایک ہفتے میں دو دن ایک ٹرک آتا ہے جو ان کو خالی کر کے واپس کرین سے اپنی جگہ رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے آپ کو کسی پارک، سڑک یا فٹ پاتھ پر ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی نہیں ملے گا۔ تھوکنا تک جرم ہے۔ صفائی کا یہ عالم ہے کہ جن جوتوں میں، میں ٹورنٹو پہنچا تھا وہ ایک سال تک پالش نہیں ہوئے تھے۔ نہ تو مٹی اور نہ ہی گرد۔ فضا شیشے کی طرح چمکتی ہوئی جس میں نہ گاڑیوں کا دھواں اور نہ کسی ہارن کی آواز۔ ہارن اگر کسی نے بجا دیا تو لوگ اچھل کر دیکھنے لگتے ہیں کہ کیا ہو گیا ہے؟ جتنی تیز رفتار بارش ہو جائے، مجال ہے کہ کہیں پانی کھڑا دکھائی دے۔ نہ تو کیچڑ نظر آتا ہے اور نہ کوئی چھینٹے اڑتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی غیر متوقع طور پر کوئی بڑا طوفان آجائے تو سنبھالنے میں انہیں بھی دقت پیش آتی ہے۔

مفتی نے ڈبل روٹی کے سلائس گرم کیے اور آملیٹ بنایا۔ چائے ٹی بیگ والی بنائی۔ ایک کپ میں ٹی بیگ ڈالا اور پھر اس پر کھولتا پانی ڈال دیا۔ فریج سے دودھ نکال کر اس کپ میں ڈالا اور چینی ڈالنے کے بعد چائے تیار۔ یہ ناشتا میں نے آج تک نہیں کیا تھا۔ میں تو پراٹھوں، سالن اور تازہ کڑکتی چائے پینے کا عادی تھا اور یہ ناشتا میرے حلق سے کیسے اترتا۔ پر یہاں مجھے یہ سب کرنا تھا۔ خمیری روٹی کو بھی ہضم کرنا تھا جو رات میں کھائی تھی۔ مگر میں یہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دو ماہ بعد اسی کچن میں آٹے سے تازہ روٹی بننے لگی۔ قورمے، پلاؤ، بھنا قیمہ تک بننے لگا۔ پس فرق یہ ہوا کہ چمکتا دمکتا کچن اب کوڑا کباڑ نظر آنے لگا تھا۔ مصالحوں کی خوشبو پورے اپارٹمنٹ میں پھیلی رہتی تھی۔ مفتی جو بہت صفائی پسند تھا، اس نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا مگر ناراض دکھائی دینے لگا تھا۔

ہم ناشتا کر کے اپنے تندور ہوتے گرم اپارٹمنٹ سے باہر آئے تو برفانی جھکڑوں نے میرا استقبال کیا۔ اندر بیٹھے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ باہر قطب شمالی والا ماحول ہے۔ میری لیدر کی جیکٹ، اونی ٹوپی اور مفلر بے فائدہ نظر آنے لگے۔ اب اس کے علاوہ چارہ بھی نہ تھا۔ ہماری اور سامنے والی جڑواں عمارتوں کے بیچ چیڑ کے پیڑ جھکڑوں کے زور سے آسمانوں کی جانب اڑنے کو پر تولتے تھے۔ دونوں عمارتوں کے اختتام پر ایک بڑا پارکنگ لاٹ تھا جہاں مکینوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ بیسمنٹ (Basement) بھی دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل میں بھی پارکنگ تھی جس کے اضافی پیسے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

لیتے تھے اور اسی لیے وہ اپنی گاڑیوں پر برف ہٹانے کے بے ہودہ اور سخت کام سے بچے رہتے تھے۔

ہم اپنی بلڈنگ سے باہر نکلے اور دائیں جانب مڑ گئے اور پھر ایک اور موڑ مڑا تو ایک بڑی اور مصروف روڈ پر آ کھڑے ہوئے۔ آنے جانے کے لیے دو لائن تھیں۔ اس روڈ کو مارٹن گرود (Grove Martin) کہتے ہیں اور اس پر ٹورنٹو ٹرانسپورٹ کی آرام دہ بسیں بھی چلتی ہیں۔ ہم کو سڑک کراس کر کے دوسری جانب جانا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب شیشے کے کیبن بنے تھے جس میں بسوں پر سفر کرنے والے سردی سے اپنے آپ کو بچا کر بس کا انتظار کرتے تھے۔ مفتی نے کھمبے پر ایک بٹن دبایا تو سڑک کے بیچ لگی سرخ لائٹ جل اٹھی۔ آتی جاتی ٹریفک تھم گئی اور ہم آرام سے جیکٹوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کراس کر کے دوسری جانب آ کھڑے ہوئے۔ پیدل چلنے والوں کی عزت نفس کا اتنا اہتمام مجھے حیران کر گیا۔ ہم دوسری جانب پہنچے تو ٹریفک پھر رواں ہو گئی۔ مفتی مجھے حیرت میں ڈوبا دیکھ کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''ابھی آگے دیکھتے جاؤ اور حیرت میں ڈوبتے جاؤ۔

ہم نے سب وے جانے سے پہلے کچھ گروسری کرنی تھی۔ دس منٹ کی پیدل مسافت پر ایک سپر اسٹور تھا۔ وہاں تک ہمیں پیدل جانا تھا۔ میں ٹورنٹو کو اب پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پاکستان سے کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔ اتنا خوبصورت اور چمکتا دمکتا شہر دیکھ کر میں تیرت کے جھٹکے کھا رہا تھا۔ مفتی بتا رہا تھا کہ جب تم سپر اسٹور کے اندر جاؤ گے تو تم کو اللہ کی رحمت اور برکت نظر آئے گی۔

ہم پیدل چلتے جا رہے تھے۔ دونوں جانب چھوٹے چھوٹے خوبصورت سرخ رنگ کے مکانات ایک ترتیب سے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ مفتی بتا رہا تھا کہ ان چھوٹے گھروں کو ٹاؤن ہاؤسز کہا جاتا ہے۔ پھر بڑے بڑے پارک نظر آئے جن کا کوئی کونا بھی گھاس سے خالی نہ تھا۔ موسم کی پہلی برف ابھی نہیں پڑی تھی۔ میں با آسانی ان پارکوں میں جھولے اور بچوں کے کھیلنے کا انتظام دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم بڑی بڑی اپارٹمنٹ بلڈنگز کے سامنے پہنچ گئے۔ ہر عمارت بیس بیس منزلہ ہوگی۔ دس بارہ عمارتوں کے بیچ ایک مارکیٹ تھی۔ ایک لائن میں چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ جس میں سپر اسٹور، فارمیسی، بینک، شراب خانے اور بہت کچھ تھا۔ گروسری کا ایک اسٹور تھا جس کا نام گلاٹی تھا۔ اس کے ساتھ ایک اسٹور تھا جس پر جاز لکھا تھا۔ جاز ایک سکھ کا نام تھا۔ بعد میں یہی جاز میرا دوست بنا اور دیسی چیزیں ہم اس سے خریدتے تھے۔ ایسی مارکیٹ کو یہاں اسٹرپ مال کہا جاتا ہے۔

ہمیں گلاٹی سپر مال میں جانا تھا۔ مفتی کہہ رہا تھا کہ تم اندر دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے کہ کتنا بڑا اسٹور ہے اور کتنی اشیا سے بھرا پڑا ہے۔

میں اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ خاص کر کھانے پینے کی چیزوں سے جس کا تعلق ہو سکتا ہے وہ وہاں بہت صفائی اور قرینے سے سجی سجائی رکھیں تھیں۔ سب سے پہلے سبزیوں کا حصہ تھا جہاں ہر قسم کی سبزی موسمی ہو یا غیر موسمی انتہائی صاف ستھری، تر و تازہ، نہایت مناسب نرخوں پر دستیاب تھیں۔ ان کے نرخ ساتھ لکھے ہوئے تھے۔ آلو پیاز، ٹماٹر، مٹر، شکر قندی، گوبھی، مرچیں، ادرک، لہسن۔ یہ سب کچھ ایک قطار میں پڑی تھیں۔ اب تو پاکستان میں بھی یہ نظام آ گیا ہے کہ آپ ٹرالی بھر کر کاونٹر پر جاتے ہیں اور ادائیگی کر کے باہر نکل جاتے ہیں۔ ہر اسٹور کا اپنا اشتہاری اخبار ہر ہفتے کو آتا ہے۔ یہ ''فلیئر'' ہر ہفتے آپ کے دروازے پر پڑے ہوتے ہیں۔ خاتون خانہ ان کا بغور جائزہ لیتی ہیں کہ کس چیز کی سیل کہاں لگی ہے۔ جیسے آج گلاٹی پر۔ انڈوں کی سیل تھی۔ عمومی نرخ دو ڈالر کے درجن تھے اور آج سیل پر ایک ڈالر اور انتیس سینٹ کے درجن بک رہے تھے۔ مفتی نے ڈیری کے سیکشن میں چار ڈبے انڈوں کے اٹھا لیے۔ مختلف قسم کا دہی۔ دودھ کی ہر قسم، پنیر، کریم، مکھن کئی ایک اقسام کا، ہر قسم کے پھل کا تازہ جوس، مختلف اقسام کی ڈبل روٹیاں، غرض ہر چیز جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں موجود تھیں۔ پھر گوشت کا شعبہ تھا جہاں خنزیر سے لے کر بکری اور مرغی تک کا گوشت بک رہا تھا۔ یہاں جانور کے ہر حصے کی اپنی قیمت ہے۔ یہ نہیں کہ دو کلو بکرا دے دو۔ یہاں گوشت حلال موجود نہ تھا اور میں نے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ میں نے بکرے کے پائے دیکھے تو مفتی سے بولا۔ ''یہ گورے بھی بکرے کے پائے کھاتے ہیں ؟''

مفتی بولا ''یہ بکرے کے نہیں۔ خنزیر کے پائے ہیں۔''

اگر پھلوں والے حصے میں آؤ تو اتنے زیادہ اقسام کے پھل تھے کہ میں بھی کئی ایک کے نام تک نہ جانتا تھا۔ مجھے پاکستان میں بتایا گیا تھا کہ وہاں پھل وغیرہ بہت کم اور مہنگے ملتے ہیں۔ مگر یہاں تو ایک بہتات میں اور کم نرخوں پر دستیاب تھے۔ کیلے، انگور، مالٹے، کینو، انار، سیب، ناشپاتیاں اور ان سب کی مختلف اقسام ڈھیروں کے حساب سے بجی تھیں۔ کوئی نہ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کوئی ملازم ان کو اٹھا کر کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ میں دلچسپی سے دیکھتا تھا اور مفتی میری دلچسپی دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

ہم کاؤنٹر پر آئے تو سیل گرل نے چار درجن انڈے دیکھ کر کہا کہ ایک آدمی صرف دو درجن لے سکتا ہے۔ مفتی نے پھر دو درجن میرے نام پر لیے۔ اب تو انٹرنیٹ پر ایسے اسٹور دیکھے جاسکتے ہیں مگر ان دنوں یہ ایک نئی چیز تھی جو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس اسٹور کا سائز اتنا بڑا تھا کہ درجنوں ہمارے بڑے اسٹور اس میں سما سکتے تھے۔ وہ تو میں نے بعد میں دیکھا کہ اس سے بھی بڑے بڑے اسٹور... موجود ہیں کہ درجنوں گلاٹی بھی مل جائیں پھر بھی وہ اسٹور اس سے بھی بڑے ہیں۔

ہر ایک کے ہاتھ میں اسٹور کا فلائر ہوتا ہے اور وہ اپنی پسند کی چیزیں خریدرہا ہوتا ہے۔ اسٹور کا مستعد عملہ ہر لحظہ مدد کے لیے تیار ہوتا ہے۔ کسٹمر سروس تو کمال کی ہوتی ہے۔ مجال ہے کہ ان کے چہروں پر کوئی شکن بھی آجائے۔ یہاں کی خواتین گوری ہوں یا کالی، سب ہی نرخوں اور سیل پر بہت زیادہ بحث کرتی ہیں۔ خواتین کے رنگوں اور کپڑوں میں فرق ہوسکتا ہے مگر شاپنگ کے وقت دنیا کی تمام عورتیں آپس میں بہنیں ہی ہوتی ہیں۔ میں اور مفتی ٹرالی گھسٹتے پورے اسٹور میں گھوم رہے تھے۔ ہماری شاپنگ زیادہ نہ تھی۔

سنیچر کا اخبار یہاں بہت اہمیت رکھتا تھا کیونکہ جاب کے سب اشتہار سنیچر کے اخبار میں آتے ہیں۔ ٹورنٹو اسٹار یہاں کا سب سے بڑا اخبار ہے اور پھر سن اخبار ہے۔ سن تو گھر لانے کے قابل بھی نہیں ہوتا اور ہمیشہ اسکینڈل کا سہارا لیتا ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کے باہر شیشے کے بکسوں میں یہ اخبار پچاس سینٹ کا ملتا ہے، مگر اسٹور میں مفت مل رہا تھا۔ میں نے ایک اخبار اٹھایا تو وہ ایک کلو وزنی تھا۔ پہلے تو یہ سمجھا کہ دو تین اٹھالیے ہیں۔ مفتی ہنس کر بولا کہ نہیں ایک ہی ہے، اٹھالو۔

رائل بینک آف کینیڈا یہاں کا ایک بڑا بینک ہے۔ گلاٹی سے چند اسٹور چھوڑ کر اسی مارکیٹ میں ہے۔ مفتی پھر مجھے بینک لے گیا۔ صاف ستھرا ماحول اور مستعد عملہ۔ لوگ ایک لائن میں اندر کھڑے تھے اور سب کو باری باری نمٹایا جارہا تھا۔ مفتی کا کوئی کام تھا اور وہ لائن میں لگ گیا۔ میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک سیاہ فام بھی آبیٹھا۔ اس کی گوری بیوی لائن میں کھڑی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا بچہ صاف ستھرے کارپٹ پر کھیلتا تھا اور کرسمس ٹری کے جلتے قمقمے اس کو اپنی جانب متوجہ کررہے تھے اور وہ ان کی جانب لپک رہا تھا۔ باپ اسے زبانی روکتا تھا اور وہ اس درخت کا ستیاناس کر رہا تھا۔ میں سوچتا کہ اگر ہمارے بچے نہ رکیں تو ہم ایک دو لگا دیتے ہیں یا کم از کم جھاڑ تو ضرور پڑتی ہے مگر یہاں تو باپ کو کوئی فکر ہی نہ تھی۔ سیاہ فام کی گوری بیوی سے گندمی رنگ کے بچے پیدا ہوئے تھے۔ نقش تو سیاہ فام کے تھے مگر رنگت نکھری ہوئی تھی۔ ایسی نسل عام دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ میں ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا تھا۔ ایک نئی تہذیب میرے سامنے کھل کر ظاہر ہورہی تھی۔ ان کی انگریزی کا لہجہ میرے سر کے اوپر سے گزر جاتا تھا اور مجھے فکر یہی تھی کہ میں جاب کیسے ڈھونڈوں گا اور کون مجھے رکھے گا۔ یہی فکر مجھے کھائے جارہی تھی۔ میں ایک ایک کا جائزہ لے رہا تھا کہ مفتی فارغ ہوکر آگیا۔

پھر مجھے وہ بتارہا تھا کہ ٹرانسپورٹ کا سسٹم کیسے کام کرتا ہے۔ ٹورنٹو ٹرانسپورٹ (TTC) کا ایک وسیع و عریض نظام ہے۔ اس کے نیچے بسوں اور سب-وے کا ایک جال بنا ہوا ہے۔ آپ ایک ٹکٹ لیں اور یک طرفہ کسی بھی جگہ آپ پہنچ سکتے ہیں۔ اسی ایک ٹکٹ میں آپ بس سے سب-وے اور پھر دوسری بس اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو ایک اور بس کا سفر آپ کرسکتے ہیں، جب تک آپ منزل کو نہیں پہنچتے۔ ایک ٹکٹ ان دنوں دو ڈالر میں ملتا تھا۔ ایک ماہ کا پاس اسی ڈالر کا تھا جس پر آپ پورے مہینے میں لامحدود سفر کرسکتے ہیں۔ بینک کے ساتھ ایک مشہور فارمیسی کی چین ''شاپرز ڈرگ مارٹ'' کے نام سے تھی۔ وہاں سے میں نے چار ڈالر کے دو ٹکٹ خریدے

گائی دی موپاساں

فرانس کا مشہور افسانہ نگار، نارمنڈی میں پیدا ہوا۔ روئن کالج سے گریجویشن کرکے پیرس میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ دس سال تک بحری فوج کے محکمے میں معمولی کلرک کی حیثیت سے کام کیا لیکن اصل شوق افسانہ نگاری تھا چنانچہ مشہور فرانسیسی ناول نویس گستاؤ فلابیر کے ساتھ مسلسل سات برس کام کیا۔ 1880ء میں اس کا ایک افسانہ The Ball of Fat اس سال کے بہترین افسانوں کے مجموعے میں شامل کیا گیا۔ اس شاہکار افسانے کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ مشہور ہوگیا۔ اگلے برس اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ House of Mrnc Teallier شائع ہوا تو نقادوں نے اسے فرانس کا سب سے بڑا افسانہ نگار قرار دیا۔ اس کا پہلا ناول ''A Woman`s Life'' 1883ء میں چھپا۔ آخر عمر میں ذہنی مرض میں مبتلا ہوگیا اور جنون کی حالت میں اسپتال میں وفات پائی۔

ہانیہ اسماعیل۔ کراچی

www.urdusoftbooks.com

کیونکہ اس کے بعد ہمیں سب وے جانا تھا۔

وہاں سے گھر آکر انڈے رکھے اور واپس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرنے لگے۔ سردی میرے لیے بہت تھی مگر مفتی کہہ رہا تھا کہ ابھی تو کچھ نہیں دسمبر میں دیکھنا۔ برف باری دسمبر میں عام طور پر شروع ہوتی ہے اور مارچ یا اپریل تک جاری رہتی ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی کی وجہ سے بسیں کم چلتی ہیں۔ عام دنوں میں ہر چار یا پانچ منٹ کے وقفے سے بس آجاتی ہے مگر ان دو دنوں میں دس سے پندرہ منٹ بعد بس آتی ہے۔ ایک اور بڑی سہولت یہ بھی تھی کہ ہر اسٹاپ کا ایک نمبر ہوتا ہے۔ آپ گھر میں بیٹھ کر ایک ٹول فری نمبر ملاتے ہیں اور پھر اپنا اسٹاپ نمبر دباتے ہیں۔ وہاں سے پوچھا جاتا ہے کہ کس سمت میں آپ کو جانا ہے۔ جیسے ہمیں کپلنگ (Kipling) سب-وے جانا تھا تو اس کے لیے کہا گیا کہ ایک دبائیں۔ ایک نمبر دبایا تو پھر بس کا شیڈول بتا دیا گیا۔ ایک پیغام میں بتایا گیا کہ اگلی بس مثال کے طور پر گیارہ بج کر آٹھ منٹ پر اس اسٹاپ پر پہنچے گی اور اس کے بعد جو پہنچے گی تو اس کا ٹائم بھی بتا دیا گیا۔ باہر سردی اور برف پڑ رہی ہے تو آپ ایک منٹ پہلے اسٹاپ پر پہنچ جائیں۔ حیرت انگیز طور پر ہر بس اپنے مقررہ وقت پر پہنچتی ہے کہ آپ اس سے اپنی گھڑی کا ٹائم درست کر سکتے ہیں۔ مفتی نے یہ طریقہ مجھے سمجھایا اور ہم اب اسٹاپ پر کچھ منٹ پہلے ہی آ کھڑے ہوئے تھے۔

سب وے مشرق سے مغرب چلتی ہے اور اس کے درمیان والے اسٹیشن سے شمال سے جنوب بھی چلتی ہے۔ مغربی سائیڈ کا آخری اسٹیشن کپلنگ پڑتا تھا اور مشرقی سائیڈ کا آخری اسٹیشن کنیڈی ہے۔ کنیڈی سے پھر زمین کے اوپر ایک ٹرین چلتی ہے جو آپ کو ٹورنٹو کے مشرقی شہروں سکاربرو اور مارکھم لے جاتی ہے۔ سکاربرو میں دیسی بہت رہتے ہیں۔ مارکھم ان دنوں آخری حصہ ہوتا تھا۔ اب تو مارکھم سے بھی کئی میل آگے شہر پھیل گیا ہے۔ یہ سب مغربی حصہ ہے۔ مشرقی حصے میں، مسی ساگا، کا مشہور شہر آباد ہے جو قدرے نیا ہے۔ ان دنوں بہت کم پاکستانی تھے اور وہ شہر ابھی پھیل رہا تھا۔ اب جب میں جاتا ہوں تو مسی ساگا اپنی حدود سے میلوں دور تک مغربی سمت میں پھیل چکا ہے۔ اتنے زیادہ تارکین وطن آچکے ہیں کہ اب مسی ساگا میں پاکستانی، انڈین اور سکھ ہر جانب نظر آتے ہیں۔ میں ان دنوں ٹورنٹو پہنچا تھا جب تارکین وطن نے آنا شروع کیا تھا اور ہمیں خال خال پاکستانی نظر آتے تھے۔ ہمارے علاقے میں قریبی مسجد بھی دس کلومیٹر دور تھی۔ کوئی ایک حلال ریسٹورنٹ ہوگا یا دیسی گروسری کی دکان ہوگی۔ اب تو ہر چوک پر کئی دکانیں، ریسٹورنٹ اور مسجدیں آباد ہو چکی ہیں۔ شلوار قمیص میں خواتین و حضرات گھومتے نظر آتے ہیں۔ پہلے پاکستانیوں کے مرکز لندن اور نیو یارک تھے اور اب ٹورنٹو سب سے آگے نکل چکا ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ یاریاں انڈین اور سکھ نظر آتے ہیں تو حیرت کی بات نہیں۔ حالانکہ دونوں انڈین ہیں مگر سکھ اپنا علیحدہ تشخص رکھتے ہیں۔ ان سے پوچھیں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں تو سینہ پھلا کر کہتے ہیں ”پنجاب کے۔“

پہلے تو میں پریشان ہو جاتا تھا کہ پنجاب تو پاکستان میں ہے اور یہ پاکستان میں کہاں رہتے ہیں؟ برسوں پہلے ایک واقعہ پڑھا تھا۔ آصف نامی شخص ایک کنونشن میں شرکت کے لیے دہلی گیا تھا۔ اسے اشوکا ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔ ایئرپورٹ سے ٹیکسی لی۔ سکھ ڈرائیور سے کہا کہ مجھے اشوکا اتار دینا۔ ٹیکسی چلی تو ڈرائیور نے زور زور سے سانس کھینچنی شروع کر دی۔ آصف کو عجیب سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”سردار جی کوئی طبیعت شبیعت تو خراب نہیں ہے۔“ سردار جی نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ ”بھایا کہاں سے آ رہے ہو۔“ آصف نے کہا۔ ”لاہور سے۔“ سردار جی نے ٹیکسی سائیڈ میں کھڑی کی اور آصف کو زور زور سے سونگھنے لگا۔ آصف نے گھبرا کر کہا۔ ”سردار خیر تو ہے؟“ وہ بولا۔ ”تبھی تو میں کہوں اپنی مٹی کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔“ پھر اس نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ہوں۔ اتنے دنوں بعد اپنی مٹی کی خوشبو سونگھی ہے۔ بھایا کچھ ساگ سبزی ٹفن میں پڑی ہے تو دے دو۔ واگورو ری سوں۔ تا زندگی دعا دوں گا۔“ آصف کو یاد آ گیا کہ چلتے وقت بیوی نے زبردستی دو پراٹھے اور کباب دے دیئے تھے کہ اگر فلائٹ میں ناشتا ملنے میں دیر ہو تو کھا لیا۔ اس نے وہ ٹفن بڑھا دیا۔ سردار جی نے کباب تو ایک طرف کر دیئے اور کئی دن کے فاقہ زدہ شخص کی طرح خالی پراٹھا کھانے لگے۔ پراٹھا ہضم کر کے بولی۔ ”اب ایک ہفتہ بھی کچھ نہ ملے تو غم نہیں۔ اتنے سال بعد اپنے ہاں کا گندم کھایا ہے۔ سواد آ گیا۔ اب جب تک آپ دلی میں رہو، میری گڈی حاضر ہے۔“ سکھ پنجاب سے ہجرت کے بعد بھی پنجاب کو بھولے نہیں ہیں۔ اسی لیے ہم خود کو ہندوستانی کبھی نہیں کہتے ہیں۔ سکھ اور ہندو آپس میں زیادہ گھل مل کر نہیں رہتے بلکہ پاکستانیوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

بس اپنے مقررہ وقت پر آ کھڑی ہوئی۔ اب تو ایسی بسیں لاہور میں بھی چل رہی ہیں۔ ان دنوں میرے لیے نئی

Urdu Soft Books

چیز تھی۔ڈرائیور آگے بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک ڈبہ رکھا تھا۔میں نے ٹکٹ اس میں ڈالا اور مفتی کے ساتھ پیچھے ایک سیٹ پر آبیٹھا۔مفتی مجھے ایک دن میں اتنی زیادہ چیزیں سکھلا رہا تھا جو مجھے آیندہ ہمیشہ کام آتی رہی تھیں۔ہم مارٹن گروو پر رہتے تھے اور کپلنگ تک پندرہ منٹ لگتے تھے۔ہم بس میں بیٹھے تھے اور مفتی مجھے یہاں رہنے سہنے کے اطوار بتا رہا تھا کہ کس طرح یہاں لوگوں سے بات کی جاتی ہے، کس طرح کسی بات کا ردِعمل دیتے ہیں اور کس طرح کسی کی بات کا جواب دیتے ہیں۔میں نے جو کچھ پہلے ایک مہینے میں سیکھا وہ مجھے ہمیشہ کام آیا۔اس کے لیے میں مفتی کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔

بس اپنے اسٹاپ پر رکتی۔کچھ سوار ہوتے اور کچھ اتر جاتے۔صاف وشفاف سڑکیں، پارک، دیدہ زیب عمارتیں اور درختوں کی بہتات تھی۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت پارک بنے تھے۔کوئی ایک چیز بھی بے ڈھنگی یا بے ترتیب نہیں لگتی تھی۔

بس سب وے پہنچی۔جہاں کوئی پیدل نہیں جا سکتا ہے۔اس میں صرف بس ہی داخل ہوتی ہے کیونکہ بس کے مسافر کو اسی ٹکٹ پر ٹرین کا سفر بھی کرنا ہوتا ہے۔اسی لیے کوئی پیدل یا کوئی کار اس میں داخل نہیں ہو سکتی ہے۔مفتی مجھے یہاں ٹریفک کے قانون اور بورڈ بھی سمجھا رہا تھا۔ہم اندر داخل ہوئے تو کچھ سیڑھیاں زیرِ زمین جا رہی تھیں۔وہیں سے میں نے ٹورنٹو ٹرانسپورٹ کا نقشہ لیا جو بعد میں مہینوں میرے کام آتا رہا اور اسے دیکھ کر میں کہیں اور کسی بھی جگہ سب-وے یا بسوں کے ذریعے پہنچ سکتا تھا۔آپ کہیں بھی جا رہے ہوں تو صرف یہ معلوم کرلیں کہ جگہ کس انٹرسکشن کے قریب ہے اور سمت کون سی ہے۔شمال جنوب یا مشرق کہ مغرب؟ مفتی نے مجھے بعد میں نقشے کی مدد سے کہیں بھی پہنچنے کا طریقہ پوری عرق ریزی سے سمجھا دیا تھا۔ہر سڑک پر جو بس چلتی ہے اس کا نمبر بھی لکھا ہوتا ہے اور ہر بس کا پہلا اور آخری اسٹاپ بھی لکھا ہوتا ہے۔پھر جو بھی پاکستان سے ٹورنٹو آتا تو میں اس کو سب یہی باتیں اور طریقے سکھلاتا جو میں نے مفتی سے اور پھر اپنے تجربے سے سیکھے تھے۔

ٹرین کا اسٹیشن صاف ستھرا اور کسی بھی گندگی اور مٹی اور دھول سے پاک تھا۔ہر اسٹیشن پر چھوٹے چھوٹے اسٹور تھے اور بیشتر دیسی یا چینی لوگ چلا رہے تھے۔یہ سب وے سارے راستے زیرِ زمین نہیں چلتی بلکہ کئی مقامات پر یہ زمین کے اوپر بھی آجاتی ہے۔

کپلنگ آخری اسٹیشن تھا اور ٹرین پہلے سے موجود تھی۔ہم اس میں سوار ہو کر نیلی نیلی سیٹوں پر جا بیٹھے۔خودکار دروازے تھے جو کچھ دیر میں بند ہوئے پھر یہ ٹرین فراٹے بھرتی روانہ ہوگئی۔کسی بھی چیز کا پہلا تجربہ بہت خوشگوار اور حیرت ناک ہوتا ہے اور آج میں بھی اسی سے گزر رہا تھا۔میری حیرتیں مفتی کو بہت خوش کر رہی تھیں اور وہ مجھ سے کہتا کہ میں بھی تمہیں دیکھ کر خود بھی پہلی بار لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

راستے میں اسٹیشن آتے اور ٹرین ایک منٹ کے لیے رکتی اور پھر روانہ ہو جاتی۔راستے میں کیل (Kele) اسٹیشن آیا تو مجھے علی سفیان آفاقی کا ایک سفرنامہ یاد آگیا کہ کیل کے سب وے کے باہر ہائی پارک ہے اور اس کی بڑی تعریف کی تھی۔مجھے یہ سب دیکھنے کی کوئی جلدی نہ تھی کیونکہ میں مکمل طور پر بسنے کے لیے یہاں آچکا تھا اور یہ مقامات اپنے وقت اور اچھے موسموں میں دیکھ لیتا۔پہلے مجھے اپنا ذہن یہاں بسانا تھا جو ابھی تک پاکستان سے پی آئی اے اور پھر ٹورنٹو کے بیچ اٹک گیا تھا۔کل میں نے اپنے قدم یہاں رکھے تھے اور اگر مفتی نہ ہوتا تو میں کہیں کسی کونے میں اپنا چہرہ تکیے میں دیے آنسو بہا رہا ہوتا۔یہ تو مجھے مفتی ساتھ گھسیٹے لیے جا رہا تھا ورنہ میں کہاں اس ذہنی حالت میں تھا کہ دوسرے دن ہی سیر سپاٹا کے لیے نکل پڑتا۔میں نئی دنیا دیکھ کر خوش بھی ہوتا مگر دوری کا احساس ہوتا تو بچے یاد آتے، گھر اور گلیاں، اپنی موٹر سائیکل اور دریا سندھ کا چوڑا پاٹ ڈسنے لگتا۔ٹرین بھاگی چلی جا رہی تھی۔ایک دو تین منٹ بعد کوئی اسٹیشن آجاتا۔زیادہ تر چڑھنے والے ہوتے۔ٹرین بھرتی چلی گئی۔سیٹیں پُر ہوگئیں۔نئے چڑھنے والے خاموشی سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

دروازے کے ساتھ دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔وہ پہلے تو ہمیں دیکھ کر مسکرائیں۔میں نے سوچا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔پھر ایک نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو میں چونکا۔انہوں نے پھر اشارہ کیا تو میں نے مفتی سے پوچھا ''یار مفتی یہ کیا ماجرا ہے؟'' وہ میرے کان میں بولا ''انہیں اپنا کام کرنے دو۔ہم نے وہی کرنا ہے جو ہمیں کرنا چاہیے۔تم نظر انداز کرو۔'' اور میں نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔دراصل سفرنامے پڑھنے والوں کو ہمیشہ سے یہی گلہ رہتا ہے کہ لکھنے والے پر ہمیشہ کوئی لڑکی مرتی ہے اور مہربانی فرما کر مجھے اس میں شامل نہ کریں مگر ہونی کو کون روکے۔ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ہوا یہ کہ ایک دن میں ٹرین میں سوار ہوا۔رات کا وقت تھا۔مسافر نہ ہونے کے برابر تھے۔زیادہ تر سیٹیں خالی تھیں۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میں جس طرف بیٹھا تھا ادھر کچھ زیادہ ہی ویرانی تھی۔ میں نے سفر کی بوریت مٹانے کے لیے اپنے سامنے اخبار پھیلا لیا تھا۔ تبھی لمحے بھر کو ٹرین رکی۔ کئی مسافر سوار ہوئے۔ ان میں وہ بھی تھی۔ باقی مسافر تو داہنی طرف والی سیٹوں کی طرف بڑھ گئے مگر وہ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ امریکا میں جرائم کی دنیا کالوں نے آباد کر رکھی ہے۔ یہ ہر وہ جرائم کرتے ہیں جس کا موقع آسانی سے مل جائے۔ چوری چکاری۔ رہزنی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ان کی عورتیں بھی کم نہیں ہیں۔ مردوں کے شانہ بشانہ جرائم کرتی ہیں۔ وہ بیٹھنے کے بعد میری طرف کھسک آئی۔

اس دن یہی ہوا تھا مگر اس کے بعد آج تک میری بھرپور کوشش کے بعد بھی کچھ ایسا واقعہ نہ ہو سکا کہ راہ چلتے کسی نے مجھے دوست بنانے کی کوشش کی ہو۔ سب۔وے ہمیشہ سے برائی کے اڈے رہے ہیں۔ نیویارک میں تو یہ مافیا کا گڑھ رہا ہے۔ میں نے صرف سب۔وے میں نازیبا حرکات دیکھی ہیں۔ باہر شاذ و نادر ہی ایسا کچھ دیکھا ہوگا۔ ٹورنٹو تو پھر بھی جرائم سے بہت حد تک پاک ہے۔ یہ بھی نہیں کہ صرف مجرم اور برے لوگ ہی سب وے میں سفر کرتے ہیں۔ کچھ مسلمان خواتین سروں پر اسکارف لیے بیٹھی تھیں۔ یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت ہے جب تک کوئی دوسرا اس سے متاثر نہ ہو۔ آپ کسی کو گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بھی جرم ہے۔ کسی کو ہاتھ لگانا ایسے ہے کہ آپ نے اسے خنجر مار دیا ہو۔ یہ تو ناممکن ہے کہ آپ راہ چلتے کسی کو کندھا ہی مار لیں۔ اگر غلطی سے کسی سے ٹکرا جائیں تو معافیوں کا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ تجربات تو بعد میں مجھے ہوئے۔

مفتی کہہ رہا تھا کہ یہ مختلف النسل لوگوں کا ملک ہے۔ ہر ایک کو اپنے مذہب اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے۔ کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ”اور تم بھی خیال رکھنا اور اپنے کام سے کام رکھنا۔“ میں نے یہ نصیحت پلے باندھی اور اس سے مجھے اپنے آپ پر قابو پانے میں بڑی مدد ملی۔

چالیس منٹ کے سفر کے بعد ”کینیڈی“ کا مشرقی حد پر آخری اسٹیشن آیا۔ ایک جم غفیر ہمارے ہمراہ اترا۔ وہاں سے اسی ٹکٹ پر ریپڈ ٹرین پکڑ کر سکاربرو آئے۔ ریپڈ ٹرین زیر زمین نہ تھی۔ آس پاس پارک، بلند عمارتیں، صاف و شفاف سڑکیں اور ان پر دوڑتی گاڑیاں تھیں۔ آخری اسٹاپ آیا تو ہم دونوں دوسروں کے ساتھ اتر آئے۔

باہر نکلے تو سامنے ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ یہ ایک بڑا شاپنگ مال تھا۔ ٹرین مال ہی میں آ رکتی ہے۔ باہر بہت بڑا پارکنگ لاٹ تھا۔ سینکڑوں گاڑیاں ایک ترتیب سے پارک تھیں۔ مفتی بولا کہ میں تمہیں شاپنگ مال دکھانے آیا ہوں تاکہ تمہیں یہاں کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو سکے اور یہ کہ یہاں کے مال کس طرح کے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مفتی نے یہ بتایا کہ وہ دو ہفتے بعد پاکستان جا رہا ہے اور اگر کچھ بھیجنا ہے تو میں لے جاؤں گا تم یہاں سے بھی خریداری کر سکتے ہو۔

مفتی پشاور میں رہتا تھا اور مجھے قندیل کے لیے کچھ بھیجنا بھی تھا۔ سوچا تھا کہ بیٹی بہت خوش ہوگی جب یہ دیکھے گی کہ اس کے بابا نے تحائف بھیجے ہیں۔

اس مال کے آس پاس اونچی اونچی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھیں۔ میں کہہ رہا تھا ”یار مفتی! یہ اپارٹمنٹ تو بہت ہی خوبصورت اور بڑے لگتے ہیں۔ کیا ان کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے؟“

مفتی بھی لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ اس کو ایک قدردان قسم کا رنگروٹ ملا تھا جو اس کی ہر بات کو اہمیت دیتا تھا غور سے سنتا اور اس کو اپنے پلے باندھ لیتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یہ کونڈو کہلاتی ہیں۔ یہ کرایے کی بلڈنگ نہیں ہیں بلکہ لوگ خرید کر ان میں رہتے ہیں اور یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔“

میں مرعوب ہو کر اثبات میں سر ہلا رہا تھا اور مجھے نانگا پربت والے شاہ جی یاد آ رہے تھے اور میری زبان سے ان کا مشہور فقرہ نکلا۔ ”مار اوے“ اور پھر میں خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس ہنسی میں ایک درد تھا بچھڑنے کا اور دوری کا۔

مجھے یاد آ گیا کہ جب شاہ جی نے سنا کہ میں نے کینیڈا جانے کا حتمی ارادہ کر لیا ہے اور کسی طور بھی ان کا مشورہ نہیں مان رہا ہوں کہ کالج سے آ کر جو فالتو وقت بچتا ہے اس وقت کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنا رہا ہوں یعنی ان کی شاپ کے باہر چھوٹی سی دکان نہیں کھول رہا ہوں تو وہ بے بسی سے بولے تھے۔

”اچھا یہ بتاؤ کینیڈا میں دکانیں ہیں؟ کس کس قسم کی ہیں۔“

میں نے اس وقت تک کینیڈا صرف تصویروں میں دیکھا تھا اس لیے کہا۔ ”ہر قسم کی دکانیں ہیں۔“

”میرا دعویٰ ہے ایک قسم کی دکان نہیں ہوگی۔ اگر تم نے وہیں دکان کھول لی تو قسم سے بہت کمائی ہوگی۔“

”کس قسم کی؟“ استفسار کیا تو وہ بولے۔

”بہت معمولی سا خرچ آئے گا اور آمدنی ٹھیک ٹھاک

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

ہوگی۔“

”دکان ہوگی کس قسم کی؟“

”پان کا کیبن، قسم سے بہت آمدنی ہے اس کام میں، کراچی لاہور والے پان کھانے آئیں گے باقی لوگ نسوار لینے۔ ہے نا اچھا مشورہ؟“

اور تب ان کی جگہ میں نے نعرہ لگایا تھا۔ ”مار اوئے۔“

وہ سمجھے کہ میں پان کا کیبن کھولنے پر راضی ہو گیا ہوں۔ ”کینیڈا پہنچنے کے بعد کئی سال تک وہ تقاضا ہوتا رہا کہ کب پان کی دکان کھول رہا ہے۔“

خیر میں بتا رہا تھا کہ وہ کیا کمال کا مال تھا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاکستان میں بھی خاص کر کراچی میں بڑے مال بن چکے ہیں۔ جب یہ مال کھلا تھا تو کینیڈا کا چھٹے نمبر پر بڑا مال تھا۔ ان چھ میں سے چار تو ٹورنٹو میں ہیں۔ یہ مال 1973 میں کھلا تھا۔ دو سو سے زیادہ شاپس ہیں اور ہر شاپ میں گھومنے کے لیے بھی گھنٹوں لگ جائیں۔ اس کے علاوہ سینما بھی ہیں۔ ڈبل اسٹوری مال میں کھلے کھلے راستے ہیں جن کے بیچ آرام دہ صوفے رکھے تھے۔ رنگ و نور کی بارش تھی۔ چھت سے لٹکے ہوئے فانوسوں اور روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ برقی زینے اوپر اور نیچے کو آ رہے تھے۔ کرسمس کے درخت ہر کونے میں سجے تھے۔ میں پینڈوؤں کی طرح حیرت سے یہ مقامات دیکھ رہا تھا۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے مختلف مقامات پر کچھ صاف ستھری جگہیں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ ایک رش تھا جو اس مال میں مچا تھا۔ بڑے بڑے فلاور پاٹ پڑے تھے جن میں رنگ برنگے پھول اور چھوٹے چھوٹے درخت آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔

میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ مفتی پر نظر پڑی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ میں بھی پہلی بار لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

کھانے پینے کے لیے ایک بڑا علاقہ مخصوص تھا۔ جہاں فاسٹ فوڈ کی درجنوں دکانیں تھیں۔ پاکستان میں تو فاسٹ فوڈ پیسے والے لوگ کھاتے ہیں اور یہاں یہ غریبوں کی خوراک ہے۔ دو ڈالر میں میکڈونلڈ کا برگر مل جاتا ہے جتنا بس کا کرایہ ہے۔ کوئی عام یا سستی چیز ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کی میک ویلیو ہے۔ ہم اپنا سارا زور کے۔ایف۔سی یا میکڈونلڈ پر لگاتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ KFC کی چکن ساؤتھ افریقا یا چین سے آتی ہے اور پاکستان میں بھی یہیں سے درآمد ہوتا ہے۔ ہم کینیڈا یا امریکا میں اس لیے نہیں کھاتے کہ کوئی حلال کی سند ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر پاکستان میں یہ سب بڑے شوق سے خود بھی کھاتے ہیں اور بچوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ نہ عوام کوئی سوال کرتے ہیں اور نہ حکمران کوئی جواب دیتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی بھی چیز کا اپنے ملک سے موازنہ نہیں کروں گا مگر آج یہ لکھتے ہوئے مجھے سچ بتانا پڑ رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی حلال کر کے کوئی چیز بیچتا ہے تو وہ حلال کی سرٹیفکیٹ بھی دیوار پر لگاتا ہے۔ یہاں بہت سے مسلمان بھی غیر حلال چکن یا بیف کھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھ کر کھا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب حلال عام ملتا ہے تو پھر کیوں خطرہ مول لیا جائے۔ آج اس پر بسم اللہ پڑھ لی تو کل ہمارے بچے خدانخواستہ الکوحل پر بھی پڑھ لیا کریں گے۔ ہم اپنی اور یجنل چیزوں کو چھوڑ کر بھونڈے نقال بن چکے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے، مادر اور فادر ڈے منا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ تو سال میں ایک بار ہی اپنے والدین سے ملتے ہیں اور اس لیے اس دن کو مناتے ہیں۔

یہاں اب میرے بچے ہمیں کوئی چپس نہیں کھانے دیتے جب تک اس کے اجزا نہ پڑھ لیں۔ اگر شک ہوتا ہے تو کمپنی کو فون کر کے پوچھ لیتے ہیں کہ کسی جانور کے اجزا تو استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔ ہم کو تو پاکستان میں مردار بھی کھلا دیتے ہیں، جس کا قرآن پاک میں صاف لکھا ہے کہ یہ حرام ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے خفا کیوں ہے۔ انگریز جو کچھ بھی بول دے اس کے گرد ہماری توجہ کا ایک مجمع لگ جاتا ہے۔ یہ کسی بھی زوال شدہ قوم کی نشانی ہے۔ میں یورپ گھوما اور انگلینڈ کے علاوہ کسی ایک ملک میں بھی کسی کو انگلش بولتے نہیں سنا۔ میں عمرے پر گیا تو امیگریشن پر کھڑا سعودی میرا پاسپورٹ لے کر چومنے لگا تو میری آنکھیں دھندلا گئیں کہ یا اللہ ہم کیا اتنے گر چکے ہیں کہ پاسپورٹ کو بھی چومنے پر اتر آئے ہیں۔ پچھلے سال میں لاہور گیا تھا۔ بچوں نے کہا کہ ہم نے سب وے جا کر برگر کھانا ہے۔ میں انہیں لے گیا۔ میں نے وہاں کے منیجر سے پوچھا کہ یہ میٹ کہاں سے آتا ہے تو جواب ملا سعودی عرب سے آتا ہے۔ میں بولا وہاں کون سی انڈسٹری لگی ہے کہ وہ حلال کر کے ہمیں بھیج رہے ہیں۔ میں ذرا سیدھا ہوا تو منیجر نے کہا ”سر! یہ چین سے آتا ہے۔“

شرم سے میرا سر جھک گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا ”پاکستانی تجھے سلام۔“

لگتا ہے کہ میں اپنے ٹریک سے جذباتی ہو کر ہٹ گیا۔ چلیں آپ کو ٹورنٹو دکھاتے ہیں۔ میں سکاربرو ٹاؤن سینٹر

www.urdusoftbooks.com

میں کھڑا تھا اور نظریں ایک چیز پر نہ ٹکتی تھیں۔ میرے لیے تو یہ ایک نئی دنیا تھی۔ صاف ستھرے لباسوں میں مسکراتے اور زندگی سے بھرپور لوگ۔ کوئی آپس میں خوش گپیوں میں ... مصروف ہے تو کوئی دکانوں میں داخل ہو رہا ہے۔ کوئی شاپنگ کے بیگ لیے مطمئن باہر نکل رہا ہے اور کوئی بچوں کو سانتا کلاز کے ساتھ کھیلتے خوش ہو رہا ہے۔ اور تو اور سانتا کلاز اپنی مصنوعی برف کی طرح سفید داڑھی اور سرخ لباس میں خود بھی خوش ہے۔ شاندار دکانیں جو روشنیوں سے جگمگا رہی ہیں۔ کپڑے، جوتوں، کتابوں کی دکانیں کثیر تعداد میں ہیں۔ مفتی نے بتایا کہ کینیڈا میں بیر کا سب سے بڑا اسٹور بھی یہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تمہیں کیسے معلوم؟ تو کہنے لگا ''ہر کوئی جانتا ہے۔ یہ بھی کوئی خفیہ بات ہے جس کا کسی اور ایک کو پتا نہیں؟'' پھر میرا بازو پکڑ کر کہا۔ ''تمہیں ایک عجیب و غریب ریسٹورنٹ دکھاتا ہوں۔''

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا ''کیا مفت میں کھانا ملتا ہے۔''

مفتی ہنس پڑا ''بہت مہنگا ہے اور اگر مفت میں دیکھنے بھی دیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔''

وہ مجھے کھینچتا ہوا رین۔فورسٹ لے آیا۔ یہ مت سمجھیں کہ جنوبی امریکا کا رین فورسٹ ہے۔ بلکہ یہ نارتھ امریکا میں ریسٹورنٹ کی بہت مشہور چین ہے۔

ایک بھرپور جنگل کا ماحول جس میں مصنوعی سبزہ اور درخت ہیں۔ بہت ہلکی روشنی میں جیسے کسی اصلی جنگل میں آپ آ نکلے ہوں کہیں آبشار ہے اور کہیں درخت پر کوئی بندر جمپ لگاتا ہے۔ ایک ہاتھی کسی کونے میں درختوں کے بیچ کھڑا چنگھاڑ رہا ہے۔ بندر درختوں پر بیٹھے اپنی مخصوص آوازیں نکال رہے ہیں۔ بن مانس تو باقاعدہ سینہ کوبی کر رہا تھا۔ ایک مگرمچھ پانی میں لیٹا تھا۔ میں قریب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے اردگرد جمع تھے۔ اس نے ڈکار لے کر کچھ حرکت کی تو سب ڈر کے پیچھے ہو گئے۔ ایک بچے نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ بھی نقلی نکلا۔ ستونوں کی جگہ رنگ برنگی تیرتی مچھلیوں کے ایکوریم تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی کڑکتی تھی، جانور چلّانا شروع کر دیتے تھے۔ چیتا غرّاتا تھا اور کوئی شیر کسی درخت کی اوٹ سے نکل کر دھاڑتا تھا۔ میں بہت دیر اس ریسٹورنٹ کی نیرنگیاں دیکھتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے اندر بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کھایا جائے۔ مفتی نے جب یہ کہا کہ ایک بندے کے بیس ڈالر سے زیادہ لگتے ہیں تو فوراً میں نے پاکستانی روپے میں اس کا حساب کیا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہاں سے چلے آئے۔

اوپر والی منزل پر برقی زینے سے پہنچے۔ ہمیں چار گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے یہاں کی سیر کرتے، مگر تھکاوٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اوپر آئے تو وہی نظارے تھے جو نیچے تھے۔ یہاں ڈالر۔ون کے نام سے ایک بہت بڑی دکان تھی۔ ہر چیز ایک ڈالر کی تھی۔ میں چیزوں کے نام بتانے لگوں تو پوری کئی صفحے درکار ہوں گے۔ میں نے مفتی سے اجازت لے کر قندیل کے لیے اسکیچ بک، رنگدار پنسلیں، چاکلیٹس کچھ کھلونے خریدے۔ مفتی نے کہا کہ وہ پشاور میں میرے کزن سعید جان کو دے دے گا۔

جب تھکنے لگے تو ہم نے واپسی کی راہ لی۔ شام ہو رہی تھی۔ ہم سب۔وے سے کپلنگ پہنچے اور چھیالیس نمبر بس سے اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے پیچھے مارٹن گرو وروڈ پر اتر گئے۔ اب تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور ہم باقاعدہ کپکپا رہے تھے اور آسمان ایک دھند میں لپٹا نظر آتا تھا۔

اپارٹمنٹ میں کانپتے ہوئے داخل ہوئے تو وہ ماں کی گود کی طرح آرام دہ اور پُرسکون تھا۔ سردیاں یہاں اکتوبر سے مئی تک چلتی ہیں اور گرم ہوا کا نظام ان مہینوں میں بلا روک ٹوک اپارٹمنٹس میں جاری رہتا ہے۔ ہمیں بھوک لگی تھی۔ مفتی سیدھا کچن میں جا گھسا اور کچھ تیار کرنے لگا۔ میں نے اپنی جیکٹ کا بوجھ اتارا اور الماری میں لٹکا دیا۔ اتنے میں طارق کا نیویارک سے فون آ گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ خیریت معلوم کی اور بھرپور حوصلہ دیا۔ کافی دیر بات کرنے کے بعد تمنا بھابی نے بات کی۔ میں ابتدائی دنوں میں ڈپریشن میں رہتا تھا اور بھابی ہر روز فون کر کے گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔ تسلی دیتیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کا درس دیتیں اور ہر روز میں ان سے دعا کرنے کا کہتا۔ ان دونوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا، ورنہ میں تو ہمت ہار بیٹھا تھا۔

میں نے فون رکھا تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو واجد سامنے کھڑا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ واجد آج سے دس سال پہلے جب میں ملتان میں فارمیسی میں ماسٹر کر رہا تھا تو وہ مجھ سے ایک کلاس پیچھے تھا۔ نہایت عاجز اور شریف النفس انسان تھا۔ ہمیشہ ایک ہی طرح کے موڈ میں ملتا ہمیشہ مسکرا کر اور پُرخلوص انداز میں بات کرتا تھا۔ اکثر ہاسٹل میں میرے کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ میں ماسٹر کرنے کے بعد ملتان سے ڈیرہ آ کر گومل یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گیا اور پھر واجد کی کوئی خبر نہ ملی اور مگر جب ملا تو دروازہ کھولنے پر وہ مجھے کینیڈا میں ملا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے شادی کر لی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

وہ مجھے دیکھ کر منہ کھولے حیرت سے تکنے لگا۔ کچھ لمحے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت سے گنگ رہے۔ پھر بڑے تپاک سے ملے۔ وہ گلاٹی سے سامنے والی بلڈنگ میں رہتا تھا اور ایک دو ماہ پہلے سعودی عرب سے سیدھا کینیڈا چلا آیا تھا۔ میں نے سعدیہ بھابی کا پوچھا تو بولا وہ باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ وہ مفتی سے بات کر کے مجھے بھابی سے ملانے باہر لے آیا۔ وہ اپنے ایک دوست چودھری قدوس کی گاڑی میں تھے۔ ان سے سلام دعا ہوئی۔ باہر سرد جھکڑ چل رہے تھے۔ ہوا بلڈنگ سے ٹکرا کر شوکتی تھی اور باہر کھڑے ہونے سے باز رکھتی تھی۔ واجد نے اپنا فون نمبر دیا اور دوبارہ ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد آج تک واجد اور ان کی فیملی ایک طرح سے ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ میں امریکا چلا آیا اور وہ ٹورنٹو میں رہے۔ آج تک ہم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہیں۔ چودھری قدوس پھر میرا دوست بنا اور زندگی کے ایک لمبے سفر کے بعد اب ہم امریکا دونوں ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔

مجھے کینیڈا آ کر اتنے زیادہ تجربات سے گزرنا پڑا کہ ہر دن کوئی نئی بات لیے طلوع ہوتا۔ اپنی زندگی کا ایک واقع یاد آ گیا ہے۔ مجھے کینیڈا میں آئے تین سال ہو گئے تھے۔ میں واجد اور چودھری امریکا کے فارماسسٹ کے لائسنس کے لیے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمیں پڑھتے پڑھتے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ میں ان میں سے سب سے پہلے امتحان میں بیٹھ رہا تھا اور امتحان امریکا میں جا کر دینا تھا اور میرا ارادہ ڈیٹرائیٹ (Detroit) میں آ کر یہ امتحان دینے کا تھا جو ٹورنٹو سے چار گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ایک سال پہلے امریکا کی سب سے بڑی فارمیسی کی کمپنی سی-وی-ایس والے کینیڈا آئے تھے اور مجھے جاب کی آفر کی تھی اور ساتھ ہی امریکا میں مستقل رہائش کے لیے H1-B ویزا بھی مجھے بھیج دیا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب تک کینیڈا کا پاسپورٹ نہیں ملتا میں امریکا نہیں جاؤں گا اور اپنا امریکا کا H1-B ویزا الماری میں رکھ دیا تھا۔ جب امتحان دینے میں ڈیٹرائیٹ جانے والا تھا تو چودھری نے مجھے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ ڈیٹرائیٹ جائے گا۔ دو دن بعد میرا امتحان تھا اور چھ ماہ کی پڑھائی کے بعد میری تیاری مکمل تھی۔ میری گاڑی پر ہم دونوں ڈیٹرائیٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنے امریکا کے ویزے کے کاغذات بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ وہ میری گاڑی چلا رہا تھا اور میں ساتھ سیٹ پر بیٹھا اپنے نوٹس پڑھ رہا تھا۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ ہو چکا تھا۔ ہم بارڈر پر پہنچے تو آگے لمبی لائن لگی تھی۔ میں نے دیکھا تو وہ ہر گاڑی کی تلاشی ڈگی کھول کر لے رہے ہیں۔ میں نے چودھری کو بتایا کہ ڈگی کا بٹن اس کے بائیں ہاتھ پر نیچے ہے۔ وہ ڈھونڈتا رہا مگر اسے نظر نہ آیا۔ میں نے کہا کہ تم اس سیٹ پر آ جاؤ اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاتا ہوں۔ بس میں نے سیٹ ہی تبدیل کی تھی اور سامنے سے امیگریشن آفیسر نے مجھے سیٹ تبدیل کرتے دیکھ لیا اور معلوم نہیں کون سے شک کا کانٹا اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ہمارا نمبر آیا تو مجھے ڈانٹ کر کہا ”گاڑی بند کرو۔“

مجھے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ سیاہ فام کی انگریزی ویسے بہت کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں نے پوچھا ”ایکسکیوزمی۔“

یہ کہنے پر تو وہ زیادہ بگڑ گئی۔ بہر حال میں اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ گاڑی بند کی۔

اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔

میں نے کہا کہ میرا ٹیسٹ ہے۔ بولی ٹیسٹ دینے کے کاغذات کہاں ہیں۔ میں نے ان کی ای میل دکھائی تو کہنے لگی کہ ای میل کو تو ہم نہیں مانتے۔ پھر پوچھا کہ کوئی ڈاک سے لیٹر آیا ہو۔ میں نے نہیں میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ گاڑی کو امیگریشن کے آفس کے باہر پارک کر کے آفس میں جاؤ۔ میں حکم بجا لایا اور وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آفس میں آ گئی۔ ہمیں بٹھا دیا گیا۔ پھر سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو دو گھنٹے جاری رہا۔ وہ کہتی تھی کہ تم نے سیٹ تبدیل کیوں کی؟ میں اسے سمجھاتا تھا مگر وہ کچھ سمجھنے پر تیار نہ تھی۔ کہنے لگی کہ ای میل کو تو میں نہیں مانتی اور تم واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ تمہیں ڈاک سے لیٹر بھیجیں۔ میں گڑگڑایا کہ ایک دن بعد میرا ٹیسٹ ہے اور لیٹر آنے میں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے اور اگلا ٹیسٹ چھ ماہ بعد ہو گا تو میری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اس کے سینے میں کسی انسان کا دل نہ تھا بلکہ کسی امیگریشن والے کے سینے میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ کہنے لگی کہ تم امریکا گئے تو وہیں چھپ جاؤ گے۔ ان دنوں میرا پاسپورٹ بھی پاکستانی تھا اور گیارہ ستمبر ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔

اس کالی موٹی بھینس کی عقل بھی بھینس جیسی تھی۔ مسلمان اس پر پاکستانی، وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے ٹوئین ٹاور میں نے ہی گرایا ہے۔ یکا یک وہ جھٹکے سے اٹھی۔ اس کے تیور انتہائی خطرناک تھے۔

(سفر کہانی ابھی جاری ہے)

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

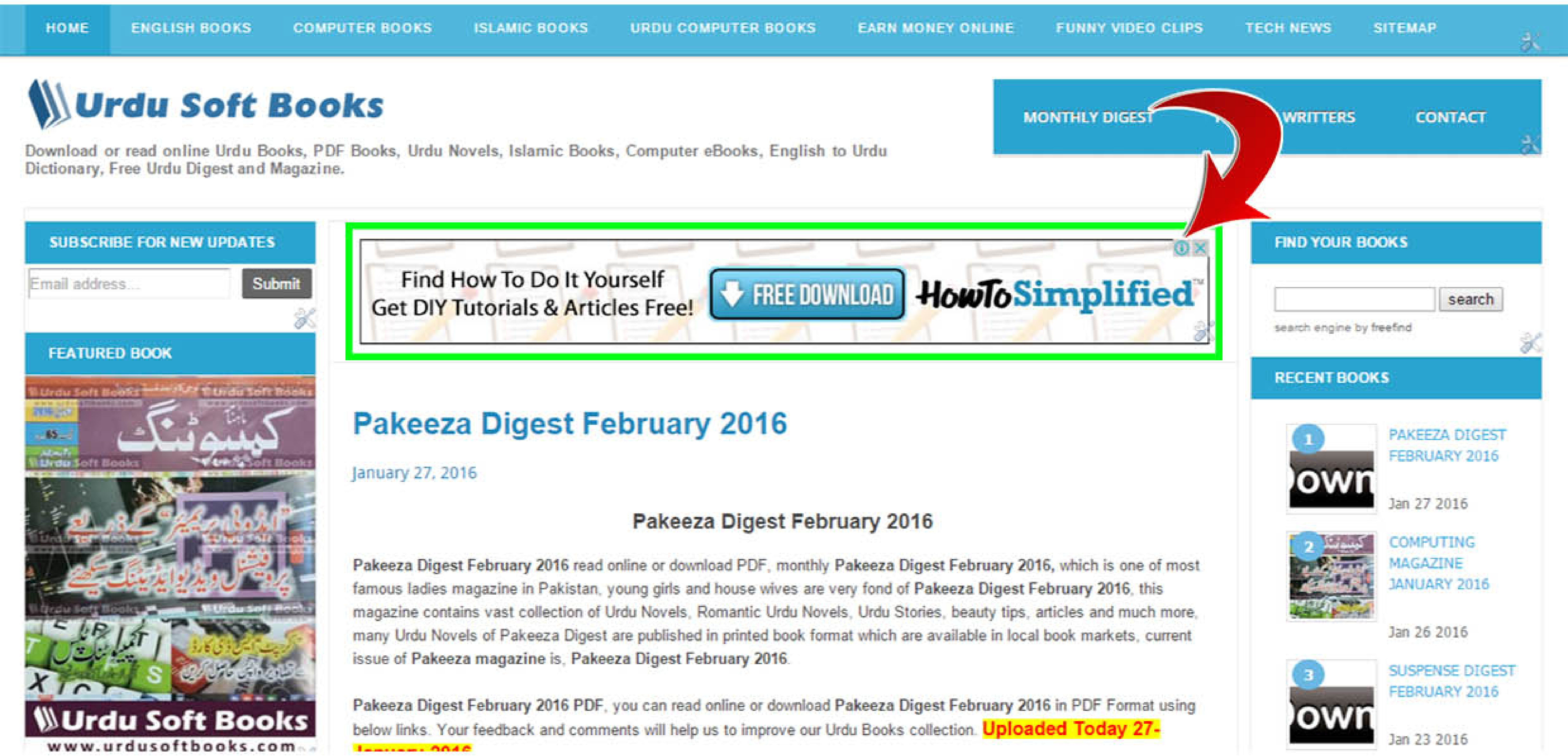

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کر کے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

جولائی کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے ساتویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

☆فاطمہ جناح

قائداعظم کی عظمت فقط ان کے فہم وفراست، ان کی قابلیت اور صلاحیت کی دین نہیں تھی، اس کے پیچھے ان کی بے شمار قربانیاں تھیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے انہوں نے اپنا آرام تج دیا، صحت کی پروانہیں کی، بیماریوں کو درخور اعتنا نہیں جانا، اپنی گھریلو زندگی سے زیادہ اہمیت اپنی تحریک کو دی۔ اِسی وجہ سے وہ بابائے قوم کہلائے۔ یوں تو تحریک پاکستان کے کئی اور رہنماؤں نے بھی عظیم قربانیاں دیں، مگر قائداعظم کے نقوش پا کا صحیح معنوں میں تعاقب تو اُن کی چھوٹی بہن، محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی، گھر نہیں بسایا، اپنا کُل جیون اپنے بھائی کی دیکھ ریکھ میں صرف کر دیا، اپنی زندگی تحریک پاکستان کے نام کردی تھی۔ ہر محاذ پر ان کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ تحریک پاکستان میں خواتین کی شمولیت ان کی کرشماساز شخصیت کے طفیل ممکن ہوئی۔ انہوں نے ناخواندہ اور نیم متوسط طبقے کی عورتوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اسی وجہ سے مادرِملت یعنی قوم کی ماں کہلائیں۔

آغا شورش کاشمیری نے ان کی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں کھینچا۔ ”وہ اپنے عظیم بھائی کی ہوبہو تصویر تھیں۔ بلند وبالا قد، گلابی چہرہ، ستواں ناک، آنکھوں میں بلا کی چمک، ہر چیز کو ٹٹولتی ہوئی نظر، سفید بال، ماتھے پر جھریوں کی چنٹ، آواز میں جلال وجمال، چال میں کمال، بانی پاکستان کی نشانی، ایک حصار جس کے قرب سے حشمت کا احساس ہوتا ہے، جس کی دوری سے عقیدت نشوونما پاتی ہے۔“

محترمہ فاطمہ جناح نے اس ملک کے لیے بے شمار قربانیاں دیں اور تکالیف برداشت کیں۔ یاد رہے، قائداعظم نے جب آنکھیں بند کیں، ان کے سامنے ایک ایسا پاکستان تھا جو مشکلات اور مصائب کے باوجود پھل پھول رہا تھا مگر فاطمہ جناح کو تو بعد میں کئی کرب ناک مناظر بھی دیکھنے پڑے۔ لیاقت علی خان کا قتل، اس کے بعد بیوروکریسی کی ریشہ دوانیاں، سیاست میں موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا رجحان۔ قائداعظم کی وفات کے بعد انہیں سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی کہ نئے حاکم ان کے دوٹوک مؤقف اور اعتماد سے خوف زدہ تھے۔ قائد کی تیسری برسی کے موقع پر مادرِملت کی ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والی تقریر پر سینسر کی قینچی چلائی گئی۔ پھر آمریت آن دھمکی، جس نے طاقت کے نشے میں اخلاقی اصولوں کو روند ڈالا۔ البتہ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

فاطمہ جناح 31 جولائی 1893 کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ دو برس کی عمر میں ماں سے جدائی کا کرب سہنا پڑا۔ اب بڑی بہن نے پرورش کی ذمّے داری سنبھال لی۔ اس زمانے میں بڑے بھائی محمد علی جناح انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے۔ جب وہ لوٹے، فاطمہ جناح چار برس کی تھیں۔ وہ بمبئی جا کر وکالت کرنے لگے۔ یوں کچھ برس کے لیے یہ پورا خاندان بمبئی جا بسا۔ وہیں گھر پر ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

1902 میں باندرہ کانونٹ اسکول میں داخلہ کروا گیا۔ قابل طالبہ تھیں۔ تمام امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ 1906 میں سینٹ پیٹرک اسکول کا حصہ بن گئیں۔ 1913 میں سینئر کیمرج کا امتحان پاس کیا۔ پھر احمد ڈینٹل کالج کلکتہ میں داخلہ لے لیا۔ 1922 میں وہاں سے ڈگری لی۔ 1923 میں پریکٹس شروع کر دی۔ جب 20 فروری 1929 کو قائداعظم کی زوجہ رتی جناح کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے نے فاطمہ جناح کی زندگی بدل دی۔ انہوں نے قائداعظم کی دیکھ ریکھ کی ذمّے داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ اب وہ بھائی کے شانہ بشانہ کام کرنے لگیں۔ سیاسی نکات پر بحث کرتیں۔ انہیں اپنے مشوروں سے نوازتیں۔ 1934 میں جب قائداعظم محمد علی جناح لندن میں تھے، تو فاطمہ جناح بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ آگے کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

انہوں نے نہ صرف قیام پاکستان سے قبل، بلکہ اس کے بعد بھی پاکستانی سماج اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ 1929 تا 1948 وہ قائداعظم کا سایہ بنی رہیں۔ یہ دو عشروں پر محیط سفر تھا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد لگ بھگ دو عشرے حیات رہیں اور ان برسوں میں ان کی شخصیت اور افکار ابھر کر سامنے آئے۔ انہوں نے قائداعظم کی شفاف سیاسی اقدار کو ازسرنو زندہ کرنے کی ٹھوس اور جامع کوشش کی۔

ایوب خان کے خلاف انتخابی میدان میں اترنا ان کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ تھا، جس سے کمزور پڑتے جمہوری حلقوں میں جان پڑ گئی۔ پوری قوم ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس مقبولیت اور احترام نے ایوب خان اور ان کے حواریوں کو حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے اس قابلِ احترام ہستی پر تنقید شروع کر دی۔ کیچڑ اچھالی گئی۔ انتخابات میں دھاندلی کا سہارا لیا گیا۔ یہی نہیں، بعد میں کراچی کے باسیوں کو گوہر ایوب نے فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کی سزا بھی دی۔ مشرقی پاکستان میں بھی وہ بہت مقبول تھیں۔ انہیں ''مکتی نیتا'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہاں بھی انہیں خاصے ووٹ پڑے۔ انتخابات کے بعد محترمہ نے متعدد تقاریر میں ان مسائل کی نشاندہی کی، جو مستقبل قریب میں پاکستان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے والے تھے۔ انہوں نے امریکا کی بڑھتی مداخلت، بیرونی قرضوں کے ناقابل برداشت دباؤ، غربت، مشرقی پاکستان کے بگاڑ اور ناخواندگی کی پیش گوئی کر دی تھی۔ بدقسمتی سے کسی نے ان کی دانش سے استفادے کی کوشش نہیں کی، ورنہ آج پاکستان کا یہ حال نہیں ہوتا۔

ان کی شخصیت پروقار اور متوازن تھی۔ فضول خرچی سے پرہیز کرتی تھیں مگر گھر کی تزئین و آرائش کا ہنر جانتی تھیں۔ انہوں نے قائداعظم کے لیے طعام و آرام کا، ملاقاتوں کا ایک نظام بنا رکھا تھا۔ کتب بینی اور مطالعے کی شوقین تھیں۔ خواہش مند تھیں کہ پاکستان کی خواتین سیاست سے بے تعلق نہ رہیں، انتخابات میں بھرپور حصہ لیں۔ قرآنی تعلیم کو بے حد اہم جانتی تھیں۔ یہ بھی چاہتی تھیں کہ خواتین خود کو پروفیشنل تعلیم سے آراستہ کریں، خود انحصار ہوں اور قومی آمدن میں اضافے کا ذریعہ بنیں۔ کتنے ہی فلاحی اور رفاہی اداروں کی تشکیل اور سرپرستی کا ذمہ انہوں نے اٹھایا۔ کشمیری مہاجرین کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

9 جولائی 1967 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ ایک پُراسرار واقعہ تھا کہ اس سے ایک روز قبل انہوں نے ایک شادی کی تقریب میں شرکت کی تھی، جہاں وہ ہشاش بشاش تھیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی سرکار کا خوف ختم نہیں ہوا۔ مادرِ ملت نے اپنی زندگی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں قائداعظم کے پاس دفن کیا جائے، مگر حکومت کی کوشش تھی کہ انہیں میوہ شاہ قبرستان میں دفنایا جائے۔ عوامی ردِعمل کے باعث یہ منصوبہ ملتوی کرنا پڑا۔ جب قصر فاطمہ سے ان کا جنازہ مزار قائد کی سمت نکلا، تو لاکھوں کا مجمع تھا۔ سر ہی سر تھے۔ ہر طرف سے پھولوں کی پتیاں نچھاور ہو رہی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق لوگوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔ ایسا منظر فقط قائداعظم کے جنازے پر دیکھا گیا تھا۔ تدفین کے وقت بدنظمی بھی دیکھنے میں آئی۔ پولیس نے عوام پر لاٹھی چارج کیا، جب

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

کہ بعد میں فسادات بھی پھوٹ پڑے۔

عوام کے ایک طبقے کا خیال یہ تھا کہ مادرِ ملت کی موت طبعی نہیں، انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں عدالت میں پٹیشن بھی دائر ہوئی۔ اخبارات میں اداریے لکھے گئے۔ 1971 میں ایک اخبار میں غسل دینے والوں کے بیانات پر مبنی رپورٹ شائع ہوئی، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ ان کے جسم پر زخموں کے نشان تھے اور کپڑوں پر خون لگا تھا۔ یہ بازگشت بعد کے برسوں میں بھی سنائی دیتی رہی، مگر حیرت انگیز طور پر کسی حکومت نے اس اہم معاملے کی تحقیق کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ کچھ بڑے وکلاء نے چند بیانات تو دیے، مگر پھر وہ بھی خاموش ہوگئے۔ یہ پُراسرار اور مجرمانہ خاموشی ہنوز قائم ہے۔

☆قدرت اللہ شہاب

ان کے گرد اسرار کی دھند ہے۔ وہ کون تھے، فقط ایک

بیوروکریٹ، ایک قلم کار یا ایک ولی؟ ایک باکرامت انسان؟ ایسا انسان جسے پاکستان کو ایک عظیم طاقت بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی؟ اور یہ ذمہ داری سونپی کس نے تھی؟ وہ کن کے احکامات کی پیروی کررہے تھے؟

اس قدر سوالات ہیں کہ آدمی چکرا جائے۔ جانے یہ سلسلہ کب شروع ہوا، مگر بلاشبہ یہ ممتاز مفتی تھے، جن کی کتب میں قدرت اللہ شہاب کے طلسم میں رنگے تذکرے نے وہ اینٹ رکھی، جس پر قدرت اللہ شہاب کے روحانی سلسلے کی عمارت کھڑی ہونے والی تھی۔ ان کی کتب میں جہاں جہاں، جب جب قدرت اللہ شہاب کا تذکرہ آیا، اس کے ساتھ جڑے روحانی واقعات بھی بیان کیے گئے۔ ''لبیک'' ممتاز مفتی کا ایک ماسٹر پیس ہے، بے شک ایک قابلِ مطالعہ کتاب، مگر اس کا کمزور ترین حصہ وہی، جہاں وہ شہاب کی شخصیت کے روحانی پہلو کو، مافوق الفطرت ڈھب پر بیان کرتے ہیں۔ مفتی کے مشہورِ زمانہ ناول ''علی پور کا ایلی'' کے دوسرے حصے میں ''الکھ نگری'' میں شہاب ایک ولی، ایک باکرامت شخص کے طور پر نظر آتے ہیں۔

کچھ یہی معاملہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا بھی رہا۔ بانو قدسیہ کی کتاب ''مردِ ابریشم'' میں شہاب کی اس قدر خوبصورت اور متاثر کن تصویر کشی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا ان کے عشق میں مبتلا ہوجائے۔ کھل کا دعویٰ تو نہیں کیا کہ وہ ولی تھے، مگر اشارے ضرور ملتے ہیں۔ اشفاق احمد تو ویسے ہی ''باباؤں'' کے گرویدہ تھے ان کا تذکرہ عام کرنا چاہتے تھے۔ شہاب ان کے لیے آئیڈیل ثابت ہوئے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس میں حصہ ڈالا ہوگا۔ اس حلقے میں ابن انشاء اور جمیل الدین عالی کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔

پھر آخری برسوں میں قدرت اللہ شہاب کی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' شائع ہوئی، جو بلاشبہ اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں سے ایک ہے۔ چوں کہ وہ شہاب کے اپنے قلم سے نکلی تھی، تو اس میں انہوں نے اپنی شخصیت کا بت نہیں بنایا۔ البتہ محیر العقول واقعات ضرور شامل کیے، جو قاری کے مطالعے کو خوب مہمیز کرتے ہیں اور اُسے گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

اس پورے معاملے کو دو زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلا زاویہ یہ کہ شہاب واقعی اللہ کے نیک بندے تھے۔ اور مذکورہ شخصیات یعنی مفتی، اشفاق، بانو نے ان سے فیض اٹھایا، وہ ان کے ممنون بھی تھے اور ان کی روحانی صلاحیتوں سے متحیر بھی۔ اسی تشکر اور حیرت کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں، کیا کرتے تھے۔

اس کا دوسرا پہلو ذرا تاریک ہے۔ ناقدین الزام لگاتے ہیں کہ شہاب کا بت تراشنے، ان کی مابعدالطبیعیاتی شبیہہ پیش کرنے کا مقصد ذاتی مفادات حاصل کرنا تھا۔ ادیبوں کا یہ حلقہ ذکر شہاب یوں کیا کرتا کہ وہ ایک بااثر بیوروکریٹ تھے۔ ان کے منظورِ نظر کے لیے مواقع کی بہتات تھی۔ سرکاری ملازمت، ریڈیو اور ٹی وی کے کنٹریکٹ، ریالٹی دینے والے پبلشرز، بیرونِ ملک دورے۔ یہی نہیں، کبھی تو یوں بھی ہوا کہ ایک پورا ادارہ بنادیا گیا کہ ان کا ایک مداح سرا بے روزگار تھا۔

سچ جو بھی ہو، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدرت اللہ شہاب نے نہ صرف پاکستانی بیوروکریسی، بلکہ اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ نہ صرف ان کتابوں اور تحریروں کی مدد سے، جو اوروں نے ان کے بارے میں لکھیں، بلکہ ان تحریروں کے ذریعے بھی، جو ان کے قلم سے نکلیں۔ ''یا خدا'' ان کا شاہکار ناولٹ ہے، جس نے خاصی کھلبلی مچائی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے

www.urdusoftbooks.com

سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ "ماں جی" بھی ان کا ماسٹر پیس افسانہ ہے۔ بعد میں جن ادیبوں نے اپنی والدہ پر قلم اٹھایا، ان میں سے کوئی شہاب کے اثر سے نہیں نکل سکا۔ ایک ناقد کے مطابق کوئی اس موضوع میں ان کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ "شہاب نامہ" کا تذکرہ تو ہو ہی گیا، جس نے لاکھوں کو گرویدہ بنایا۔

اب کچھ ذکر شہاب ہو جائے۔ وہ 26 فروری 1917 کو گلگت کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سرسبز ماحول میں پلے بڑھے۔ ابتدائی تعلیم ریاست جموں و کشمیر اور موضع چمکور صاحب ضلع انبالہ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگلش کا مرحلہ طے ہوا۔ 1941 میں وہ انڈین سول سروس کا حصہ بن گئے۔ اوائل میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات سرانجام دیں۔ 1943 میں بنگال میں ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کہتے ہیں، انہوں نے قحط کے دنوں میں سرکاری ذخیرہ مستحق افراد میں تقسیم کر کے خوب نیکیاں کمائیں۔ شہاب نامہ میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ انہوں نے ایک اہم سرکاری دستاویز، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ تقسیم کے وقت انگریز مسلمانوں کے مفادات کو زک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں، چپکے سے قائد اعظم محمد علی جناح تک پہنچا دی تھی۔

آزادی کے بعد وہ حکومت آزاد کشمیر کے سیکریٹری جنرل ہو گئے۔ بعد ازاں پہلے گورنر جنرل پاکستان غلام محمد، پھر اسکندر مرزا اور بعد ازاں صدر ایوب خان کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ایوب خان کے زمانے میں ان کا شمار پاکستان کے اہم ترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ ایوب خان کے خاصے قریب تھے۔ اگر ان کے چاہنے والوں کے دعوے درست ہیں اور اُن کی اپنی کتاب میں درج بیانات پر یقین کر لیا جائے، تو انہوں نے ایسے چند اہم فیصلے میں کلیدی کردار ادا کیا جنہوں نے پاکستان کی قسمت کا رخ بدل دیا۔

جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے پیچھے اختلافات کی کہانی ہے۔ اب وہ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انہیں مالی طور پر کئی مسائل کا سامنا رہا۔ ایک طرح سے وہ جلاوطن تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے انگلستان کے نواحی علاقوں میں گزارا۔ مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی شرانگیزیوں کا جائزہ لینے کے لیے ان علاقوں کا خفیہ دورہ کیا اور اسرائیل کی زیادتیوں کا پردہ چاک کیا۔ ان کی اس خدمت کی بدولت مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کا منظور شدہ نصاب رائج ہوا جو فلسطینی مسلمانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اس دورے سے کچھ پُراسرار اور مافوق الفطرت واقعات بھی جڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے، ان پر جادو کر دیا گیا تھا اور کئی برس بعد اسی اسرائیلی سحر نے ان کی جان لی۔

جیسے کہ اوپر ذکر آیا، وہ ادیب کی حیثیت سے بھی ایک معروف شخصیت تھے۔ بااثر ہونے کی وجہ سے کچھ قلم کار تو ان کے اردگرد رہتے، کچھ دور دور۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک عرصے تک اس ادارے نے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا مگر پھر اس کا اثر جاتا رہا۔

شہاب کے گرد جو روحانی ہالا تھا، اس کی وجہ سے چند فوائد ضرور ہوئے ہوں گے مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی ادبی حیثیت دب گئی۔ وہ باکمال فکشن نگار تھے۔ اس صنف پر ان کی بڑی گرفت تھی۔ کتاب "نفسانے" اور "ماں جی" کے افسانے اس کا ثبوت ہیں۔ مطالعہ بھی اچھا تھا۔ بدقسمتی سے بیوروکریٹ اور روحانی حیثیت فکشن نگار پر چھا گئی۔ ان کی بیگم عفت کا تذکرہ بھی "شہاب نامہ" سمیت کئی کتب میں شامل ہے۔ یہی معاملہ ان کے بیٹے ثاقب کا بھی تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے 24 جولائی 1986 کو اسلام آباد میں وفات پائی۔ وہ اسلام آباد کے سیکٹر H-8 کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے ایک مضمون میں اشفاق احمد نے ان کا خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ ادبی پیرائے میں کیا جانے والا دعویٰ تھا۔

☆ عالم چنا

شہرت بھی عجب شے ہے... کوئی اس کے لیے ساری زندگی زور مارتا رہے، اپنی کل صلاحیتیں پھونک دے، خزانوں کے دروازے کھول دے مگر شہرت اسے اپنی نظرِ کرم سے محروم رکھتی ہے۔ اسی طرح کچھ گوہر نایاب گمنامی کی تاریکی میں اتر کر خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے پاس نہ تو کوئی انوکھا ہنر، نہ ہی کوئی خاص صلاحیت، اس پر مستزاد شہرت کی خواہش بھی نہیں رکھتے، مگر ان پر یہ دیوی ہن برساتی ہے۔ اتنا نوازتی ہے کہ پوری دنیا میں ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ملک کا صدر بھی شہرت کی دوڑ میں آپ سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی عالم چنا کے معاملے میں ہوا۔ نہ تو ان کے

پاس کوئی انوکھا فن تھا، نہ ہی کوئی خاص قابلیت، شناخت کے بھی وہ آرزومند نہیں تھے، مگر دیکھ لیجیے، آج گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ان کا نام درج ہے۔ پورا پاکستان ان سے واقف۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ اس سادہ لوح انسان کے گرویدہ ہیں۔ 1953 میں سندھ کے علاقے سہون میں پیدا ہونے والے عالم چنا کے نصیب میں جو شہرت تھی، اسے دورِ نوجوانی میں چمکانا تھا۔ وہ 1982 تا 1998 دنیا کے سب سے طویل القامت شخص کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک غریب سندھی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں غربت ہو، وہاں تعلیم کا کہاں تصور۔ پیٹ ہی زندگی کا محور۔ اُن کا خاندان معروف صوفی بزرگ لعل شہباز قلندر کے مزار سے وابستہ تھا۔ یہاں وہ چھوٹے موٹے کام کرتے، جس سے معمولی آمدنی ہوتی۔ اسی ماحول میں عالم چنا نے آنکھ کھولی۔ کم سنی میں ان کا قد اچانک بڑھنے لگا۔ وہ بچوں میں نمایاں نظر آتے۔ پہلے قد نے ساڑھے چھ فٹ کی حد عبور کی، پھر سات فٹ، پھر ساڑھے سات فٹ۔ مگر وہاں اس ماحول میں بڑھتے قد کی کسے پروا تھی۔ کسے پیمائش کی فکر تھی۔ وہ بھی اپنے بڑوں کے ساتھ مزار کی دیکھ ریکھ کیا کرتے۔

اس زمانے میں شہر شہر سرکس لگتے تھے۔ سرکس کرنے والے سالانہ عرس کے موقع پر سہون کا بھی رخ کرتے۔ 1978 میں سرکس لگا، تو انتظامیہ کے کسی شخص کی نظر اس نوجوان پر پڑی، جو عام سے کام، عام سے انداز میں انجام دے رہا تھا، اس بات سے یکسر بے خبر کہ وہ کتنا خاص ہے۔

سرکس والوں کے پاس چھوٹے قد کے فنکار تو تھے ہی، جنھیں وہ بونوں کے طور پر استعمال کرتے مگر کوئی دیو نہیں تھا۔ انہوں نے اس دراز قد نوجوان کو ملازمت کی پیشکش کر دی۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق انہیں ماہانہ 160 روپے کی پیشکش کی گئی تھی اور اس وقت مزار پر کام کر کے وہ فقط 15 روپے ماہانہ کمایا کرتے تھے۔ توقع کے عین مطابق انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔ کسے خبر تھی کہ یہ عام سا فیصلہ پاکستان کو وہ چہرہ عطا کرے گا جو مستقبل میں اس کی شناخت بن جائے گا۔

سیدھا سادہ عالم چنا اپنی نئی زندگی میں خوش تھا۔ سرکس کے دوران جب وہ رنگ میں انٹر ہوتا، تو لوگوں کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ وہ رنگ میں موجود ننھے منے بونوں کو جھپٹا مار کر پکڑ لیتا اور انہیں ہوا میں اچھلتا، تو لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے۔

یہ 1981 کے آس پاس کی بات ہے۔ بیرونِ ملک مقیم ایک شخص پاکستان لوٹا، تو دل بہلانے کو ساحل کے پاس لگا سرکس دیکھنے پہنچ گیا۔ اس نے اس نوجوان کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کا کیمرا حرکت میں آیا۔ اس نے نوجوان کی کئی تصاویر بنائیں۔ جھٹ پٹ ایک خط گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں کو لکھ دیا کہ جناب ذرا ادھر متوجہ ہوں، حیرت آپ کی منتظر ہے۔

تصاویر نے ان لوگوں کو بھی چونکا دیا۔ کچھ ماہ بعد ایک ٹیم کراچی پہنچی۔ سرکس ان دنوں بند تھا۔ وہ اس دراز قد عجوبے کو کھوجتے ہوئے سہون آ گئے۔ وہاں اس کا قد ناپا۔ وہ 7 فٹ 7 انچ تھا۔ یہ ایک ریکارڈ تھا۔ یعنی دنیا کا سب سے قد آور انسان ایک پاکستانی تھا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں تو نام آ گیا، مگر شاید اسے سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا، اگر چند بڑے سندھی اخبارات میں یہ خبر شائع نہ ہوتی۔ اردو اور انگریزی اخبارات میں یہ خبر چھپی، اس کے بعد ٹیلی ویژن ان کی جانب متوجہ ہوا۔ خبرنامہ میں ان کا تذکرہ ہونے کی دیر تھی، راتوں رات عالم چنا ایک معروف شخصیت بن گئے۔ اخباری رپورٹروں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ سیدھے سادے عالم چنا خوش تو تھے مگر جیسے جیسے شہرت بڑھنے لگی، وہ تھوڑے پریشان رہنے لگے۔ سرکس سے وہ دور ہو گئے تھے۔ دیہی زندگی میں اطمینان تھا۔ وہ دوبارہ سے مزار کی دیکھ ریکھ میں لگ گئے۔

معروف صحافی، ندیم پراچہ کے مطابق اس زمانے میں صدر ضیاء الحق سندھ کے دورے پر آئے، تو سہون بھی گئے۔ اس زمانے میں بھٹو صاحب کی پھانسی کی وجہ سے سندھ میں احتجاج زوروں پر تھا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ دنیا کا طویل القامت شخص یہیں رہتا ہے، سندھی ہے، اس سے ملیے، پبلک میں اچھا تاثر جائے گا۔

کچھ سرکاری اہل کار سہون میں عالم چنا سے ملے۔ انہیں خوش خبری سنائی گئی کہ صدر پاکستان انہیں ایک ایوارڈ دینا چاہتے ہیں، انہیں کراچی چلنا ہوگا۔ عالم چنا کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کچھ وجوہات کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

چڑھی۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ عالم چنا نے سندھی قوم پرستوں کے اصرار پر یہ سفر ملتوی کر دیا۔ البتہ اب انہیں بیرونِ ملک سے دعوتیں ملنے لگی تھیں۔ کئی غیر ملکی دورے کیے۔ گورے ان سے ملتے، ساتھ تصاویر بنواتے۔ پاکستانی اخبارات میں بھی ان کا چرچا رہا۔ انہوں نے ایک ہیرو کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ البتہ ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

1985 میں حکومت نے انہیں پھر یاد کیا۔ 23 مارچ کو یومِ پاکستان کی پریڈ تقریب میں صدر پاکستان نے انہیں ایک ایوارڈ پیش کیا۔ اگلے دن کے تمام اخبارات میں وہ تصویر صفحۂ اوّل پر شائع ہوئی، جس میں سات فٹ، سات انچ کے عالم چنا جھک کر پاکستان کے طاقتورترین شخصیت سے ہاتھ ملا رہے تھے، جو سر اٹھا کر انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اخباری رپورٹس کے مطابق سندھ قوم پرست اخبارات نے جب یہ تصور شائع کی، تو ضیاالحق پر طنز کرنا بھی ضروری جانا۔

وقت کے ساتھ ان کی شہرت پھیلتی گئی۔ چاہے کوئی تہوار ہو، ٹی وی والے انہیں ضرور مدعو کرتے۔ صدر اور وزیراعظم جیسی شخصیات کے ساتھ ان کی تصاویر شائع ہوتیں۔ عرب ممالک میں انہیں بہت محبت ملی۔ امریکا میں سپر اسٹار کا درجہ حاصل تھا۔ چھوٹے بڑے، سب ان سے محبت سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں فلاحی سرگرمیاں بھی شروع کیں۔ اس کے لیے بیرونی دوروں سے فنڈز اکٹھے کیا کرتے۔ اپنے علاقے میں وہ یونیورسٹی بھی بنانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔

1989 میں عالم چنا کی شادی ہوئی۔ اگلے برس ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ وہ مسرور تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی مکمل اور پُرسکون ہے، مگر حقیقت تلخ تھی۔ اب وہ بیمار رہنے لگے۔ صحت بگڑنے لگی۔ بیماری ہی کے دنوں میں انہوں نے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ شہر جدہ میں پاکستان ایمبیسی اسکول میں طلبا نے ان کا ایسا استقبال کیا جو ماضی میں وہاں عمران خان کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت وہ سہارا سے چلا کرتے تھے۔ کچھ برس بعد ان کی کمر بستر سے لگ گئی۔

1998 میں ان کے گردے فیل ہو گئے۔ حکومت نے علاج کی غرض سے امریکا بھیجا مگر حالات اب سنبھالنے والے نہیں تھے۔ وہ کوما میں چلے گئے۔ 2 جولائی 1998 کو نیویارک میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں سہون میں دفن کیا گیا۔ ان کی عمر 45 برس تھی۔

وہ آخر تک مزار سے وابستہ رہے۔ جب تک جسم میں قوت رہی، مزار جاتے رہے۔ قریبی لوگ بتاتے ہیں، آخری دنوں میں وہ ماضی میں پہنچ گئے تھے۔ وہ اکثر سرکس کے دن یاد کیا کرتے تھے۔

☆ مولانا اشرف علی تھانوی

انگریز سرکار میں مسلمان معاشی اور تعلیمی طور پر تو دیگر طبقات سے پیچھے رہ گئے تھے مگر دینی تعلیم اور تحقیق کے میدان میں پیش رفت جاری رہی۔ اس کا سبب وہ مخلص علماء و فضلاء تھے جنہوں نے بے لوث ہو کر دین کی خدمت کی۔ اس زمانے میں کیسے کیسے گوہر نایاب گزرے، کوئی حدیث کا عالم، کوئی فقہ کا۔ کسی کی عربی پر گرفت، کسی کی فارسی پر، مگر ایسے علماء کم ہی گزرے ہوں گے جنہوں نے اپنی علمیت اور فکر سے نہ صرف اپنی نسل کو متاثر کیا، بلکہ آنے والے عہد پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ اور مولانا اشرف علی تھانوی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔

انہوں نے 9 ستمبر 1863 کو گاؤں تھانہ بھون اتر پردیش میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد شیخ عبدالحق ایک باثروت آدمی تھے۔ ان کی علمیت کا بھی شہرہ تھا۔ فارسی پر خوب گرفت۔ بہت اچھے انشاء پرداز۔ الغرض انہیں علمی و ادبی ماحول میسر آیا، جو تربیت میں معاون ثابت ہوا۔ رجحان اوائل سے دین کی جانب تھا۔ باپ نے بیٹے کا ذوق و شوق دیکھا تو تربیت کی کل ذمے داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔

ان کا شمار کم گو اور خاموش طبع بچوں میں ہوتا تھا۔ کھیلوں سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ نماز روزے کے پابند تھے۔ سوانح خاکوں کے مطابق فرض کے ساتھ ساتھ وہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتے تھے۔ حصول علم کی خواہش میرٹھ لے گئی جہاں فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ادھر حافظ حسین مرحوم دہلوی جیسا استاد میسر آیا۔ ذہین فطین بچوں میں ان کا شمار ہوتا تھا جو پڑھتے، ذہن پر نقش ہو جاتا۔ کلام پاک حفظ کر کے تھانہ بھون آ گئے۔

ادھر مولانا فتح محمد کی صحبت میسر آئی۔ ان سے عربی اور

Urdu Soft Books

فارسی کی تعلیم پائی۔ اب دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ اس وقت عمر پندرہ برس تھی۔ پانچ سال تک وہاں رہے۔ نوجوانی میں بھی اپنی توجہ کو بھٹکنے نہ دیا۔ زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا یا اپنے استاد خاص کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ اگلی منزل کانپور تھی۔ حسب روایت تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہاں مدرسہ فیض عام میں پڑھانے لگے۔ کانپور ہی کے زمانے میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اپنے والد کے ساتھ سعودی عرب روانہ ہوئے۔ کتابوں میں درج ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے ملاقات ہوئی۔ اسی پُرنور مقام پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ استاد کی خواہش تھی کہ وہ کچھ ماہ ٹھہر جائیں مگر والد ساتھ تھے۔ والد کی اطاعت مقدم تھی، سو لوٹ آئے۔ اگلی بار جب خانہ خدا کا رخ کیا، تو چھ ماہ حاجی صاحب کی خدمت میں رہے۔

اسی دوران انہیں خلافت ملی۔ ساتھ ہی ہدایت کی گئی کہ وہ خدا کے بھروسے، تھانہ بھون پہنچیں۔ اگر حالات سخت ہوں تو انہیں برداشت کریں۔ چودہ سال کانپور میں رہے تھے، وہاں جم گئے تھے مگر جو استاد کا حکم ہوا تو آبائی وطن تھانہ بھون لوٹ آئے۔ مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ عمر کے آخری حصے تک وہاں پڑھاتے رہے۔ انہوں نے تھانہ بھون اور اس کے گردنواح پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندوستان کے طول وعرض سے لوگ ان سے فیض یاب ہونے کے لیے تھانہ بھون آنے لگے۔

وہ زمانہ انہوں نے تحقیق، تصانیف وتالیف میں گزارا۔ ایک اندازہ کے مطابق ان کی کتاب کی تعداد 800 کے لگ بھگ ہے۔ قرآن پاک کا سلیس، بامحاورہ ترجمہ بھی کیا۔ اس تفسیر میں روایات صحیحہ اور اکابر کے اقوال کا التزام کیا گیا۔ اعمال قرآنی بھی اہم کتاب ہے، جس میں قرآن مجید کی بعض آیتوں کے خواص بیان کیے گئے ہیں۔ ''حقیقۃ الطریقۃ'' سلوک وتصوف کے مسائل پر مشتمل ہے۔ ''احیاء السنن'' فقہی ترتیب پر جمع کی گئی احادیث کا احاطہ کرتی ہے۔ ''الانتباہات المفیدہ'' میں زمانہ جدید کے مذہبی اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ''بہشتی زیور'' بھی ان کی اہم تصنیف ہے۔

اشرف علی تھانوی کا 83 سال کی عمر میں 20 جولائی 1943 میں انتقال ہوا۔ ان کی نماز جنازہ ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ تھانہ بھون کے قبرستان میں وہ مدفون ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے نظریات اور افکار نے دیوبند مکتبۂ فکر پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس زمانے میں سنی مسلک میں دیوبندی اور بریلوی تقسیم واضح تھی۔ انہوں نے علمی وفکری انداز میں اپنا موقف پیش کیا۔ آنے والی نسلوں نے بھی ان کے کتب سے استفادہ کیا۔ ان کی تصانیف آج بھی دینی ذوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

☆ابن صفی

اصل نام ان کا اسرار احمد تھا، مگر اس نام سے بھلا انہیں جانتا کون ہے۔ اچھے خاصے شاعر تھے، مزاح بھی خوب لکھا مگر ان کے چاہنے والوں میں سے بہت کم کو اس کی خبر ہوگئی۔ وہ سب تو ان کی جاسوسی کہانیوں کے رسیا تھے۔ جنون تھا ان کی کتابیں پڑھنے کا۔ اسٹال پر پہلے ہی بکنگ ہوجاتی۔ یوں اسٹاک آیا، یوں ختم ہوگیا۔ جو بے چارے دیر سے پہنچتے انہیں لائبریروں کی سمت دوڑنا پڑتا۔ وہاں بھی ان ہی کے ہاتھ تازہ

ناول آتا جو خوش قسمت ہوں، ورنہ کچھ اور انتظار کی اذیت اٹھائیں، اپنے من پسند کردار عمران کرنل آفریدی سے کچھ دن اور دور رہیں۔ ان کے فن کو سراہنے والوں میں مولوی عبدالحق، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، محمد حسن عسکری، حسن نثار جیسی شخصیات شامل۔ سنتے ہیں، ایوب خان اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی انہیں دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے مقالے ''اردو ادب آزادی کے بعد'' اور ڈاکٹر علی حیدر نے اپنی کتاب ''اردو ناول سمت و رفتار'' میں ان کا ذکر ضروری جانا۔ اُن کے ناولوں کی تعداد 245 بتائی جاتی ہے۔

یہ ابن صفی کا تذکرہ ہے، جو سری ادب کے بے تاج بادشاہ اور اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے قلم کار تھے۔ پاپولر ادب لکھنے والے دیگر قلم کاروں کا شہرہ وقت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے، مگر ابن صفی کے ہاں نہ جانے کیا کمال تھا، آج بھی ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ بلکہ اب تو ادب عالیہ تک محدود رہنے والے بھی محبت اور احترام سے ان کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ ان پر پی ایچ ڈی تھیسس لکھے جارہے ہیں، فقط پاکستانی جامعات میں نہیں، ہندوستان میں بھی ان پر تحقیق ہورہی ہے۔

وہ 26 جولائی 1928 کو الہ آباد، اتر پردیش کے

www.urdusoftbooks.com

علاقے نارا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام صفی اللہ تھا۔ شاعر نوح ناروی ان کے ماموں تھے۔ انہوں نے الہ آباد سے میٹرک کیا۔ وہیں ایونگ کرسچن کالج سے انٹر کا مرحلہ طے ہوا۔ 1947 میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں پاکستان تقسیم ہوگیا جس کی وجہ سے ان کا ایک سال ضائع ہوا۔ تقسیم کے بعد والد تو ادھر آگئے۔ البتہ باقی گھرانا کچھ برس ادھر ہی رہا۔ 1949 سے 1952 تک تدریس سے متعلق رہے۔ اگست 1952 میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ کراچی آگئے۔ بغل میں جامعہ آگرہ کی ڈگری تھی، جو کڑی شرائط پوری کرنے پر ملی تھی۔ اگلے کچھ برس لالوکھیت میں گزرے۔

ادبی سفر کا آغاز 1948 میں ہوا۔ ماہنامہ نکہت میں ابتدائی تخلیقات شائع ہوئیں۔ ''فرار'' کو ان کی پہلی کہانی کہا جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں وہ مختلف قلمی ناموں سے جو بڑے اچھوتے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھتے رہے۔ ان کے زمانے میں جنس ادب میں بکنے والا موضوع تھا۔ وہ اس رجحان کے خلاف تھے۔ اس لیے ایسا ادب لکھنے کا فیصلہ کیا جو قبولیت کی سند حاصل کرے۔ انہوں نے سری ادب کی راہ چنی۔ ابن صفی کا قلمی نام اختیار کیا اور حمید و فریدی سیریز کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' لکھا، جو 1952 میں شائع ہوا۔ اسے حیران کن ردعمل ملا۔

اگست 1955 میں انہوں نے ''خوفناک عمارت'' کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا۔ کردار میں ایسا جادو تھا کہ جس نے وہ کتاب پڑھی، عمران کا دیوانہ ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے میں یہ کردار مقبولیت کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں ''بھیانک آدمی'' آیا۔ یہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اکتوبر 1957 میں انہوں نے اسرار پبلیکیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت ناول ''ٹھنڈی آگ'' منصۂ شہود پر آیا۔ 1958 میں وہ لالوکھیت سے ناظم آباد کے علاقے میں منتقل ہوگئے۔ 1980 تک وہاں رہیں۔

1960 سے 1963 تک آپ انفصام کے مریض رہے، لیکن یونانی طریقہ علاج سے اس سے جان چھڑالی۔ بیماری کے دنوں میں جب ان کے ناول شائع نہیں ہو رہے تھے، کئی ابن صفی پیدا ہوگئے، مگر شفا کے بعد ''ڈیڑھ متوالے'' نامی ناول لکھا، جو بیسٹ سیلر ثابت ہوا اور ان سب کی چھٹی ہوگئی۔

1977 میں ان کے ایک ناول ڈاکٹر دعاگو کو پاکستان ٹیلی ویژن نے ٹیلی فلم کی شکل دی، مگر کچھ وجوہات کی بناء پر اُسے ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جاسکا۔ اس میں قوی خان نے مرکزی کردار نبھایا تھا۔ مشہور اداکار قوی خان نے اس میں عمران کا کردار ادا کیا تھا۔ عمران سیریز پر ایک فلم بھی بنی تھی، مگر وہ باکس آفس پر ناکام رہی۔ ''دھماکا'' کے نام سے ایک فلم بھی بنی جو ناکام ثابت ہوئی۔

17 ستمبر 1979 کو انہیں اٹیک ہوا۔ اس کے بعد ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ تشخیص کے بعد سرطان کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ وہ جناح اسپتال میں داخل ہوگئے۔ لبلبہ کے کینسر کی تصدیق ہوئی۔ اس بات کو انہوں نے اپنے مداحوں سے چھپائے رکھا۔ 24 جولائی 1980 کو طبیعت بگڑ گئی۔ دو روز بعد، اپنی سالگرہ والے روز ہی وہ جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ تدفین قبرستان پاپوش نگر میں ہوئی۔

ناقدین انہیں اردو کا سب سے بڑا جاسوسی ناول نگار قرار دیتے ہیں، ان کے پچاس برس پرانے ناول آج بھی مزہ دیتے ہیں۔ ان کا کردار عمران سیریز اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں کتنے ہی مصنفین نے اسے آگے بڑھایا۔ ان میں سے بیش تر ناول نگار کمزور تھے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے ابن صفی کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''میں نے کبھی ابن صفی کے ناولوں کو (دیگر پاپولر لٹریچر کے مانند) کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے انٹلیکچوئل اسے ایک سب اسٹینڈرڈ مواد گردانتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ابن صفی کے تخلیقی ذہن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ابن صفی کے ناول کیوں پڑھتے ہیں، تو میں جواب دیتا ہوں، کیونکہ ابن صفی ہمارے کئی ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتے ہیں۔''

ابن صفی کے مداح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں سراہنے والوں میں اگاتھا کرسٹی، اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور نارویجین پروفیسر فن تھیسن شامل ہیں۔ کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے ابن صفی کے فن کے بارے میں کہا تھا۔ ''ابن صفی کے ناولوں کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے۔ اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔''

☆ قتیل شفائی

آج تک ہے دل کو اس کے لوٹ آنے کی اُمید
آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ

وہ اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔ سادہ لہجہ، اس میں سچائی کی قوت، عام فہم زبان، یہی عوامل ہیں انہیں ہر دل عزیز بنانے کے قارئین کے دلوں تک ان کے اشعار رسائی

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پاتے تھے کہ وہ ان کے جذبات کے ترجمان ہوتے۔ یہی سبب تھا کہ ایک عالم ان کا گرویدہ تھا۔ یوں تو مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کا اصل میدان غزل ہے۔ غزلیں، جو گیتوں میں ڈھلیں تو برصغیر میں پھیل گئیں۔

لاکھ چاہا ہے کہ اس کو بھول جاؤں، پر قتیل
حوصلے اپنی جگہ ہیں، بے بسی اپنی جگہ

یہ تذکرہ ہے قتیل شفائی کا، جو پاک و ہند میں یکساں مقبول تھے۔ مہدی حسن اور جگجیت سنگھ نے جن شعرا کا کلام زیادہ گایا، ان میں قتیل بھی شامل ہیں۔ ان کے نغمات ''زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں'' اور ''اے دل کسی کی یاد میں'' بھلا کسے یاد نہیں۔ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ ویسے فقط نغمگی اور لطافت ان کے گیتوں کی پہچان نہیں جناب۔ ان کی شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور بھی تھا۔ کیوں ناں ہو... صف اوّل کے ترقی پسند شعرا میں گنتی ہوتی تھی۔

قتیل شفائی 24 دسمبر 1919 کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ اصل نام اورنگ زیب خان تھا۔ شاعری میں وہ حکیم یحییٰ خان شفا کے شاگرد تھے۔ اسی نسبت سے شفائی کا لاحقہ نام کے ساتھ لگایا۔ کم سنی میں شعر کہنے لگے تھے۔ 1942 میں ان کا پہلا مجموعہ ''ہریالی'' شائع ہوا۔ تقسیم ہند سے کچھ عرصے قبل گیت نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ اپنی پہلی فلم کے لیے گیت لکھ رہے تھے، برصغیر میں آزادی کے فسادات شروع ہوگئے، جس کی وجہ سے فلم ڈبے میں چلی گئی۔ بٹوارے کے بعد لاہور میں فلمی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ فلم ''تیری یاد'' کے انہوں نے گیت لکھے، جس کا بڑا چرچا ہوا۔ کچھ لوگ اسے پاکستان کی پہلی فلم بھی کہتے ہیں۔ اب ایک در کھل گیا تھا۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے درجنوں فلموں کو اپنے گیتوں سے سجایا۔ وہ اپنے عہد سے آگے تھے۔ اوروں کے برعکس گیتوں میں آسان اور عام فہم الفاظ استعمال کرنے کے لیے معروف تھے۔ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی فلمی صنعت کو سب سے زیادہ مقبول گیت انہوں نے ہی دیے۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے ڈھائی ہزار کے قریب نغمے لکھے۔ فلم گلنار، انارکلی، نائلہ، نوکر، انتظار اور عشق لیلیٰ کے گیتوں نے دھوم مچادی۔ ''کیوں ہم سے خفا ہوگئے اے جانِ تمنا''، ''صدا ہوں اپنے پیار کی''، ''ہر آدمی الگ سہی مگر امنگ ایک ہے'' اور ''یہ محفل جو آج سجی ہے'' جیسے نغمے بھلا کون بھول سکتا ہے۔

تمام موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر عنایت حسین، جی اے چشتی، رشید عطرے، خواجہ خورشید انور اور صفدر حسین جیسے موسیقاروں کی دھنوں پر ان کے گیت خوب جچتے۔ فلموں میں جدید اردو رومانوی شاعری متعارف کروانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

کتنے ہی اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، امیر خسرو ایوارڈ، نقوش ایوارڈ ان کے حصے میں آئے۔ بھارت میں بھی بڑی پزیرائی ہوئی۔ جب ادھر جاتے، مشاعرے لوٹ لیتے۔ ان پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ مہاراشٹر کی نصابی کتب میں ان کی نظموں نے جگہ پائی۔ مگدھ یونیورسٹی میں ان پر مقالہ لکھا گیا۔

ویسے ادب میں وہ پکے ترقی پسند تھے۔ ان کا ایک شعر:

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں دیکھا
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

ترقی پسندوں میں سلوگن کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ''ادب لطیف'' اور ''سنگِ میل'' جیسے پرچوں کے مدیر رہے، جن کے پلیٹ فورم سے انہوں نے متعدد نوجوان شاعر اور افسانہ نگاروں کو متعارف کروایا۔ ان کی دیگر کتب جلترنگ، روزن، جھومر، گفتگو، چھتنار، آموختہ، پیراہن، ابابیل کے زیرِ عنوان شائع ہوئیں۔ قتیل شفائی کا 11 جولائی 2001 کو انتقال ہوا۔ گو وہ چلے گئے، مگر ان کے لازوال گیت آج بھی سماعتوں میں رس گھول رہے ہیں۔

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

☆سرگنگارام

دہلی اور لکھنؤ کی اہمیت سے انکار نہیں، مگر یہ لاہور تھا جو مشترکہ ہندوستان میں نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ علم و ادب کا گہوارہ۔ فلم نگری بھی ادھر ہی تھی۔ مؤرخین متفق ہیں کہ اگر بٹوارا نہ ہوتا تو آج ممبئی نہیں، لاہور سب سے بڑی فلم

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

انڈسٹری ہوتا۔ تقسیم کے بعد بھی یہ شہر پنجاب کی عظیم تہذیب کا چہرہ ٹھہرا۔ کہتے ہیں، جس نے لاہور نہیں دیکھا، اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ تذکرہ زندہ دلوں کے شہر لاہور کا ہو، تو لازم ہے کہ ایک ایسے شخص کا تذکرہ بھی آئے گا، جو معروف معنوں میں تو پاکستانی نہیں کہ تقسیم سے پہلے ہی جہانِ فانی سے کوچ کر گیا تھا مگر اس شہر پر اتنی گہری چھاپ چھوڑی کہ لاہور کا تذکرہ اس کے بغیر اور اس کا تذکرہ لاہور کے بغیر ادھورا لگتا ہے۔

ہم بات کر رہے ہیں گنگا رام جی کی، جنھیں احترام سے سر گنگا رام کہا جاتا تھا۔ بڑے دیالو اور ملن ساز تھے، دل نیک تھے، اسی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان، سب ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے فلاحی کاموں کی فہرست طویل اور قابلِ فخر ہے۔ لاہور میں کئی جگہ ان کے اخلاص کی علامات نظر آتی ہیں۔ اس وقت کے گورنر پنجاب سر میلکم ہیلی نے سر گنگا رام کی سماجی شخصیت کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ”وہ ایک سورما کی مانند جیتتا ہے اور ایک صوفی کی مانند دان کرتا ہے۔“

گنگا رام اگروال اپریل 1851 کو ننکانہ صاحب کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابا قصبے کے پولیس اسٹیشن میں جونیر سب انسپکٹر تھے۔ بعد میں وہ امرتسر چلے گئے اور وہاں کورٹ میں منشی ہو گئے۔ البتہ ان کا خاندان ادھر ہی رہا۔ گنگا رام بڑے سمجھ دار اور مہذب نوجوان تھے۔ میٹرک کے بعد انہوں نے مشہور زمانہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ 1871 میں انہیں اسکالرشپ ملی۔ انہوں نے Roorkee کے تھامسن سول انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے 1873 میں گولڈ میڈل کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے۔ مقابلے کا امتحان دے کر انگریز سرکار میں اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے۔ کیریر کا آغاز لاہور سے کیا، جس سے انہیں عشق تھا۔

سر گنگا رام اسپتال، جی پی او، لاہور عجائب گھر، ایچیسن کالج، گورنمنٹ کالج لاہور کا کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ، میو اسپتال کا البرٹ وکٹر ونگ، میو اسکول آف آرٹس (موجودہ این سی اے) ماڈل ٹاؤن اور گلبرگ جیسی اس دور کی جدید عمارتیں آج بھی سر گنگا رام کی مہارت اور قابلیت کا اعتراف کرتی ہیں۔ ان کا اثر شہر کے چپے چپے پر نظر آتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق جس زمانے میں وہ ایکسین آف دی سٹی تھے، انہوں نے پنجاب، بالخصوص لاہور کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پٹھان کوٹ اور امرتسر کے درمیان ریلوے ٹریک بچھانا بھی ان کا ایک کارنامہ۔ یہ سر گنگا رام ہی تھے، جنھوں نے لاہور میں پہلا جدید سینی ٹیشن سسٹم اور واٹر ورکس کا نظام قائم کیا، جو تقریباً سو سال تک کام کرتا رہا۔

ان کا اصل کارنامہ ماڈل ٹاؤن کا قیام تھا۔ 1921 میں لاہور شہر سے باہر ایک ہزار ایکٹر پر مثالی ہاؤسنگ اسکیم کا منصوبہ بنایا، جسے اپنی نگرانی میں مکمل کیا۔ گو ان کی وفات کے بعد اس میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ اور تعمیرات میں غفلتیں ہوئیں، جن کی وجہ سے اس کا حسن متاثر ہوا، مگر آج بھی اس علاقے میں وہ ترتیب نظر آتی ہے، جس کا سنگِ بنیاد سر گنگا رام نے رکھا تھا۔ 10 جولائی 1927 کو لاہور کے اس محسن کا انتقال ہوا۔

☆نصیر الدین شاہ

یوں تو بالی وڈ میں کتنے ہی ستارے چمکے، کئی باصلاحیت اداکاروں نے یہاں اپنے فن کا لوہا منوایا، سپر اسٹار کا درجہ حاصل، مگر عجیب معاملہ ہے کہ ہندو اکثریتی ملک کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری پر مسلمانوں کا غلبہ رہا۔ ماضی میں یوسف خان (دلیپ کمار) کا سکہ چلتا تھا، تو اب سلمان خان، عامر خان اور شاہ رخ خان راج کر رہے ہیں۔ گیت اور مکالمہ نگاری کے میدان میں بھی مسلمان چھائے رہے۔ اور فقط کمرشل فلموں پر مسلمانوں کا غلبہ نہیں رہا جناب، متوازی سینما، یعنی آرٹ فلموں میں بھی انہوں نے خود کو منوایا۔ کریکٹر ایکٹر کرنے والے بیش تر بڑے اداکار مسلمان تھے، مگر ان میں کسی کو وہ مقام نہیں ملا جو نصیر الدین شاہ کے حصے میں آیا، جنھیں کچھ حلقے موجودہ انڈسٹری کا سب سے بڑا اداکار بھی کہتے ہیں۔ یہ عام رائے ہے کہ انہوں نے کمرشل اور آرٹ سینما کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ ایسے رول کیے، جنھوں نے ناظرین کو بھی گرویدہ بنایا اور ناقدین کو بھی قائل کیا۔

انہوں نے 20 جولائی 1950 کو اتر پردیش میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے افغان جنگجو جان فشاں خان کی نسل سے ہے۔ معروف افغان مصنف ادریس شاہ، مشہور پاکستانی اداکار سید کمال اور کرکٹر اویس شاہ اسی خاندان سے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ اینسلم، اجمیر

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اور سینٹ جوزف کالج، نینی تال سے حاصل کی۔ رجحان ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کی جانب تھا۔ علم فنون میں ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔ 1971ء میں دہلی کے نیشنل اسکول آف ڈراما پہنچ گئے۔ مستقبل میں یہ ادارہ ان کے کیریر پر گہرے اثرات مرتب کرنے والا تھا۔

فلمی کیریر کے آغاز میں کئی مشکلات کا سامنا رہا مگر صلاحیت اپنا راستہ بنا ہی لیتی ہے۔ 1975 میں ریلیز ہونے والی ”نشانت“ ان کی پہلی فلم تھی۔ سخت مقابلے کا زمانہ تھا۔ پہچان بنانے کے لیے بہت زور مارنا پڑتا تھا۔ وہ روایتی ہیرو کے سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے، مکمل ولن بھی نہیں لگتے تھے۔

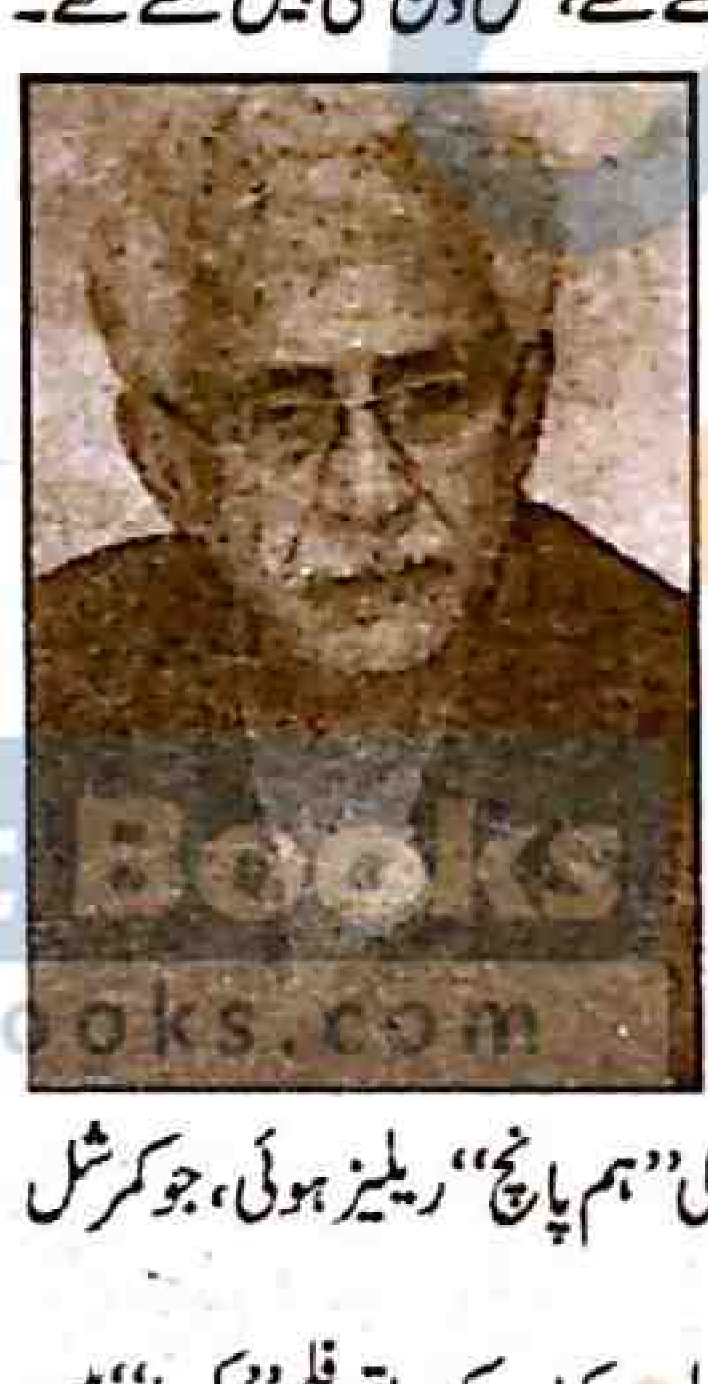

زیادہ کام انہوں نے آرٹ سنیما میں کیا، مگر صلاحیتیں دھیرے دھیرے شناخت عطا کرتی رہیں۔ 1980ء میں ان کی نویں فلم ”آکروش“ ریلیز ہوئی، جو ٹرینڈ سیٹر ثابت ہوئی۔ اس کا شمار ان فلموں میں ہوتا تھا، جنہوں نے انڈسٹری کا چہرہ بدل دیا۔ اسی برس ان کی ”ہم پانچ“ ریلیز ہوئی، جو کمرشل فلم تھی اور کامیاب رہی۔

1986 میں انہیں دلیپ کمار کے ساتھ فلم ”کرما“ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک بڑے بجٹ کی بھاری بھرکم فلم تھی۔ ستاروں کے درمیان ان کی چمک ماند نہیں پڑی۔ کیریر سنبھلنے لگا۔ پھر اجازت، جلوا اور ہیرو ہیرالال میں نظر آئے، جنہیں اچھا ریسپانس ملا۔ پھر تو ہر طرح کا کام کیا۔

ان کی مشہور فلموں میں نشانت، آکروش، اسپرش، مرچ مسالا، البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے، تریکال، بھاونی بھوائی، موہن جوشی حاضر ہو، اردھ ستیا، کتھا اور جانے بھی دو یاروں شامل ہیں۔ ”جانے بھی دو یارو“ کا شمار اپنے وقت کی مقبول ترین فلموں ہوتا تھا۔ اسے مزاحیہ فلموں کی صنف میں ماسٹر پیس قرار دیا گیا۔ 1994ء میں انہوں نے فلم ”مہرہ“ میں منفی کردار کیا، یہ فلم بلاک بسٹر ثابت ہوا۔ ان کی مشہور ترین فلموں میں ”معصوم“ بھی شامل، جو سینٹ جوزف کالج نینی تال میں فلمائی گئی۔ انہوں نے فقط بالی وڈ میں کام نہیں کیا۔ ہالی وڈ کا بھی رخ کیا۔ کئی فلموں میں مضبوط کردار نبھائے، جن میں ”لیگ آف ایکسٹرا آرڈنری جینٹلمین“ نمایاں ہے۔ وہ پاکستانی فلموں میں بھی نظر آئے۔ ”خدا کے لیے“ میں انہوں نے خصوصی کردار کیا، جسے بڑی پزیرائی ملی۔ پھر ”زندہ بھاگ“ میں نظر آئے۔ فلموں کے ساتھ ساتھ وہ تھیٹر بھی کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ دہلی، ممبئی، بنگلور اور لاہور میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر مشتمل کھیل پیش کیے۔

2006 میں ان کی ڈائریکٹ کردہ فلم ”یوں ہوتا تو کیا ہوتا“ ریلیز ہوئی، جو 9/11 کے تناظر میں تھی اور بڑی مہارت سے فلمائی گئی تھی۔

ان کا شمار ایسے فنکاروں میں ہوتا ہے، جو فن کو سرحدوں سے آزاد سمجھتے ہیں اور فلم کو فکری اور ادبی ذائقہ دینے کے حامل ہیں۔ وہ ہندوستان میں بڑھتی ہندو انتہا پسندی کے ناقد ہیں اور امن کے حامی ہیں۔ ان کے ان ہی افکار کی وجہ سے دیگر ممالک میں وہ بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر محبوب الحق

پاکستان نے کیسے کیسے نابغۂ روزگار پیدا کیے۔ ایسی کتنی ہی شخصیات گزریں، جن کی علمیت اور قابلیت فقط اپنے ملک تک محدود نہیں رہیں، غیروں نے بھی ان سے اکتساب علم کیا۔ کچھ تو ایسے تھے، جنہوں نے مغربی علوم میں ایسی گرفت حاصل کرلی کہ بعد میں مغرب ان کی فکر سے استفادہ کرنے لگا۔ ڈاکٹر محبوب الحق بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے پاکستانیوں کو ان کے کارناموں کی خبر نہیں۔

24 فروری 1934 کو پنجاب میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر محبوب الحق کا شمار جنوبی ایشیا کے معروف ماہرین معیشت میں ہوتا ہے۔ انہیں اطلاقی ریاضیات کے شعبے گیم تھیوری میں سند تصور کیا جاتا تھا۔ انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ تھیوری پر بھی ان کا وسیع کام تھا۔ وہ گیارہ برس ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر برائے پالیسی پلاننگ بھی رہے۔ ان کا ترتیب دیا ہوا ہیومن ڈیولپمنٹ انڈکس ایک عرصے تک استعمال ہوتا رہا۔ ان کی کتاب Reflections on Human Development نے اس شعبے کو نئی فکر اور نظریات سے لیس کیا۔ ضیا دور میں وہ وزیر معیشت رہے۔ وہ پاکستان کے 13 ویں وزیر معیشت تھے۔ (بہت سے لوگ انہیں فقط اسی حیثیت سے جانتے ہیں) بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی ماہرین معیشت کا تذکرہ ان کے بنا نامکمل ہے۔

جب محبوب الحق نے شعور کی آنکھ کھولی، ہندوستان تقسیم،

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کے دہانے پر کھڑا تھا۔ بڑا پُرآشوب دور تھا۔ اگست 1947 کے بعد حالات بگڑنے لگے۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ پنجاب کے جس حصے میں ان کا خاندان مقیم تھا، وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی۔ ان کا خاندان خون کا دریا پار کر کے پاکستان پہنچا۔ ان تلخ تجربے نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے، تاہم کسمپرسی کے باوجود انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے سوشل سائنسز ڈیپارٹمنٹ کا حصہ بن گئے۔ 1958 میں اکنامکس میں بی ایس کی ڈگری لی۔ انہیں برطانیہ کی اسکالرشپ مل گئی۔ ادھر وہ کیمبرج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہیں ان کی مسٹر امرتیا سین سے دوستی ہوئی، جو مستقبل میں ہندوستانی معیشت میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے تھے۔ یہ دوستی کئی عشروں تک قائم رہی۔ اب وہ امریکا چلے گئے۔ انہوں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ کے لیے انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے امریکی معیشت کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ کمیونزم اور کیپٹل ازم کی تقسیم میں وہ ہمیشہ کیپٹل ازم کی حمایت کرتے نظر آئے۔ انہیں امریکا اور برطانیہ میں اچھی ملازمتوں کی پیش کش ہوئی، مگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے، سو لوٹ آئے اور بیوروکریسی کا حصہ بن گئے۔ وہ نوجوان اور قابل تھے، نئے نظریات اور خیالات سے لیس تھے۔ جلد انہوں نے شناخت بنا لیا۔ ماہر معیشت کے طور پر شہرت حاصل کرتے جارہے تھے۔ ملک بھر میں ہونے والے سیمینارز اور ورکشاپس میں لیکچرز دیتے، جہاں وہ ایوب خان کی پالیسیوں کی حمایت کرتے نظر آتے۔ انہیں یقین تھا کہ فری مارکیٹ کے اصولوں کے اطلاق سے پاکستانی معیشت میں واضح بہتری آسکتی ہے۔ 70ء میں بیرونِ ملک چلے گئے اور بین الاقوامی اداروں میں خدمات انجام دیتے رہے۔

وہ معیشت کی تھیوری انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ میں نظریہ ساز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس میدان میں Human Development کا تصور متعارف کروانے والے فلسفیوں میں ان کی گنتی بھی ہوتی ہے۔ وزیر معیشت کا عہدہ چھوڑنے کے بعد وہ خاصے مصروف رہے۔ 89ء وہ اقوام متحدہ کے ڈیولپمنٹ نیٹ ورک UNDP کے اسپیشل ایڈوائزر ہوگئے۔ ان کی نگرانی میں بین الاقوامی اسکالرز کی ایک ٹیم نے Human Development پر پہلی رپورٹ مرتب کی۔

پاکستان لوٹ کر وہ پلاننگ کمیشن کا حصہ بن گئے۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے مشیر معیشت کے طور پر بھی کام کیا۔ کہا جاتا ہے، بھٹو صاحب نے محبوب الحق کو اپنی کابینہ میں وزیر معیشت بننے کی پیش کش کی تھی، مگر بھٹو کے سوشل ازم کی جانب جھکاؤ کی وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ نیشنلائزیشن کے بھی خلاف تھے جس کا بھٹو فیصلہ کر چکے تھے۔ بھٹو نے بعد میں بھی ان سے رابطہ کیا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ 1982 میں ضیاالحق انہیں قائل کرنے میں کامیاب رہے اور وہ کابینہ میں شامل ہوئے۔ زندگی کے آخری برسوں تک وہ مصروف رہے۔ پھر بیماریاں آئیں، ان کی صحت گرتی چلی گئی۔ 1996 میں ان کی مشہور زمانہ کتاب شائع ہوئی۔ 16 جولائی 1998 کو نیویارک میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ چوہدری نصیر احمد ملہی

کسی زمانے میں انہیں پاکستانی سیاست کا روشن چہرہ قرار دیا جاتا تھا۔ آج کیسا تاریک دور ہے... ہمیں ان کے کارناموں کی خبر ہی نہیں۔ ہمیں علم ہی نہیں کہ تحریک پاکستان کا ایک ایسا رہنما بھی تھا، جس نے مسلم لیگ کو منظم کرنے کے لیے اپنی جائیدادیں فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ چوہدری نصیر احمد ملہی کا تذکرہ ہے، جنھیں احترام سے لارڈ ملہی کہا جاتا تھا۔

چوہدری نصر احمد ملہی 15 اگست 1911 کو بدوملہی، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری غلام حیدر ملہی کا شمار علاقے کی معزز شخصیات میں ہوتا تھا۔ یہ خاندان پنجاب کی اشرافیہ کا چہرہ تھا۔ انتہائی بااثر اور فعال۔ ان کے پردادا ایک زمانے میں گورنر پنجاب بھی رہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم جی ایم مسلم ہائی اسکول سے حاصل کی، جو ان کے والد کے نام سے موسوم تھا۔ یہ اسکول مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر 1918 میں شروع کیا گیا تھا۔ اس اسکول میں ذہین طلبا کو وظیفہ بھی دیا جاتا۔ اب انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سے ریاضی اور عربی کے مضامین کے ساتھ انہوں نے گریجویشن کیا۔ یونیورسٹی آف پنجاب سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں پنجاب میں سیاسی سرگرمیاں زور پکڑنے لگی تھیں۔ مسلم لیگ دھیرے دھیرے فعال ہو رہی تھی۔ البتہ کانگریس بھی خاصی متحرک تھی۔ ہندو مسلم تقسیم اس طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری نصیر احمد نے اوائل میں کانگریس کا چناؤ کیا، مگر دھیرے دھیرے ان پر واضح ہونے لگا کہ اس خطے میں کانگریس کا مستقبل تاریک ہے۔ ایک بڑی تبدیلی جنم لینے والی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے 1940 میں لاہور کانفرنس منعقد کی، تو اس میں چوہدری نصیر احمد نے بھی شرکت کی، جس کے بعد ان پر واضح ہو گیا کہ یہ پارٹی جلد اس علاقے میں کلیدی کردار ادا کرنے والی ہے۔ وہ مسلم لیگ کا حصہ بن گئے اور سیالکوٹ میں اسے منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ جلد اس کے صدر ہو گئے۔

1943 میں ان کی قائد اعظم سے بمبئی میں جناح ہاؤس میں ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے مشورے پر مئی 1944 میں پنجاب مسلم لیگ کنونشن منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں محمد علی جناح، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین جیسے رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس کنونشن کے بعد خضر حیات ٹوانہ کی حکومت ہل گئی۔ مسلم لیگ پنجاب میں تیزی سے ابھری اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا محسوس ہونے لگا، جو شاعر مشرق علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ مسلمان ایک پلیٹ فورم پر اکٹھے ہونے لگے۔ جلسے جلوسوں کے لیے وہ اپنی جیب سے خرچ کرتے۔ انہیں لارڈ ملبی کہا جانے لگا۔ چوہدری صاحب کی قائدانہ صلاحیت اور قابلیت کے اعتراف میں انہیں پنجاب میں مسلم لیگ کی قیادت سونپ دی گئی۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا، بھاری ذمے داری، مگر انہوں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ یہ عہدہ قیام پاکستان کے بعد بھی کئی برس ان کے پاس رہا۔

انہوں نے تحریک آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا، تو اس میں کچھ حصہ سیالکوٹ کے اس رئیس کا بھی تھا، جو تحریک کے لیے اپنی آدھی جایداد بیچ چکا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

مؤرخین کے مطابق محمد علی جناح کی خواہش تھی کہ وہ مستقبل میں وزیر اعظم کا منصب سنبھالیں۔ قائد اعظم زندہ رہتے، تو چوہدری نصیر احمد ضرور اس منصب تک پہنچتے، مگر بعد میں پاکستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدلے۔ البتہ ان کی اہمیت سے انکار کرنا یا انہیں نظر انداز کرنا اب بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ تعلیم، قانون اور پارلیمانی امور کی وزارتوں پر فائز رہے۔

ان ہی کی تجاویز پر پاکستان کے سرکاری اسکولوں میں یونیفارم رائج ہوا۔ اس وقت ایچیسن کالج کو وفاقی حکومت سے گرانٹ ملتی تھی، جسے انہوں نے یہ کہہ کر بند کروا دیا کہ اس طرح کے ادارے حکومتی گرانٹ کے محتاج نہیں۔ یہاں امرا کے بچے پڑھتے ہیں۔ 1955 میں جینوا کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت چوہدری نصیر احمد ہی نے کی۔ اس میں انہوں نے ایفرو ایشین ممالک کے مسائل کی نشان دہی کی۔ انہیں سونے کے تمغے سے نوازا گیا۔ بعد میں وہ پاکستانی وفد لے کر اقوام متحدہ بھی گئے۔ پاک امریکا تعلقات کی بہتری میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں امریکی خاتون اوّل کے اعزاز میں رکھے جانے والے عشائیہ کا ایک عرصے سفارتی حلقوں میں چرچا رہا۔ کہا جاتا ہے، اس کا خرچا انہوں نے اپنی جیب سے برداشت کیا۔

وہ مارشل لا کے سخت ناقد تھے۔ ایوب خان کے اقدامات پر انہوں نے کھلی تنقید کی۔ اس کی وجہ سے دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑا، مگر وہ ڈٹے رہے۔ 1965 میں انہوں نے فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ 71ء تک انتخابی سیاست میں حصہ لیتے رہے، مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے انہیں دل برداشتہ کر دیا اور وہ عملی سیاست سے دور ہو گئے۔ البتہ سیاسی حلقوں میں ایک عرصے تک ان کا اثر و رسوخ رہا۔

انہیں پہلے مارشل لا میں اہم وزارتوں کی پیشکش ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ سے ان کے گہرے مراسم تھے اور ان ہی کے ذریعے چوہدری صاحب کو پیغام پہنچایا گیا تھا، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ انہیں ضیاالحق کے دور میں بھی کابینہ کا حصہ بننے کی دعوت دی گئی، مگر ان کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

12 جولائی 1991 کو تحریک پاکستان کے اس رہنما کا انتقال ہوا۔ وہ پاکستان سیاست میں وضع داری، اخلاقیات اور اصول پسندی کی علامت تھے، جنہوں نے ہمیشہ اپنا دامن کرپشن سے پاک رہا۔ بدقسمتی سے ان کے بعد آنے والوں نے ان کی پیروی کرنے سے شعوری اجتناب برتا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

قابلِ فخر

شکور پٹھان

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا نام سن کر سر عقیدت سے جھک جاتا ہے اور اگر ان کا تعلق علاقائی یا مذہبی طور پر یکساں ہو، کوئی ربط ہو تو ان سے انسیت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسے ہی لوگوں کا مختصر مختصر سا تذکرہ تاکہ نئی نسل انہیں بھلا نہ دے۔

کچھ اپنوں کا ذکر، کچھ دلچسپ واقعات

www.urdusoftbooks.com

اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام (چیزوں کے) نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تم اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ ان سب نے کہا کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے، ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے سکھایا۔ اور کامل علم و حکمت والا تو تو ہی ہے۔ اللہ نے آدم سے فرمایا تم ان کے نام بتادو۔ اور جب انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا کہ میں نے تمہیں نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمان کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں تمہارا ظاہر و باطن ہے۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ (البقرہ...... 31-34)

علم، جس نے آدم کو ملائکہ پر فضیلت دی اور اسے مسجود ملائک بنایا۔ علم، سب سے پہلا حکم جو اللہ نے اپنے آخری نبی کو دیا، پڑھ اپنے رب کے نام سے۔

علم جو انسانوں کو، قوموں کو رفعت عطا کرتا ہے۔ علم، مومن کی گمشدہ میراث، جس کے لیے حکم ہوا اسے حاصل کرو چاہے جہاں سے ملے، جہاں تک جانا ہو۔ علم، کبھی نہ ختم ہونے والی دولت، وہ دولت جو بانٹنے سے اور بڑھتی ہے۔ علم، ہر

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

جسے حاصل کرنا بہترین کام قرار دیا گیا۔

اور اس قوم کی بد نصیبی کا کیا کہیے جسے اللہ نے اپنے نور کو پھیلانے کے لیے چنا، نور، روشنی جو علم کا منبع ہے، جو تاریکی کا سینہ چیر کر پوشیدہ کو سامنے لاتا ہے، جس سے عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اور آج وہی قوم علم کے میدان میں سب سے پیچھے اور اغیار کی محتاج ہے۔

ہم سب اور خصوصاً ہمارے اہلِ علم اور اہلِ قلم اس جہالت پر کڑھتے اور ہم وطنوں کو جہالت کا طعنہ تو بہت دیتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو آگے بڑھ کر پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ اندھیری راتوں پر تو خوب عالمانہ گفتگو کرتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو عمل کا ایک چھوٹا سا دیا روشن کرتے ہیں۔

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

لیکن اپنے آپ کو اس جوکھم میں کون ڈالے۔ مغرب کے لیے سونے کی چڑیا، ہندوستان، جہاں فرنگیوں کی آمد سے قبل مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، جنھوں نے اپنی معشوقاؤں کی یاد میں مقبرے تعمیر کیے، طویل و عریض قلعے اور عظیم الشان محل تعمیر کیے۔ طاؤس و رباب، حسن و عشق، کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، یہ بازی، وہ بازی اور اسی قسم کے مشاغل اور فنون کو ترویج دی۔

فرنگی گومتی کے کنارے پہنچ گئے اور ہم شطرنج کی بازیوں میں جتے رہے۔ خواص کا یہ حال ہو تو عوام بھلا کس کھیت کی مولی ہیں۔ دنیا سائنس میں ایک سے بڑھ کر ایک ایجاد کر رہی تھی اور ہم دنیا کو مسلمانوں کے سائنس پر احسانات گنوا رہے تھے۔

عوام الناس کی بات تو چھوڑیں، ہمارے اہلِ علم اس بات سے متفکر تھے کہ کہیں مسلمان نوجوان جدید علم حاصل کر کے الحاد اور بے دینی کا شکار نہ ہو جائیں۔

یوں قتل سے بچوں کے نہ ہوتا بدنام...... افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی، جیسی پھبتیاں عام تھیں۔

شاید فلک کج رفتار کو اس قوم پر رحم آیا۔ آج سے سو سوا سو سال پہلے ایک مرد دانا کو ہمت اور آگہی دی کہ اگر دنیا میں عزت سے جینا ہے تو علم حاصل کرنا ہے۔ اس اولوالعزم دیوانے کا نام سید احمد خان تھا جس نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام پر منتج ہوئی۔

یہ سرسید کا ہی احسان ہے کہ آج ہم اور آپ ایک دوسرے سے علم و دانش پر گفتگو کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

میرا شہر ہمیشہ شکر گزار رہے گا سیٹھ دیا رام جیٹھامل (ڈی جے) نادر شاہ ایڈولجی ڈنشا (این ای ڈی) اور ان جیسے دیگر ہندوؤں اور پارسیوں کا اور ان مشنریوں کا جنہوں نے قیام پاکستان سے قبل شہر میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے قائم کیے جن کا نعم البدل ہم آج تک نہیں پیش کر سکے۔ پھر سرسید کی اتباع میں حسن علی آفندی نے مسلمانوں کے پہلے تعلیمی ادارے، سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد رکھی۔

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت نے اپنے محدود ذرائع سے کچھ تعلیمی ادارے قائم کیے لیکن وہ میرے شہر کی علمی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں تھے۔

لیکن ہر دور میں کچھ سر پھرے ایسے گزرے ہیں جو اپنے مقصد اور نصب العین کے لیے۔

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ'' کے مصداق تن من دھن ایک کر دیتے ہیں۔

آج میں اپنے شہر کے ایسے ہی کچھ محسنوں کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں جن کے دم سے میرا شہر علم کی روشنی سے منور ہوا۔

پی ٹی وی کے مقبول پروگرام ''کسوٹی'' میں جب ماہرین عبیداللہ بیگ اور افتخار عارف کسی مشکل میں پڑ جاتے تو کن انکھیوں سے قریش پور کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کرتے۔ وجۂ شہرت اچھی، یا بری؟

یہ ایک عجیب سی تقسیم ہے جس میں ہم نے انسانوں کو

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

بانٹا ہوا ہے۔ اچھے لوگ اور برے لوگ لیکن اچھائی یا برائی کا پیمانہ ہر ایک کا مختلف ہے۔ میرا اچھا آپ کے نزدیک برا اور آپ کا اچھا میرے لیے برا ہو سکتا ہے پھر ایک اور فارمولا ہم نے بنا لیا ہے کہ جسے اچھا سمجھ لیا ہے اس کی برائیاں جیسی بھی چھوٹی یا بڑی ہوں، ان سے ہم درگزر کرتے ہیں اور جسے برا سمجھتے ہیں اس کی اچھائیاں چاہے کتنی ہی بڑی ہوں انہیں خاطر میں نہیں لاتے اور صرف برائی کے حوالے سے ہی اس کردار کو یاد رکھتے ہیں۔

یارو کوئی نہ کامل فرشتہ ہوتا ہے نہ پورا شیطان۔ انسان، انسان ہوتا ہے، مرکب خطا و نسیاں، اچھائی اور برائی کا مجموعہ۔ کیوں نہ جس انسان سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہو اور جس نے ہمیں اور دنیا کو فائدہ پہنچایا ہو اس کی اچھائی کو یاد رکھیں۔

عبدالرحمان محمد قریشی، ایک کامیاب ٹرانسپورٹر لیکن کم تعلیم یافتہ (یا شاید غیر تعلیم یافتہ) اور بعض حوالوں سے متنازعہ شہرت کا حامل لیکن جب اللہ نے کسی سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اپنی تائید و نصرت اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہے اور اسے بلند مرتبہ و مقام دیتا ہے۔

اسی ٹرانسپورٹر کے نجانے کیا جی میں آئی کہ اسے ان نوجوانوں کی فکر ہوئی جو دن کو محنت مزدوری میں مشغول ہونے کی وجہ سے علم کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ اس نے ان کے لیے قریشی نائیٹ کالج قائم کیا اور پھر 1959ء میں میرے شہر کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی۔ آج کراچی کا ہر دوسرا تیسرا تعلیم یافتہ شخص اسلامیہ کالج اور اے ایم قریشی کا احسان مند ہے۔ مجھے اعداد و شمار کا علم نہیں لیکن ایک وقت تھا جب اسلامیہ کالج کے طلبا و طالبات کی تعداد جامعہ کراچی سے زیادہ تھی۔

یہ ایک غریب پرور کالج تھا۔ جسے شہر کے کسی کالج میں داخلہ نہ ملے، اسلامیہ کالج اسے اپنی آغوش میں جگہ دیتا تھا اور نجانے کتنے ایسے ہوں گے جنہیں اپنی کم قابلیت کے باوجود تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ کراچی کے اکثر مشاہیر نے یہیں تعلیم حاصل کی۔ میں سب کا نام تو نہیں جانتا لیکن ایک دو سے تو آپ بھی واقف ہوں گے، جیسے ایشین بریڈمین، ظہیر عباس اور فلمسٹار ندیم وغیرہ۔

قریشی کی بوقلموں شخصیت کا ایک اور عجیب پہلو اس کی علماء سے عقیدت تھی۔ وہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ کے عقیدت مند تھے۔ علامہ کے انتقال کے بعد انہیں اسلامیہ کالج کے احاطہ میں ہی دفن کیا گیا۔ اسلامیہ کالج میں ایک اور نابغہ روزگار شخصیت یعنی مولانا سید ابوالحسن ندوی بھی مدفون ہیں۔ اے ایم قریشی نے بھی انہی مشائخ کے قدموں تلے جگہ پائی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست۔
یہ رتبہ بلند جسے مل گیا، مل گیا۔

☆☆☆

کراچی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنی خاص روایات کی حامل ہے۔ میرے کچھ دوست علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہیں۔ فن گفتگو، حاضر جوابی اور بزلہ سنجی، علیگیوں کی خاص پہچان ہیں لیکن سب سے بڑی شناخت ان کی علم و ادب سے محبت ہے۔

اسی محبت نے کراچی کے ایک نمایاں علیگ، ظل احمد نظامی کو قائل کیا کہ آپ نے کے ڈی اے کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے 145 اسکیمیں جاری کر کے بلاشک شہر کی بے حد خدمت کی لیکن اب ایسا کچھ کیا جائے کہ آنے والی نسلوں کو بھی فیض پہنچے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ یعنی ایسا کوئی علمی ادارہ قائم کیا جائے جس سے آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہوتی رہیں۔

زیڈ اے نظامی یا ہم سب کے نظامی صاحب نے اپنے علی گڑھ کے ساتھیوں کی مدد سے نجی شعبے میں پاکستان کی پہلی انجینئرنگ یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی۔

سرسید یونیورسٹی نے جہاں میرے شہر میں معیاری

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

انجینئرنگ کالج اور یونیورسٹیوں اور نشستوں کی کمی کا مسئلہ کم کیا وہیں اعلیٰ پائے کی تدریسی اور تحقیقی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ مستحق اور قابل طلبہ کے لیے اسکالرشپ وغیرہ جاری کیں۔

کے ڈی اے کی ترقیاتی اسکیمیں اور سرسید یونیورسٹی میرے شہر والوں کو ہمیشہ نظامی صاحب کی یاد دلاتی رہیں گی۔

دانائے راز

ہم اکثر و بیشتر بات کرتے ہیں کہ ہمارے دین نے عورت کو بڑا اعلیٰ مقام عطا کیا ہے لیکن عملاً ہمارا طرزِ عمل اسے کہیں ثابت نہیں کرتا۔

سرسید کو بھی قوم کی تعلیم کی فکر تھی لیکن شنید یہ ہے کہ وہ بھی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ حکیم الامت، علامہ اشرف علی تھانوی نے بھی خواتین کی علمی ضروریات کو قرآن پڑھنے اور سرتاج کو خط لکھنے اور دھوبی کا حساب رکھنے سے زیادہ نہیں سمجھا۔ اور تو اور ہمارے شاعر کو بھی لڑکیوں کا جدید تعلیم حاصل کرنا نہ بھایا اور اس نے یوں طنز کیا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے خانوادے کے ایک فرزند نے یہ راز جان لیا کہ دنیا میں آگے بڑھنا ہے تو عورت کو جو اپنی اولاد کی سب سے بڑی معلم ہوتی ہے اسے بھی ہر طرح کا علم حاصل کرنا چاہیے۔

الحاج مولوی ریاض الدین احمد شعر اور دانشوروں کے شہر آگرے میں مسلم لیگ کے ہراوّل دستوں میں شامل اور ایک متحرک کارکن تھے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل، علم سے محبت تو لازمی تھی۔ انجمن اسلامیہ ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔

ایک بار جب قائداعظم آگرہ تشریف لائے تو مولوی صاحب نے ان سے اجازت طلب کی کہ وہ جناح کے نام سے لڑکیوں کا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آگرہ میں تو مولوی صاحب کا خواب پورا نہ ہوا لیکن تقسیم کے بعد انہوں نے کراچی میں اپنا مشن جاری رکھا۔ یہاں آگرہ کے مہاجرین کے چندوں کی مدد سے پاکستان چوک پر پہلا گرلز اسکول قائم کیا لیکن ان کا خواب اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے زمین عطیہ کی محترمہ فاطمہ جناح جنہیں خواتین کی فلاح و ترقی بے حد عزیز تھی، ذاتی دلچسپی لے کر ایک خطیر رقم کی منظوری دلوائی۔ حالات

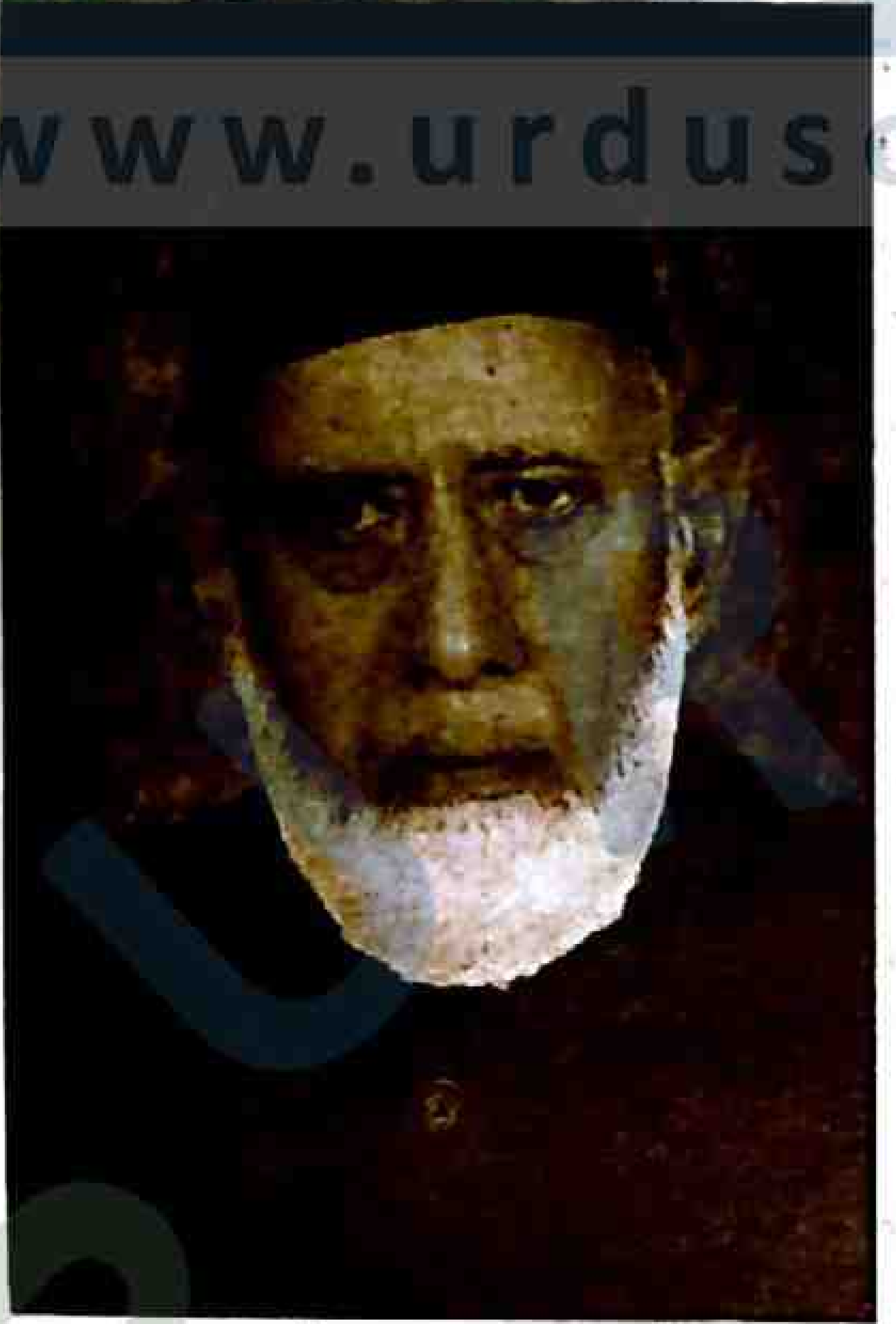

اتنے سازگار پھر بھی نہ تھے۔ مولوی ریاض الدین صاحب نے ایک ایک اینٹ جمع کر کے جناح گرلز کالج کی داغ بیل ڈالی ریاض گرلز کالج سے جناح گرلز کالج اور جناح گرلز کالج سے جناح پوسٹ گریجویٹ گرلز کالج عزم و ہمت کی ایک داستان ہے۔

1998 میں سندھ کے علم دوست گورنر، حکیم محمد سعید شہید نے جناح کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر فائز کیا۔

الحاج مولوی ریاض الدین کی انتھک محنت ٹھکانے لگی۔

لیکن یہ منزل نہیں آغاز سفر ہے۔ کون ہے جو اس شمع کو لے کر آگے چلے؟

☆☆☆

دلی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔ یہ بار بار اجڑی اور بار بار آباد ہوئی۔ کبھی رائے پتھورا، تو کبھی تیمور، کبھی لودھی تو کبھی کیقباد نے اس پر لشکر کشی کی۔ نجانے کیا تھا اس نگری میں کہ یہ سلسلہ کہیں ٹھہرتا ہی نہ تھا۔ کبھی مغلوں نے چڑھائی کی تو کبھی مرہٹوں نے قسمت آزمائی کی۔ ایک قیامت آتی اور ایک جاتی تھی۔ کبھی ابدالی کے سر میں سودا سمایا دلی پر چڑھائی کرنے کا تو کبھی دلی کی شامت اعمال نادر شاہ درانی کی صورت نازل ہوئی۔ کبھی تغلق تو کبھی خلجی اور آخر میں تان گوروں پر ٹوٹی۔ پھر بھی یہ شہر اچھا رہا کہ جس کسی نے اسے لوٹا اسے اپنے ڈھب سے آباد کیا۔ کبھی یہ دہلو کہلایا، کبھی اسے کیلوکھری کا نام دیا گیا، کبھی 'سیری' کے نام سے پکارا گیا۔ کسی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

نے اسے جہان آباد بنایا تو کسی نے اسے تغلق آباد کا نام دیا اور آخر اس کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا، گوروں نے مغلوں کو چلتا کیا اور دلی پر قابض ہوئے اور آخر کار اسے ہندوستانیوں کے حوالے کر کے خود بھی چلتے بنے اور آج یہ شان سے سر اٹھائے، بھارت کا دارالحکومت بنی ہوئی ہے۔

مگر میرا شہر ایسا بدنصیب ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی ہر پل، ہر ساعت، ہر آن اسے لوٹا جا رہا ہے اور اس کی بربادی میں،، ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب ہی دامے درمے قدمے سخنے اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ اس شہر کے قدیم باسی کنارے بیٹھے، بے بسی سے اسے لٹتے دیکھتے ہیں۔ عروس البلاد، شہروں کی دلہن، کا دامن عفت، اپنے پرائے سب ہی تار تار کر رہے ہیں۔ روشنیوں کے اس شہر کو، دہشت، خوف اور نفرت کے اندھیروں میں دفن کر دیا گیا ہے۔

حکومتوں کا تو اس شہر سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ ان کے نزدیک یہ بہت اہم شہر ہے، صرف اس کے ذرائع آمدنی کا سارا حصہ بٹورنے کے اس شہر سے انہیں کبھی کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس شہر کی ضرورتیں اس کے مسائل ان کا مسئلہ ہی نہیں ہیں۔

ملک کے چپے، چپے سے لوگ قسمت آزمائی کے لیے اسی شہر کا رخ کرتے ہیں اور میرا شہر کسی کو مایوس نہیں کرتا لیکن وائے بدنصیبی، اس شہر سے فیض تو سب اٹھاتے ہیں لیکن اسے اپناتا کوئی نہیں۔ اپنی شناخت صرف اپنے آبائی شہروں کے حوالے سے کراتے ہیں، وہ یوں کہ اس شہر کا شناختی کارڈ بنا کر نوکریوں اور تعلیمی اداروں کے داخلے سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ پھر جب وسائل تقسیم ہوں تو ان کا حصہ ان کے آبائی علاقوں کو ملے۔ اور تو اور وہ جنہوں نے اسے اپنی آخری منزل بنایا، جن کے لیے اس کے بعد صرف بحیرہ عرب ہی ہے وہ بھی کچھ عرصہ تو اس کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے پھر وہ بھی اس لوٹ مار میں جٹ گئے۔ میرے شہر کو ہماری ہوس زر، بدذوقی اور بدسلیقگی کھا گئی۔ خوب صورت، قدیم اور تاریخی عمارتیں کھنڈر بنتی گئیں اور ہم دیکھتے رہے۔ ان حسین یادگاروں کو ڈھا کر بھدے، بے ہنگم اور بدنما شاپنگ پلازے اور فلیٹ بنا دیئے گئے۔ قدیم تعلیمی اداروں، اسپتالوں کا حال، بے حال کر دیا۔

میں نے پچھلے مضمون میں میرے شہر کے ان محسنوں کو یاد کیا تھا جن کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ اور ان سے بہت پہلے ''غاصب'' گوروں نے اس شہر کو اپنا سمجھ کر اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ تعلیمی ادارے، اسپتال، بازار، مارکیٹیں، باغیچے، انگریز کا دیا، کیا کچھ نہیں تھا میرے منتخب روزگار، عالم میں انتخاب شہر میں، جسے ہم سب نے لوٹ کر ویران کر دیا۔

ناجائز تجاوزات نے عمارتوں کی خوبصورتی ہی ڈھانک دی۔ آج شاید ہی کوئی، میری ویدر ٹاور، کے قریب سے گزرتے ہوئے نظر اٹھا کر اس عمارت کو دیکھتا ہوگا جو کبھی بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ اگر صفائی ستھرائی کا انتظام ہوتا، عمارتوں اور دیگر تعمیرات کی دیکھ بھال کی جاتی تو بعید نہیں کہ یہ شہر بھی روم اور لندن کے ہم پلہ ہوتا۔

یہی حال طب وصحت کے شعبے میں رہا۔ یہاں کبھی لیڈی ڈفرن، سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ اور سوبھراج جیسے خوب صورت اور معیاری اسپتال ہوا کرتے تھے۔ آج انہیں دیکھ کر کوئی ان اسپتالوں میں اپنے مریضوں کو کبھی داخل نہ کرے۔

خیر یہ تو عادت سی بنالی ہے میں نے اور یہ رونا کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ آج ایسی دو ہستیوں کی بات کرتے ہیں جو کہیں دور دیس سے آئی تھیں لیکن میرے شہر کی ایسی جی جان سے خدمت کی کہ یہاں کے اصلی باسیوں اور وہ جنہوں نے اسے اپنا مسکن بنایا، انہوں نے اس کا عشر عشیر بھی نہ کیا ہوگا۔ میرا شہر جن کا ہمیشہ ہمیشہ احسان مند رہے گا۔

دست عیسیٰ......روح مریم

میرے رب کا کام وہی جانتا ہے۔ مالک کائنات نے اپنی سب سے محبوب تخلیق یعنی انسان کے لیے زمین اور آسمان کی ساری نعمتیں مسخر کر دیں لیکن ساتھ ہی اسے تکالیف اور مصیبتیں بھی دے دیں۔ شاید یہ ہمیں آزمانے کے لیے کہ تکلیفیں اٹھا کر بھی کون ثابت قدم رہتا ہے اور مالک کی بندگی کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

انہی مصیبتوں اور کٹھناؤں میں سے ایک بہت ہی مہیب، تکلیف دہ اور خوفناک بیماری، کوڑھ یا جذام کی ہے۔ کوڑھی بدنصیب اپنے جسم کو گلتے، سڑتے دیکھتا تھا۔ جسم کا گوشت تعفن زدہ ہو جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتا رہتا۔ اپنے بھی اس کے قریب نہیں آتے۔ شہر سے باہر احاطے بنا کر انہیں وہاں سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

ہر شہر میں کوڑھی احاطے ہوتے۔ ان کی روٹی پانی بھی دور سے ہی ان کے سامنے پھینک دی جاتی۔ اس بیماری کو لاعلاج سمجھ لیا گیا اور گویا قدرت سے شکست مان لی۔

لیکن قدرت ہی نے ایسے انسان بھی پیدا کیے جو اپنی عزیمت اور ریاضت سے تقدیر کو بھی شکست دیتے ہیں۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

دراصل ایسے جواں ہمتوں کی پشت پر بھی اسی مالک کا ہاتھ ہوتا ہے جو علیٰ کل شئی قدیر ہے۔

جرمنی کے شہر لائزگ کی رہنے والی، طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والی رتھ کتھرینا مارتھا فاؤ (Ruth Pfao Martha Katherina) نے پاکستان میں جذام کے بارے میں ایک فلم دیکھی۔ وہ ایک مسیحی تبلیغی ادارے سے وابستہ تھیں۔ جرمنی جیسے لاجواب ملک کی شہری، زندگی کی ہر سہولت اور تمام خوشیاں تیاگ کر انہوں نے پاکستان جا کر اور جذام کے مریضوں کی خدمت کا تہیہ کیا اور میرے شہر کراچی کا رخ کیا۔ میرے شہر کو سسٹر رتھ نے اپنا گھر ایسا بنایا کہ پھر لوٹ کر ہی نہیں گئیں۔ سٹی اسٹیشن کے عقب میں میکلوڈ روڈ پر ایک چھوٹا سا مرکز بنایا اور کوڑھیوں کا علاج شروع کر دیا۔

جنہیں ان کے اپنے کوڑھی احاطوں میں پھینک آتے تھے ان کوڑھیوں کو یہ نیک دل سسٹر رتھ فاؤ اپنے ہاتھ سے دوائی دیتی، مرہم پٹی کرتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی۔

ڈاکٹر فاؤ کی نیک نیتی اور محنت کا صلہ مالک نے ایسا دیا اور ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی کہ نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے دیگر حصوں سے بھی جذامی ان کے پاس علاج کرانے آتے رہے۔

ایک اور مہربان ڈاکٹر، آئی کے گل (I.K.Gill) بھی اس مشن میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور میری ایڈیلیڈ لیپروسی سینٹر کی بنیاد ڈالی۔ اس سینٹر میں نہ صرف علاج معالجہ بلکہ سروے اور تحقیق کا کام بھی ہوتا جس کا دائرہ پورے ملک میں پھیل گیا۔ سسٹر رتھ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے 1996ء میں پاکستان کو جذام سے پاک ملک قرار دیا جو کہ ایشیا کے چند اوّلین ممالک میں سے ایک تھا۔

مشرقی جرمنی کے شہر لیزگ پر جب دوسری جنگ عظیم میں روس نے قبضہ کر لیا تو رتھ فاؤ اپنے خاندان کے ساتھ فرار ہو کر مغربی جرمنی آ گئیں اور طب کا پیشہ اپنایا۔ ڈاکٹر فاؤ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھیں اور انسانیت کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنونی ہی ہوتے ہیں جو بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ سن ساٹھ میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بقیہ زندگی پاکستانی عوام کے لیے اور جذام کے خلاف جہاد کے لیے وقف کر دیں گی۔ بتدریج انہوں نے اپنے مشن کا دائرہ کار پھیلایا اور دور دراز علاقوں تک میں بھی نرسنگ کے عملے کی تربیت اور تعلیم کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے پاکستان کے علاوہ جرمنی سے بھی عطیات جمع کیے اور کراچی اور راولپنڈی میں جذام کے اسپتال قائم کیے۔

1988 میں انہیں پاکستانی شہریت دی گئی جو کہ پاکستان کے لیے ایک اعزاز ہے نہ کہ سسٹر رتھ کے لیے۔ 1989 میں انہیں ہلالِ پاکستان کے اعزاز سے نوازا گیا۔ 2000 میں ڈاکٹر رتھ نے نیشنل لیپروسی کنٹرول پروگرام شروع کیا جس میں جذام کے علاوہ ٹی بی کے مریضوں کا بھی علاج ہوتا ہے۔ 14 اگست 2010ء کو انہیں پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز ''نشانِ قائداعظم'' عطا کیا گیا۔ پاکستان کے علاوہ دنیا جہاں سے انہیں اعزازات سے نوازا گیا مگر دکھی دلوں کی دعا سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

سسٹر رتھ فاؤ بہرحال خوش نصیب ہیں کہ ان کی خدمات کا ان کی زندگی میں اعتراف کیا گیا لیکن ایک گورا غریب ایسا بھی ہے جو ہمارے حاکموں کے ساتھ آیا تھا اور میرے شہر سے اس کی محبت کی نشانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں لیکن اس بے چارے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا نہ یہ پتا کہ وہ کب پیدا ہوا اور کب دنیا سے رخصت ہوا، کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔

این ای ڈی کالج کے سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک جو پاکستان چوک سے جا ملتی تھی، یہ پہلے اس کے نام پر تھی لیکن اب شاید یہ بھی اس کے نام پر نہیں ہے۔ کہاں گیا شاعر جو کہتا تھا۔

''نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا''

میں تو نہیں جانتا، آپ مجھے بتائیں کہ کیا آپ نے ''جیمز اسٹریچن'' کے نام سے کوئی یادگار دیکھی ہے۔ مجھے تو اس کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا، بہت سر مارا پر اس کی تصویر تک انٹرنیٹ پر نہ مل سکی اور تو اور جس بلدیہ کراچی کا یہ میونسپل انجینئر اور سیکریٹری تھا ان کی آرکائیوز پر بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ انجینئر جو میرے شہر کو لندن کی طرز پر ترقی دینا چاہتا تھا۔ آپ دانتوں تلے انگلیاں داب لیں گے اگر میں اس کی خدمات کا حال بتانے بیٹھ جاؤں۔

ہم نے تو جو اس کے ساتھ کیا۔۔۔ سو کیا، یہ دیکھیں کہ اس نے میرے شہر کے ساتھ کیا کیا۔

1873ء میں اسے میرے شہر کا میونسپل انجینئر اور سیکریٹری ''لگایا'' گیا۔ یہ جیمز اسٹریچن سخت قابلِ منتظم، منصوبہ ساز،

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ڈیزائنر اور انجینئر تھا۔ عہدہ سنبھالتے ہی اس نے بے شمار ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔

میرا شہر جو اس سے پہلے ماہی گیروں کی ایک بستی اور بنیادی سہولیات سے محروم تھا۔ شہر میں پانی گدھا گاڑیوں اور گدھوں کی پیٹھ پر لدے مشکیزوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا تھا۔ جیمز نے سیمنٹ اور لوہے کے پائپوں کے ذریعے پانی کی فراہمی کا منصوبہ بنایا۔ حکومت نے جو رقم مختص کی وہ بہت کم تھی۔ جیمز نے احتجاج کیا اور مطلوبہ رقم لے کر ہی رہا۔ پانی کی فراہمی کا ایسا نظام بنایا کہ یومیہ فی شہری 45 گیلن پانی ملنے لگا۔

انہی دنوں میرے شہر میں ہیضے کی وبا پھیلی۔ گندے پانی کی نکاس کا کوئی نظام نہ تھا اور یہ اس مرض کا سب سے بڑا سبب تھا۔ جیمز نے میرے شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا، حفظان صحت کے حوالے سے میرے شہر پر یہ جیمز کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔

جیمز نے بجلی اور ٹیلی فون کی لائنیں بچھانے کا منصوبہ بھی شروع کیا جو اس کے عہد کے بعد جا کر مکمل ہوا۔ جیمز اسٹریچن نے ٹراموے کا باقاعدہ نظام قائم کیا اور کراچی موٹر ٹراموے کمپنی کا آغاز کیا جسے ستّر کی دہائی میں میرے شہر کے کرتا دھرتاؤں نے ختم کر دیا۔

شہر کی مرکزی، ایمپریس مارکیٹ، بھی جیمز کا کارنامہ ہے جسے ہم سب نے مل کر ایک کوڑے خانے میں تبدیل کر دیا۔

میری ویدر ٹاور کی خوب صورت اور دیدہ زیب عمارت، ٹاور کا علاقہ جس کے نام سے جانا جاتا ہے، جیمز کی ماہرانہ صلاحیت کا شاہکار ہے جسے ہم نے اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ ہم اسے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔

جیمز اسٹریچن کو گوتھک، اطالوی اور راجھستانی طرز تعمیر میں مہارت حاصل تھی۔ سندھ کا مشہور، گذری اسٹون اس کا پسندیدہ تھا اور اکثر عمارتوں میں یہی پتھر نظر آئے گا۔

ڈی جے کالج، جسے اٹالین طرز پر تعمیر کیا گیا، سندھ مدرسۃ الاسلام، اسلامی اور راجھستانی طرز تعمیر پر بنایا گیا، البتہ اس کا ایک مینار گوتھک طرز پر تعمیر کیا گیا۔ یہ سب جیمز کی تعمیری صلاحیت کے مرہونِ منت ہیں۔

میری ویدر ٹاور سے متصل ہر مزجی، جمشید جی، رستم جی، بلڈنگ، ڈینسو ہال، ایڈولجی ڈنشاہ ڈسپنسری اور لیڈی ڈفرن اسپتال اور نجانے کتنی خوبصورت عمارتیں، جیمز کی میرے شہر سے محبت کا ثبوت ہیں۔

جیمز نے جس انداز میں شہر کا نقشہ بنایا، جس طرز کی عمارتیں تعمیر کیں اور جو منصوبے جاری کیے اگر ان کا تسلسل رہتا اور ان کی مناسب دیکھ بھال کی جاتی تو آج میرا شہر روم اور لندن جیسے شہروں کا ہم پلہ ہوتا لیکن ہم نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ خوبصورتی، سلیقہ اور صفائی ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ آپ حسین سے حسین عمارت تعمیر کر کے دیکھ لیں، سال کے اندر اندر ہم اسے پان کی پچکاریوں، مایوس مریضوں کے لیے خوش خبری کے اشتہاروں، سیاسی نعروں سے مزین کر دیں گے۔

آنجہانی کاؤس جی ساری عمر کڑھتے رہے، اس شہر کے پرانے نوحہ گر، امر جلیل، اکثر اس کا مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک کمزور سی عورت یاسمین لاری نے بچے ہوئے سنگ سمیٹ کر دل ریزہ ریزہ کو جوڑنے کی کوشش کی۔ ان کی سعی کے نتیجے میں کئی عمارتوں کو قومی ورثہ قرار دیا گیا لیکن میرے شہر کی اکثریت یا تو اس کی بربادی میں اپنا حصہ ڈال رہی ہے یا لب بام بیٹھی محو تماشا ہے۔

کیا کسی اور جیمز اسٹریچن کے لیے ہمیں پھر انگریز کا انتظار ہے۔

☆☆☆

ابن مریم ہوا کرے کوئی...

روح افزا پیتے ہوئے بچے نے سوال کیا، انّو یہ روح کیا ہوتی ہے؟ میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سوال میرے لیے آسان بناتے ہوئے کہا کہ یہ جو ہم کہتے ہیں روح کو سکون مل گیا، روح کو خوشی ہوئی اس کے کیا meanings ہیں؟

عزت پر بن آئی تھی۔ مجھے تو اپنے وجود کی meaning اور purpose کا پتا نہیں۔ بہرحال کچھ تو بات بنانی تھی اپنی اولاد سے اپنی نالائقی چھپانے کے لیے۔

میں نے کہا بیٹا جب تم کسی کے کام آتے ہو اور کسی کو سکھ پہنچاتے ہو اور اس میں تمہارا اپنا کوئی فائدہ نہ ہو تو تمہیں ایک خوشی اور سکون کا احساس ہوتا ہے جو کہ physically محسوس نہیں ہوتا لیکن اندر کہیں ایک اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اسی کو روح کی خوشی کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

نہ جانے وہ کیا سمجھا اور کیا نہیں لیکن مجھے اپنے جواب پر سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جس سرخوشی اور طمانیت کی بات کی تھی وہ مجھے اپنی زندگی میں تو کہیں نظر نہ آئی کہ میری ساری زندگی کی تگ ودو اور سوچ بچار صرف اور صرف اپنی ذات تک ہی محدود

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

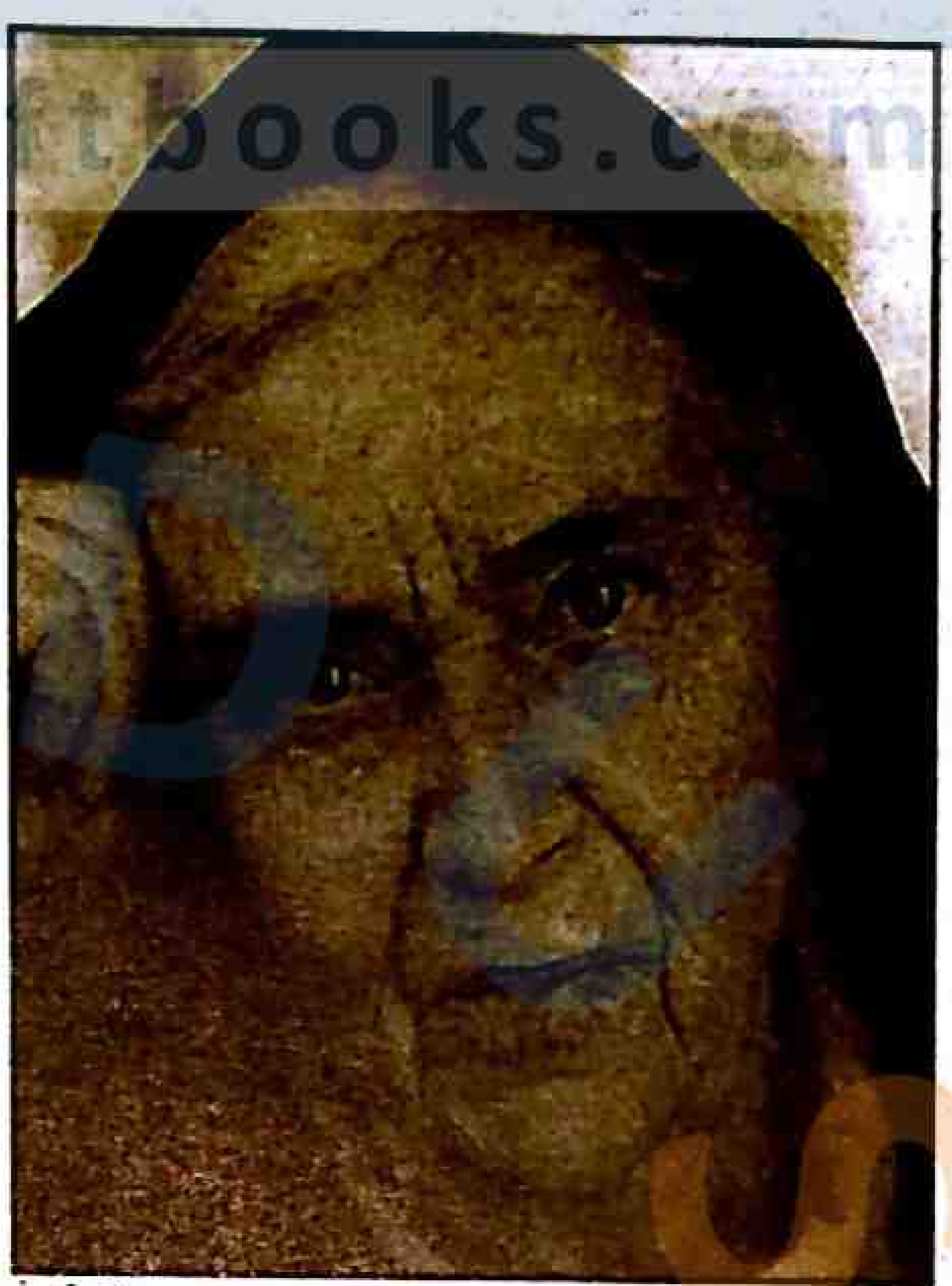

رہی۔ یہ احساس طمانیت تو ان کو ملتا ہوگا جو اپنی ذات کی نفی کر کے صرف مخلوق خدا کے لیے سوچتے اور جیتے ہوں گے جیسے انبیائے کرام یا کسی درجے میں اولیا اللہ۔ یا پھر وہ موجدین اور محققین جو انسانیت کے لیے آسانیاں تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یا پھر وہ جو لوگوں کے دکھ درد کا مداوا کرتے ہیں جیسے اپنے ایدھی صاحب، جیسے مدر ٹریسا، جیسے Ruth Madame Pfao یا جیسے Florence Nightingale.

ہمارے وہ معالجین اور جراح بھی اس کیفیت سے گزرتے ہوں گے جب وہ اپنی مسیحائی سے کسی کی تکلیف کم کرتے ہیں۔ کسی کے دکھ کا درماں کرتے ہیں۔

میرا شہر جہاں ہزار ہا دکھوں کی آماجگاہ ہے وہیں اللہ نے اس شہر کو ایسے چارہ گر بھی بخشے کہ وہ شہر تو کیا تمام عالم میں اپنا نام کر گئے۔

یہ وہ ہیں جو یہ راز جان گئے کہ خالق کی رضا کے لیے اس کی مخلوق سے پیار کرنا چاہیے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

لیکن سب سے سادہ اور سب سے بڑی بات میں نے کراچی کی بسوں میں ایک مانگنے والے سے سنی جو کہہ رہا تھا

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

اگر نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے تو پھر اس کا راستہ اس کے بندوں سے حسن سلوک اور ان کی خدمت ہی کے ذریعے طے پائے گا۔

آج میں ان مسیحاؤں اور چارہ گروں کو آپ سے ملا کر یاد کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیت اللہ کے بندوں کی تکالیف اور دکھ درد دور کرنے میں لگا دیں۔

میرے یہ تاثرات ایک عام شہری کے احساسات ہیں جو ان شخصیات کو ان کی عمومی شہرت کے حوالے سے جانتا ہے۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں دیگر معاملات پر کوئی تحقیق نہیں کی ہے نہ مجھے ان سے کوئی سروکار ہے۔ بدقسمتی سے مجھے ان کی پیشہ وارانہ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ نہیں معلوم اور اکثر کی تصاویر بھی نہیں مل سکیں اگر کوئی دوست ان کی تصاویر مہیا کر دیں تو ممنون رہوں گا۔

تاثیر مسیحائی کی میری عمر اس وقت دس بارہ سال کی تھی۔ میرے ایک عزیز کا بیٹا جو میرا ہی ہم عمر تھا، ایک حادثے میں شدید زخمی ہو کر جناح اسپتال میں پڑا تھا۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اسے دیکھنے گیا تھا۔

میرا مسئلہ ہے کہ میں عیادت اور تیمارداری کے لیے تو پہنچ جاتا ہوں لیکن مجھ سے مریض یا مجروح کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جیسے ہی مجھے اس کی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے میری اپنی حالت بگڑ جاتی ہے اور پھر لوگ باگ مریض کے بجائے مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔

اسپتال کے اس وارڈ میں سارے مریض دماغی چوٹوں کے مریض تھے اور اکثر کی حالت بہت بری تھی۔ میرے عزیز کا سر بھی پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور آس پاس دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہونے لگا۔ میں ماں کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ مجھے سرد پسینے چھوٹ رہے تھے اور جی بری طرح متلا رہا تھا۔ میں جیسے تیسے وارڈ سے نکل کر ایک کوریڈور میں چلنے لگا تاکہ کہیں ایسی جگہ مل جائے جہاں قے کر سکوں۔ اچانک زور سے چکر آیا اور میں سر پکڑ کر ایک دیوار کے سہارے نیچے بیٹھ کر ابکائیاں لینے لگا۔ شاید مجھے قے ہو گئی تھی کہ ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک مرد اور عورت کی آوازیں سنائی دیں۔ مرد شاید مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا ہو گیا ہے تم کو پھر اس نے عورت جو نرس تھی اس سے کہا کہ چھوکرے کو اندر لاؤ۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ مرد ڈاکٹروں والے سفید کوٹ میں تھا اور جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ میں شرمندہ سا چوروں کی طرح نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے نرس سے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کچھ کہا اور وہ پلک جھپکتے میں ایک چھوٹا سا تولیہ اور ایک پلاسٹک کی تھیلی میں برف لے آئی۔ نرس نے میرا چہرہ صاف کیا اور ڈاکٹر میرے چہرے پر برف ملتے ہوئے جھلایا ہوا کچھ انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ کھردرا اور آواز میں درشتگی تھی لیکن میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈک اور روئی جیسی نرمی تھی۔

اس نے جلدی میں مجھ سے کہا کہ باہر بیٹھو اور واپس وارڈ میں مت جانا۔

میں شرمندہ سا باہر آیا اور اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ مجھے جانا کہاں ہے۔ ڈاکٹر اور نرس میرے پیچھے کمرے سے نکلے اور تیزی سے کہیں چلے گئے۔ میں نے یوں ہی نظر اٹھا کر دروازے کے ساتھ لگی نام کی تختی پر نظر ڈالی جہاں لکھا تھا۔

سینئر ڈاکٹر، سرجن او وی جمعہ

نیچے بہت سارے حروفِ تہجی لکھے ہوئے تھے جو دو سے زیادہ سطروں میں تھے۔

میرا وہ عزیز جانبر نہ ہوسکا۔ میں پھر ماں کے ساتھ اس کے گھر پرسہ دینے گیا اور جیسا کہ ہماری خواتین کا دستور ہے وہ متوفی کے آخری لمحات کی پوری روداد تفصیل سے بتاتی ہیں۔ میں بھی وہیں بیٹھا سن رہا تھا۔ ایک جملہ شاید دو بار بولا گیا وہ تھا۔ ”حالانکہ ڈاکٹر جمعہ نے آپریشن کیا تھا، پھر بھی نہ بچ سکا۔“

یہ ”حالانکہ“ اس اعتماد اور شہرت کا ترجمان تھا جو سرجن جمعہ سے منسوب تھی۔

اس کے بعد میں اکثر و بیشتر اخبارات میں پڑھتا رہتا کہ سرجن جمعہ بیرونی دورے سے واپس آگئے یا بیرونی دورے پر جا رہے ہیں۔

میرے شہر والے جانتے ہیں کہ سرجن جمعہ کیا تھے اور کس قدر قابلِ بھروسا تھے انہیں ایک اساطیری (legendary) حیثیت حاصل تھی۔

ہم جس سے عقیدت رکھتے ہیں اس کے بارے میں ہر اچھی بات پر یقین کرلیتے ہیں اور لوگ بات کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں زیبِ داستاں کے لیے۔

مجھے علم نہیں اس بات میں کس قدر صداقت ہے کہ سرجن جمعہ کا ایک بیٹا شدید زخمی حالت میں ان کے اسپتال لایا گیا لیکن وہ ایک اور ایمرجنسی آپریشن میں مصروف تھے اور اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا اور وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر رشید جمعہ ان کے صاحبزادے اس وقت محکمۂ صحت کے بہت بڑے عہدے پر ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ اپنے نامور والد کے مقابلے میں ان کی شہرت کیسی ہے۔

یہ تو مجھے میرے شہر والے ہی بتائیں گے۔

دستِ عیسیٰ

میرے کالج میں دو بھائی پڑھا کرتے تھے۔ ایک میرا ہم جماعت تھا اور بڑا اگلی کلاس میں تھا۔ دونوں بھائی کھیلوں میں بہت اچھے تھے اور کرکٹ، ہاکی اور ٹیبل ٹینس کی ٹیموں میں شامل تھے۔

دونوں بھائیوں کے چہرے کچھ لمبوترے سے تھے اور کوئی انہیں رنگیلا برادرز اور کوئی کسی اور نام سے انہیں چھیڑتا تھا۔

مجھے کسی نے بتایا کہ ان دونوں بھائیوں اور ان کے سارے اہلِ خانہ نے اپنی آنکھیں عطیہ کردی ہیں۔ یقین جانیے اس دن کے بعد سے مجھے وہ دونوں سب سے زیادہ حسین و جمیل لگنے لگے۔

ان لڑکوں ہی سے پتا چلا کہ اس کی ترغیب انہیں سرجن ایم ایچ رضوی نے دی تھی۔ سرجن، ڈاکٹر رضوی کراچی میں آنکھوں کے مشہور اسپتال اسپنسر آئی اسپتال کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے نجانے کتنی آنکھوں کو روشنی بخشی۔

شاید پاکستان کا پہلا آئی بینک بھی انہی کی مساعی سے عمل میں آیا۔ ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں تو ان کے کیمپ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

لگتے ہی تھے لیکن انہیں اکثر بیرونِ ملک بھی بلایا جاتا تھا۔

اسپنسر آئی اسپتال کو انہوں نے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔

لیکن اب سننے میں آیا ہے کہ مریض اسپنسر اسپتال کا نام سن کر خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔

ہم نے اپنے مشاہیر کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ اس کا غماز ہے کہ

ہم زندہ قوم ہیں!

یعنی مردوں کی نشانی کو مٹا دیتے ہیں

تیرے آزار کا چارہ نہیں ہے نشتر کے سوا

☆......☆

ہماری قوم کا ایک مرغوب مشغلہ ہے ملک کے مسائل کا حل تجویز کرنا۔ ہم میں سے ہر کوئی آئینی، پارلیمانی، قانونی، سیاسی اور دینی مسائل پر اپنی ایک صائب، رائے رکھتا ہے۔

ہم چند دوست بھی اپنی منڈلی میں بیٹھے، ایک قومی حکومت تشکیل دینے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور ایسے ناموں کی تلاش میں تھے جو عوام میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ غیر متنازعہ بھی ہوں۔ یہ بڑا ہی کٹھن کام تھا کہ پاکستان کے آٹھ دس نیک نام لوگوں کے نام تلاش کیے جائیں۔ سب سے پہلا نام جو تجویز ہوا وہ بالکل غیر متنازعہ تھا یعنی عبدالستار ایدھی صاحب کا لیکن چونکہ انہیں رموزِ مملکت سے شناسائی نہیں ہے چنانچہ انہیں بالاتفاق نااہل قرار دے دیا گیا۔

کچھ نام جو اس وقت معتبر تھے اب متنازعہ ہوچکے ہیں جیسے اپنے فخرو بھائی۔ ایک نام جسٹس مفتی تقی عثمانی صاحب کا تھا۔

ایک دوست نے سرجن ادیب رضوی کا نام لیا۔ میں تقریباً چالیس سال سے ملک سے باہر ہوں اس لیے یہ نام کچھ اجنبی لگا۔ میں نے ادیب سہارنپوری اور میرزا ادیب کے نام تو سنے تھے لیکن سرجن ادیب رضوی کے نام سے ناواقف تھا۔

بعد میں پتا چلا کہ اس مسیحا صفت شخص نے نجانے کتنوں کو دوسری زندگی عطا کی۔ اعضاء کی پیوندکاری اور خاص کر گردوں کی پیوندکاری سے کتنے گھروں کے چراغ روشن رکھے۔

نہ صرف ایک معالج بلکہ ان کی بے شمار سماجی اور فلاحی خدمات ہیں اور بجا طور پر حکومت نے نوبیل انعام کے لیے ان کے نام کی سفارش کی تھی۔

نوبیل تو انہیں نہ مل سکا جس سے ان کی قدر و قیمت میں

کوئی کمی نہیں آئی البتہ نوبیل والوں کی قدر ضرور کم ہوئی۔

شاید نوبیل والوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ ان کے اپنے شہر میں صرف مسلکی وابستگی کی بناء پر ان کے نام کے بورڈ پر رنگ پھیر دیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے ایک نوبیل پانے والے کو ہم پاکستانی نہیں بلکہ اس کے مسلک کی بناء پر مسترد کر چکے ہیں۔ دوسری کو امریکی ایجنٹ کہہ کر ہو لیے ہیں لیکن خود کو کسی شعبہ میں منوانے کی کبھی کوشش نہیں کی ہے۔

☆☆☆

میرے ہم عمروں کو یاد ہوگا کہ ریڈیو اور ٹی وی ہماری زندگی میں کیا مقام رکھتے تھے۔ کیا کچھ معیار تھا زبان و بیان کا اور کیا کچھ ہم سیکھتے تھے اور کس قدر عظیم تھے وہ فنکار جو ہمارے ذوق، ہماری تہذیب کی آبیاری کرتے تھے۔

دنیا میں طرح طرح کے فن اور قسم قسم کے فنکار ہیں، شوبز فن کا وہ شعبہ ہے جو ہمارے دل و جاں سے قریب تر ہے۔ شاید ہی کوئی ہو جو کسی فن اور کسی فنکار سے متاثر نہ ہو۔ بہت سے اداکار، گلوکار، صداکار ایسے ہیں جنہیں "لاکھوں دلوں کی دھڑکن" کہا جاتا ہے۔ کچی عمر کے لڑکے، بالیاں جنہیں اپنے خوابوں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر فلموں اور ڈراموں کے ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں لیکن ان کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ادھر شباب کی ندی اتری ادھر یہ بھی دل سے اترتے گئے۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

۔کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے کردار ہیں جو میرے آپ کے گھروں میں ہوتے ہیں اور جب یہ پردے پر نظر آتے ہیں تو لگتا ہے کہ اپنا ہی کوئی ہے۔ ان سے مرعوب نہیں ہوا جاتا بلکہ محبت کی جاتی ہے۔

آج ایسی ہی کچھ ہستیوں کا ذکر ہے جنہیں ہمیشہ ہم نے اپنے دل میں پایا۔ جو ہمیشہ اپنے اپنے سے لگے۔ آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو ایک زمانہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

کوئل کی کوک

السلام علیکم بچو! السلام علیکم بھائی جان!

اور اس کے ساتھ ہی ایک کھلکھلاتی، کھنکھناتی، کلکاریاں مارتی بچی کی آواز گھر میں ایسے گونجتی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

جی ہاں یہ ہم سب کی محبوب، منی باجی کی آواز ہوتی تھی اور پروگرام ہوتا تھا، بچوں کی دنیا جس کا نام پہلے کبھی نونہال ہوا کرتا تھا۔

بچوں کا یہ پروگرام بڑوں کا بھی پسندیدہ ہوتا تھا۔ پہلے پہل عبدالماجد اور پھر ظفر صدیقی اس کے بھائی جان بنے۔ پروین اختر، یعنی منی باجی البتہ شروع سے آخر تک منی باجی ہی رہیں جو چھوٹے بڑے ہر ایک کی محبوب تھیں۔ چھوٹے انہیں اپنوں میں جانتے تھے اور بڑے انہیں ایک پیاری سی بچی سمجھتے تھے۔

غیر منقسم ہندوستان کے پُر فضا پہاڑی مقام، شملہ میں پیدا ہونے والی منی باجی تاحیات مجرد رہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی مقصود۔ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، بھی کوتاہ قد اور بچوں کی سی آواز رکھتے تھے اور آخر عمر تک ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ رہے۔ مقصود کا ایک مقبول پروگرام ''ٹائنی ٹاٹ'' ہوا کرتا تھا جس کا ٹائیٹل سانگ بھی انہی کی آواز میں تھا۔ افسوس کے بہت کوشش کے باوجود بھی منی باجی کی آواز کا کوئی ریکارڈ نہ مل سکا نہ ہی مقصود کے ٹائنی ٹاٹ کی کوئی ریکارڈنگ محفوظ ہے۔

تقسیم سے قبل، بہزاد لکھنوی کے توسط سے منی باجی دہلی ریڈیو سے وابستہ ہوئیں۔ آزادی کے بعد کے دو سال شہر زندہ دلاں لاہور میں گزارے پھر کراچی چلی آئیں جہاں ان کے گھر والوں نے ریڈیو پاکستان کراچی کے عقب میں، رتن تلاؤ کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ منی باجی کے ابا ریڈیو پاکستان کی کینٹین چلاتے تھے اور جب عمر کی نقدی ختم ہونے آئی تو اپنی بیٹی پروین اختر اور بیٹے مقصود کو یہ کینٹین سونپ دی۔ بابائے نشریات زیڈ اے بخاری کی نظر سے ایسا گوہر بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا، چنانچہ منی پھر ریڈیو پر واپس آئیں اور پینتالیس سال تک ان کی کھلکھلاتی ہنسی اور کوئل جیسی آواز ہمارے کانوں میں مٹھاس انڈیلتی رہی۔

منی باجی ساٹھ، ستر کی عمر تک پہنچ کر بھی منی ہی رہیں اور لوگ آخر تک انہیں ایسے ہی چاہتے رہے۔ اب تو کان ترستے ہیں ایسی میٹھی، جلترنگ کی سی آواز سننے کے لیے۔

لکھنوی بوا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

خالہ عرش منیر البتہ ہمیشہ بزرگ ہی رہیں کہ ہم نے جب بھی سنا اور دیکھا تو ہمیشہ ایک تیز طرار بڑی بی کا ہی تصور ابھرا لیکن خالہ جس روپ میں بھی آئیں ہمیشہ محبوب رہیں۔ ٹی وی اسکرین پر حسین ترین چہروں کے درمیان، سفید چونڈی اور پان کی سرخی آلود دانتوں والی اس بوا پر سے نظر ہی نہ ہٹتی کہ جب وہ بولتیں تو لگتا کہ گھر کی دادی یا بوا چوکی پر بیٹھی، چھالیا کترتے ہوئے، چھوٹوں کو ڈانٹ پھٹکار کر رہی ہیں۔

خالہ کی زبان اودھ کے دریاؤں کی دھلی ہوئی، اور ان کے تیز لہجے کے باوجود دلنشین تھی اور ہوتی کیوں نا؟ لکھنوی بوا اپنے وقت کے صاحب طرز اور عظیم مزاح نگار اور ادیب، شوکت تھانوی کی بیگم جو تھیں۔

عرش منیر اور شوکت تھانوی دونوں نے آل انڈیا ریڈیو سے صداکاری کی۔ پاکستان آنے کے بھی دونوں ریڈیو سے

وابستہ رہے۔ خالہ نے پھر ٹی وی پر بھی کام کیا۔ ریڈیو پر ان کا ڈراما جس میں ان کا مکالمہ ''دھابے جی آئے تو بتا دینا'' بہت سوں کو یاد ہوگا۔ کراچی ریڈیو سے طویل ترین عرصہ تک چلنے والے اور مقبول ترین پروگرام ''حامد میاں کی ہاں'' میں عرش منیر اکثر و بیشتر اپنی آواز کی دھنک بکھیرتیں۔

ٹیلی ویژن پر بے تحاشا ڈرامے کیے، جس میں خدا کی بستی، شمع، افشاں اور نجانے کتنے ڈرامے ہیں۔ بہت سوں کو اطہر شاہ خان عرف جیدی کے ''آنٹی فلاور باڈی'' یعنی خالہ گلبدن یاد ہوں گی۔

ہر گھر میں ایک ایسی بوا ہوتی ہیں اور خالہ اسی لیے ہر ایک کو اپنی ہی لگتی تھیں اگر ہم میں سے کسی کو وہ کہیں نظر آجاتیں تو کیا ہم انہیں خالہ یا بوا سلام نہیں کہتے۔ ہماری بوا بھی تو ایسی ہی تھیں۔

ٹھسے والی عورت

ٹھسے والی، یہ لفظ بہت پڑھا لیکن معنی سمجھ تب آئے جب اکا بوا کو اسکرین پر دیکھا۔

لکھنؤ کی مسلم تہذیب کا مرقع، شائستگی کا مجموعہ، ایک دور، ایک تہذیب اور ایک طرز زندگی کی نمائندہ، بیگم خورشید مرزا، المعروف اکا بوا کو دیکھ کر بیک وقت، احترام، ادب اور ساتھ ہی محبت کے جذبات ابھر آتے۔ کبھی وہ ایک سخت گیر سربراہ خاندان کے کردار میں نظر آتیں تو کبھی ایک شفیق بزرگ کی سی مسکراہٹ بکھیرتیں۔ جس روپ میں بھی آتیں دلوں پر چھا جاتیں اور پھر اسکرین پر ان کے علاوہ کسی پر نظر ہی نہ ٹھہرتی۔

علیگڑھ مسلم گرلز کالج کے بانی، شیخ عبداللہ کی زمانہ ساز، اپنے دور کے مروجہ رسوم و رواج سے ہٹ کر چلنے والی بیٹیاں، یعنی رشید جہاں، انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے ایک مشہور عالم رسالے انگارے کی شریک مصنفہ اور دوسری خورشید جہاں، جو اس وقت رینوکا دیوی کے نام سے فلموں

میں جلوہ گر ہوئیں جب، تعلیم یافتہ، مسلمان خواتین اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

بیگم خورشید مرزا نے کئی ریڈیو پروگراموں کی میزبانی بھی کی لیکن شہرت انہیں ٹی وی ڈراموں سے ملی۔ افشاں، کرن کہانی، زیر زبر پیش، انکل عرفی، پرچھائیاں، انا، ماسی شربتے اور نجانے کتنے ڈراموں میں اداکاری کی لیکن ان کے نام سے کم ہی واقف ہیں البتہ اکا بوا کو ہر کوئی جانتا ہے۔

علیگڑھ سے کراچی آکر اودھ کی تہذیب کے رنگ بکھیرے آخر کار شہر زندہ دلان لاہور میں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئیں اور ایک عہد، ایک زمانہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

ڈھونڈ انہیں اب چراغ رخ زیبا لے کر۔

☆☆☆

میرا شہر، عالم میں انتخاب، کبھی ایک بہت پُرسکون شہر ہوا کرتا تھا۔ یوں نہیں تھا کہ یہاں آبادی نہ تھی اور لوگوں کی چہل پہل نہ تھی۔ میں نے تو ہمیشہ یہاں رونقیں ہی دیکھیں۔ بڑے سے بڑا سانحہ یا واقعہ ہو، میرے شہر میں زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ ان دنوں بھی جوڑیا بازار، بولٹن مارکیٹ، صدر اور بوہری بازار میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا لیکن ٹریفک اس قدر بے ہنگم نہیں تھا۔ رکشا اور منی بسوں کی ایسی ریل پیل نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر ان منحوس گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں نہیں تھیں جن سے میرا پورا ملک گونج رہا ہے۔ آدمی کو آدمی کا ڈر نہ تھا۔ بازار میں چلتے ہوئے جان کا خوف نہیں تھا، دن دہاڑے مال ومتاع لٹ جانے کی فکر نہ تھی۔

اس وقت بھی یہ زندگی سے بھرپور، روشنیوں کا شہر تھا جہاں ملک کے کونے کونے سے لوگ آنکھوں میں خواب سجائے آتے اور ان کی تعبیریں پاتے تھے۔ میرے شہر نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔

ہم ہمیشہ شہر کے مضافات میں رہے جہاں زندگی عموماً پُرسکون ہوا کرتی تھی۔ پڑوسی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے محلے کی مائیں سب کی خالہ ہوا کرتی تھیں۔ بزرگ چاہے دوسرے محلے کے ہوں انہیں آتا دیکھ کر ہم کھیل روک دیتے اور انہیں گزرنے دیتے۔ سگریٹ پینے والے اپنی سگریٹ چھپا لیتے۔ بسوں میں نوجوان، عمر رسیدہ لوگوں کے لیے نشست خالی کر دیتے۔

اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ کیسے مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف قوموں و مذہب و مسلک کے لوگ باہم شیر و شکر رہتے تھے۔

بہار کالونی میں جہاں ہم سب سے پہلے رہے، ہمارے ہمسایہ ایک عیسائی خاندان تھا۔ ہم کرائے پر رہتے تھے۔ مکان کے نچلے حصے میں کبھی میمن تو کبھی پنجابی کرایہ دار رہتے۔ سامنے کے گھروں میں ایک گھر کچھی میمن، جن کے پڑوس میں ایک بوہری خاندان رہتا تھا۔ اگلا گھر امروہے کے سادات کا تھا جہاں مجالس عزا منعقد ہوتیں۔ اس سے جڑے ہوئے مکان میں حیدرآبادی اور آخری مکان ایک پشتون خاندان کا تھا۔

گورنمنٹ اسکول بہار کالونی میں ہمارے ساتھ، اوروں کے علاوہ شیدی، مکرانی، بلوچ اور یہاں تک کہ کچھی ہندو بھی پڑھتے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کی ایک جوڑی بڑی مشہور تھی۔ نام تو جانے ان کا کیا تھا مگر وہ بنگالی اور بہاری ڈاکٹر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

غرض یہ کہ لانڈھی، کورنگی، بہادرآباد سوسائٹی، گلشن اقبال جہاں کہیں ہم رہے پاس پڑوس اور محلے میں، بنگالی، پٹھان، پنجابی، رانگڑ راجپوت، کاٹھیاواڑی، بوہری، خوجے، بلتی، شیدی، بلوچ یہاں تک کہ سوسائٹی میں ہمارے دوست انڈونیشی بھی تھے۔ کالج میں زنجباری، ایسٹ افریقن، عرب لڑکے ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ پارسی طلبہ تو ہمارے کالج کی شان تھے اور امتحانوں میں اکثر ہمارے کالج کی پارسی لڑکیاں پوزیشن حاصل کیا کرتیں۔

خیر یہ ایک لمبی کہانی ہے، اس دور کی رواداری اور بھائی چارے کی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ مجموعی طور پر راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ اور ہوا کے دوش پر ایک آواز ایسی تھی جو اس سکوت کو توڑنے کے باوجود خوش کن لگتی تھی اور وہ تھی ریڈیو کی آواز۔

بھلے دنوں میں وقت گزاری کا سب سے بڑا سہارا ریڈیو ہی تھا ریڈیو رکھنا بھی ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا۔ لیکن بقول فراز

"ہوا کسی کی نہیں"

ہوا کی لہروں کے دوش بدوش پاس پڑوس کے لوگ بھی اس سے مستفید ہوتے۔ ہوٹلوں، چائے خانوں اور دکانوں پر سارا دن فلمی گانے اور خبریں وغیرہ با آواز بلند جاری رہتے۔ یاد ش بخیر، سن ساٹھ کے ابتدائی سالوں کی بات ہے ہمارے محلے کے ایک درزی کی دکان پر کرکٹ کی کمنٹری چلتی رہتی۔ محلے کے لڑکے ایک بورڈ پر تازہ ترین اسکور لکھتے رہتے، کوئی راہگیر رک کر پوچھتا کہ حنیف کی سنچری ہوگئی یا فضل کی کتنی وکٹیں ہوئیں۔

ہمارے معمولات بھی ریڈیو پروگرام کے مطابق طے پاتے۔ بارہ بجے کمرشل سروس کا میوزک سنتے ہی میں اپنا بلّہ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سنبھال اسکول کی راہ لیتا کہ لڑکوں کے اسکول دوپہر ساڑھے بارہ بجے شروع ہوتے تھے۔

ریڈیو کے شوقین صرف ایک ہی اسٹیشن پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ ان دنوں اچھے ریڈیو کو جانچنے کا پیمانہ صرف یہ تھا کہ اس پر "سیلون" صاف سنائی دیتا ہو۔

ریڈیو سیلون سے صبح سویرے پرانے گیت اور بدھ کی شام کو بناکا گیت مالا کے علاوہ آکاش وانی دلی، ایران زاہدان اور ریڈیو جنوبی ایشیا کے علاوہ خبروں کے لیے بی بی سی بھی بڑے شوق سے سنے جاتے تھے۔

لیکن یہ اسٹیشن خاص پروگراموں کے لیے تھے۔ ہمارا اپنا ریڈیو پاکستان، کراچی اتنے دلچسپ اور متنوع پروگرام پیش کرتا کہ آج بھی کانوں میں وہ آوازیں گونجتی ہیں۔

کراچی ریڈیو کی خوش قسمتی کہ اسے زیڈ اے بخاری جیسا براڈ کاسٹر اور منتظم ملا۔ اس کے علاوہ ایک سے ایک نادر روزگار صداکار، لکھنے والے، موسیقار، گلوکار اور دیگر فنکار اور ہنر مند میسر آئے۔

آیئے آج چند پروگراموں کو یاد کرتے ہیں۔

ان کا نہ کوئی ریکارڈ میسر ہے نہ ہی مجھے وثوق سے یاد ہے کہ کون سا پروگرام کس دن ہوتا تھا۔ یہ ساری ماضی کی دھندلی سی یادیں ہیں۔

قرآن حکیم اور ہماری زندگی۔

دن کا آغاز علی الصبح عام طور پر قاری زاہد قاسمی کی تلاوت قرآن سے ہوتا جس کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا درس قرآن ہوتا۔ پھر اکثر مہدی حسن کی پرسوز آواز میں ان کی ساتھیوں نسیمہ شاہین، فریدہ علی اور مدھو الماس کی ہمنوائی میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ پیش کی جاتیں جو فضا میں ایک نور بکھیر دیتیں۔ شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے
زمین کے فرش پر عرش الٰہی کے مکیں آئے
شافع روز جزا، اللہ اکبر آ گیا
وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اور پھر کبھی ناصر جہاں کی منفرد اور پاکیزہ آواز میں۔ "جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں" کانوں میں رس گھولتی۔

اس کے بعد دینی موضوعات پر سید حسن مثنیٰ ندوی، افتخار احمد بلخی اور حمید نسیم جیسے دانشوروں اور علما کی گفتگو ہوتی۔

آٹھ بجے اردو، انگریزی اور بنگلہ میں خبریں ہوتیں۔ بنگلہ خبریں عندل چوہدری اور دلارا ہاشم پڑھتیں۔ جبکہ انگریزی خبریں انیتا غلام علی، انور حسین، رضوان واسطی اور ایک بہت ہی مقبول آواز والے ایڈورڈ کی ریڈ پیش کرتے۔ اس سے آپ خبروں کی ادائیگی کے معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گیارہ بجے نشریات پھر شروع ہوتیں۔ ساڑھے گیارہ بجے طلبہ کا مقبول پروگرام اسکول براڈ کاسٹ ہوتا۔ یہ ناچیز بھی دو بار اس میں شامل ہو چکا ہے۔ بارہ بجے کمرشیل سروس شروع ہوتی جس میں رنگ برنگے اشتہارات کے ساتھ فلمی گانے اور اسپانسرڈ پروگرام پیش کیے جاتے۔ بزم حیٰ سنز، ایس ایم سلیم پیش کرتے جس میں فلمی ستاروں اور کھلاڑیوں وغیرہ سے بات چیت سنوائی جاتی۔ خواتین کا پروگرام، سنگی باجی، جسے شاید ڈالڈا والے پیش کرتے تھے، طلعت صدیقی پیش کرتیں۔

شام کو مقامی خبروں کے ساتھ فوجی بھائیوں کا پروگرام ہوتا جسے شمیم اعجاز پیش کرتیں۔ بازار کے بھاؤ ابراہیم نفیس سناتے۔

یہ وہ پروگرام ہیں جو تقریباً ہر روز پیش کئے جاتے جبکہ کچھ پروگراموں کے دن مخصوص تھے۔

جمعہ کی دوپہر نعتیں اور قوالیاں پیش کی جاتیں۔ اسی دن آپ کی خدمت میں زیڈ اے بخاری بھی آتا تھا۔

جمعرات کی شب جب مولانا سلیم الدین شمسی اپنی پاٹ دار آواز اور منفرد ترنم کے ساتھ مثنوی مولانائے روم پیش کرتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔

اور شاید جمعرات کی رات ہی، دیکھتا چلا گیا۔ پیش کیا جاتا، جسے پہلے عبدالماجد اور ان کے انتقال کے بعد ایس ایم سلیم جیسے باکمال صداکار پیش کرتے۔ یہ ہمارے روزمرہ کے رویوں پر تبصرہ ہوتا جس کے آخر میں۔ "سیلانی یہ سب دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور دیکھتا چلا گیا" شاید میرے دوستوں کی سماعتوں میں آج بھی رس گھولتا ہوگا۔

منگل کی رات یا ور مہدی شہر میں ہونے والی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کرتے جسے وراثت مرزا کی خوبصورت آواز میں پیش کیا جاتا۔ منگل ہی کی شب ایک مقبول پروگرام دھنک، جسے بعد میں کہکشاں کا عنوان دیا گیا، پیش کیا جاتا تھا۔ مزاحیہ خاکوں کے اس پروگرام میں، میرے دوستوں کو شاید، فسانہ آزاد کے کردار میاں خوجی کا "نہ ہوئی قرولی ورنہ ہو جاتا کچھ" تو یاد ہوگا۔

پیر کی شب پورا گھر ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتا۔ جی ہاں

Urdu Soft Books

اس دن اسٹوڈیو نمبر نو پیش کیا جاتا تھا۔ مجھے اب تک بخاری صاحب اور ایس ایم سلیم کا لائٹ ہاؤس کا محافظ، آواز کے سائے اور کریم کے جوتے اور بہت سے ڈرامے یاد آتے ہیں جو کئی بار پیش کیے گئے۔

پینسٹھ کی جنگ کے بعد، شاہ بلیغ الدین کا، ہماری کہانی تاریخ کی زبانی ایک بہترین اور سبق آموز پروگرام تھا۔ اسی طرح اکہتر کی جنگ کے دوران طلعت حسین گھن گرج کے ساتھ، جواباً عرض ہے میں دشمن کے پروپیگنڈے کا جواب دیتے۔ اس پروگرام کو چند ایک بار اداکار محمد علی نے بھی پیش کیا لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی۔

ہفتہ طلبا کے لیے نہ صرف طلبا بلکہ شہر کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی رات دیر گئے تک جاگتے۔ اس میں مقابلہ حسنِ قرات، مشاعرہ، اردو اور انگریزی مباحثے کے علاوہ میرا سب سے پسندیدہ پروگرام، مقابلہ معلومات عامہ جسے میجر آفتاب اور محمد فائق پیش کرتے اور آخری دن ادبی محاکمہ خاصے کی چیز ہوتا۔

کشتی، فٹبال اور ہاکی کی کمنٹری میں ایس ایم نقی اور کرکٹ کی کمنٹری میں عمر قریشی اور جمشید مارکر کی جوڑی کا جوڑ آج تک نہیں پیدا ہوسکے۔

موسیقی کے پروگرام، نذر حسین، مہدی ظہیر، لعل محمد اقبال، امراؤ بندو خان وغیرہ پیش کرتے۔ نجانے کس دن، رات کے وقت گیتوں بھری کہانی پیش کی جاتی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے پروگرام میرے دوستوں کی یاد سے محو ہو گئے ہوں لیکن اتوار کے دن کے چند پروگرام ایسے ہیں جنہیں شاید ہی کوئی بھلا پائے۔

اتوار کی صبح پیامی (عبدالحکیم) آپ کے خط پیش کرتے۔ اس کے بعد کراچی ریڈیو کی تاریخ کا طویل ترین عرصہ تک چلنے والا اور مقبول ترین پروگرام، حامد میاں کے ہاں، جسے انتظار حسین لکھتے تھے آتا۔ یوں لگتا جیسے ہم حامد میاں کے گھر بیٹھے ہوں۔ حامد میاں (امیر خان) کا یہ دیکھیے گا ان کی بیگم صفیہ معینی کا میں کہے دیتی ہوں۔ اور ان کے سالے انجم (افضل صدیقی) کے ''جناب والا'' آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ اس کے علاوہ، صفدر (جمشید انصاری) اور احسان (محمود علی) اور حامد میاں کے پڑوسی (نام یاد نہیں رہا) ان کی ملازمہ اب بھی زندہ محسوس ہوتے ہیں۔

دس بجے، السلام علیکم بچوں اور السلام علیکم بھائی جان کے ساتھ ایک ہنستی، کھلکھلاتی آواز ابھرتی تو گویا سارے گھر میں گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔ جی ہاں یہ سب کی محبوب منی باجی کی آواز ہوتی اور پروگرام ہوتا بچوں کی دنیا جس میں ظفر صدیقی بھائی جان ہوتے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے، گویا کہ کراچی کا قومی ترانہ، یعنی بندر روڈ سے کیماڑی ضرور سنوایا جاتا۔

اتوار کی صبح ایک نہایت شاندار پروگرام ''صبح دم دروازہ خاور کھلا'' آتا جسے محمد فائق کے ساتھ، کوئلوں جیسی آواز اور پریوں کی سی صورت والی غزالہ رفیق پیش کرتیں۔ اس میں بڑی نادر اور نایاب چیزیں، مشہور لوگوں کے انٹرویو، بھولے بسرے گیت، دلچسپ باتیں اور نجانے کیا کیا کچھ ہوتا جو آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی ریڈیو کے پاس سے ہٹنے نہ دیتا۔

اسی طرز کا ایک پروگرام طلبہ کے لیے رات کو محمد نقی ''شب کو ہے گنجینہ گوہر کھلا'' کے عنوان سے پیش کرتے لیکن اتوار کی صبح، حلوا پوری یا نہاری کے ناشتے کے ساتھ جو مزہ، صبح دم دروازہ خاور کھلا، میں آتا اس کا عالم ہی نرالا تھا۔

اب سنا ہے کہ سائنس نے بڑی ترقی کرلی ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کے پاس جدید ساز و سامان اور ٹیکنالوجی آگئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے اور ایف ایم اسٹیشن بن گئے ہیں۔

لیکن آپ ایمانداری سے بتائیں ان میں سے کسی کے پاس بخاری صاحب، شکیل احمد، امیر خان، ایس ایم سلیم، عبدالماجد، مہدی ظہیر کا پاسنگ بھی ہے۔

☆☆☆

''تو پھر ویک اینڈ پر کیا کر رہے ہو؟''

یہ وہ سوال ہے جو تواتر سے ہفتے کے آخری دن میرے دفتر میں دہرایا جاتا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ہفتہ بھر محنت مزدوری صرف چھٹی منانے کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ چھٹی کے دن سے زیادہ اس کا تصور پرلطف ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان ایک یا دو دنوں کے بعد دفتر آنا ہی نہیں ہے۔ کون ہے، جو یہ نہ کہے کہ

''جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن''

سکون اور تفریح بھی انسان کی بنیادی ضروریات کا حصہ ہیں۔ ہر کسی کا تفریح اور وقت گذاری کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی کھیل کود، ناچ گانے اور سیر و تفریح کا دلدادہ ہوتا ہے، کسی کو اپنے پیاروں سے ملنے کا اشتیاق ہوتا ہے، کوئی اپنے ہفتہ بھر کے ذاتی کام چھٹی کے دن نمٹاتا ہے۔ کوئی اس فرصت کو غنیمت جانتا ہے اور گھر میں مرمت، صفائی وغیرہ میں

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

مصروف ہوتا ہے۔ کوئی یہ دن پڑھنے لکھنے میں گزارتا ہے تو کسی کے لیے یہ دن اپنے رب کی عبادت کا ہوتا ہے۔

اور کچھ بلکہ بہت سے لوگوں کے لیے چھٹی کے دن کا مطلب صرف اور صرف آرام کرنا ہوتا ہے اور وہ جی بھر کے اپنی نیند پوری کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے صرف سو کر تعطیل گزارنا سخت ناپسند ہے۔ صرف آرام کرنے کو میں چھٹی کے دن کو ضائع کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں انسان چوبیس گھنٹوں میں اپنی ضرورت کے مطابق آرام کر ہی لیتا ہے۔ چھٹی کے دن کا سب سے بڑا انعام وہ بے فکری ہوتی ہے جو کم از کم اس دن کے لیے میسر آتی ہے۔

آج سے ربع صدی قبل شاید ہم ان سہولیات اور آسانیوں کا تصور بھی نہ کر پاتے جو آج ہمیں میسر ہیں۔ مثلاً فلم دیکھنا ایک زمانے میں ایک بہت بڑا کام نظر آتا تھا، اہلِ خانہ کے ساتھ گھر سے تیار ہو کر نکلنا، سواری کا بندوبست کرنا، سنیما ہال پہنچ کر ٹکٹ کے لیے تگ و دو، انٹرول میں بوتلوں اور بن کباب یا کافی وغیرہ سے لطف اندوز ہونا۔ اب یہ سب کچھ آپ کی انگلی کی ایک جنبش کی مار ہے۔ اب کوئی بھی فلم، کسی بھی وقت اپنے اسمارٹ فون یا لیپ ٹاپ یا آئی پیڈ پر۔

''اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی''

انسان سدا کا ناشکرا ہے۔ کیا ہمارے خواب وخیال میں بھی تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا جب ہر دوسرے کے پاس اپنی ذاتی سواری ہوگی۔ مزدور کے گھر بھی رنگین ٹیلی ویژن ہوگا، موبائل فون تو اب پرانی چیز ہوئے، اب مجھے اپنے فون پر پیغام ملتا ہے کہ منظور بھی اب واٹس اپ یا آئی ایم او پر ہے۔ اور یہ منظور وہ ہے جو میرے گھر کام کرنے آتا ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ان دنوں کو یاد کرتے رہتے ہیں جب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ کچھ تو ایسا ضرور رہا ہوگا کہ بیتے دنوں کی سہانی یادوں سے دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتی ہیں۔

ایک عجیب ہی کیفیت ان دنوں ہوتی تھی چھٹی کے دن کی۔ دو باتیں ایسی تھیں کہ اتوار کا دن عام دنوں سے الگ لگتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ابا جنہیں ہفتے بھر ہم صرف صبح سویرے کام پر جاتے اور رات گئے گھر آتے دیکھتے، وہ سارا دن گھر پر ہوتے اور ہمیں گھر بھرا بھرا اور روشن سا لگتا۔

دوسرے یہ کہ ہفتے بھر لگا بندھا ایک سا ناشتا ہوتا لیکن اتوار کے دن بالکل الگ ناشتا ہوتا اور یہ اس پر منحصر ہوتا کہ یہ مہینے کا کون سا دن ہے۔ شروع کے اتوار گھر والے صبح ایک برتن یا ڈونگہ ہاتھ میں پکڑا دیتے کہ جاؤ فلاں جگہ سے نہاری لے آؤ۔ رات یا دن کے وقت نہاری کھانا تو آج کے دور کی بدعت ہے۔ ہمارے دنوں میں یہ صرف ناشتے یعنی، نہار منہ کھائی جاتی تھی۔

یا پھر حلوا پوری منگوائی جاتی لیکن یہ کبھی کبھار کے چونچلے ہوتے، ہفتے کی شام دفتر سے آتے ہوئے ابا صدر کی ایمپریس بیکری سے، رسک یا ٹوسٹ، جسے ہم کراچی والے پیار سے، پاپے، کہتے ہیں، لیتے آتے جن کا اپنا ہی سواد تھا۔

پھر کبھی امی میٹھی ڈبل روٹی یا مالپوے بناتیں، ہم کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کرتے تھے کہ ماں جو کچھ بناتی تھیں لاجواب ہوتا تھا اور مجھے یقین ہے آپ کی امی بھی جو کچھ بناتی ہوں گی ایسا ہی مزیدار ہوتا ہوگا۔

لڑکے بالے ایک دوسرے کے گھر کے ساتھ بنے چبوترے یا تھڑوں پر بیٹھے گپ شپ لڑا رہے ہوتے تو کوئی بڑوں کی چارپائی یا چوکی گلی میں ڈال دیتا یا کوئی چٹائی یا دری کسی سائبان کے نیچے یا چبوترے پر بچھا دیتا اور تاش، کیرم یا شطرنج کی بازیاں جمتیں اور ساتھ چائے اور سگریٹ کے دور چلتے۔

کوئی اپنی سائیکل کھول کر اس کی مرمت میں لگ جاتا، کوئی لوہے کی استری میں کوئلے دہکا کر ہفتے بھر کے کپڑوں پر استری کر رہا ہوتا تو کوئی گھر بھر کے جوتے جمع کر کے اسے چیری بلاسم یا کیوی پالش سے چمکا رہا ہوتا۔ کوئی ٹوٹی کرسی جوڑ رہا ہوتا تو کوئی چارپائی کے بان کس رہا ہوتا۔

اخبار کسی کسی گھر میں آتا لیکن اتوار کا اخبار اور ان دنوں کے مقبول اخبار، جنگ، انجام اور حریت کے اتوار ایڈیشن، خاص کر جنگ کا نیلے سرورق والا اخبار ہاتھوں میں پھیلے ہوتے۔

یہ سب کچھ تھا اور کسی نہ کسی صورت، کچھ کم یا زیادہ، اب بھی ہے لیکن ایک یاد جو بچپن کے ساتھ ہی چلی گئی لیکن میرے شہر والوں کے دل سے کبھی نہ جا سکے گی وہ ہے کراچی ریڈیو کے مقبول پروگرام ''حامد میاں کے ہاں'' کی۔

حامد میاں کا گھر شہر کے ہر گھر میں تھا اور شہر کا ہر گھر حامد میاں کا گھر تھا۔

اتوار کی صبح پراٹھوں کی خوشبو میں آنکھ کھلتی اور گھر میں ایک اور گھر کا شور بپا ہوتا اور یہ شور ہوتا حامد میاں کے گھرانے کا۔ کانوں میں حامد میاں کی پاٹ دار اور بارعب آواز آتی۔ ''اور

www.urdusoftbooks.com

یہ دیکھیے گا۔" ان کا تکیہ کلام سنائی دیتا۔ پھر باورچی خانے سے ان کی بیگم کی زوردار آواز آتی۔ "اے ہاں میں کہے دیتی ہوں۔" جو اپنے چھوٹے بھائی انجم کو ڈانٹ رہی ہوتیں اور انجم میاں اپنے لا ابالی انداز میں۔ "ہم سے نہیں ہوسکتا جناب والا۔" سے اپنے بہنوئی اور بہن کی بات کو ہوا میں اڑا رہے ہوتے۔ یا پھر حامد میاں اپنے برادر خورد احسان کے ساتھ کسی نئے مسئلے یا قانون پر بات کر رہے ہوتے۔ کبھی کبھار حامد میاں کے پڑوسی اپنی پوربی زبان میں کوئی شکایت لیے چلے آتے۔

سارے کردار اور ساری باتیں یوں لگتا کہ جانو ہمارے گھر میں اور ہماری ہی ہو رہی ہیں اور یہ آوازیں میں اپنے ہوش سنبھالتے ہی سنتا آرہا تھا کہ یہ پروگرام میری پیدائش سے بہت پہلے یعنی 1950ء میں شروع ہوا تھا۔ زیادہ تر اسے انتصار حسین نے تحریر کیا بہت بعد میں دوسرے لکھنے والے بھی آئے جن میں انجم کا کردار ادا کرنے والے، امن اخبار، کے ایڈیٹر، افضل صدیقی بھی شامل تھے۔

گرجدار اور بارعب آواز کے مالک، امیر خان، حامد میاں کا مرکزی کردار ادا کرتے۔ حامد میاں جو ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم، ایک بااصول انسان، ایک قانون پسند شہری اور ایک خاندان کے ایسے سربراہ تھے جو ہر اچھے اور صحت مند معاشرے کو مطلوب ہیں۔

حامد میاں کی بیگم صاحبہ، صفیہ معینی جیسی کہنہ مشق فنکارہ جن کا کردار ادا کرتی تھیں۔ ہمارے گھروں کی وہ خاتون جنہیں روزمرہ کے مسائل کا سامنا رہتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو جھیل رہی ہوتی ہیں اور تخیل پسند حامد میاں کے سامنے مہنگائی، ملاوٹ، بے ایمانی کا رونا روتیں اور ہمارے معاشرے کی اصل تصویر دکھاتیں۔ اور ہماری ضروریات کی ترجمانی کرتیں۔

جمشید انصاری، یعنی حامد میاں کے بیٹے صفدر ایک شریف اور پڑھے لکھے نوجوان، کا کردار ادا کرتے۔

ہمارے ایک اور محبوب فنکار، محمود علی، حامد میاں کے بھائی کا کردار ادا کرتے۔ یہ بھی اپنے برادر بزرگ کی طرح شریف اور اصول پسند انسان تھے لیکن معاشرے کے منفی پہلوؤں سے بھی واقف تھے۔ تخیل پسند حامد میاں ایک مثالی معاشرے کی ترجمانی کرتے جبکہ احسان حالات حاضرہ سے باخبر ایک عملی شخصیت تھے۔

لیکن جس کردار سے اس پروگرام میں رنگینی تھی وہ تھے حامد میاں کے برادر نسبتی، یعنی سالے صاحب، انجم جن کا نام تھا جسے مشہور صحافی اور اخبار امن کے مدیر افضل صدیقی پیش کرتے۔ مزاح کا رنگ لیے ہوئے یہ منفی کردار معاشرے کے لاپرواہ، بے حس اور لا ابالی عنصر کی نمائندگی کرتا۔ جس میں بے اصولی، قانون شکنی، سستی، کاہلی ٹوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے آخری دنوں میں ایک اور کردار شاہد کا شامل ہوگیا تھا جو بظاہر تو انجم کا چیلا ہوتا ہے لیکن انجم کے کارناموں کی خبریں حامد میاں اور اپنی خالہ یعنی بیگم صاحبہ تک پہنچاتا۔

نصیرالدین، حامد میاں کے پڑوسی کبھی کبھار اپنی پوربی زبان سمیت آتے اور کسی دن ہم سب کی بوا، ہماری آپ کی عرشی خالہ یعنی عرش منیر بھی اپنی جھلک دکھلا دیتیں جن کی آواز تو گویا ہر گھر کی آواز ہوتی کہ نانی، دادی یا بوا تو ہم سب کے ہاں ہوتی ہی ہیں۔

حامد میاں کا گھر ایک جیتا جاگتا گھرانا لگتا جس کے کرداروں کی بات چیت میں نام کو بھی تصنع نہیں ہوتا تھا اور یہ ہماری تمہاری طرح کے ہوتے۔ میرے شہر کی حسین یادوں میں ،حامد میاں کا یہ دیکھیے گا، بیگم صاحبہ کا، میں کہے دیتی ہوں اور انجم کا جناب والا، یا، ہمارے گھر میں کہہ رہی تھیں، یا "پھول والی آئیں تو ہم کہہ دیں گے" جیسے مکالمے، ایک عہد کے انداز گفتگو، ایک زمانے کے چلن اور رنگ ڈھنگ جواب خواب و خیال ہوئے جن کی بس یاد ہی رہ گئی ہے جو کبھی کبھار دل کے نہال خانے میں روشن ہوکر کسی اور زمانے میں لے جاتی ہے۔

سپنے سہانے لڑکپن کے میرے نینوں میں ڈولیں بہار بن کے۔

☆☆☆

(ترجمہ) یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا (البلد)

سدھارتھ نے جب آنکھ کھولی تو اپنے چاروں اور دکھ، تکلیف، اشانتی اور کٹھنائیں پائیں۔ سارے جگ میں کون تھا جو دکھی نہیں تھا۔ اس کا حساس من اتنے دکھ دیکھ نہیں پایا اور دنیا کو تیاگ کر نروان کی تلاش میں بن میں جا کر بس گیا۔ اس کی تپسیا نے اسے ادھ موا کر دیا یہاں تک کہ پیٹ پیٹھ سے لگ گیا اور اس کا شریر ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا۔

گوتم (سدھارتھ) نے تو دنیا سے مکھ موڑ کر اپنے من کو سکھی کرنا چاہا مگر وہ کیا کرتے جو اس دکھ ساگر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے لیے رہ گئے تھے۔

دنیا میں ایسا کون ہے جسے کوئی نہ کوئی دکھ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے دوسروں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے اور غم کو چھپانے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ جو بیٹھا ہنس رہا ہے اپنے اندر کیا کیا لیے ہوئے ہے۔

دکھ کا کوئی ایک نام نہیں۔ کوئی بھوک سے بے حال ہے تو

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کوئی کسی روگ اور بیماری کے ہاتھوں پریشان ہے اور غربت تو ہے ہی تمام دکھوں کی ماں۔

پھر کوئی اولاد نہ ہونے پر افسردہ ہے تو کوئی اولاد ہی کے ہاتھوں دکھی ہے۔ کوئی مال و دولت کے انبار لیے بیٹھا ہے لیکن تنہا ہے اور کوئی کثیر العیال ہے لیکن کنگال ہے۔ کوئی اپنی ضرورت کے لیے عزت کا سودا کر رہا ہے اور کہیں کوئی سفید پوش غیرت مند اپنی مشکل دوسروں سے کہنے سے پہلے نجانے کس کرب سے گزر رہا ہے۔ کہیں بوڑھے والدین بیٹی کے بالوں میں چاندی کے تار دیکھ کر ہول کھا رہے ہیں اور کہیں کوئی کسی کو یاد کر کے رو رہا ہے۔

ایسے میں وہ جوان دکھیوں کے چہرے پر مسکان لانے کے جتن کرتے ہیں، یقین کیجیے بہت بڑا کام کرتے ہیں۔ جو دوسروں کو خوش کرتے ہیں، انہیں ہنساتے ہیں اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھتے ہیں، انسانیت کے محسن ہیں۔

لیکن کوئی نہیں جانتا کہ جو دوسروں کی زندگیوں میں رنگ بکھیرتے ہیں خود کس عالم میں ہوتے ہیں۔

”خود اندھیرے میں ہیں اوروں کو دکھاتے ہیں چراغ“

ایسے چند لوگوں کو میں نے ذرا قریب سے جھانکا تو پتا چلا کہ یہ تو اپنے سوز کو ترنم اور اپنی آہ کو تبسم میں ڈھالنے والے فنکار ہیں۔

ہمارے دور کے سب سے عظیم مزاحیہ فنکار معین اختر کے ساتھ مجھے بحرین میں دو دن ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان کے ساتھ ایک فلم بھی دیکھی۔ ان دو دنوں میں، میں نے ایک بار بھی معین کو ہنستے یا مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ وہ پوری سنجیدگی سے اپنے پروگرام اور ساتھی فنکاروں تاج ملتانی اور نگہت سیما کی ریہرسل پر توجہ دیے ہوئے تھے۔

سوسائٹی میں ہمارے محلے (حیدر علی روڈ) کے قریب پہاڑیوں میں فلم نئی لیلیٰ نیا مجنوں کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اداکار کمال اور اداکارہ نسیمہ خان تو ایک کار کی چھت سے کہنیاں ٹکائے باتوں میں مصروف تھے۔ ان سے ہٹ کر ایک طرف کرسی پر لہری صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ یقین کیجیے کہ اگر کوئی مجھ سے لفظ گھمبیرتا کے معنی پوچھے تو میں اسے لہری صاحب کی اس وقت کی تصویر دکھا دوں۔

لیکن جو چہرہ مجھے نہیں بھولتا وہ اداکار ننھا کا ہے۔ انہیں پردے پر ہمیشہ ہنستے بولتے ہی دیکھا لیکن ایک بار میں کراچی میں میٹروپول ہوٹل کے سامنے ٹیکسی کی تلاش میں کھڑا تھا کہ ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رکی۔ ایک شخص اتر کر ہوٹل میں غائب ہو گیا۔ میں ڈرائیور سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ کیا ٹیکسی خالی ہے کہ میری نظر پچھلی سیٹ پر، پولیس کی وردی میں ملبوس ایک گول مٹول سے شخص پر پڑی۔ یہ ننھا تھے اور کسی فلم کی شوٹنگ سے آ رہے تھے۔ یقین جانیے ان کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ چند سال بعد سنا کہ ننھا نے خودکشی کر لی۔ نجانے کیا دکھ اسے کھائے جا رہا تھا۔

یہ واقعہ شاید آپ نے سن رکھا ہو۔ مضائقہ نہیں کہ ایک بار اور سن لیں۔

ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا کہ ڈاکٹر صاحب میں ہر طرح سے صحت مند ہوں بس ایک بیماری ہے کہ مجھے ہنسی نہیں آتی۔ کئی سال ہو گئے مجھے ہنسے ہوئے۔ میں ہنسنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا تم بڑے صحیح وقت میں آئے ہو۔ تمہارا علاج آسان ہے۔ آج کل شہر میں سرکس آیا ہوا ہے وہاں پیٹر نام کا ایک مسخرہ (کلاؤن) ہے۔ وہ اس قدر مزیدار حرکتیں کرتا ہے کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم پیٹر کا تماشا دیکھو گے تو فوراً ہنس پڑو گے۔ اس شخص نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب...... میں ہی تو پیٹر ہوں۔

ایسے ہی کئی پیٹر میرے شہر والوں کو ہنساتے رہے۔

شہر میں ہونے والے ورائٹی پروگراموں اور فنکشنوں نے ہمارے ملک کو فن کی دنیا کے کئی بڑے نام دیے۔ لہری، نرالا، معین اختر، آغا سرور، رنگیلا کراچی والا، صلاح الدین طوفانی، افضال و شوکت، صبغت اللہ باری وغیرہ ان پروگراموں کی جان ہوتے تھے۔

آج کے شہنشاہ ظرافت عمر شریف پر تو کبھی تفصیل سے بات ہو گی، میں آج کچھ ایسے فنکاروں کو یاد کر رہا ہوں جن کے نام تو اتنے مشہور نہیں لیکن میرے نزدیک یہ فنکار کسی بھی سپر اسٹار سے کم نہیں۔

الف اور نون ایک بے حد مقبول پروگرام تھا اور اس میں معاشرے میں پھیلی بے ایمانی اور منافقت کا کچا چٹھا کھولا جاتا تھا لیکن یہ ٹی وی کے بہت ابتدائی دنوں میں پیش ہوا۔ پھر چند سال بعد اسے دوبارہ اور رنگین پیش کیا گیا، پھر اس کے پروگراموں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔

ففٹی ففٹی وہ پروگرام تھا جس نے مقبولیت کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس کی ایک وجہ تو اس میں پیش کیے جانے والے چھوٹے چھوٹے خاکے ہوتے تھے جن سے ہر ذوق اور عمر کے ناظرین محظوظ ہوتے تھے، پھر یہ بڑے متنوع ہوتے تھے ان میں رقص، فلموں کی نقلیں، گانے، انٹرویو، خبریں اور حالات حاضرہ پر فوری طنز اور نجانے کیا کچھ ہوتا تھا اس کی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

سب سے بڑی خوبی ان خاکوں کا عام فہم ہونا تھا۔

ففٹی ففٹی کے فنکاروں کی تو خوبیاں کیا بیان کروں۔ گو کہ اس میں اشرف خان، بُشریٰ کمال، رؤف عالم، عادل واڈیا، لطیف کپاڈیا، بشریٰ انصاری اور عمر شریف نے بھی کام کیا لیکن جو شہرت اسمٰعیل تارا، ماجد جہانگیر اور زیبا شہناز کے حصے میں آئی اور جس طرح ان تینوں نے اپنے فن کا سکہ بٹھایا وہ آج تک ناظرین کے ذہنوں میں موجود ہے۔

اگر میں اس کے مختلف یادگار خاکوں کی بات کروں تو یہ بات بہت طویل ہوجائے گی۔ میرے سارے احباب ان تینوں کو جانتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔

میں تو فقط آپ کو یاد دلانا چاہ رہا تھا کہ ففٹی ففٹی والے میرے ملک کا فخر ہیں اور یہ میرے شہر میں رہتے تھے۔

یہ چھوٹے نام کا بہت بڑا فنکار۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں فن کو ناپنے اور جانچنے کے پیمانے صرف مرکزی کرداروں تک محدود ہیں۔ ریڈیو ٹی وی پر بے شمار ایسے فنکار ہیں جن کے نام بھی لوگ نہیں جانتے لیکن وہ صلاحیت میں بڑے بڑے سپر اسٹارز سے کہیں آگے ہیں۔

مثلاً لاہور ٹی وی کے ایک فنکار ایوب خان تھے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر وہ کہیں مغرب میں ہوتے تو ان کا درجہ بڑے فنکاروں میں ہوتا جب کہ ہمارے ہاں شاید بہت سے ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔

ملک انوکھا بھی ایسے ہی ایک فنکار تھے۔ انہیں مزاحیہ اداکاروں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن وہ ایک حقیقی اداکار تھے۔ جو بھی کردار وہ ادا کرتے تھے وہ بالکل اصل معلوم ہوتا۔ مختلف زبانوں اور ان کے مخصوص لہجے پر انہیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ میں بہت عرصہ تک ان کی زبان اور قومیت نہیں جان سکا۔

وہ سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، مارواڑی اور نجانے کتنے لہجوں پر قادر تھے اور یہ ساری زبانیں بولنا بھی جانتے تھے۔

دوبئی چلو کا شاطر نوسرباز، وارث کا مہنگا، سیڑھیاں کا پولیس حوالدار، باادب باملاحظہ کا شہزادہ اور منڈی کا آڑھتی کا منشی۔

ان کی بول چال، لباس، چال ڈھال ایسی ہوتی کہ صرف وہ کردار یاد رہ جاتا۔

میرے نزدیک ملک انوکھا ایک بہت قد آور فنکار تھا اور پھر وہ میرے شہر کا بھی تو تھا۔

اللہ اس کی روح کو سکھی رکھے کہ وہ ہمیں خوش رکھتا تھا۔

☆☆☆

بہت سوچا، سر کھپایا لیکن سمجھ نہ پایا کہ یہ چیز جسے محبت کہتے ہیں، یہ کیونکر ہوتی ہے۔ اس عالم رنگ و بو میں بے شمار دل کو موہ لینے والے، جو اس پر چھا جانے والے، ایک سے بڑھ کر ایک حسین، طرح دار، باکمال، شاندار بلکہ عظیم الشان لوگوں سے پالا پڑتا ہے لیکن دل کسی کسی کو ہی اس طرح چاہتا ہے جسے محبت کہا جاتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو اس کا باعث بنتی ہے، کسی کو کوئی صورت بھا جاتی ہے، کسی کی کوئی ادا دیوانہ کردیتی ہے، کسی کا کوئی کارنامہ، کوئی صلاحیت اس طرف مائل کردیتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تعلق کسی نہ کسی صورت ضرور ہوتا ہے۔ بنا کسی تعلق کے پسندیدگی تو ہوتی ہے محبت نہیں ہوتی۔ اور شاید اس طرح بھی محبت ہوتی ہو لیکن کیا ایسا بھی کوئی ہے جس سے سارا عالم بغیر کسی تعلق کے محبت کرتا ہو۔ آپ کہیں گے ایسے بہت سے ہیں جنہیں غیر بھی چاہتے ہیں، جیسے نیلسن منڈیلا، گوتم بدھ، مدر ٹریسا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ حوالے بہت ہی محدود اور کسی خاص شعبے کے حوالے سے ہیں۔

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میرا دعویٰ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک ہی شخص ایسا ہے، جس سے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے بلکہ دنیا کے ہر خطے کے لوگ پیار کرتے ہیں، جسے ہر کوئی اپنا جانتا ہے۔ جس کے لیے بھی ایک عالم دعا گو رہتا تھا۔ اور اس سے نہ تو کوئی علاقائی تعلق تھا، نہ وہ ہماری زبان بولتا تھا، کچھ لوگ شاید مذہب کی بات کریں، تو اس کے چاہنے والے افریقا، لاطینی امریکا، مشرق بعید اور دنیا بھر کے وہ لوگ بھی ہیں جن کا مذہب و مسلک بھی مختلف ہے۔ نہ ہی اس شعبے کی وجہ سے وہ محبوب تھا جو اس کی وجۂ شہرت ہے، کہ میں نے اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں کو اس کے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے جنہیں یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کرتا کیا ہے۔ پچھلے سو سال میں محبوبیت اور مقبولیت میں کوئی اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

جی ہاں میں بات کر رہا ہوں اس کی جو اپنے آپ کو عظیم ترین کہتا تھا، جو تتلی کی طرح رقص کرتا تھا لیکن مقابل کے لیے اس کا ڈنک بھڑ سے ۔۔۔ بھی زیادہ تند ہوتا تھا۔ جو بڑبولا مشہور تھا لیکن دنیا اس کی گلفشانیوں پر مرتی تھی۔ جو مخالف کو اپنی زبان درازی سے ہی زیر کرلیتا تھا اور سننے والے اس کی بات سے بھی بے مزہ نہ ہوتے کہ وہ تو اس کی ایک ایک ادا پر مرمٹتے تھے۔

جی، یہ اسی محمد علی کی بات ہے، وہ جو چہرے پر ایک بچے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

کی سی معصومیت لئے ہوتا لیکن مسکراہٹ جس کی شرارت سے بھرپور ہوتی اور جب وہ اپنے حریف کے مقابل ہوتا تو بجلی کی سی تیزی سے مخالف پر ٹوٹ پڑتا۔ اس کے مقابل روایتی انداز میں، ایک ہاتھ سے چہرے کا دفاع کرتے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ضرب لگانے کی کوشش کرتے لیکن یہ ہمیشہ دونوں ہاتھ نیچے لٹکائے، ایک ایسے خوبصورت انداز میں رقص کرتا ہوا رنگ کے چاروں طرف چکر لگاتا کہ دیکھنے والے جھوم جھوم جاتے۔ جو مخالف کے وار کو ہاتھوں پر روکنے کی بجائے اس پھرتی سے جھکائی دیتا کہ حریف اپنی ہی جھوک میں لڑکھڑا جاتا اور اسی دوران یہ اس کے چہرے پر زوردار ضرب لگا چکا ہوتا۔

محمد علی، باکسنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ، جس سے پہلے اور جس کے بعد دنیا نے باکسنگ جیسے وحشی کھیل میں دلچسپی نہیں لی سوائے ان کے جو اس کھیل کو پسند کرتے ہیں یا حصہ لیتے ہیں۔ علی کے کیریر کے دنوں میں تو بچے، بوڑھے، مرد وزن،

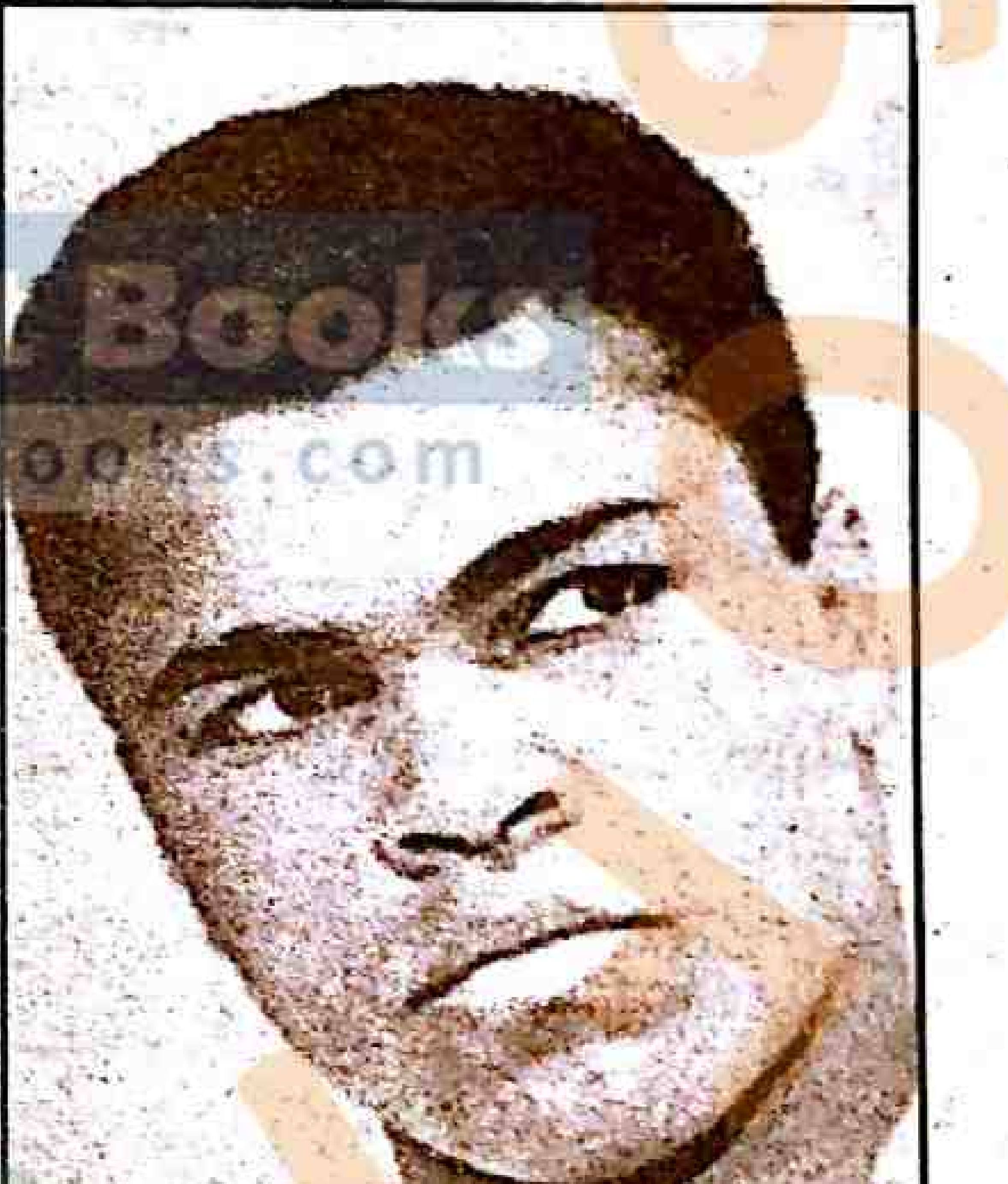

امیر غریب، عربی عجمی اور کافر و مسلم سب اسی کے گن گاتے اور اسی پر مرتے۔ وہ رنگ میں اترتا تو فضا ”علی، علی!!“ کے نعروں سے گونج رہی ہوتی۔

اور کیوں نہ ہوتی۔ ایسا مبارک نام جس کا ہو وہ ناکام کیونکر ہو۔ ازل سے ابد تک کائنات کی محبوب ترین ہستی اور ان کے محبوب عم زاد کے ناموں کے امتزاج سے زیادہ مبارک نام اور کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے بچپن سے حیرانگی ہوتی تھی کہ اس نام کے لوگوں کو میں نے ہمیشہ نمایاں دیکھا۔

ہوش سنبھالتے ہی اللہ اور اس کے پیارے رسولؐ کے بعد جس نام سے عقیدت ہوئی وہ ہمارے قائداعظم کا نام تھا۔ لیکن بچپن میں ہم صرف انہیں قائداعظم ہی کے نام سے جانتے تھے۔ دو تین جماعت پڑھنے کے بعد ان کے پورے نام یعنی ’محمد علی جناح‘ کا علم ہوا۔ لیکن اس دوران ایک اور محمد علی کا نام جا بجا نظر آتا تھا وہ تھے ’محمد علی چاولہ‘ جو قسطوں پر پنکھے، سلائی مشین اور ریڈیو دیتے تھے اور ان کے نام کے بورڈ اور اخبارات میں اشتہارات نظر آتے۔ پھر تیسری جماعت میں آئے تو ایک دن اسکول پہنچ کر پتا چلا کہ ملک کے وزیر خارجہ ’محمد علی‘ بوگرہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس خبر سے ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ اس دن اسکول ان کے انتقال کے سوگ میں بند رہا۔ پھر دو سال بعد فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان الیکشن ہوئے تو ایک اور محمد علی کا نام بہت نمایاں تھا یعنی نظام اسلام پارٹی کے سربراہ چوہدری محمد علی، جو شاید وزیراعظم بھی رہ چکے تھے۔ انہی دنوں ایک خوبرو اداکار کی تصویریں فلموں کے اشتہاروں اور اخبارات کے فلمی صفحوں پر چھائی ہوئی تھیں اور یہ تھے اداکار محمد علی۔ اور میرا یہ یقین راسخ ہوگیا تھا کہ اس نام کے لوگ زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہتے ہیں کہ یہ دو مبارک ترین ناموں کا امتزاج ہے۔

لیکن اس محمد علی سے ہمارا تعارف محمد علی کے نام سے نہیں بلکہ ”کاسیس کلے“ کے نام سے ہوا اور اس کے بعد بھی ہم اسے محمد علی کلے ہی پکارتے رہے۔

اور یہ کہانی شروع ہوتی ہے 1964 سے جب ایک دن اخبار میں پڑھا کہ روم اولمپک کے ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن کاسیس کلے نے عالمی چیمپئن ’سونی لسٹن‘ کو شکست دے دی۔ (یہ وہی روم اولمپک تھا جس میں پاکستان نے بھارت کو ہرا کر پہلی مرتبہ اولمپک ہاکی میں سونے کا تمغہ جیتا اور ہاکی کی دنیا میں اپنی آمد کا اعلان باآواز بلند کیا) اور سچ تو یہ ہے کہ یہ خبر ہم نے اس وقت تو پڑھی بھی نہیں تھی کہ باکسنگ کا کھیل کوئی ایسا مقبول عام نہ تھا۔ کرکٹ ہاکی اور فٹبال عوام الناس کی دلچسپی کے مرکز تھے۔ کھیلوں کا ایک انگریزی ماہنامہ اسپورٹس ٹائمز (Sportimes) البتہ دنیا بھر کے کھیلوں کی خبریں دیتا۔ اس جیسا معیاری کھیلوں کا رسالہ پھر کبھی شائع نہ ہوا۔ بہت بعد میں شائع ہونے والے رسالے، دی کرکٹر اور اخبار وطن صرف کرکٹ تک محدود تھے۔

خبر تو اس وقت بنی جب اس کاسیس کلے نے اعلان کیا کہ اس نے ”نیشن آف اسلام“ میں شمولیت اختیار کرلی ہے اور اب اسے ”محمد علی“ کے نام سے پکارا جائے۔ کلے کا یہ

www.urdusoftbooks.com

اعلان کرنا تھا کہ دنیا میں روشن خیالی اور آزادی کے سب سے بڑے ٹھیکیدار امریکا میں گویا کہ تھرتھری سی مچ گئی (اس نیشن آف اسلام کا اسلام سے کیا تعلق تھا اور بعد میں 1971 محمد علی نے باقاعدہ اسلام قبول کیا اس کا اس داستان سے کوئی تعلق نہیں، یہ صرف برسبیل تذکرہ اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے یاد رکھیے)

سونی لسٹن جو ایک خونخوار اور مجرمانہ ماضی کا حامل باکسر تھا اپنی شکست پر شدید تلملایا ہوا تھا اور اس نے کلے کو جوابی مقابلے کی دعوت دی۔ جوابی مقابلہ اب دو ہیوی ویٹ باکسرز کے درمیان نہیں بلکہ دو نظریات کے درمیان تھا اور ساری دنیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ علی نے لسٹن کو زچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ اسے بدبودار ریچھ کا خطاب دیا اور ایک دن ایک بڑا سا رسہ لے کر لسٹن کے کیمپ کے سامنے پہنچ گیا کہ مجھے ریچھ کا شکار کرنا ہے۔ یہ ابتدا تھی اس کردار کی جس کی ان لن ترانیوں اور لاابالی پن پر ایک دنیا واری واری جانے والی تھی۔

دنیا اس مقابلے کے لیے بے تاب تھی لیکن مقابلہ شروع ہوا، بہت سے لوگ ہال میں داخل ہو کر اپنی نشستیں تلاش کر رہے تھے اور بہت سے کرسیوں پر بیٹھنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ سونی لسٹن زمین پر چت نظر آیا۔ تین منٹ سے بھی کم وقت میں علی نے اسے دھول چٹا دی تھی۔ بڑبولے Mouth Big کا ئیس کلے جسے اس کی جائے پیدائش کے حوالے سے Louisville Lip بھی کہا جاتا تھا، نے اعلان کر دیا کہ میں عظیم ترین ہوں۔ اور پھر وقت نے اس کی بات کو سچ ثابت بھی کیا۔ انیس سو اڑسٹھ تک علی نے اپنی مہارت، پھرتی اور طاقت کی دھاک بٹھا دی، وہ پیش گوئی کرتا کہ میں فلاں کو اس راؤنڈ میں زیر کروں گا اور اکثر و بیشتر اس کی پیشگوئی پوری ہوتی۔ فلائیڈ پیٹرسن نے، جسے شکست دے کر سونی لسٹن چیمپین بنا تھا نے علی کو مقابلے کی دعوت دی لیکن مقابلے سے پہلے علی کے مذہبی خیالات کے بارے میں کچھ اشتعال انگیز باتیں کیں۔ علی نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا اور مقابلے کے دوران اسے فوراً ناک آؤٹ کرنے کی بجائے بارہویں راؤنڈ تک اس کی پٹائی کرتا رہا۔ آخر ریفری نے مقابلہ روک کر پیٹرسن کی جان چھڑوائی۔ یہی حشر برطانوی چیمپین ہنری کوپر کا کیا، جس کی حالت دیکھ کر اس کی بیوی رو پڑی اور ریفری سے کہہ کر مقابلہ رکوایا۔

لیکن علی کی یہ عظمت، آزادی اور رواداری کے سب سے بڑے مبلغ، امریکا کو ایک آنکھ نہ بھائی اور علی کے لیے یکے بعد دیگرے مشکلات کھڑی کی گئیں جس میں سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اسے ویتنام میں جنگ کے لیے فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا۔ علی نے اولاً اپنے مذہبی خیالات کی وجہ سے فوج میں جانے سے انکار کیا۔ دوسرے وہ اس جنگ کے خلاف تھا، جس کی عالمی رائے عامہ بھی مخالف تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمزور سے ملک پر لشکر کشی کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس نے اعلان کیا میرا ویت کانگ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس حرف انکار کا صلہ علی کو اپنا باکسنگ لائسنس اور عالمی اعزاز گنوا کر ملا۔

علی اب باکسر سے بڑھ کر عالمی ضمیر کا استعارہ بن گیا تھا۔ ہمارے وقت کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے اسے لکھا کہ دنیا میں جب کوئی ایک بھی تمہارا دوست نہ ہو تو برطانیہ چلے آنا، ایک شخص برٹرینڈ رسل نام کا تمہارا دوست ضرور ہوگا۔

امریکی حکام نے جس سے اس کا اعزاز و اکرام چھینا، دنیا نے اسے عزت دی اور اپنی پلکوں پر بٹھایا۔ نہ صرف امریکا کے باضمیر عناصر، بلکہ ایشیا، افریقا، مشرق وسطیٰ، لاطینی امریکا اور یورپ کے ملک اس کی مہمان نوازی کو اپنے لیے اعزاز جانتے اور اس کے راستوں میں دیدہ و دل فرش راہ کیے

مودود چشتی

(430ھ۔527ھ)

خاندان چشت کے اکابر میں سے تھے اور مادرزاد ولی اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خواجہ ابو یوسف چشتی کے فرزند تھے۔ طفولیت ہی میں آپ سے کرامات سرزد ہونے لگی تھیں۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لگ گئے۔ تیس برس کی عمر میں والد کی وفات پر مسند نشین ہوئے۔ والد سے جب بیعت ہوئے تو بیس برس تک گوشہ نشینی کی زندگی گزار دی۔ تعلیم کے سلسلے میں بخارا بھی تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ المشائخ خواجہ نجم الدین عمرؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ احمد المنامقی سے بھی آپ نے فیض پایا تھا، خواجہ مودود کا ہر قول اور فعل شریعت کے عین مطابق ہوا کرتا تھا جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے، سب لوگ دل و جان سے قبول کرتے۔

مرسلہ: طاہر علی صدیق۔ حیدرآباد

Urdu Soft Books

رہتے۔

قانوناً تو لازمی فوجی خدمات سے انکار کی سزا قید ہوتی ہے لیکن چونکہ علی نے اپنے خلاف فیصلے کو چیلنج کر رکھا تھا اور مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا، چنانچہ اسے قید کی سزا نہ دی جا سکی۔ علی کے عزم و ہمت کے سامنے بالآخر حکام کو ہار ماننا ہی پڑی اور 1971 میں اس کا باکسنگ لائسنس بحال کر دیا گیا اور اسے پیشہ ور مقابلوں کی اجازت دے دی گئی۔

اسی 1971ء میں اس کا جو فریزئر سے مقابلہ ہوا جو اس کی غیر موجودگی میں اب عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن تھا۔ اس مقابلے کو صدی کا سب سے بڑا مقابلہ Fight of the Century قرار دیا گیا۔

علی نے اپنے آپ کو عظیم ترین قرار دیا لیکن وہ بہر حال انسان ہی تھا اور عظیم ترین ذات صرف خدا کی ہے۔ اس مقابلے میں اسے پوائنٹس پر شکست ہوئی لیکن وہ اپنی دھن میں لگا رہا اور بالآخر جنوری 1974 کو اس نے نیو یارک کے میڈیسن اسکوائر گارڈن میں جو فریزئر کو شکست دے کر اپنے آپ کو اس وقت کے چیمپئن "جورج فورمین" کے مقابلے کا اہل ثابت کیا۔ فورمین، جو فریزئر کو شکست دے کر چیمپئن بنا تھا۔

فورمین اب تک تمام مقابلوں میں ناقابلِ شکست رہا تھا اور اس نے اپنے تمام حریفوں کو ناک آؤٹ کی ذلت سے دو چار کیا تھا۔ علی سے اس کے مقابلے کو Rumble in the Jungle کا نام دیا گیا کہ یہ افریقا کے ملک زائرے کے شہر "کنشاسا" میں تھا۔

علی جسے اپنے مقابل کی نفسیات سے کھیلنے کا ہنر آتا تھا، نے مقابلے سے پہلے فورمین سے کچھ سرگوشی کی۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی فورمین نے علی پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے لیکن کوئی کاری ضرب نہیں لگا سکا۔ علی نے آج اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور اپنے عمومی "اوپن چیسٹ" انداز کے بجائے رنگ کی رسیوں کا سہارا لیے رہا جسے علی نے بعد میں Rope a dope کا نام دیا۔ وہ مستقل کمر سے نیچے اور پیٹھ پر فورمین کے مکے کھاتا رہا۔ ساتویں راؤنڈ تک فورمین بری طرح تھک گیا تھا۔ یہ وہ فورمین تھا جس کے مکے کی طاقت سے دیوار ڈھے سکتی تھی۔ آج وہ سات راؤنڈ تک ایک بھی کاری ضرب اپنے مقابل کو نہ لگا سکا تھا۔ آٹھویں راؤنڈ کے درمیان یکا یک علی نے دفاع کی بجائے دائیں، بائیں اور دائیں سے تین مکے بجلی کی سی تیزی سے لگائے اور فورمین لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ فورمین جس نے کبھی زمین کا منہ نہ دیکھا تھا، اسے یہ بھی تجربہ نہیں تھا کہ ریفری کی گنتی پر کب کھڑا ہو جانا چاہیے۔ ریفری نے علی کا ہاتھ بلند کر کے اس کی فتح کا اعلان کر دیا۔ وہ علی جسے 1967 سے رنگ سے باہر رکھنے کی کوشش کی گئی، آج پھر دوسری مرتبہ عالمی چیمپئن تھا۔

علی نے فورمین کے کان میں کیا سرگوشی کی تھی یہ دلچسپ داستان ہے، اسے پھر کبھی سناؤں گا کہ پہلے ہی یہ کہانی بہت طویل ہوگئی ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، علی بھی انسان ہی ہے، اور ہر عروج کو زوال بھی ہے اور یہ کہ تمام تر بزرگی اور عظمت صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہے۔ 1978 میں وہ دن آ گیا کہ ایک نوجوان باکسر لیون اسپنکس کے ہاتھوں علی شکست کھا گیا۔ دو ماہ بعد جوابی مقابلے میں اسپنکس کو شکست دے کر تیسری مرتبہ عالمی ہیوی ویٹ کا اعزاز اپنے نام کیا اور ساتھ ہی کھیل کو خدا حافظ کہہ دیا۔

پھر مجھے یاد نہیں کس وجہ سے ریٹائرمنٹ سے واپس آ کر اس وقت کے ایک بہت ہی مشاق اور طاقتور چیمپئن لیری ہومز کو مقابلے کی دعوت دے ڈالی۔ علی اب بوڑھا ہو رہا تھا، اس کا وزن بڑھ رہا تھا اور کمر اور پیٹ کے گرد گوشت بڑھتا جا رہا تھا۔ مقابلے سے پہلے طبی معائنے میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب علی کے بطور ہیوی ویٹ باکسر دن پورے ہو گئے ہیں اور اتنا بڑا مقابلہ اس کے لیے ضرر رساں ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر اس کا مینیجر لیری ہومز سے ملا اور اس سے رندھی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ لڑتے ہوئے خیال رکھے کہ کوئی ضرب ایسی نہ ہو جو، جان لیوا ثابت ہو۔

علی جس سے اس کے اپنے ہی نہیں مخالف بھی محبت کرتے تھے۔ ایک نسل اس دوران اس کی عاشق ہو چکی تھی، سچے اور بڑے کھلاڑی تو اور بھی بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ لیری ہومز نے علی کے مینیجر کے دونوں ہاتھ تھام کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ I love the champ

علی رعشہ کی بیماری کا شکار ہوا۔ مجھے نہیں یاد کہ میرے اپنے زمانے میں کسی اور کو اتنا، مقبول، مشہور اور محبوب دیکھا ہو۔ آپ میری بات سے اتفاق کریں نہ کریں لیکن اس کی نماز جنازہ پھر اسے قبرستان تک پہنچانے کے عمل تک ایک ایک لمحہ پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔

But still: Love the champ

www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے
لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں
صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب
ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن
حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے
۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox
کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے
Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause
ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

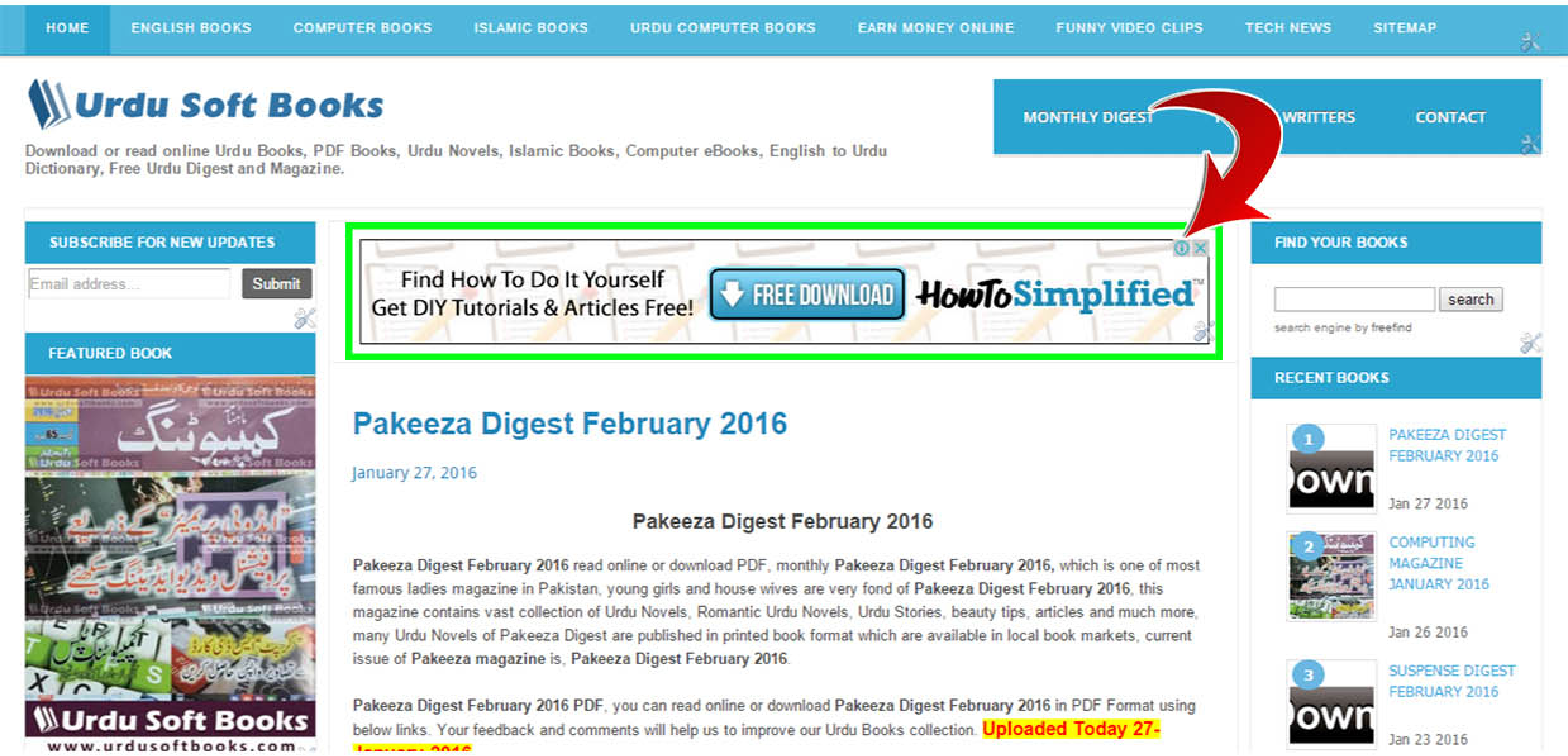

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کر کے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

وقت کی جست

ابنِ کبیر

یہ دنیا اسرار سے بھری ہے۔ کب کہاں کون سا تحیّر خیز قصّہ جنم لے لے، کسے پتا۔ گِل پریز نے بھی کب سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو جائے گا جو اسے تاریخ کے صفحات پر امر کر دے گا۔ صدی کے سب سے تحیّر خیز قصّے کا مرکزی کردار قرار دے دیا جائے گا۔

دنیا کے حیران کن واقعات میں سے ایک واقعہ

پہاڑوں پر شام اتر رہی تھی۔

ہوا چلتی تو کھیتوں میں سبز لہری اٹھنے لگتی۔ چراگاہ میں دوڑتیں بھیڑیں اب دھیمی پڑ چکی تھیں۔ ندی بنا آواز کیے بہہ رہی تھی۔

عورت کا سر مرد کے سینے پر تھا۔ اس کے پُرسکون چہرے پر الوہی روشنی تھی اور اس کا سانس ہموار تھا۔

وہ جنگی لباس زیب تن کر چکا تھا۔ اس کی تلوار کمر سے لپٹی تھی۔ گھوڑا اصطبل میں تیار کھڑا تھا۔ گوشت کے پارچوں کا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

تھیلا میز پر دھرا تھا۔ وہ سفر کے لیے تیار تھا مگر جانا نہیں چاہتا تھا کہ جو لمحات اسے میسر تھے، وہ محبت اور مسرت سے لبریز تھے۔ وہ یہاں، اسی وادی میں رہنا چاہتا تھا مگر فرض اسے پکار رہا تھا۔

”مجھے جانا ہی ہوگا۔“ سپاہی نے دھیرے سے کہا۔

”زندگی اسرار کا دوسرا نام ہے۔“ عورت کا سر ہنوز اس کے سینے پر تھا۔ اس کے ہونٹ سیب کی قاش کے مانند تھے وہ لب ہلے اور یوں لگا جیسے مطرب نے ساز کے تار چھیڑ دیے ہوں۔ ”بہتی ہواؤں میں رازوں کا بسیرا ہے۔“

”ہاں۔“ مرد دھیرے سے مسکرایا۔ اُسے شادی کے ابتدائی دن یاد آگئے۔ تب اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر اس مکان کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے یہ جملے کہے تھے۔ ”تحیر ہمارے اردگرد ہے، ہر پل کچھ انوکھا رونما ہو رہا ہے!“

”اور ان میں سب سے حیرت انگیز کیا ہے؟“ اب عورت براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں ایک لہر اٹھی۔ سورج پہاڑ کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔

”سب سے حیرت انگیز ہے...“ آدمی کے چہرے پر روشنی تھی۔ ”اپنے محبوب کی دھڑکن سننا۔“

عورت کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اسے وہ پل یاد تھے، جب سپاہی اسے بیاہ کر اس جنت نظیر وادی میں... اپنے لکڑی کے اس خوبصورت گھر میں لایا تھا، جس کے پہلو سے ندی بہتی تھی۔ اور یہیں انھوں نے یہ جانا تھا کہ اپنے محبوب کی دھڑکن سننا سب سے پُرمسرت اور تحیر خیز تجربہ ہے۔

”مجھے جانا ہوگا۔“ آدمی علیحدہ ہوگیا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ عورت نے ایک دھاگا اس کے بازو پر باندھ دیا۔ اس نے میز سے تھیلا اور پانی کا مشکیزہ اٹھا لیا۔ باہر گھوڑا ہنہنایا، اسے مالک کے آنے کی خبر ہوگئی تھی۔ عورت اسے محبت سے دیکھ رہی تھی۔

وہ گھوڑے پر جست لگا کر سوار ہوا۔ اپنی بیوی کو دیکھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔ وہ گھوڑا اور اس کا سوار... وادی میں حرکت کرتی اکلوتی شے معلوم ہوتے تھے۔ ہر سو کامل سکوت تھا۔

دروازے پر کھڑی عورت انھیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس پل... وہ دنوں اس بات سے لاعلم تھے کہ کچھ واقعات اپنے محبوب کی دھڑکن سننے سے بھی زیادہ تحیر خیز ہوتے ہیں اور ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہونے کو تھا...

☆☆☆

یہ میدرڈ تھا، دنیا کا مرکز۔

گھوڑا شہر کے مضافات میں داخل ہو کر دھیما پڑ گیا۔ سپاہی کے کپڑے دھول سے اٹ چکے تھے۔ اس کے جوتے پر ریت اور سبز رنگ تھا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ سرسبز وادیوں سے آ رہا ہے۔ اس کے بال لمبے اور سینہ چوڑا تھا۔ سپہ گری اس کا آبائی پیشہ تھا۔

اب وہ ایک بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ہر سو روٹی کی سوندھی خوشبو پھیلی تھی۔ وہ تنور کے پاس آ کر گھوڑے سے اترا۔ لگام تھامے نان بائی کی طرف گیا۔ سپاہی نے کچھ سکے اچھالے۔ ایک گرم نان اس کے ہاتھ پر رکھ دی گئی۔ سپاہی نے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر پیٹ بھرا اور مشکیزے سے پانی پیا۔ نزدیک ایک سرائے تھی۔ وہ اس سمت ہولیا۔ اس نے گھوڑا باندھا۔ اس کے آگے چارا ڈالا اور سرائے کے اندر داخل ہوگیا چلا گیا۔

اندر حبس تھا۔ بیشتر میزیں خالی تھیں۔ ایک نوجوان کونے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سپاہی کو دیکھا، تو بوکھلا کر سیدھا ہوگیا۔ سپاہی نے اشارہ کیا، تو لڑکے نے تیزی سے ایک میز صاف کر دی اور کھڑکی کھول دی۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کچھ روشنی ہوئی۔ سرائے اپنے بھید کھولنے لگی۔ اس نے دیکھا... کونے میں بوری پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور تیز تھیں۔ ماتھے پر زخم کا نشان تھا جو شاید کسی جنگ کی دین تھی۔ البتہ اُس کا حلیہ کسی مداری سا تھا۔

سپاہی قہوے سے دل بہلا رہا تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا، تو بوڑھا پہلو میں کھڑا تھا۔

”بہادر نوجوان۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

سپاہی اس طرح کے تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ وہ کاندھے اچکا کر رہ گیا۔ بوڑھا بیٹھ گیا۔ اب وہ سپاہی کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ سپاہی نے اس پر نظر نہیں ڈالی۔ قہوہ ختم کر کے وہ اٹھنے کو تھا کہ بوڑھے نے سوال کیا۔ ”عزیز من، تمھارا نام کیا ہے؟“

”گل پریز۔“ سپاہی کی آواز پاٹ دار تھی۔ وہ ایک دلیر انسان تھا۔

”آہ، گل پریز۔“ بوڑھے نے گہرا سانس لیا۔ ”اس نام سے تو تحیر جڑا ہے، یہ نام صدیوں تک باقی رہے گا۔“

گل پریز نے بوڑھے پر اچٹتی سے نگاہ ڈالی۔ وہ اسے

www.urdusoftbooks.com

میدرد کا ایک شاطر ٹھگ لگا۔ اس نے قہوہ کی قیمت ادا کی اور باہر آ گیا۔ بوڑھے کی نظریں اب تک اس پر ٹکی تھیں۔

سرائے کے ملازم نے آواز لگائی۔ ''کیا دیکھ رہے ہیں بڑے میاں؟ آپ کی جان پہچان کا تھا۔''

''ذرا سوچ تو لڑکے۔'' بوڑھا بظاہر سڑک کی سمت دیکھ رہا تھا مگر اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ''اگر اس سرائے میں بیٹھے بیٹھے تو ایک لمحے کو آنکھیں میچ لے۔ اور جب آنکھ کھولے تو خود کو... میلوں دور، کسی پرائے دیس میں پائے... تو بتا ذرا، تو کیا کرے گا، حیرت سے مر جائے گا ناں؟''

''قطعی نہیں۔'' لڑکا جھٹ سے بولا۔ ''میں تو فوراً کوئی سرائے تلاش کروں گا اور ادھر ملازم ہو جاؤں گا۔''

سرائے میں لڑکے کا قہقہہ گونج رہا تھا۔ سپاہی اپنا گھوڑا کھول کر جا چکا تھا۔ ایک تتلی کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔

''گل پریز۔'' بوڑھے نے دھیرے سے سپاہی کا نام لیا۔ میلوں دور... وادی میں درخت سے پھل اتارتی عورت کے کان میں ہوا نے سرگوشی کی۔ اسے کسی کی یاد آ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ سولہویں صدی کا آخری عشرہ تھا۔

نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا۔ طاقت کی جنگ سمندر پر لڑی جا رہی تھی۔ یورپی قوتیں برسرپیکار تھیں۔ وہ اجنبی زمینوں پر قبضہ کر لیتے، وہاں ہزاروں سپاہی تعینات کر دیتے، اپنا گورنر لگا دیتے اور ان کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ شروع ہو جاتی۔

نوآبادیاتی قوتوں میں ہسپانیہ بھی شامل تھا، جس کا اثر و رسوخ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس نے کئی ایشیائی ممالک میں کالونیاں بنائی تھیں۔ ان ملکوں میں فلپائن بھی شامل تھا۔

بارسلونا رجمنٹ کا تازہ دم دستہ بندرگاہ پر اکٹھا ہو رہا تھا۔ ان فوجیوں کے روبرو ایک طویل اور پُرخطر سفر تھا، مگر ان کے چہرے اندیشوں سے پاک تھے۔ وہ ایسے ہی خطروں کا سامنا کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔

گل پریز کپتان کے خیمے میں حاضری دے چکا تھا۔ اب وہ فوجی اصطبل کی سمت جا رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا اندراج کروا دیا۔ بوڑھے منشی نے چاندی کے سکوں کی ایک تھیلی سونپ دی۔

''امید ہے، تم جلد لوٹ آؤ گے۔'' آدمی نے اندراج کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے گھوڑے کو کوئی بیماری وغیرہ تو نہیں۔''

''وہ گل پریز کا گھوڑا ہے۔'' اس کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔

''مگر گل پریز تو نہیں ہے۔'' منشی نے بے پروائی سے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ تم زندہ لوٹ آؤ۔''

گل پریز خیمے سے باہر آ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلا سمندر تھا، جس پر سفید جھاگ تیر رہا تھا۔ کنارے سے کشتیاں لگی تھیں۔ بحری بیڑوں کے مستول نظر آ رہے تھے۔ سمندری پنچھیوں کی پرواز میں اطمینان تھا۔

گل پریز جانتا تھا کہ یہ اطمینان ایک التباس ہے۔ ان کے سامنے ایک کٹھن سفر تھا۔ فلپائن جانے والے راستے پر جہاں بحری قزاقوں کا خطرہ تھا، وہیں پرتگالی بیڑوں سے ٹکراؤ کا بھی خدشہ تھا۔ خیر، ان سے تو نمٹا جا سکتا تھا مگر قدرت سے مقابلہ ناممکن تھا۔ موسم بگڑ جائے، جہاز کو ہولناک طوفان آ لے، تو انسان بے بسی سے فقط اُن لمحات کے گزرنے کا انتظار کر سکتا ہے۔

وہ ڈاک خانے کی طرف چل پڑا۔ اس نے تھیلی سے چند سکے نکال کر جیب میں ڈالے اور باقی گن کر جمع کروا دیے۔ اس کے گاؤں کا نام سن کر اہل کار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''وہ تو جنت نظیر ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے گردن ہلائی۔ بندرگاہ کی سمت سے شور اٹھا تھا۔ سپاہی کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔

''وہاں کون تمہارا منتظر ہے۔'' اہل کار نے تھیلی پر مہر لگاتے ہوئے پوچھا۔

''میری بیوی۔'' گل پریز نے دھیرے سے کہا تھا۔ ''جس کی دھڑکن مجھے اب بھی سنائی دے رہی ہے۔''

اس کا آخری جملہ اہل کار سن نہ سکا۔ سپاہی کی آواز باہر اٹھتے شور میں دب گئی تھی۔

☆☆☆

تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

آسمان پر بادل آ گئے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گرج چمک کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔ بادبان گرا دیے گئے۔ لہریں اٹھنے لگیں۔ جہاز ڈولنے لگا تھا۔ کپتان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ملاح دوڑتے پھر رہے تھے۔

سپاہی زیریں کیبن میں تھے۔ بیش تر خاموش۔ کیبن میں مکمل سناٹا تھا۔ اچانک ایک نوجوان سپاہی زور سے چیخا۔ وہ گر پڑا تھا۔ وہ نیا نیا تھا اور ان حالات سے گھبرا گیا تھا۔ بجلی

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

گرجی۔ یوں لگتا تھا، جیسے دھماکا ہوا ہو۔

گل پریز کے پہلو میں بیٹھے آدمی نے قے کردی۔ اس کے چہرے پر رنجیدگی تھی۔ گل پریز نے اس کا کاندھا تھپکا۔ ’’سب ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔‘‘

وہ ایک مشکل سفر تھا۔ قزاقوں کا تو انھیں خوف نہیں تھا، نہ ہی پرتگالی بیڑے ادھر سے گزرتے۔ البتہ موسم کا قہر نازل ہوگیا۔ طوفان نے انھیں آلیا تھا۔

رات بھر آسمان برستا رہا۔ لہریں جہاز کے اوپر سے جارہی تھیں۔ کبھی کبھی سمندر عرشے پر آجاتا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ صبح جاکر بارش رکی۔ البتہ بادل چھائے رہے۔ دوپہر کے وقت سورج نکلا۔

اُن کی منزل فلپائن کا شہر منیلا تھی۔ منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک طوفان اور آیا، مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔

منیلا چھوٹا سا شہر تھا۔ اس پر نوآبادیاتی اثرات نمایاں تھے۔ جون 1571 میں ہسپانوی کپتان لوپیز ڈی لیگازپی نے یہ شہر فتح کیا تھا۔ تب سے یہ ہسپانیہ کی کالونی تھی۔ یہ شہر فلپائن کا مرکز تھا۔ تاریخی اور ثقافتی ورثے کا امین... مگر اس سے اس پر ہسپانوی اثرات نمایاں تھے۔

گل پریز کا جلد یہاں دل لگ گیا۔ مقامی باشندے پستہ قد اور گھٹے ہوئے جسم کے تھے۔ وہ محنتی اور جفاکش تھے۔ بظاہر وہ ہسپانوی سپاہیوں سے بڑی محبت سے پیش آتے، مگر اندر ہی اندر اُن میں بغاوت کا لاوا ایک رہا تھا۔ وہ آزادی کے خواہش مند تھے۔ گل پریز کے دستے کی آمد سے قبل ایک مقامی مذہبی پیشوا کی قیادت میں ایک گروہ نے بغاوت کردی تھی۔ گورنر گومیز پریز نے اس بغاوت کو بڑی شدت سے کچلا۔ مذہبی پیشوا کو مرکزی چوراہے میں پھانسی دی گئی۔

پہلی نظر میں یوں لگتا تھا کہ اب منیلا میں شانتی ہے۔ اس کی بندرگاہوں سے تجارتی قافلے گزر رہے تھے۔ مقامی وسائل... بڑی سہولت سے لوٹے جارہے تھے۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ کو کھود ڈالا گیا۔ بیش قیمت نوادرات اور جواہرات ہسپانیہ پہنچا دیے گئے۔ یہ واضح تھا کہ مقامی لوگ ان ہٹے کٹے، اجنبی زبان بولنے والے غیر ملکیوں سے نفرت کرتے ہیں، مگر کیا کرسکتے تھے... گورنر بڑا سخت گیر آدمی تھا۔ چہرہ درشت۔ ماتھے پر جنگ کا عطا کردہ نشان، جسے وہ کبھی نہیں چھپاتا۔ کمر سے ہمہ وقت تلوار لٹکتی رہتی۔ وہ ایک ظالم اور جابر شخص کی شہرت رکھتا تھا، جس کا حرم مقامی عورتوں سے بھرا رہتا۔

گل پریز کے لیے حالات معمول کے مطابق تھے بس موسم سے ہم آہنگ ہونے میں اسے کچھ وقت ہوئی۔ وہ سرسبز وادیوں میں پلا بڑھا تھا۔ ساحلی شہروں کی مرطوب اور نمکین فضا سے کچھ اُلجھن ہوتی تھی مگر یہ سب تو سپاہی کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ بس، اپنی محبوبہ میریوز کی یاد اُسے راتوں کو ستاتی۔ صبح بیدار ہوتا تو اس کے دل میں خواہش ہوتی کہ کھڑکی سے اُسے پھول چنتے ہوئے دیکھے، وہ اس کے لیے بھیڑ کا گرم دودھ لے کر آئے اور روغنی روٹی پیش کرے۔ وہ دونوں شکر کریں اور روٹی بانٹ کر کھائیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے سینے پر سر رکھ کر محبت سے لبریز دلوں کو دھڑکتا ہوا سنیں۔ بس، یونہی ان کی زندگی گزر جائے۔

شومئی قسمت ... یہ ممکن نہیں تھا۔ ان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ جب وہ بیدار ہوتا، تو خود کو گھٹن زدہ کمرے میں پاتا۔ کھڑکی کے باہر بھرا پرا بازار ہوتا، جہاں بھاؤ تاؤ ہو رہا ہوتا۔ وہ اپنے بےترتیب کمرے میں لباس تلاش کرتا، جسے رات شراب پینے کے بعد اس نے اتار پھینکا تھا۔ چہرے پر پانی مارتا اور گوشت کا ایک ٹکڑا چباتا ہوا پانی گرم کرنے کو چولھا پر چڑھا دیتا۔ اس پانی میں وہ ایک مقامی پودے کی پتیوں کو جوش دے کر کچھ شکر ملا دیتا۔ کچھ ہسپانوی فوجی اس میں دودھ بھی شامل کردیتے تھے۔ وہ اس مقامی گرم مشروب کے دیوانے تھے، جو جسم کو چست رکھتا تھا۔

منیلا پہنچنے کے چار روز بعد اس نے مریوز کو ایک محبت بھرا خط لکھا، جس میں اس کی زلفوں اور ہونٹوں کی تعریف کی۔ اسے اپنے پہلو میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ندی اور پہاڑوں کو یاد کیا۔

اس نے خط مکمل کر کے فوراً روانہ کردیا تھا۔ اس روز ایک تجارتی جہاز منیلا کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تھا جو مراکش اور پرتگال سے ہوتا ہوا اسپین جارہا تھا۔

گل پریز کی عجیب و غریب، ناقابلِ یقین کہانی بیان کرنے والے لکھتے ہیں کہ جب یہ خط ہسپانیہ پہنچا، تو ڈاکیا اُسے گاؤں لے جانے سے پہلے میدرد کی ایک سرائے میں گیا تھا، جہاں ایک حواس باختہ سا نوجوان ملازم تھا اور ایک پُراسرار سا بوڑھا جو کونے میں ایک بوری پر بیٹھا رہتا تھا۔

ایک محقق لکھتا ہے کہ ڈاکیا سرائے میں بیٹھا قہوہ پی رہا تھا، تب بوڑھے نے اس سے دریافت کیا تھا۔ ’’کیا تیرے پاس کوئی ایسا خط ہے، جو تو شمال میں وادیوں کی سمت لے جارہا ہو؟‘‘

جواب میں ڈاکیے نے بتایا تھا۔ ’’ہاں... اس کے پاس

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

فلپائن سے آیا ہوا گل پریز نامی سپاہی کا ایک خط ہے۔"
بوڑھے نے سرد آہ بھری تھی اور کہا تھا۔ "تحیر!"

☆☆☆☆

ہسپانیہ کی فلپائن میں موجودگی کے باعث سب سے زیادہ خطرہ چین کو تھا۔

شہنشاہ چین اور اس کے حواریوں کی کوششوں کے باوجود یہ علاقہ ایک عرصے سے ہسپانیہ کے زیرِ تسلط تھا، جس کی بڑی وجہ گورنر گومیز پریز تھا، جس کی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے چند قریبی جزائر پر... جو کل تک چینی سرکار کی کالونی تھے، قبضہ کرلیا تھا۔ یہ جزائر موجودہ ملائیشیا اور انڈونیشیا کے آس پاس تھے۔ جب پانی سر سے اونچا ہوگیا، تو اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے چین نے خودکش دستے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان دستوں کی کہانی عجیب ہے۔ کہتے ہیں، یہ تیاری بچے کی پیدائش سے شروع ہو جاتی ہے۔ نوزائیدہ بچے منتخب کر لیے جاتے ہیں۔ تربیت اس انداز میں ہوتی ہے کہ ان کے دل محبت اور ہمدردی جیسے لطیف جذبات سے یکسر عاری ہوجائیں۔ ان پر کالا جادو کیا جاتا اور ذہنوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ کسی کو میدانی، کسی کو شہری اور کسی کو سمندری علاقوں میں حملے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ چین میں سمندری حملہ آوروں کو "کالی موت" کا نام دیا جاتا تھا۔ اُن کا سانس بڑا پکا ہوتا۔ یہ سات منٹ تک زیرِ آب رہ سکتے تھے۔ کمر پر تیل کی مشکیں باندھ کر تیرتے ہوئے دشمن کے بحری جہازوں تک جا پہنچتے۔ اگلے ہی پل شعلہ بھڑکتا ہے اور وہ دھماکے سے خود کو اڑا لیتے ہیں۔

چین کے خودکش دستوں کا نشانہ گورنر منیلا تھا۔ مخبروں نے اشارہ کیا تھا کہ وہ قریبی جزائر کے دورے کو روانہ ہونے والا ہے۔ دشمن نے تیاری کر رکھی تھی۔ خودکش دستے ایک ویران جزیرے کے پاس ایک گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ رات میں گورنر کا بحری جہاز ادھر سے گزرا۔ کہتے ہیں، اس جہاز پر کوئی غدار سوار تھا، جس نے مشعل روشن کر کے اشارہ کیا۔ کالی موت کے نام سے مشہور اُس دستے کے سات ارکان دھیرے سے پانی میں غائب ہوگئے۔ انھوں نے سانس روک کر ایک طویل فاصلہ طے کیا۔ ایک ایسی رسی سے بحری جہاز پر چڑھے، جس کا پہلے ہی انتظام کیا گیا تھا۔

کچھ پلوں بعد جہاز کے نچلے حصے میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ پھر کچھ اور دھماکے سنائی دیے۔ منیلا کے ساحل سے مشرق میں روشنی دیکھی جاسکتی تھی۔ جہاز کا عملہ کشتیوں کے ذریعے فرار ہوگیا۔ جہاز دھڑ دھڑ جلتا رہا اور پھر سمندر میں غرق ہوگیا۔

جب منیلا یہ خبر پہنچی کہ چینیوں نے گورنر گومیز کو قتل کر دیا ہے تو ہسپانوی دستے پر سکتا طاری ہوگیا۔ کئی تو صدمے سے گر پڑے۔ محل کے گرد پہرہ بڑھا دیا گیا تھا۔ گل پریز کو اضافہ ڈیوٹی دینے پڑ رہی تھی۔

گل پریز: تاریخ کے آئینے میں

اگر ہم تاریخی حوالے کھنگالیں، تو گل پریز کا نام پہلی بار 1908 میں دنیا کے سامنے آیا، جب لوک داستانوں پر تحقیق کرنے والے ایک امریکی تھامس ایلی بون نے Harper میں شائع ہونے والی اپنی تحریر میں ایک ہسپانوی فوجی کا تذکرہ کیا، جو زمان و مکاں کی جست لگا کر فلپائن سے میکسیکو پہنچ گیا تھا۔

یہ مضمون تھامس ایلی بون کی سیریز "میکسیکو کی داستانیں" نامی سیریز کا حصہ تھا، جو 1910 میں کتابی صورت میں چھپی۔ اس نے انیسویں صدی کے امریکی ادیب واشنگٹن ارونگ کی کہانی Tales of the Alhambra کا بھی تذکرہ کیا، جس میں ایک گورنر اور ایک سپاہی کی کہانی شامل ہے، جو گل پریز کی کہانی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ یہی محقق لکھتا ہے کہ اس نوع کے عناصر ہسپانوی لوک داستانوں میں بھی ملتے ہیں۔

1900 میں میکسیکو میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس میں وہاں کی قدیم لوک داستانوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں ایک ایسی داستان کا ذکر تھا، جس میں ایک اجنبی اچانک ایک روز... میکسیکو میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں سولہویں صدی کے اوائل تک جاتی تھیں۔

بعد کی کتابوں میں بھی یہ تذکرہ آتا رہا۔

1964 میں شائع ہونے والی فرینک ایڈورڈ کی کتاب Strange World میں اس کا ذکر ہوا، تو یکدم یہ پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جنھوں نے اپنے تئیں اس کی توجیہہ کی کوشش کی۔ اس گروہ کی اکثریت اس واقعے کو خلائی مخلوق سے جوڑتی ہے۔ کچھ اسے ٹیلی پیتھی کی انتہائی شکل قرار دیتے ہیں۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ادھر مقامی باشندوں نے رات کو چھپ کر جشن منایا۔ وہ ہسپانیہ سے نفرت کرتے تھے۔

☆☆☆

وہ قیامت کی رات تھی۔

منیلا دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طرف مقامی تھے، جو آج پرانے مٹکوں سے شراب نکال کر پی رہے تھے اور کل صبح دیر سے بیدار ہونے والے تھے۔ ادھر ہسپانوی صفوں میں خوف اور اندیشے حرکت کر رہے تھے۔ گورنر کے محل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ آج سے پہلے ہسپانوی عہدے دار اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ وہ قائم مقام مقرر کرنے کے لیے میدرد سے جاری ہونے والے احکامات کا انتظار کرتے، تو بغاوت کا اندیشہ تھا۔ انھیں آپس ہی میں فیصلہ کرنا تھا۔ مگر دقت یہ تھی کہ اعلیٰ عہدے داروں کا کسی ایک نام پر متفق ہونا سہل نہیں تھا۔ ان کے درمیان واضح اختلافات تھے۔

صبح تک کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ اندر بحث جاری تھی۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ جن غداروں نے چینیوں کا ساتھ دیا، وہ محل میں موجود ہیں اور کوئی اور سازش رچ سکتے ہیں۔

سخت پہرہ تھا۔ نہ تو کسی کو محل کے اندر آنے کی اجازت تھی، نہ ہی باہر جانے کی۔ فوجی دستوں کے تین حصار تھے۔ ایک اندرونی حصے میں، ایک احاطے میں اور ایک فصیل پر۔

گل پریز کو فصیل پر تعینات کیا گیا تھا۔ وہ رات کا جاگا ہوا تھا، مگر چوکس رہنے کی کوشش میں جتا تھا۔ صبح سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دل ڈوب سا جاتا مگر خود کو یہ کہہ کر سنبھال لیتا کہ اس کا سبب تھکن ہے اور آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہے۔

''دھوپ میں کیسی تپش ہے۔ لگتا ہے، جیسے دماغ پگھل رہا ہو۔'' وہ بڑبڑاتا۔ جانے کیوں آج اُسے وہ بوڑھا یاد آرہا تھا، جس سے میدرد کی ایک سرائے میں ملاقات ہوئی تھی۔

کچھ دیر سستانے کو اس نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ شہر پر نظر ڈالی۔ بندرگاہ پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ دھوپ پانی کی نیلی چادر پر چمک رہی تھی۔ آسمان صاف تھا۔

''اگر میں کچھ پلوں کو آنکھیں بند کرلوں، تو کیا مضائقہ ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں میچ لیں۔ جو آخری شے اس نے دیکھی، وہ صاف آسمان کے نیچے پھیلا سمندر تھا اور چوکور چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو پہاڑ تک چلے گئے تھے۔

وہ انسانی تاریخ کا ایک پُراسرار پل تھا... ایک ناقابلِ یقین پل۔

☆☆☆

آنکھیں بند کرنے کے بعد گل پریز کو اپنی محبوبہ مریوز کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔

وہ باورچی خانے میں کھڑی تھی۔ گھر دھویں سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھر دھواں بڑھنے لگا۔ منظر دھندلا رہا تھا۔ مریوز اس دھویں میں غائب ہوگئی۔ ایک غنودگی سی تھی جو فلپائن میں گورنر کے محل کا پہرہ دیتے گل پریز پر اتر آئی تھی۔

وہ خواب کی پُراسرار سرزمین پر تھا... ایک کھٹکا ہوا۔ اس کا نیزہ ذرا پھسلا تھا۔ وہ زمین سے ٹکرایا تو آواز ہوئی۔ گل پریز چونک کر سیدھا ہوگیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

''شاید سو گیا تھا۔'' اس نے انگڑائی لی۔ اور سمندر کی سمت دیکھا۔ وہاں مٹیالی لہریں اٹھ رہی تھیں اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ آگے کچے مکانات تھے جن کے پیچھے صحرا تھا۔

اس نے آنکھیں ملیں۔ جسم تھکن سے چور تھا۔ غور سے منظر کو دیکھا۔ سمندر میں اکادکا کشتیاں تھیں اور شام اتر چکی تھی۔ افق سرخ ہوگیا تھا۔ آج سے قبل اس نے فلپائن کے آسمان کو یوں سرخ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے کچھ عجیب لگا۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ یہ منظر بدلا ہوا تھا۔

اس نے خود کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ شاید وہ بہت دیر تک سویا رہا ہو اور شام آگئی ہو۔

اس نے خود کو کوسا اور مستعد کھڑا ہوگیا۔ مگر بے چینی برقرار رہی۔ شام ضرور اتر آئی تھی، مگر اندھیرا سمندر کو بدلنے کی تو قوت نہیں رکھتا۔ آج پانی مٹیالا اور بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ پھر وہ بحری جہاز بھی نظر نہیں آرہے تھے جنھیں خطرے کے پیشِ نظر تعینات کیا گیا تھا۔

اس نے دائیں سمت دیکھا۔ فصیل پر اسے ایک سپاہی کھڑا نظر آیا۔ وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کا نیزہ نسبتاً لمبا تھا اور لباس کا رنگ سرخ تھا۔

''شاید نئے دستے تعینات کر دیے گئے ہیں۔'' اس نے خود سے کہا اور سپاہی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اجنبی سپاہی ساکت کھڑا رہا۔ گل پریز ان مکانات کو دیکھ رہا تھا، جن سے وہ مانوس نہیں تھا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ جس منظر میں پکے مکانات تھے، وہاں اچانک جھونپڑیاں کہاں سے آگئیں۔ پھر پہاڑوں کی جگہ آج اسے صحرا نظر آرہا تھا۔

وہ واقعی پریشان تھا۔ اس نے پلٹ کر محل کی سمت

دیکھا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ یہ جگہ اس دیوار سے یکسر مختلف تھی، جس پر اس نے ٹیک لگایا تھا۔ وہ متذبذب تھا۔ خود کو تسلی دی کہ وہ پہلی بار یہاں تعینات ہوا تھا، ممکن ہے، یہ جگہ ایسی ہی ہو، اور صبح اس نے توجہ نہ دی ہو۔ اس نے دائیں سمت دیکھا تو چونکا۔ سپاہی غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر ٹہلنے لگا۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ بے شک یہ جگہ اجنبی تھی۔ یہ بندرگاہ، مکانات محل... سب کچھ بدل گیا تھا۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا... کچھ پلوں قبل، جب اس نے آنکھیں موندیں تھیں، دیوار سے ٹیک لگایا تھا، وہ فلپائن کے شہر منیلا میں تھا... گورنر کے محل کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ اور اب... اب وہ کہاں تھا؟ کس جگہ پر تھا؟ اگر یہ کوئی اور جگہ تھی، تو وہ یہاں کیسے آ گیا؟ شام اتنی جلدی کیسے اتر آئی؟

کیا کسی نے اس پر سحر کر دیا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے اپنا بازو ٹٹولا، جہاں گھر سے رخصتی کے وقت اس کی بیوی نے ایک حفاظتی دھاگا باندھا تھا... وہ دھاگا غائب تھا۔

اچانک اسے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ دائیں جانب... کچھ دور دو سپاہی کھڑے تھے۔ ایک تو وہی، جسے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ ایک کوئی اور تھا۔ وہ دونوں عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گئے۔ گل پریز نے سوچا، شاید وہ اس بات پر ناراض ہوں کہ اتنے کٹھن حالات کے باوجود وہ سو گیا۔ اس نے خود کو سزا کے لیے تیار کر لیا، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ انتہائی سنگین رونما ہو چکا ہے۔

☆☆☆

شام گہری ہو گئی۔

اسے کچھ سپاہی اپنے سمت آتے دکھائی دیے۔ ان کی چال میں عجلت تھی۔ گل پریز کی بے چینی بڑھ گئی۔ جب وہ قریب آئے، تو وہ چونکا۔ ان کے نیزے حملے کی پوزیشن میں تھے اور ان کے چہروں پر کرختگی تھی۔ انھوں نے اس کو گھیر لیا۔

''کیا ہوا دوستو۔ خیریت؟'' اس نے لہجہ دوستانہ رکھنے کی کوشش کی، مگر ان کی جارحیت میں کمی نہیں آئی۔

ایک نے چیخ کر کچھ کہا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ گل پریز گھبرا کر آگے بڑھا، تو ایک اور سپاہی چلایا۔ اس نے نیزہ سیدھا کر دیا، اس کی انی چمکی۔ کسی قوت نے آدمی کے پیر پکڑ لیے۔ وہ جنگ کا خوب تجربہ رکھتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہاں موجود سپاہی اسے اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھا، تو اس کا سر تن سے جدا ہو جائے گا۔

اس نے سر جھکا لیا اور اپنا نیزہ گرا دیا۔

''بھائیو، میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔'' وہ بوکھلا کر چلایا۔

کسی نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ زمین پر آ رہا۔ اگلے ہی لمحے سپاہی اس پر پل پڑے۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ ''بھائیو، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے... میں شاہ کا وفادار ہوں... کسی نے سازش کی ہے۔''

مگر کوئی کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سب اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ اسے لاتوں اور مکوں پر رکھ لیا گیا۔ وہ گریہ کر رہا تھا، شکوہ کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے تلوار کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ ضرب کاری تھی۔ اس پر بے ہوشی نے حملہ کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ایک کونے میں لے گئے۔ اسے رسیوں میں جکڑ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا۔ اس نے بے ہوشی سے قبل انھیں اجنبی زبان میں بڑبڑاتے سنا۔ وہ اُس زبان کا فقط ایک ہی لفظ سمجھ سکا۔ ''دشمن...''

سولھویں صدی کا سب سے پُراسرار واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

☆☆☆

خوف اُسے کبھی چھو کر نہیں گزرا، کوئی ہتھیار زخمی نہ کر سکا، کوئی دشمن شکست نہیں دے سکا، وہ گل پریز تھا... اس کی پرورش وادیوں میں، پہاڑوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی رفتار ہوا سی تھی اور اس کے بازوؤں میں منہ زور لہروں سی قوت تھی مگر اس سمے... وہ بے بسی کی اتھاہ گہرائی میں پڑا تھا۔

مایوسی کے سائے گہرے ہو گئے۔ وہ رسیوں سے بندھا ایک بدبودار اور گھٹن زدہ خیمے میں پڑا تھا۔ رسیاں کسی ہوئی تھیں۔ پیاس سے گلا چیخ رہا تھا۔ بہت دیر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کچھ دیر پہلے ایک شخص آیا۔ وہ اپنے لباس اور چال سے کوئی اعلیٰ افسر لگتا تھا۔ اس نے اجنبی زبان میں کچھ پوچھا۔

گل پریز کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ یہ لوگ کون تھے؟ کچھ پلوں پہلے تو وہ فلپائن میں تھا اور اب... یہاں اجنبی لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ کہاں آ گیا۔ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے؟ کسی سحر کے زیر اثر ہے؟ کسی کی بددعا اسے لگ گئی ہے؟

اس افسر کے سوالوں کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اس کے اشارے پر دو سپاہی آگے بڑھے اور اس پر لاتوں

www.urdusoftbooks.com

کی بارش کردی۔ وہ درد اور ذلت کے احساس سے چلّا اٹھایا۔
''میں ہسپانیہ کا سپاہی ہوں... میرا تعلق بارسلونا رجمنٹ سے ہے... گورنر کا قتل ہو گیا ہے۔''
افسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سپاہی رک گئے۔ آدمی جھکا۔ اس نے چباتے ہوئے کہا۔ ''ہسپانیہ؟''
زخموں سے چور گل پریز نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''میں فلپائن میں تھا... یہ کون سی جگہ ہے؟''
''فلپائن؟'' اعلیٰ افسر نے حیرت سے سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ سب کچھ دیر بڑبڑاتے رہے۔ افسر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے اسے پانی لا کر دیا۔ اس نے گلا تر کیا۔ زندگی بحال ہوتی محسوس کی۔ اس نے دروازے پر تعینات سپاہی کو دیکھ کر منہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ گستاخی سے ہنسا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے خشک روٹی کا ایک ٹکڑا اس کی جانب اچھالا۔
روٹی باسی تھی، مگر اس وقت وہ بھی غنیمت تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ چہار سو سناٹا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔
اچانک شور اٹھا۔ پیروں کی آواز سنائی دی۔ کچھ افراد مشعل لیے اندر داخل ہوئے۔ افسر کے ساتھ کچھ سپاہی تھے۔ انھوں نے گل پریز کو کھڑا کر دیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، تو اس کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کر دیا گیا۔ اس کا منہ خون سے بھر گیا۔
اعلیٰ افسر کے ساتھ ایک خوش لباس آدمی تھا جو اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے چھڑی سے گل پریز کا لباس اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بال اور جوتوں کا جائزہ لیا۔ افسر کے کان میں سرگوشی کی۔ افسر نے سر سے اشارہ کیا تو وہ آدمی گل پریز کی جانب متوجہ ہوا۔
''تم کون ہو؟'' گو آواز کرخت تھی، مگر وہ ہسپانوی میں بات کر رہا تھا۔ گل پریز کو لگا جیسے زندگی لوٹ آئی ہو۔
''شکر ہے بھائی تم ہسپانوی جانتے ہو۔ میں گل پریز ہوں۔ میرا تعلق بارسلونا رجمنٹ سے ہے۔''
مترجم متذبذب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یہ باتیں افسر کو بتائیں۔ کچھ دیر وہ اجنبی زبان میں کچھ کہتا رہا۔
مترجم پھر اس سے مخاطب تھا۔ ''تم محل میں کیسے پہنچے؟''
''میں تو منیلا میں... محل ہی میں تعینات تھا۔ گورنر گومیز کا قتل ہو گیا تھا کل رات۔ یہ کون سی جگہ ہے۔''

مترجم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''غور سے سنو... تم اس وقت میکسیکو میں ہو۔''
''کیا۔'' وہ چلّایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ ''کیوں مذاق کرتے ہو۔ میں تو فلپائن میں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔ ذرا سی نیند لی... اور تم لوگ کون ہو۔ کہیں تم بدمعاشوں نے محل پر قبضہ تو نہیں کر لیا۔''
اس کے چہرے پر ایک اور گھونسا رسید ہوا۔ وہ زمین پر آ رہا۔ مترجم اور اعلیٰ افسر کچھ دیر بعد آپس میں بات کرتے رہے۔ مترجم اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ''ذرا مجھے آج کی تاریخ اور سن تو بتاؤ میرے ہسپانوی دوست۔''
''اکتوبر...'' گل پریز ذہن پر زور دے رہا تھا۔ ''24 اکتوبر 1593۔''
''اور تم کہہ رہے ہو کہ کچھ دیر پہلے تم منیلا میں تھے۔'' اس کا لہجہ استہزا تھا۔ ''بکواس بند کرو اور اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔ تم گورنر کو قتل کرنا چاہتے تھے ناں۔''
''گورنر...'' وہ چلّایا۔ ''ہاں اس کا قتل ہو گیا ہے۔ گورنر گومیز کو کل چینیوں نے قتل کر دیا۔''
''میں منیلا کے گورنر کی نہیں، میکسیکو کے گورنر کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے دانت پیسے۔
''میکسیکو؟'' وہ ہنسنے لگا۔ ''تم پھر مذاق کرنے لگے۔ سچ بتاؤ، تم لوگوں نے منیلا پر قبضہ کر لیا ہے ناں۔ مگر تم چینی تو نہیں لگتے۔''
اس کے سر پر گہری ضرب لگی۔ دنیا تاریکی میں اتر گئی۔
☆☆☆
گل پریز کی کہانی نے میکسیکو کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔
شرفاء کی محافل سے نان بائی کی دکانوں تک... ہر کوئی اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ سپاہی خود تو جیل میں پڑا سڑ رہا تھا، مگر اس کی کہانی اعلیٰ ایوان میں گردش کر رہی تھی... گلی محلوں میں سانس لے رہی تھی۔
اس کی گرفتاری کی اگلی صبح پورے میکسیکو میں یہ خبر پھیل گئی کہ فوج نے ایک ہسپانوی کو گرفتار کیا ہے، جو گورنر کو قتل کرنے آیا تھا اور محل کی فصیل تک جا پہنچا۔
اسی دوپہر اُسے قانونی شوریٰ کے سامنے پیش کیا گیا، جہاں ایک تیز طرار افسر نے یہ سوال اٹھا کر کھلبلی مچا دی کہ ایک ہسپانوی اپنے جنگی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں نیزہ لیے آخر اتنے آرام سے محل تک کیسے پہنچ گیا؟

www.urdusoftbooks.com

اِس سوال کا حل کی حفاظت پر تعینات میکسیکن دستے اور اس کی کمان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک ماہر تفتیشی افسر نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ میکسیکو کے بارے میں کتنا جانتا تھا، شہر کے گلی محلوں کی کتنی خبر رکھتا ہے، اس سے کچھ پُر پیچ سوالات کیے۔

سوالات کے بعد اس نے شوری کے سامنے اعلان کیا۔ ''اس شخص کو میکسیکو کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ یا تو یہ مخبوط الحواس ہے یا بہت بڑا جھوٹا ہے۔''

انھوں نے گل پریز کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ جس جگہ وہ موجود ہے، وہ فلپائن سے نو ہزار میل دور ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک بے کراں غصیل سمندر یعنی بحرالکاہل ہے۔ یہ سفر تیز رفتار جہازوں کی مدد سے بھی کئی روز میں مکمل ہوگا۔

''بہتر یہ ہے کہ تم یہ لغو کہانی بند کرو اور سچ اگل دو۔'' ایک افسر چلّایا۔

''مگر یہی سچ ہے۔'' گل پریز کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ تو وہ خوف زدہ تھا، نہ ہی تشدد اسے توڑ سکا، مگر تحیر نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ ''میں کل دوپہر تک فلپائن میں تھا... اور جانے کیسے میں... ایک پل میں... یہاں اس منحوس جگہ پہنچ گیا۔''

وہ رونے لگا۔ کچھ سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہاں ایک مشہور شاعر بھی قید تھا۔ اس نے اپنا دکھ بھرا قصہ اسے سنایا۔ شاعر نے اس پر یقین تو نہیں کیا مگر ایک دلچسپ قصہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے اس واقعے پر ایک نظم لکھی، جو ایک سپاہی کی مٹھی گرم کر کے باہر پہنچا دی گئی۔ اگلے روز یہ نظم بازاروں میں پڑھی جا رہی تھی۔

بات پھیلتی گئی۔ تین روز بعد ایک ساحر نے یہ دعویٰ کر دیا کہ گل پریز سچ بول رہا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ بڑے میاں، تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو، تو اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''میرے قبضے میں جنات ہے، انھوں نے مجھے خبر دی ہے۔''

کچھ دن بعد چند مذہبی مبلغوں نے اپنے وعظ میں کتاب مقدس کے ان حصوں کا تذکرہ کیا، جن میں ایک فرد کے ایک لمحے میں ایک سے دوسری جگہ پہنچنے کا تذکرہ تھا۔ کچھ سائنس داں اور فلسفی بھی اس قسم کے دعوے کرتے نظر آئے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اسے شیطان کا پجاری قرار دینے کی کوشش کی۔

الغرض گل پریز کا نام اسرار کے پرندے سے جڑ گیا تھا اور اب یہ پرندہ میکسیکو کے آسمان میں گردش کر رہا تھا۔ یہ اعلان کر رہا تھا کہ جیل خانے میں ایک عجیب شخص قید ہے، جو زمان و مکان کی جست

منطقہ معتدلہ جنوبی

ساڑھے تیئس درجے جنوبی عرض بلد سے ساڑھے چھیاسٹھ درجے عرض بلد جنوبی یعنی خطِ جدی سے دائرہ قطب جنوبی کے درمیان واقع ہے۔ اس کو منطقہ معتدلہ جنوبی یا (SouthTemperate zone) کہتے ہیں۔ اس منطقہ میں سورج کی شعاعیں کبھی عموداً نہیں پڑتیں پھر بھی یہاں پر گرمیوں میں کافی گرمی پڑتی ہے اور سردیوں میں اچھی خاصی سردی ہوتی ہے مگر اس کے سالانہ درجہ حرارت کی اوسط منطقہ باردہ کی گرمی کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اور منطقہ باردہ کے مقابلے میں اس کی سردی بھی کم ہوتی ہے چونکہ یہ منطقہ حارہ جتنا گرم اور منطقہ باردہ جیسا سرد نہیں اس لیے اسے منطقہ معتدلہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: رعنا تبسم۔ لاہور

لگا کر یہاں پہنچا ہے... آؤ، اس کی پُراسرار کہانی سنو۔

☆☆☆

زندگی قید میں تھی۔ کوٹھری میں حبس رہتا۔ کھڑکی سے نیلا سمندر نظر آیا کرتا تھا۔

قانونی شوریٰ کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ تفتیش کار بھی کوئی سراغ نہ پا سکے، مگر وہ اس کی کہانی پر اعتبار کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اور وہ کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ بھلا کون مان سکتا تھا کہ وہ ایک پل میں نو ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آ گیا۔ کیا اس کے پاس کوئی جادوئی قالین تھا؟ ایسی باتیں تو بس قصے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت کا ان سے کیا تعلق۔

گل پریز سخت اذیت میں تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا، اس کا سر... جس نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا تھا، تن سے جدا کر دیا جاتا، مگر کیسی بدقسمتی ہے... اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ وہ ہر صبح اپنی محبوبہ کو یاد کر کے روتا۔ اسے لگتا تھا کہ ساری زندگی اسی کال کوٹھری میں کٹے گی۔ کاش کسی طرح وہ اُسے ایک پیغام پہنچا سکتا، یہ خبر دے سکتا کہ وہ زندہ ہے اور آج بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

آخر دو ماہ بعد... اچانک اس کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ ایک تجارتی جہاز میکسیکو کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ وہ فلپائن سے آیا تھا۔ مسافر جہاز سے اترے، تو شہر میں یہ خبر پھیل

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

گئی کہ دو ماہ قبل گورنر گومیز کو چینیوں نے قتل کر دیا تھا۔

جب یہ خبر قانونی شوریٰ کے سربراہ تک پہنچی، تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے فوراً باقی ارکان کو اکٹھا کیا اور جہاز کے کپتان کو بلا بھیجا۔ اس نے بھی خبر کی تصدیق کی۔

پہلی بار انھیں لگنے لگا کہ گل پریز شاید سچ ہی کہہ رہا تھا۔ انھوں نے کپتان سے قتل کی تاریخ دریافت کی۔

''24 اکتوبر 1593۔'' کپتان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ناممکن... یہ نہیں ہوسکتا۔'' ایک افسر چلّایا۔

''کیا ہوا جناب؟'' کپتان گھبرا گیا۔ ''سب خیریت تو ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک افسر کے لب وا ہوئے۔

''کیا تم گل پریز نامی کسی سپاہی کو جانتے ہو؟''

''گل پریز۔'' کپتان کے چہرے پر حیرت تھی۔ ''آپ تک اس کی خبر کیسے پہنچی۔ وہ تو... دو ماہ قبل غائب ہوا تھا۔ بڑا تلاش کیا، مگر کوئی خبر نہیں...''

''وہ یہاں ہے۔ میکسیکو میں۔'' قانونی شوریٰ کے سربراہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

پہلے تو کپتان خوب ہنسا۔ ''حضور، کیوں مذاق کرتے ہیں۔ درمیان میں طویل سفر۔ ہمارا کوئی جہاز یہاں نہیں آیا۔ کیا وہ اڑ کر آ گیا تھا؟''

پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''کہیں وہ... چینیوں کے جہاز میں تو یہاں نہیں پہنچا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا جناب۔''

''ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔'' شوریٰ کے سربراہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد گل پریز ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آج اشرافیہ کو اس کی یاد کیسی آ گئی۔ وہ تو اسے بھلا بیٹھے تھے۔

''اگر ہم تمھیں آزاد کر دیں...'' ہال میں آواز گونجی۔ ''تو تم کیا کرو گے گل پریز؟''

''میں...'' اس نے ہچکی لی۔ ''میں اپنی محبوبہ کے پاس جاؤں گا، اپنے گھر، اپنے گاؤں۔''

''تو جاؤ، ہم تمھیں آزاد کرتے ہیں۔'' شوریٰ کے سربراہ نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ہال میں دیر تک اس آواز کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

''اوہ... مگر... سچ۔ میں آپ کا شکریہ۔'' وہ بوکھلا گیا۔

''جہاز تیار کھڑا ہے گل پریز۔ تیار ہو جاؤ۔''

انھوں نے سکوں کی وہ تھیلی بھی اسے سونپ دی، جو گرفتاری کے وقت انھیں ملی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس بحری جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ ہر شخص اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کے لیے ایک مافوق الفطرت انسان تھا، جس کی جست نے زمان و مکاں کو لپیٹ دیا... جو ایک لمحے میں دنیا کے ایک سے دوسرے کونے میں پہنچ گیا۔

دو روز تک لوگ اس سے دور دور رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ بے ضرر ہے، تب قریب آئے۔ اور تب اس نے انھیں اپنی عجیب و غریب کہانی سنائی، جو نا قابلِ یقین معلوم ہوتی تھی، مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا... گل پریز ان کے سامنے موجود تھا۔

فلپائن جانے کی بجائے وہ مراکش کی بندرگاہ پر اتر گیا۔ کپتان اس بات کے خلاف تھا، مگر وہ فوجی جہاز نہیں تھا۔ گل پریز کسی حکم کا تابع نہیں تھا۔ کپتان نے احتیاطاً میدرد یہ خبر پہنچا دی کہ منیلا میں لاپتا ہونے والا اُن کا سپاہی میکسیکو کی قید میں تھا، جہاں سے اُسے بنا کسی تاوان یا مطالبے کے رہا کر دیا گیا ہے۔

گل پریز کا اندازہ تھا کہ کپتان ایسا ہی کرے گا۔ اس نے منصوبہ بنا لیا تھا۔ مراکش کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اس نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ اس نے سمندری اور بحری راستے تیزی سے طے کیے۔ ایک روز پو پھٹنے سے قبل وہ اپنا گھوڑا لینے میدرد کے فوجی اصطبل پہنچ گیا۔ وہاں آج ایک نوجوان منشی بیٹھا تھا۔

اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور مسلسل کھانس رہا تھا۔

سپاہی نے اپنا نام بتایا۔ منشی نے کھاتہ دیکھا، تو چونکا۔ ''ارے، تمھیں تو فلپائن میں ہونا چاہیے تھا۔''

''میں بیمار پڑ گیا تھا۔'' وہ زور سے کھانسا۔ ''انھیں شک ہے کہ مجھے کوئی متعدی مرض ہے۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' منشی اس کی کھانسی سے گھبرا گیا اور قلم چلانے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا اپنے مالک کو پہچان کر خوشی سے ہنہنایا۔ گھر لوٹتے سمے وہ ایک سرائے کے پاس سے گزرا۔ وہاں بھیڑ تھی۔ وہاں رہنے والے بوڑھے مستقبل میں کا انتقال ہو گیا تھا۔

وہ رکنا چاہتا تھا، مگر رکا نہیں۔ چلتا رہا۔ وہ کسی کی دھڑکن سننے کے لیے بے چین تھا۔ وادی اسے پکار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی محبوبہ کا چہرہ تھا۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

قیامت برپا کردینے والی دوشیزہ کا تذکرہ

عیار حسینہ

شکیل صدیقی

خدا نے اسے حسنِ جہاں سوز کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ اسے دیکھتے ہی جذبات میں مد و جزر کا اٹھنا ضروری تھا۔ اپنی اسی خوبی و خوش شکلی کو اس نے ہتھیار بنایا اور اتحادیوں کو زک پہنچاتی چلی گئی۔

ہم نے صرف اردو کے سطحی ناول پڑھ کر ہی جانا ہے کہ جاسوسی کیا ہوتی ہے جب کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اصلی وہ لوگ، جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے لیے کام کیا تھا۔ درحقیقت انہی کو جاسوس کہا جا سکتا ہے۔ یہ کھیل کو عجیب انداز سے کھیلتے تھے۔ سرحد پار کا کوئی شخص ملک میں آجائے اور اس کے بارے میں شبہ بھی ہو جائے کہ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے تو اسے فوری طور پر نہ تو گرفتار کرتے تھے اور نہ کوئی سزا دیتے تھے۔ اس کے بجائے اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ یہ کیا معلوم کرنے آیا ہے۔ اسے دوست بنا کر اصلیت اگلواؤ اور غلط سلط معلومات اس کے دماغ میں بھر کر اسے واپس بھیج دو۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔

اگر آپ تاریخ کے طالب علم ہیں اور آپ نے بغور اس کا مطالعہ کیا ہے تو آپ ماتا ہری اور کرسٹائین کیلر سے ضرور واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنی عیارانہ حرکتوں سے سیکڑوں فوجی راز اِدھر سے اُدھر کیے۔ ان میں صوفیہ کیرولین بھی شامل ہے۔ اس نے کافی کارنامے انجام دیے، لیکن اس کا نام اخبارات میں نہ آسکا۔ اس لیے کہ سختی سے کوشش کی گئی تھی کہ اس کا نام نہ ابھرے۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی دس برس کے بعد یہ قصہ عام ہوا اور عام افراد اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

یہ 6 جون 1944ء کا واقعہ ہے جب اتحادی افواج نارمنڈی میں اتریں اور انہوں نے جرمنی کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ یہ جنگ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں جاسوسی کا ایک بڑا گورکھ دھندا (نیٹ ورک) تھا جو بہت ہوشیار جاسوسوں نے انجام دیا تھا۔

اس واقعہ کے تانے بانے 1943ء میں شمالی افریقا (الجزائر) میں اتحادی افواج نے بُنے تھے۔ جنرل آئزن ہاور کے ماتحتوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اتحادی افواج اچانک سسلی میں اتار دی جائیں۔ اس منصوبے کے بارے میں انتہائی خاص افسران کے علاوہ کسی کو علم نہ ہو۔ جن افسران کو اس راز کا علم تھا ان میں ایک امریکی بھی شامل تھا جو بلا کا عیاش اور دادِ عیش دینے میں طاق تھا۔ ان دنوں ایک ولندیزی حسینہ سے اس کی محبت کی دل فریب کہانیاں سرِ عام پھیلی ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ حسینہ ولندیزی نہیں تھی، بلکہ جرمن تھی۔ وہ سب کو اپنا نام صوفیہ کیرولین بتاتی تھی۔ بے حد حسین، آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والی، گفتگو میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ۔ اپنے اطوار سے وہ اوچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گفتگو کرتی تو دل موہ لیتی تھی۔

جنرل آئزن ہاور کے انتہائی خفیہ آفس میں یہ منصوبہ

بنایا گیا کہ اتحادی فوجیں سسلی پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیں۔ یہ منصوبہ صبح گیارہ بجے بنا اور شام پانچ بجے حملہ کیا گیا، لیکن جرمنی کو اس کی اطلاع مل چکی تھی، لہٰذا اتحادیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ انہیں ایسی شکست ہوئی کہ وہ پژمردہ اور افسردہ ہوکر بیٹھ گئے۔ انہیں مایوسی ہوئی کہ اب شاید وہ جرمنی کو کبھی شکست نہ دے پائیں۔ اس لیے کہ اس کی جاسوسی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ صبح انہوں نے منصوبہ تیار کیا اور شام سے پہلے جرمنی کو خبر ہوگئی۔

افسران کو یہ کھوج لگ گئی کہ جرمنی کو اس حملے کی خبر کیسے ہوگئی؟ اس لیے کہ ان کی تعداد سسلی میں بہت کم تھی، مگر اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے بھاری فوج طلب کرلی۔ گویا کوئی گھر کا بھیدی تھا جس نے راز افشا کردیا تھا اور اتحادیوں کو ہزیمت اور شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

اس شخص کی تلاش میں سب کوشاں تھے اور اپنے اپنے اندازے سے اس جاسوس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کررہے تھے۔ اچانک وہ امریکی ایک میز پر بیٹھا نظر آیا جس کا نام رچرڈ تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اتنے اداس کیوں ہو؟ اس نے بتایا کہ اس کی محبوبہ صوفیہ کئی دن سے نظر نہیں آرہی ہے، اس لیے دل اداس ہے۔

استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ صوفیہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ جب یہ خبر محکمۂ سراغرسانی تک پہنچی تو انہوں نے میجر رچرڈ کو طلب کرلیا۔ اس سے ٹیڑھے ترچھے اور نوکیلے سوالات کیے گئے تو اس نے قبول کرلیا کہ اس نے صوفیہ کو بتادیا تھا کہ اتحادی سسلی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں خفیہ محکمے کا انچارج جنرل انودن تھا۔ بے حد مستعد اور پھرتیلا۔ سراغرسانی کا ماہر۔ اس کی ماتحتی میں دو افسران کام کرتے تھے۔ ان تینوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اگر صوفیہ اس ریستوران میں دوبارہ نظر آئے تو ہم اس سے کوئی بازپرس نہیں کریں گے اور ایسا رویہ اختیار کریں گے جیسے ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ جب اسے یقین ہوجائے گا کہ اس پر کسی کو شبہ نہیں ہوا ہے تو وہ پھر ہماری ٹوہ میں رہے گی اور کوشش کرے گی کہ کوئی راز لے اڑے۔

ایک ہفتے بعد چند افسران نے ریستوران میں لوگوں کو یہ خبر پہنچائی کہ صوفیہ ہالینڈ سے لندن آچکی ہے۔ ممکن ہے کسی روز اس ریستوران میں بھی وارد ہوجائے۔ یہ خبر دے کر وہ چاہتے تھے کہ سب چوکنا ہوجائیں۔ صوفیہ لندن آکر آزادی سے گھومنے پھرنے لگی۔ وہ ریستورانوں اور ہوٹلوں میں فوجیوں سے ملاقاتیں کررہی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی اصلیت سے اتحادی سراغرساں واقف ہوچکے ہیں کہ وہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے۔

محکمۂ سراغرسانی کے افسران سر جوڑے اس عقدے میں الجھے ہوئے تھے کہ اس سیکرٹ ایجنٹ کو اس بار کون سی ایسی اطلاع دی جائے، جو قطعاً غلط ہو، لیکن جرمن اس پر اعتبار کرلیں۔ انہیں شبہ نہ ہو کہ ان تک پہنچنے والی اطلاع جھوٹی ہے۔ وہ اسے سچ سمجھ کر اس پر عمل کرڈالیں اور منہ کی کھائیں۔

ان دنوں اتحادی نارمنڈی میں اپنی فوجیں اتار رہے تھے اور نئی صف بندی کررہے تھے۔ جرمنی کو اس بارے میں علم تھا اور وہ جوابی حملے کے لیے تیاریاں کررہے تھے۔ اتحادیوں کی طرح سے ان کا محکمۂ سراغرسانی بھی مصروف عمل تھا اور پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

اتحادی سیکرٹ سروس نے یہ خبر پھیلانی شروع کردی کہ وہ نارمنڈی پر حملہ نہیں کریں گے، بلکہ اس بار ان کا ہدف ہالینڈ ہوگا۔ اس لیے کہ جرمنی کو اتحادیوں کا یہ منصوبہ معلوم ہوچکا ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کردی ہے۔ اب یہ راز کسی معتبر افسر کے ذریعے صوفیہ تک پہنچ جاتا تو وارے نیارے ہوجاتے تھے۔ اس لیے کہ ایک طرح سے تصدیق ہوجاتی کہ اتحادی یہ سب کرنے جارہے ہیں۔

اب ایک ایسا خوبرو اور حسین افسر تلاش کرنا تھا جو صوفیہ کے ذہن میں یہ سب بٹھا سکے۔ اس کے انداز میں گرم جوشی ہونا چاہیے تھی، تاکہ صوفیہ کو اس پر شبہ نہ ہوسکے۔ صوفیہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھی اور اسی کے لیول کے لحاظ سے کام کرنا تھا۔ اس لیے کہ سیکرٹ ایجنٹ پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔

اب جعلی طور پر ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جو ہالینڈ کا نقشہ تیار کرے اور جنگ کی علامات کو اس نقشہ پر ظاہر کرے تاکہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ اتحادی خفیہ طور پر جنگ کی تیاری کررہے ہیں۔

اس کے لیے ایک فلم کمپنی بنائی گئی۔ وارڈو اسٹریٹ لندن میں اس کا باقاعدہ آفس اور اسٹوڈیو بنایا گیا۔ اس کمپنی میں سارے افراد ہالینڈ کے بھرتی کیے گئے، جن پر ہٹلر نے مظالم کیے تھے اور اب وہ لندن میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس فلم کمپنی کا کام یہ تھا کہ وہ ہالینڈ کے لوگوں کے بارے میں فلمیں تیار کرے، پمفلٹ چھپوائے اور ان کو ہالینڈ تک پہنچائے تاکہ وہاں کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو اور وہ یقین کرلیں کہ ایک نہ ایک دن اتحادی انہیں ہٹلر کے چنگل سے چھڑا لیں گے۔

www.urdusoftbooks.com

اس کمپنی میں اتحادیوں نے مظلوم ولندیزیوں کی امداد کے لیے اپنے چند افسر بھی متعین کر دیے۔ ان افسران میں ایک گریگ بھی تھا۔ سنہری بالوں والا ایک حسین امریکی۔ انہیں تنبیہ کی گئی کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ اتحادی ہالینڈ میں اپنی فوجیں اتارنے والا ہے۔ یہ کمپنی چند ہفتوں میں خوب کام کرنے لگی۔ یعنی فلمیں بننے لگیں، پمفلٹ چھپنے لگے اور ہالینڈ تک جانے لگے۔ وہاں بھی ایک خوش وخروش پھیل گیا کہ اتحادی انہیں آزاد کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ کمپنی میں کام کرنے والے بھی ولولے سے کام کر رہے تھے کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے کام کر رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ آزادی حاصل کرنے کا باقاعدہ ایک مشن ہے۔

اب اگلا مرحلہ تھا کہ کسی طرح سے صوفیہ اور گریگ کی ملاقات کرائی جائے۔ وہ ایک سنجیدہ افسر تھا اور ہر اعتبار سے معتبر۔ ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اس میں گریگ اور صوفیہ کو بھی بلایا گیا۔ ایک طرف اسٹیج تھا جس پر چند حسینائیں محو رقص تھیں۔ آرکسٹرا جاز کی ایک خوبصورت دھن بجا رہا تھا۔ کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

صوفیہ اس محفل میں کسی نگینے کی طرح دمک رہی تھی۔ اس کی آمد پر ایک افسر ماریو نے اسے خوش آمدید کہا اور ایک وسطی میز کی طرف لے گیا۔ جو خاص طور پر اس کے لیے وہاں رکھی گئی تھی، تاکہ وہ مرکز نگاہ رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ افسر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ گریگ اپنی میز پر تنہا تھا۔ اس لیے اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ کسی لڑکی نے اب تک اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔

محکمۂ سراغ رسانی کا افسر ماریو جو صوفیہ کے ساتھ رقص کر رہا تھا اس نے نہایت عیاری سے کہا کہ اس شخص سے کبھی کوئی سروکار نہ رکھنا۔ وہ سنہری بالوں والا۔ خفیہ کا بڑا افسر ہے، لیکن اسے بہت غرور ہے۔ لڑکیاں بھی اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ یہ جرمنی کے خفیہ ٹھکانوں پر بھی جا کر وہاں کے راز لا چکا ہے۔ اس لیے اس کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

رقص تھوڑی دیر کے لیے ختم ہوگیا۔ سب اِدھر اُدھر ہوگئے۔ جب رقص دوبارہ شروع ہوا تو خفیہ کا افسر ماریو واپس آیا تو اس نے صوفیہ کو گریگ کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک اس کے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔

رقص وسرود کی محفل ڈھائی بجے رات کو ختم ہوئی۔ جن کے پاس اپنی کاریں تھیں وہ ان میں بیٹھ کر واپس چلے گئے، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ٹیکسی کرلی تھی۔ صوفیہ نے اپنے اور گریگ کے لیے ایک ٹیکسی رکوائی تھی۔ صوفیہ کی قیام گاہ کی نگرانی پہلے ہی محکمۂ سراغ رسانی کے لوگ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہیڈ آفس کو اطلاع دی کہ دونوں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

صبح نو بجے کے قریب گریگ وہاں سے نکلا اور محکمۂ سراغ رسانی کے آفس کے لیے اس نے ایک ٹیکسی کی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دل کش لگ رہا تھا۔ اس کے سنہری بال سلیقہ مندی سے کھوپڑی پر جمے ہوئے تھے۔ اس نے وہاں پہنچ کر رپورٹ دی۔ سب اس کی رپورٹ سے مطمئن تھے۔ گریگ کو ہدایت دی گئی کہ وہ دوستی کی پینگیں بڑھائے اور صوفیہ کا ہاتھ نہ چھوڑے۔ اسے ہلکے پھلکے خفیہ رازوں سے بھی آگاہ کرتا رہے۔ یہ راز اسے محکمۂ سراغ رسانی جاری کرے گا۔

جب محکمے نے دیکھ لیا کہ گریگ اور صوفیہ ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے ہیں تو انہوں نے گریگ کو خفیہ کانفرنسوں میں بلانا شروع کر دیا۔ ان کانفرنسوں میں سخت پہرہ ہوتا تھا اور باہر خاردار تاریں پڑی ہوتی تھیں۔ وہاں ہالینڈ پر حملے کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حملہ کب ہوگا اور کتنی فوج وہاں اتاری جائے گی۔ اس کے بارے میں جعلی اور مصنوعی باتیں کی جاتیں تاکہ... گریگ ان سے متاثر ہو اور انہیں صوفیہ تک پہنچا دے۔

اس قسم کی باتیں جاسوس صرف بند کمروں میں بیٹھ کر ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ وہ کسی طرح سے ہٹلر کی سماعت تک بھی پہنچ جائیں۔

لندن میں ہونے والی کانفرنسوں کی روداد گریگ، اپنی محبوبہ دل نواز صوفیہ کو گوش گزار کر دیتا تو وہ انہیں جرمنی پہنچا دیتی۔ اس کے پاس خفیہ افراد کا ایک گروپ تھا جو یہ کام کرتا تھا۔

لندن سیکرٹ سروس نے صوفیہ کو مزید اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے گریگ کو بلا کر حکم دیا کہ چند خفیہ کاغذات لے کر اسے فرانس جانا ہے۔ ایک خفیہ طیارہ اسے وہاں تک لے جائے گا۔ یہ طیارہ اسے رود بار انگلستان کے پار لے جائے گا اور جرمن افواج کے عقب میں اتارے گا۔ وہاں اس سے ایک جاسوس آکر ملے گا۔ یہ کاغذات اسے دینا ہیں۔ تمہیں کل رات بارہ بجے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ فلاں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤ۔

وہ سراغ رساں جو صوفیہ کے گھر پر متعین تھے، انہوں نے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اطلاع دی کہ گریگ جاتے وقت صوفیہ سے بھی ملا تھا۔

اتحادیوں کے جاسوسوں نے جرمنی سے اطلاع دی کہ لندن کے خفیہ محکمے سے ہٹلر کو اطلاع ملی ہے کہ ایک جاسوس انگلستان سے فرانس کے ساحل پر فلاں وقت اترے گا۔ وہ چند کاغذات کسی اور جاسوس کو دے گا۔ جو جاسوس لندن سے آرہا ہے، اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے، اسے گرفتار بھی نہ کیا جائے۔ البتہ اس جاسوس پر کڑی نگاہ رکھی جائے جسے خفیہ کاغذات ملیں گے۔

گریگ حفاظت سے فرانس پہنچ گیا اور اس نے وہ کاغذات جاسوس کے حوالے کر دیے۔ اس جاسوس نے ایسی نشانیاں بتائی تھیں کہ اس نے یقین کر لیا۔ اس کے بعد وہ پھر طیارے میں بیٹھا اور وہاں سے لندن واپس پہنچ گیا۔ البتہ اس جاسوس کو جرمن نے ہلاک کر دیا۔

جرمن سیکرٹ سروس میں صوفیہ کے اس کارنامے کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ معتبر سمجھی جانے لگی۔ مگر خفیہ کے چند جنرلوں کو اب بھی شک وشبہ تھا۔ جب ان کے شک وشبے کی خبریں لندن آفس تک پہنچیں تو انہیں تشویش ہوئی کہ کسی طرح سے ان کا شبہ دور کیا جائے۔ تاکہ جرمن یہ سمجھنے لگیں کہ اتحادی واقعی نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے اس سلسلے میں دو ترکیبیں سوچیں، یہ دونوں کامیاب رہیں۔ ایک یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنی کارروائیاں تیز کرنے کا حکم دیا جائے جو ہالینڈ میں مصروف عمل ہیں۔ ان کے ایک سربراہ کو خفیہ طیارے کے ذریعے لندن بلایا گیا۔ گفتگو تسلی بخش نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ وہ ولندیزی تھا اور اسے ایک انگریز سے بات کرنا تھی۔ ایک مترجم کی ضرورت پڑی۔ اس کے بغیر کام نہیں چل رہا تھا۔ ایسا کوئی مترجم جس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جاسکے، ملنا دشوار تھا۔

گریگ نے بتایا کہ صوفیہ نامی ایک لڑکی اس کی دوست ہے اور ہالینڈ کی رہنے والی ہے۔ وہاں کی بولی اچھی طرح سے سمجھ لیتی ہے۔ سیکرٹ سروس نے اس کا نام اور پتا لے لیا اور کہا کہ ہم اس لڑکی کو یہاں بلائے لیتے ہیں۔ اگر وہ قابل اعتماد ہے تو اس کے سامنے ولندیزی سے گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بھی سیکرٹ سروس کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ولندیزی ایجنٹ کے سامنے ہالینڈ پر حملہ کرنے کا منصوبہ زور و شور سے پیش کیا جائے تاکہ صوفیہ کو سو فی صد یقین آجائے کہ اتحادی یہی کچھ کرنے والے ہیں۔ وہ پورے وثوق سے جرمنی کو یہ اطلاع دے گی اور بتائے گی کہ سیکرٹ سروس میں یہ سب تانے بانے بنے جا رہے ہیں۔

ولندیزی نے جو کچھ کہا وہ صوفیہ نے ترجمہ کر کے خود انگریزوں کو بتایا کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں اور ان کی فوجی تیاری بالکل مکمل ہے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی، لیکن دل ہی دل میں خوش تھی کہ وہ انتہائی خفیہ رازوں کی امین بن رہی ہے۔ یقیناً قدرت اس پر مہربان تھی کہ اس کی کوشش کے بغیر انمول اور بیش بہا چیزیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

چند انگریز سیکرٹ ایجنٹ اچھی طرح سے ولندیزی جانتے تھے تاکہ ان سے گفتگو کر سکیں، اس وقت بھی وہ سب کچھ سمجھ رہے تھے مگر بدھو بنے ہوئے تھے، تاکہ صوفیہ کو بیچ میں ڈال کر بات جرمنی تک پہنچائی جاسکے۔ مترجم کی حیثیت سے اس کا کام ختم ہو گیا تو اسے چھٹی دے دی گئی۔ صوفیہ نے اپنے ذرائع سے یہ خبر جرمنی تک پہنچا دی کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے میں سنجیدہ ہیں اور اس موضوع پر ہالینڈ کے ایک مقامی سیکرٹ ایجنٹ سے میرے توسط سے گفتگو کر رہے تھے۔

جرمنی نے نارمنڈی سے فوجیں ہٹانے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ اس بات کی تصدیق ان اتحادی سیکرٹ ایجنٹوں نے بھی کی جو نارمنڈی میں کام کر رہے تھے۔ اتحادیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ مچھلی نے بالآخر چارہ کھا لیا۔ انہوں نے صوفیہ کو اس فلم کمپنی میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اس نے منظور کر لی۔ اس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کرنا چاہتے تھے۔ یہ انتہائی خفیہ کام وہ انہی کے سیکرٹ ایجنٹ سے لے رہے تھے۔

اسٹوڈیو اور فلم کمپنی کا کام چوبیس گھنٹے ہونے لگا۔ اداکاروں کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ کیمرے چلنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ فلمیں بننے اور ریلیز ہونے لگیں۔ پوسٹر خفیہ طریقوں سے ہالینڈ لے جائے گئے تاکہ جوش وخروش میں اضافہ ہو سکے اور منظر میں سچائی کا رنگ بھرا جاسکے۔

صوفیہ کو انہوں نے چونکہ کھلی چھٹی دے رکھی تھی، چنانچہ وہ فلم کمپنی میں استعمال ہونے والے کاغذات کی کاپیاں کرا کے ہالینڈ بھیج دیتی تھی۔

میجر گریگ اس بات سے لاعلم تھا کہ صوفیہ دشمنوں کی ایجنٹ ہے اور وہ جرمنی کو لندن سے اطلاعات فراہم کر رہی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ سارا بھانڈا پھوڑ دیتا ایسی

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

صورت میں اسے گرفتار کر کے اس کے انجام تک پہنچانا ضروری ہو جاتا۔ اس طرح سے بنا بنایا کھیل خاک میں مل جاتا اور وہ کسی صورت بھی ہالینڈ تک یہ اطلاعات نہ بھیج پاتے کہ اتحادی وہاں حملہ کرنے والے ہیں۔

صوفیہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے اور ان کے لیے جاسوسی کر رہی ہے، اس کا علم معدودے چند افراد کو تھا۔ ایک سیکرٹ سروس کا سربراہ جنرل کوون اور دو اس کے معاونین۔ حد یہ ہے کہ میجر گریگ جو شب و روز اس کی بانہوں میں وقت گزارتا تھا وہ بھی اس سے ناواقف تھا۔ وہ ایک اچھا سیکرٹ ایجنٹ تھا مگر صوفیہ نے اسے ہوا ہی نہیں لگنے دی تھی۔

اتحادی اپنی جگہوں پر محتاط تھے تاکہ اس بار ان کا وار بالکل نشانے پر بیٹھے اور وہ ہٹلر کو شکست سے دوچار کر سکیں۔ ہٹلر کی خفیہ تنظیم گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو چکمہ دینا آسان کام نہ تھا۔ اتحادیوں کو اس مرحلے سے بہ خیر وخوبی گزرنا تھا۔ اسی پر ان کی کامیابی کا انحصار تھا۔

اسی اثنا میں اتحادیوں کے سیکرٹ ایجنٹوں نے ہیڈ آفس تک یہ خبر پہنچائی کہ ہٹلر کو اس ماسٹر پلان کی تلاش تھی، جس کی رو سے اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ کہاں کتنا اسلحہ استعمال کریں گے اور فوجیوں کی تعداد کہاں پر کتنی ہوگی۔ حملے کا آغاز کہاں سے اور کس وقت کیا جائے گا۔ اس ماسٹر پلان کو حاصل کرنے کے لیے اس نے گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو لندن بھیجا۔ اس کی ہدایت تھی کہ ہر کام احتیاط سے کیا جائے۔

دوسری طرف اتحادی کسی احتیاط کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ کسی طرح سے نقلی اور جعلی نقشہ جرمنی پہنچ جائے تاکہ جرمنی کو یقین ہو جائے کہ اتحادی افواج نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والی ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے ایک نقشہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا تاکہ ہٹلر کی سیکرٹ سروس گستاپو کے جوانوں کو چکمہ دیا جاسکے۔ نقشہ مہارت سے بنایا گیا تھا اور ویسا ہی تھا کہ جیسا کہ جنگ کے زمانے میں بنایا جاتا ہے اور اس کے مطابق فوج کو حرکت دی جاتی ہے۔ اس نقشے کو دیکھ کر ہٹلر کو سو فی صد یقین آ جاتا۔ نقشہ تیار ہونے کے بعد اتحادی سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کسی طرح سے صوفیہ کو اس کی چوری کی ترغیب دی جائے۔ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہونے کی وجہ سے اس کے کیے ہوئے کام کی قدر و قیمت زیادہ تھی۔ ہر شخص اس پر اعتبار کر لیتا۔

سیکرٹ سروس کے سربراہ کوون نے تین بار اپنی چابیاں میز پر یوں رکھ دیں جیسے بھول گیا ہو۔ مگر جب اس نے واپس آکر دیکھا تو چابیاں ویسے ہی اس جگہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ایک بار کوون، گریگ کے گھر پر بھی گیا اور اس کی میز پر چابیاں بھول کر چلا آیا تاکہ وہ صوفیہ تک پہنچ جائیں اور وہ ان کی نقل تیار کرالے۔

ایک دن سیکرٹ ایجنٹ کے سربراہ کوون نے نقشہ اپنی تجوری سے نکالا۔ پھر گریگ اور صوفیہ کی موجودگی میں ان سے مشورہ لیا۔ اس کے بعد اسے پھر تجوری میں رکھ دیا۔ اس نے گریگ سے کہا کہ اس نے بہت دنوں سے کسی اچھے ریستوران میں کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ صوفیہ تنہائی میں اس نقشے کو تجوری سے نکال کر اس کی کاپی کرالے۔

جب صوفیہ کو کھلا موقع مل گیا تو اس نے تجوری کی چابی سے اسے کھولا۔ چابی اس نے پہلے ہی بنوار کھی تھی۔ اس نے دو چابیاں تیار کرا رکھی تھیں۔ تجوری کھل گئی تو اس نے نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا۔ اس کے پاس ننھا سا خفیہ کیمرا تھا۔ اس نے اپنے وینٹی بیگ سے اسے نکالا اور نقشے کی تصاویر کھینچنا شروع کر دیں۔ اس نے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد نقشے کو تجوری میں رکھا اور اسے بند کرنے کے بعد سیکرٹ سروس کے آفس کو بند کیا اور وہاں سے نکل آئی۔ وہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی۔ سیکرٹ سروس کا آفس تھا۔ اس کی ہر حرکت کو نوٹ کیا جا رہا تھا مگر چیف کی ہدایت تھی کہ اسے روکا ٹوکا نہ جائے۔ اس کی کامیابی حقیقت میں ہماری کامیابی ہے۔

صوفیہ کو معلوم تھا کہ وہ نقشہ اتنا قیمتی ہے کہ جس کسی کے ہاتھ لگے گا وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے گا۔ چنانچہ اسے خود جرمنی جانا چاہیے۔ اس نے اپنے وسائل استعمال کیے اور جرمنی پہنچ کر ہائی کمان کو وہ نقشہ پیش کیا۔ ہٹلر اور اس کے جنرلوں نے اس پر اعتبار کر لیا کہ نقشہ درست ہے اور اس کے مطابق عمل ہونے جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہالینڈ میں فوج جمع کی اور اس کی صف بندی کر ڈالی۔

6 جون 1944ء کا سورج ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اتحادی افواج نے نارمنڈی کے ساحل پر اتر کر دھاوا بول دیا۔ یوں ہٹلر کا سورج جو نصف نہار پر پہنچا ہوا تھا غروب ہو گیا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بدنصیب

کشمالہ حسن

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا مقدر بدنصیبی ہوتی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کرلیں لیکن قسمت کو ان پر رحم نہیں آتا۔ اچھا کام بھی کریں تو وہ برا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی چند مشہور شخصیت کا ذکرِ خاص جن کی تلاش میں بدقسمتی رہی ہے۔

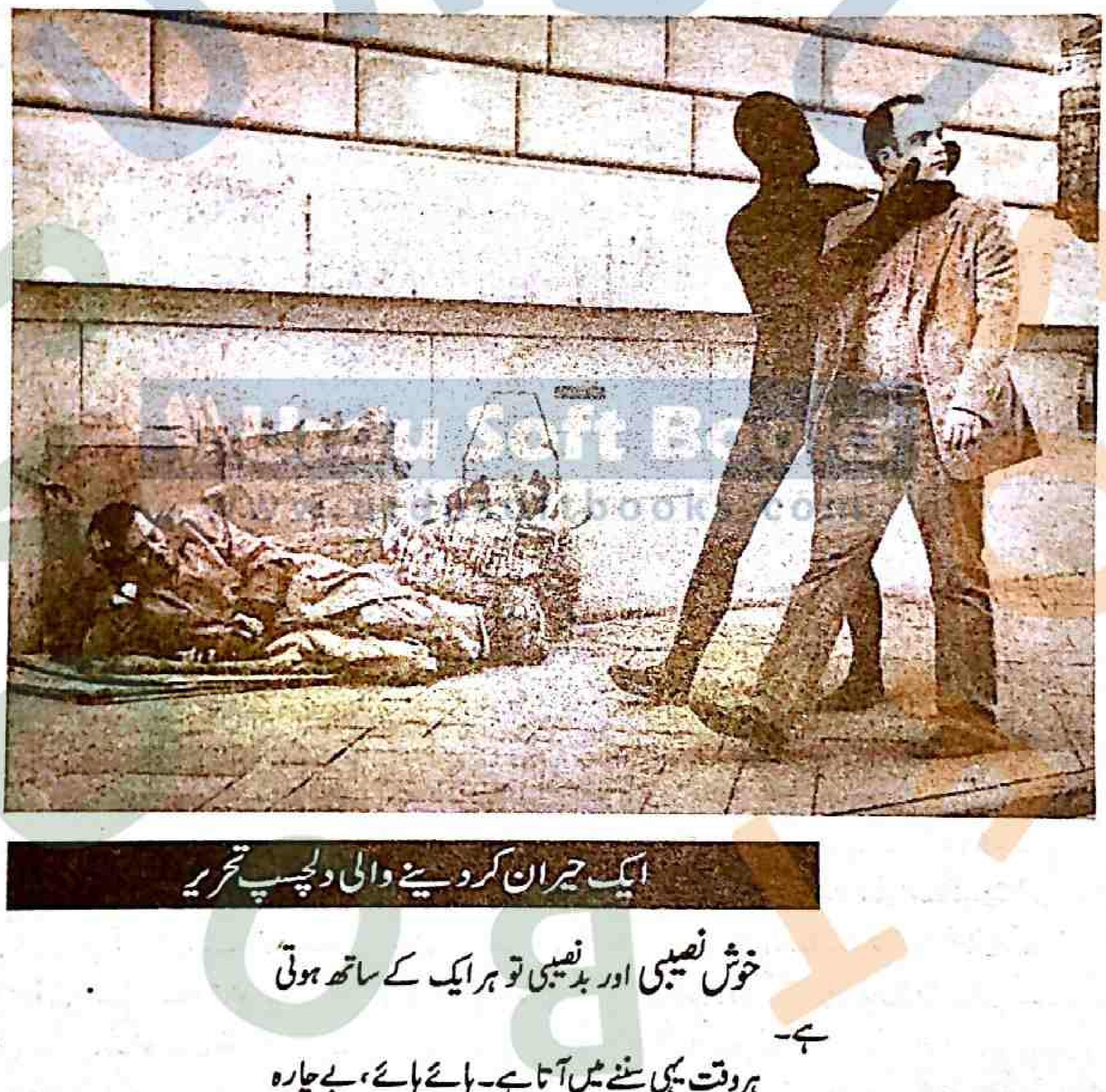

ایک حیران کردینے والی دلچسپ تحریر

خوش نصیبی اور بدنصیبی تو ہر ایک کے ساتھ ہوتی ہے۔

ہر وقت یہی سننے میں آتا ہے۔ ہائے ہائے، بے چارہ کتنا بدنصیب ہے یا کتنا منحوس ہے یا پھر یہ کہ واہ وا قسمت ہو تو ایسی ہو۔ کل تک سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا اور آج کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہ سب انسان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پیٹ بھر کر بدقسمت ہوتے ہیں۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

آیئے دنیا کے عظیم الشان بدنصیبوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

1-اسپین میں ہر سال کرسمس کی خوشی میں ایک لاٹری نکلتی ہے۔ اس کا نام ''ایلی گورڈو'' ہے۔ اس کی مالیت کروڑوں میں ہوتی ہے اور جس کی یہ لاٹری نکل آئے۔ اس کی قسمت بدل جاتی ہے اس کے پاس بینک بیلنس، شاندار گھر، کاروبار سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے دولت چیز ہی ایسی ہے۔

اسی اسپین میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام سوڈیڈو ہے۔ اس قصبے میں صرف ستر اسی گھر ہیں، گھر کیا عالیشان علاقے ہیں۔ کیونکہ اس قصبے کے ہر شخص کی لاٹری نکل چکی ہے۔ سب کے سب کروڑ پتی ہو چکے ہیں لیکن کسی نے اس علاقے سے کہیں دور جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ سب کے سب وہیں رہے صرف اپنے چھوٹے گھروں کو عالیشان بنوالیا۔

اور ان ہی گھروں کے درمیان ایک گھر بے چارے کاسٹس کا بھی ہے۔ اس نے ہر سال لاٹری کا ٹکٹ خریدا ہے۔

ایک بار تو اس نے اپنا ٹریکٹر بیچ کر درجنوں ٹکٹ خرید لیے۔ لیکن لاٹری نہ نکلنی تھی نہ نکلی جبکہ اسی سال اس کے پڑوسی کی نکل آئی۔

دوسرے سال اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ فروخت کر کے پھر درجنوں ٹکٹ خرید لیے لیکن نتیجہ وہی رہا۔ یعنی لاٹری نہیں نکلنی تھی نہیں نکلی۔ اور اتفاق سے ایک اور شخص کی نکل آئی جس کے پاس صرف دو ٹکٹ تھے۔

خوش قسمتی اس قصبے کے ہر شخص کے دروازے پر دستک دے چکی ہے۔ سوائے کاسٹس کے۔ اب ہے کوئی اس کا علاج۔

2-اب آجائیں ایک دوسرے بدنصیب کی طرف۔

اس بے چارے کا نام ہے رے سلوین۔ ورجینیا کے نیشنل پارک کے نگرانوں میں سے ایک ہے۔ بس یوں ہی سی آمدنی ہے اس کی۔

ایک بار اس کو ایک دوسرے شہر میں ایک بہت اچھی جاب کی آفر ہوئی۔ تنخواہ بھی بہت اچھی تھی اور دیگر مراعات بھی تھیں۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ گھر سے نکلا۔

اس دن موسم بھی خوش گوار تھا اور خود سلوین کا موڈ بھی خوش گوار تھا۔ اس کو بس کے ذریعے جانا تھا۔ گھر سے اسٹاپ کا فاصلہ بس پانچ منٹ کا تھا۔

ابھی گھر سے نکلا ہی تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے موسم کے تیور بدل گئے۔ کالے کالے بادل امڈ آئے۔ بارش ہونے لگی۔

خیر یہ سب تو وہاں کے لیے عام سی بات ہے۔ خاص بات یہ ہوئی کہ زور زور سے بجلیاں چمکنے لگیں اور ابھی وہ بے چارہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ ایک زور کا تڑاکا ہوا۔ پھر اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس پر بجلی گر گئی تھی۔

اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے بچا لیا گیا، یہ اور بات ہے کہ وہ دو مہینوں تک اسپتال میں رہا تھا۔ اس کے بعد ظاہر ہے وہ نوکری تو اس کے ہاتھ سے چلی ہی گئی۔

اس کی ایک جاننے والی لڑکی تھی۔ پہلے وہ ورجینیا ہی میں رہتی تھی، سلوین۔ وہ اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ پرابلم بس یہی تھی کہ سلوین کی آمدنی ابھی زیادہ نہیں تھی۔

پھر یہ ہوا کہ اس لڑکی کے والدین کیلی فورنیا چلے گئے۔ جہاں لڑکی کے باپ نے کوئی کاروبار شروع کر دیا اور اچھا خاصا بزنس ہو گیا۔

لڑکی نے اپنے باپ سے جب سلوین کا ذکر کیا تو وہ سلوین سے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے نہ صرف تیار ہو گیا بلکہ اس نے یہاں تک آفر کی کہ سلوین چاہے تو اس کی فرم بھی جوائن کر سکتا ہے۔

سلوین کو جب یہ خبر ملی تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا اس نے اپنی پرانی ملازمت چھوڑ دی اور کیلی فورنیا کے لیے روانہ ہو گیا۔

راستے میں اس پر پھر بجلی گر پڑی۔ جی ہاں بجلی دوبارہ گری۔ اس بار پورے ایک سال تک اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

پھر کہاں کی نوکری اور کہاں کی لڑکی۔ دونوں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

اس کے بعد بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔

جب بھی اس کا کوئی کام بننے والا ہوتا، اس پر بجلی گر پڑتی (محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً) خدا جانے بجلیوں کو اس سے کیا دلچسپی ہو گئی تھی۔

انتہا یہ ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر بھی بجلی گر پڑی تھی۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

اب ایک اور خاتون کا حال سن لیں۔

ان کا نام ہے۔میلانی مارٹینیز۔انہوں نے تو حد ہی کر دی۔ان کا شوق ہے ساحل کے قریب مکان بنا کر رہنے کا۔

اتنے وسائل تو نہیں تھے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح ساحل کے قریب ایک مکان بنا ہی لیا۔اپنے خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر پالی۔

موصوفہ چونکہ آرٹسٹک مزاج کی بھی ہیں۔اسی لیے انہوں نے مکان کی ڈیکوریشن بھی اسی انداز سے کی۔تکمیل کے بعد خاندان والوں اور احباب کو بلا بلا کر مکان دکھاتی رہیں۔

سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور ان کی تعریف کرتے رہے۔لیکن ایسا صرف ایک ہی مہینے ہوا تھا کہ ایک زبردست طوفان آیا۔ 1965ء کے ریکارڈ کے مطابق اس طوفان کا نام بیسٹی (Basti) تھا۔ اس خطرناک طوفان نے ان کے خوب صورت خوابوں کے محل کو اڑا کر رکھ دیا۔

ان کی خوش قسمتی تھی کہ یہ خود بچ گئیں لیکن ان کا مکان کھنڈر ہو گیا۔کچھ بھی نہیں رہا۔بہر حال روتی پیٹتی ہوئی دن گزارنے لگیں لیکن ساحل پر رہنے کا شوق ختم نہیں ہوا۔

جیسے تیسے کر کے انہوں نے ساحل پر ایک دوسرا مکان بھی بنوالیا۔یہ مکان بھی بہت خوب صورت تھا اور یہ بات ہے 1985ء کی۔اور مکان مکمل ہونے کے تین ماہ بعد پھر ایک طوفان آگیا۔اس کا نام جرآن (Juarn) تھا۔بے چاری ایک بار پھر برباد ہوگئی۔

بہر حال ہمت والی خاتون ہیں ایک بار پھر کوشش کی اور 1985ء کے بعد 1998ء میں پھر ایک مکان بنوالیا۔

اور اس بار جو طوفان آیا۔اس کا نام جارج تھا۔اور جارج نے بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پچھلے دو طوفان کر چکے تھے۔یعنی مکان پورے کا پورا برباد ہو گیا۔

اب کے وہ امریکا کے دوسرے ساحل پر جا کر آباد ہوگئیں۔یہاں انہوں نے کوئی مکان نہیں بنوایا تھا۔بلکہ کرائے کا مکان لیا تھا لیکن طوفان کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔اس نئے مکان میں آئے ہوئے چھ مہینے ہوئے تھے کہ کترینہ نام کا طوفان آگیا۔ بات ہے 2005ء کی۔

اس بار کرائے کا مکان بھی تباہ ہوگیا اور اب لوگ انہیں مشورہ دے رہے تھے کہ خدا کے لیے تم اب کسی پہاڑ پر جا کر رہو۔ہو سکتا ہے وہاں کوئی طوفان نہ آئے۔

ایک اور صاحب ہیں۔برطانیہ کے جان کلامٹ۔

ان کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے لیکن ان کے بارے میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ موصوف خوش قسمت زیادہ ہیں یا بدقسمت زیادہ ہیں۔

جب وہ صرف چار سال کے تھے تو کھیلتے کھیلتے گر پڑے۔ان کے ایک ہاتھ میں فریکچر ہو گیا۔ان کو فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔یہاں وہ دو مہینے رہے۔دو مہینے کے بعد جب ٹھیک ہو گئے تو اسپتال والوں نے فارغ کر دیا۔اسپتال سے گھر جس بس میں آرہے تھے۔اس بس کو حادثہ ہو گیا اور اس بار بھی ان کا وہی ہاتھ فریکچر ہوا۔جو پہلے ہو چکا تھا۔گھر واپس لے جانے کے بجائے انہیں دوبارہ اسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد یہ حادثوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک کے بعد ایک حادثہ۔اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جہاں بھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی ہونے لگتی ہے ان کے ساتھ حادثہ پیش آجاتا ہے اور ایک بار پھر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔

ان کے بارے میں دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ یعنی خوش قسمت بھی اور بدقسمت بھی۔بدقسمت اس لحاظ سے کہ ان کا کوئی کام بن نہیں پاتا اور حادثے ہوتے رہتے ہیں اور خوش قسمت اس لحاظ سے کہ ہر حادثے میں ان کی زندگی بچ جاتی ہے۔

سوٹو سویا راگاشی۔

ان جاپانی بڑے میاں کے لیے یہ بات یقینی ہے کہ جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے۔یہ جاپانی شخص دنیا کا واحد انسان ہے جس کا ایٹم بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکا اور اپنی طبعی موت مرا۔

6 اگست 1945ء کو یہ شخص ہیروشیما میں تھا۔جب اس شہر پر ایٹم بم ایک قیامت بن کر گرا تھا۔اس کی تباہ کاریوں کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ کیا ہوا تھا۔

بہر حال سوٹو سویا راگاشی اس ایٹمی حملے میں بھی محفوظ رہا۔اس کے خاندان کے کچھ لوگ بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

Urdu Soft Books

وہ ان زخمیوں کو لے کر ناگاساکی چلا گیا۔

اور ابھی وہاں پہنچ کر دم ہی لیا تھا کہ دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرا۔ اس نے اپنے ساتھ جو زخمی لائے تھے وہ سب مر گئے۔ اور لطف یہ ہے کہ سوٹویار اگاشی زندہ رہا۔ بعد میں اس کی موت طبعی ہوئی۔

اب ایک اور دلچسپ واقعہ سن لیں۔

یہ واقعہ ہے رابرٹ لنکن کا۔ یہ شخص تین اہم ترین آدمیوں کی موت کا سبب بن گیا اور وہ تینوں امریکی صدر تھے۔

رابرٹ لنکن مشہور امریکی صدر لنکن کا بیٹا تھا۔

جب لنکن صدر ہوا تو ایک پُروقار صدارتی تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں رابرٹ لنکن بھی شریک تھا۔ ظاہر ہے اس کا باپ امریکا کا صدر بننے جا رہا تھا۔

پھر لنکن کا انجام سب جانتے ہیں۔ اس کو قتل کر دیا گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک اتفاق یا حادثہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بہت دنوں کے بعد گارفیلڈ صدر بنا۔

صدارتی تقریب میں رابرٹ لنکن کو بھی بلایا گیا کیونکہ وہ ایک معزز شہری تھا اور کچھ عرصے کے بعد بے چارے گارفیلڈ کا بھی قتل ہو گیا۔

خیر یہ بھی ایک اتفاق سمجھا گیا۔

اس کے بعد صدر میکنلے کی صدارتی تقریب ہوئی۔ اس میں بھی یہ مدعو تھے اور کچھ عرصے کے بعد میکنلے کا بھی قتل ہو گیا۔

اس کے بعد رابرٹ کو پھر کسی صدارتی تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا۔

ہیری نیکسن ایک لاابالی شخص تھا۔ اس کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے۔

ہیری اپنے دو دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے گیا تھا۔ اس کا وفادار اور تربیت یافتہ کتا بھی اس کے ساتھ تھا۔

ایک جگہ کچھ فاصلے پر ڈائنامیٹ کی ایک اسٹک پڑی ہوئی تھی۔ کتے نے یہ سمجھا کہ اس کے مالک نے یہ اسٹک پھینکی ہے کہ وہ اسے اٹھا کر لے آئے۔

کتا دوڑتا ہوا گیا اور اسٹک کو دانتوں میں دبا کر ہیری کی طرف واپس آنے لگا۔ ہیری نے کتے کو آوازیں دے دے کر منع کرنا شروع کر دیا۔ لیکن کتا کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے ہیری کی طرف دوڑ لگا دی اور اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہیری بے چارہ اس اسٹک سے بچنے کے لیے دوڑا جا رہا تھا اور وہ کتا اس کے پیچھے تھا۔

جبکہ اس کے دونوں دوست بھی اپنی جگہ کھڑے کھڑے شور کیے جا رہے تھے۔ لیکن کتا کہاں ماننے والا تھا۔ اسے تو ہر حال میں وہ اسٹک اپنے مالک تک پہنچانی تھی اور اس نے وہ اسٹک اس طرح پہنچائی کہ خود تو پھٹ ہی گیا اس کے ساتھ بے چارہ ہنری بھی پھٹ گیا۔

ہے نہ دلچسپ اور افسوسناک صورتِ حال۔

یہ بھی ایک کہاوت ہے کہ جس طرح دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے اسی طرح ہر گولی پر بھی مرنے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔

ایسا ہی زگ لینڈ کے ساتھ ہوا تھا۔

یہ واقعہ گرچہ بہت پرانا ہے لیکن جب بھی سنیں حیرت ہی ہوتی ہے۔

ہوا یہ کہ زگ لینڈ نے اپنی محبوبہ سے بے وفائی کرتے ہوئے اس سے ناطہ توڑ لیا۔ محبوبہ بے چاری اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اس نے خودکشی کر لی۔

اس لڑکی کا ایک بھائی تھا۔ جس کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ وہ زگ لینڈ کو مارنے کے ارادے سے اس کے گھر پہنچ گیا۔ زگ لینڈ اس وقت اپنے باغ میں تھا۔

محبوبہ کے بھائی نے اسے دیکھتے ہی گولی چلا دی۔ زگ لینڈ ایک چیخ کے ساتھ گر پڑا۔ یہ دیکھ کر محبوبہ کے بھائی نے خود کو بھی گولی مار لی۔

وہ تو خیر مر گیا۔ لیکن زگ لینڈ نہیں مرا تھا۔ گولی اس کے گال پر صرف خراش ڈالتی ہوئی ایک بڑے درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی تھی۔

کئی برسوں کے بعد زگ لینڈ نے اس درخت کو گرانے کے لیے اس میں ڈائنامائٹ لگا دیا۔ دھماکا ہوتے ہی وہی گولی پوری رفتار سے نکلی اور زگ لینڈ کے دل میں پیوست ہو گئی اور وہ اسی وقت مر گیا۔

یعنی اس کے نام کی گولی پر اس کا نام تو لکھا ہوا تھا لیکن وہ وقت اس کی موت کا نہیں تھا۔ اور جب موت کا وقت آیا تو گولی کسی نے نہیں چلائی پھر بھی وہ گولی سے مر گیا۔

تو اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا عجائب خانہ ہے بھائی۔ ذرا ارد گرد دیکھو تو سہی۔ واقعات ہی واقعات ہوں گے۔

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالمِ رنگ و بو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرئہ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا بارہواں حصہ

ہم نے گزشتہ قسط تک دیکھ لیا کہ 1800ء سے 1899ء تک دنیا نے تیز رفتار ترقی کر لی۔ اب ہم 1800ء سے 1899ء تک کی اہم شخصیات پر سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ سب سے پہلے جان ڈالٹن کو دیکھتے ہیں۔

یہ ایک انگریز سائنس دان تھا۔ اس نے سائنس کی دنیا میں ایٹمی مفروضہ متعارف کروایا۔ اس طور اس نے وہ بنیادی کلیہ فراہم کر دیا جس نے کیمیا میں بے پناہ ترقی کی راہ ہموار کی۔

ڈالٹن شمالی انگلستان کے ایک دیہات میں 1766ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گیارہ برس کی عمر میں مکمل کی۔ جب کہ اپنی سائنسی تعلیم کا خرچ خود برداشت کیا۔ وہ وقت سے پہلے ہی ۔۔۔ ایک پختہ آدمی بن گیا تھا۔

بارہ سال کی عمر میں اس نے تدریس کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ جب وہ چھبیس برس کا تھا تو مانچسٹر میں رہائش اختیار کر لی اور

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اپنی موت تک وہیں رہا۔

اس نے گیسوں کی ہیئت سے متعلق دو بنیادی قوانین دریافت کیے۔ اس سے پہلے ایٹمی مفروضہ پر لوگ یقین کر چکے تھے۔ جیسے یونان کا دیمقراطفوس لیکن وہ غیر واضح تھے۔ ڈالٹن نے بہت واضح طور پر اس کے جزئیات بیان کیے۔

ان ہی سو برسوں کا ایک اور اہم کردار بیتھو ون تھا۔

دنیا کا عظیم ترین موسیقار لڈوگ وان بیتھو ون 1770ء میں جرمنی کے شہر بون میں پیدا ہوا۔

ابتدائی عمر ہی میں اس نے اپنے جوہر کا لوہا منوا لیا تھا۔ اس کی ابتدائی کاوشیں 1783ء میں چھپیں۔ نوجوانی میں وہ ویانا گیا جہاں ملاقات مختصر رہی۔

1792ء میں وہ دوبارہ ویانا گیا اور کچھ مدت کے لیے ہائیڈن سے حصول علم کیا۔ اس کے بعد بیتھو ون تمام عمر ویانا ہی میں رہا۔

پیانو بجانے میں اس کی مہارت نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ وہ بطور استاد اور فنکار نہایت کامیاب رہا تھا۔

ایک حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کا یہ عظیم موسیقار نوجوانی ہی میں بہرہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی مہارت سے یہ ثابت کر دیا کہ جو شخص کچھ کرنا چاہے اسے اس کی جسمانی معذوری بھی روک نہیں سکتی۔ وہ 57 برس کی عمر میں 1827ء میں ویانا میں فوت ہوا تھا۔

چارلس ڈارون 1809 سے 1882 عیسوی۔

فطری انتخاب کے طریقے سے عضویاتی ارتقا کا نظریہ پیش کرنے والا چارلس ڈارون 12 فروری 1809ء کو انگلستان کے شہر شیروز بری میں پیدا ہوا۔ سولہ برس کی عمر میں وہ طب کی تعلیم کے لیے ایڈن برگ یونیورسٹی میں داخل ہوا لیکن اس کی منزل تو کچھ اور تھی۔

اس نے عضویاتی تبدیلیوں پر ریسرچ کے حوالے سے ایک طویل بحری سفر اختیار کیا۔ اگلے پانچ برسوں تک اس نے فوسلز پر تحقیق کی۔ قدیم قبائل سے ملا۔ فطری عجائبات کا مشاہدہ کیا۔ وہ جو کچھ دیکھتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔ 1836ء میں وہ گھر لوٹا۔

اگلے بیس برسوں میں اس نے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جنہوں نے اسے ممتاز ماہرین حیاتیات کی صف میں لا کھڑا کیا۔

انسانی فکر پر ڈارون کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ اس کی کتاب Theory of evalution نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا اور آج تک اس کی کتاب اور ڈارون کے نظریئے پر مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا انسان بن گیا۔

اب ایک اور اہم شخص جیمز کلارک میکس ول کا ذکر ہو جائے۔

ہوسکتا ہے کہ قارئین میں سے کچھ یہ سوچنے لگیں کہ اس قسم کے کرداروں سے ان کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں اپنی فکر کی نشونما کرتے ہوئے لوگ ان کے کیا کام آ سکتے ہیں۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ علم کی طلب کی جائے۔ اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے یا جو کچھ لکھا جائے گا۔ اس سے ہمارا تعلق اتنا ہے کہ یہ معلومات آپ کے ذہن کے دریچے کھول سکے۔

آپ نے ماضی میں جھانک کر دیکھ لیا ہوگا۔ ہم یہ معلومات صرف تفریح کے لیے نہیں پیش کر رہے بلکہ اس کا مقصد علم میں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرنا ہے۔

میرا تو یہ حال ہے کہ میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ موت اس وقت آئے جب میرے ہاتھ میں کوئی کتاب ہو۔

بہرحال آ جائیں جیمز کلارک میکس ول کی طرف۔

عظیم برطانوی طبیعات دان جیمز کلارک میکس ول کی شہرت ان چار مساواتوں کی تشکیل بندی ہے جو برقیات اور مقناطیسیت کے بنیادی قوانین کو بیان کرتی ہیں۔

میکس ویل 1831ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈن برگ میں پیدا ہوا۔ اس نے غیر معمولی تیزی سے سائنس میں مہارت کی منازل طے کیں۔

صرف پندرہ برس کی عمر میں اس نے اپنا سائنسی مقالہ ایڈن برگ رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا۔

اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ اس نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ پروفیسر کی حیثیت سے بسر کیا۔ اس کی آخری ملازمت کیمبرج میں تھی۔ اس کی شادی ہوئی مگر وہ لاولد رہا۔ میکس ویل کو نیوٹن اور آئن اسٹائن کے بیچ کے وقفے میں عظیم ترین نظریاتی طبیعات داں تصور کیا جاتا ہے۔

1879ء میں وہ اپنی اڑتالیسویں سالگرہ سے کچھ ہی دن پہلے کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو کر وقت سے پہلے ہی چل بسا۔

کارل مارکس۔ ایک اہم انسان جس کے نظریات نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔

سائنسی اشتراکیت پسندی کا اصل بانی کارل مارکس 1818ء میں جرمنی کے قصبے ٹرائر میں پیدا ہوا۔ سترہ برس کی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

عمر میں کارل مارکس یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ اس کا باپ بھی ایک قانون داں تھا۔

بعدازاں وہ برلن یونیورسٹی منتقل ہوگیا۔ جینا یونیورسٹی سے اس نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد مارکس نے صحافت کا شعبہ اپنایا۔ کچھ مدت کے لیے وہ ایک اخبار کا مدیر بھی رہا۔ تاہم اپنے کٹر سیاسی نقطۂ نظر کے سبب مشکلات سے دوچار ہوتا رہا۔ اس لیے وہ پیرس منتقل ہو گیا۔ یہاں اس کی ملاقات فریڈرک کے اینگلز سے ہوئی۔ ان کے بیچ گہری دوستی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی جو آخر دم تک رہی۔

دونوں نے ایک ساتھ اور انفرادی طور پر بھی کئی کتابیں تحریر کیں۔

مارکس کو فرانس سے بھی دیس نکالا مل گیا۔ وہ برسلز چلا گیا۔ 1847ء میں اس کی پہلی اہم کتاب ''افلاس فلسفہ'' شائع ہوئی۔ اگلے برس اینگلز کی شراکت سے کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع ہوئی جس نے ایک ہلچل مچادی۔

پھر اس کی سب سے اہم کتاب ''داس کیپٹل'' 1867ء میں شائع ہوئی اور اس کتاب نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ مذہبی کتابوں کے بعد یہ کتاب سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

لوئس پاسچر

ان ہی سو برسوں کی ایک اور ممتاز شخصیت جس نے انسانی صحت کے شعبے میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ پوری دنیا کی میڈیکل سائنس اس کی اہمیت سے واقف ہے۔

فرانسیسی کیمیادان اور ماہر حیاتیات لوئس پاسچر جس کو تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز شخصیت سمجھا جاتا ہے۔

پاسچر نے سائنس میں متعدد اضافے کیے لیکن اس کی اصل وجۂ شہرت اس کا جراثیموں کے نظریے کی تشکیل اور مدافعتی حربے کے طور پر ٹیکہ لگانے کے طریقہ کار میں اضافے کا باعث ہے۔ 1822ء میں پاسچر مشرقی فرانس کے قصبے ڈولی میں پیدا ہوا۔ 1847ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس نے پہلی بار نظریہ پیش کیا کہ ضرر رساں بیکٹریا خوراک یا مشروبات کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوسکتا ہے۔ پاسچر نے ایک طریقہ کار وضع کیا جسے پاسچرائزیشن کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے مشروبات میں ان جراثیموں کو تباہ

منیلا

جمہوریہ فلپائن کی اہم بندرگاہ اور سابق دارالحکومت۔ دریائے لیوزن کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد 1571ء میں اہلِ اسپین نے رکھی تھی۔ اہم تجارتی، صنعتی اور ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں متعدد یونیورسٹیاں ہیں۔

مرسلہ: عنایت مسیح۔ کراچی

من و سلویٰ

عربی لفظ ہیں من کے معنی ترنجبین، شبنم اور سلویٰ کے معنی شہد، نیز ایک پرندے کا نام بھی ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے اور جسے لوا کہتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر وادی سینا میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے یہی دو چیزیں ان کو بطور غذا مرحمت فرمائی تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ من (Manna) ایک میٹھا گوند ہوتا ہے جو ایک قسم کے جنگلی درخت Ash-Tree سے نکلتا ہے۔ بنی اسرائیل یہی گوند کھاتے تھے۔ سلویٰ سے وہ پرندے مراد ہیں جنہیں سیلانی پرندے کہا جاتا ہے اور جو موسم سرما میں گرم خطوں اور موسم گرما میں سرد خطوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ پرندے بحرالکاہل کے کنارے کنارے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہیں اور بہت سے تھک کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔

مرسلہ: احمد علی زیدی۔ سرگودھا

موحدین

بربر حکمرانوں کا ایک خاندان۔ موحدین نے 1144ء میں مرابطین کو شکستِ فاش دی اور 1116ء میں مراکش اور 1150ء میں اسپین کا مسلم علاقہ فتح کیا۔ اس کے بعد الجزائر (1152ء) اور تیونس (1158ء) پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ 16 جولائی 1212ء کو اسپین کے مسیحی بادشاہوں نے موحدین کو تلسہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی جس کے بعد اسپین میں بربر مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا اور صرف چند چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں رہ گئیں جن میں غرناطہ کی ریاست قابلِ ذکر ہے۔ ریاستِ غرناطہ کے سقوط (جنوری 1492ء) کے ساتھ ہی ہسپانیہ میں مسلمانوں کے 781 سالہ دور اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ خاندانِ موحدین کے بانی ایک مصلح بزرگ محمد بن تومرت تھے چونکہ ان کے پیرو توحید پر بہت زور دیتے تھے اس لیے یہ لوگ مدین کہلائے۔

مرسلہ: ارباز شیخ۔ چنیوٹ

کیا جاسکتا تھا۔
پاسچر کی سب سے اہم اور معروف ایجاد یہ ہے کہ اس نے کتے کے کاٹنے پر جو جنون کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے خلاف ایک انتہائی کارآمد ٹیکہ ایجاد کیا جس کا استعمال آج بھی ہو رہا ہے ورنہ پہلے یہی ہوتا تھا کہ اس کا علاج نہ ہونے کے سبب لوگ پاگل ہو کر مر جاتے تھے۔
پاسچر نے غیر معمولی ذہانت سے کام لیتے ہوئے بیماریوں کے تدارک کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔
اس دورانیے کا ایک اور اہم شخص جس کی ایجاد نے فاصلے کم کر دیئے۔ میرا مطلب ہے ٹیلی فون۔ اس سے یہ ممکن ہوسکا ہے کہ ہم موبائل ہاتھ میں لے کر دنیا کے کسی بھی گوشے میں کسی سے بات کر سکتے ہیں۔
الیگزینڈر گراہم بیل 1847ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈن برگ میں پیدا ہوا۔ وہ چند سال ہی باقاعدہ اسکول گیا۔
صوتیات سے بیل کی دلچسپی بالکل فطرت طور پر پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کا باپ زبان کی درستی اور پیروی کی تربیت کا ماہر تھا۔
1871ء میں بیل ہوسٹن منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے ٹیلی فون کی ایجاد سے متعلق دریافتیں کیں۔ فروری 1877ء میں اپنی ایجاد کی سند حاصل کی۔
سند حاصل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیل نے فلاڈلفیا میں صد سالہ نمائش میں اپنی ایجاد ٹیلی فون کا مظاہرہ کیا۔ لوگوں نے اس میں گہری دلچسپی لی، اسے انعام ملا۔
1877ء میں بیل اور اس کے رفقاء نے خود اپنا ادارہ بنا لیا۔ یہ موجودہ امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی کا حصہ تھا۔
ٹیلی فون کی ایجاد نے بیل کو امیر بنا دیا لیکن اس نے اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ وہ دیگر کارآمد آلات ایجاد کرنے میں بھی کامیاب رہا۔
1882ء میں بیل کو امریکا کی شہریت مل گئی۔
1922ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔
ان ہی سو برسوں کی ایک اور شخصیت جس کی ایک ایجاد نے پوری دنیا کو منور کر دیا تھامس ایلوا ایڈیسن تھا۔
ہمہ گیر موجد تھامس ایلوا ایڈیسن اوہیو کے قصبہ میلان میں 1847ء میں پیدا ہوا۔ اس نے صرف تین ماہ باقاعدہ تعلیم حاصل کی جس کے بعد اس کے اسکول نے اسے کمزور ذہن قرار دے کر اسکول سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس ''کمزور'' ذہن والے نے ایجادات کے ڈھیر لگا دیئے۔
ایڈیسن کی اوّلین ایجاد ووٹ شمار کرنے والا برقی آلہ تھا۔ پہلی ایجاد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس نے اسٹاک مارکیٹ کے لیے ایک بہتر نرخ نما آلہ ایجاد کیا جو چالیس ہزار ڈالرز میں بکا۔
اس زمانے میں چالیس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔
اس کے بعد ایجادات کا تانتا بندھ گیا۔ عام لوگوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ایجاد بلب تھا۔ جو 1879ء میں پہلی بار روشن ہوا۔ اس ایجاد نے پوری دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔
ایڈیسن نے متحرک فلموں کے کیمروں اور پروجیکٹرز کو بھی بہتر بنانے کے لیے بہت کام کیا۔ اس نے ٹیلی فون میں بھی اہم اضافے کیے۔ ٹائپ رائٹر کی کارکردگی بہتر بنائی۔
مجموعی طور پر اس نے ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے ایجادات کیے۔
وہ دنیا کے عظیم ترین موجدوں میں سے ایک تھا۔ اس کا انتقال 1931ء میں نیوجرسی میں ہوا تھا۔ ان سو برسوں میں بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔ اب ہم آتے ہیں اسلامی دنیا کی طرف کہ سن 1800 سے 1899 عیسوی میں اسلامی دنیا میں کیا کیا واقعات رونما ہوئے۔
ان سو برسوں میں اسلامی دنیا میں بھی بہت کچھ ہوا۔ حکومتیں آئیں اور گئیں۔ جنگیں ہوئیں۔ واقعات رونما ہوئے۔ ہم ان کا ایک مختصر جائزہ لے لیتے ہیں۔
1800ء میں نپولین مصر پر قبضہ کر لیتا ہے۔
1803 سے 1813 عیسوی۔ آلِ سعود جو مسلکی اعتبار سے وہابی تھے انہوں نے حجاز کو عثمانی قبضے سے نکال کر اس پر غلبہ پا لیا اور حجاز کا نام تبدیل کر کے (اس دوران فرانس میں پہلی جمہوریہ قائم ہو چکی تھی)
1805 سے 1848 عیسوی۔ محمد علی مصر کو جدید بنانے کی کوشش کرتا ہے۔
1808 سے 1839 عیسوی۔ سلطان محمد دوم تنظیمات کے عنوان سے عثمانی سلطنت نے جدیدیت پسندانہ اصلاحات کو متعارف کروایا۔
1814 عیسوی۔ معاہدہ گلستان، کا کیشان علاقہ

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

روس کے حوالے کردیا گیا۔

1845 عیسوی۔ عثمانی تسلط کے خلاف سرب بغاوت۔

1821 عیسوی۔ عثمانیوں کے خلاف یونان میں جنگِ آزادی۔

1830 عیسوی۔ فرانس نے الجیریا پر قبضہ کیا۔

1831 عیسوی۔ محمد علی عثمانی شام پر قبضہ کرلیتا ہے اور اناطولیہ میں کافی اندر تک آجاتا ہے۔ وہ عثمانی سلطنت میں ایک حقیقتاً آزاد ریاست کے اندر ریاست قائم کرتا ہے۔ یورپی طاقتیں عثمانی سلطنت کے تحفظ کے لیے مداخلت کرتی ہیں اور محمد علی شام سے واپسی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

1836 عیسوی۔ نئے صوفی مصلح احمد ابن ادریسؒ کی وفات۔

احمد ابن ادریسؒ مراکش شمالی افریقا اور یمن میں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے علما کو نظر انداز کر کے عوام تک اسلام کی زیادہ جاندار شکل کو براہِ راست پہنچانے کی کوشش کی۔

1839 عیسوی۔ برطانوی عدن پر قبضہ کرلیتے ہیں۔

1839 سے 1861 عیسوی۔ سلطان عبدالمجید عثمانی سلطنت کے زوال کو روکنے کے لیے زیادہ جدیدیت پسندانہ اصلاحات کا آغاز کرتا ہے۔

1843 سے 1849 عیسوی۔ برطانوی سندھ طاس پر قبضہ کرلیتے ہیں۔

1854 سے 1856 عیسوی۔ کریمیائی جنگ۔ جو عثمانی سلطنت میں عیسائی اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے پیدا ہونے والی یورپی رقابت کی وجہ سے برپا ہے۔

مصر کا گورنر سعید پاشا فرانسیسیوں کو نہر سوئز کی رعایت دیتا ہے۔ مصر اپنے پہلے غیر ملکی قرض کا معاہدہ کرتا ہے۔

1857 سے 1858 عیسوی۔ برطانوی حکمرانی کے خلاف ہندوستان میں جنگِ آزادی۔ برطانوی آخری مغل بادشاہ کو باقاعدہ طور پر معزول کردیتے ہیں۔

سر سید احمد خان مغربی خطوط پر اسلام میں اصلاح اور برطانوی ثقافت کو اختیار کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔

1860 سے 1861 عیسوی۔ لبنان میں دروز باغیوں کے ہاتھوں لوگوں کے قتلِ عام کے بعد فرانسیسی مطالبہ کرتے ہیں کہ لبنان کو فرانسیسی گورنر کے ساتھ خود مختار صوبہ بنادیا جائے۔

1861 سے 1876 عیسوی۔ سلطان عبدالعزیز عثمانی سلطنت کی اصلاح کا عمل جاری رکھتا ہے مگر بھاری غیر ملکی قرضے بھی حاصل کرتا ہے۔ جن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطنت دیوالیہ ہو جاتی ہے اور عثمانی مالیات پر یورپی حکومتوں کا قبضہ ہوجاتا ہے۔

1863 سے 1879 عیسوی۔ مصر کا گورنر اسماعیل پاشا وسیع پیمانے پر جدیدیت کو اپناتا ہے مگر غیر ملکی قرضے بھی حاصل کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ دیوالیہ اور نہر سوئز کی برطانویوں کے ہاتھوں فروخت (1875ء) اور مصری مالیات پر یورپی تسلط کی صورت میں نکلتا ہے۔

1871 سے 1879 عیسوی۔ ایرانی ریفارمر الاقصانی مصر میں رہتے ہیں اور محمد عبدہ سمیت مصری ریفارمر کا ایک حلقہ تشکیل دیتے ہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے احیاء جدیدیت پذیری کے ذریعے یورپ کے ثقافتی غلبہ و تسلط کو روکنا تھا۔

1872 عیسوی۔ ایران میں برطانوی روسی رقابت شدت پکڑ لیتی ہے۔

1876 عیسوی۔ عثمانی سلطان بن عبدالعزیز کو محلاتی انقلاب کے ذریعے معزول کردیا جاتا ہے۔ عبدالحمید ثانی پہلے عثمانی دستور کو نافذ کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ تاہم وہ اسے بعد میں معطل کردیتا ہے۔ تعلیم، ذرائع آمدورفت اور ذرائع مواصلات میں بھی اصلاحات کرتا ہے۔

1879 عیسوی۔ اسماعیلی پاشا کو معزول کردیا جاتا ہے۔

1818 عیسوی۔ فرانس تیونس پر قبضہ کرلیتا ہے۔

1881 سے 1882 عیسوی۔ آئین پسندوں اور اصلاح پسندوں کے ساتھ مل کر مقامی مصری افسر بغاوت کردیتے ہیں اپنی حکومت نافذ کرتے ہیں تاہم ایک عوامی لہر مصر پر برطانوی قبضے کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ جس میں لارڈ کرومر گورنر بنتا ہے۔

1882 ۔ 1907 عیسوی۔ شام کی آزادی کے لیے خفیہ انجمنوں کی مہم۔

1889 عیسوی۔ برطانوی سوڈان پر قبضہ کرلیتے ہیں۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

1892 عیسوی۔ ایران میں تمباکو کا بحران۔ ایک ممتاز مجتہد کا فتویٰ کہ تمباکو کا استعمال کرنا بند کیا جائے۔ شاہ کو برطانویوں کو تمباکو کے سلسلے میں دی گئی رعایت منسوخ کرنے پر مجبور ... کر دیتی ہے۔

1894 عیسوی۔ عثمانی حکومت کے مخالف دس سے پندرہ ہزار کے درمیان آرمینیائی لوگوں کو مار دیا جاتا ہے۔

1896 عیسوی۔ ایران کے ناصرالدین شاہ کو الافغان کا ایک شاگرد قتل کر دیتا ہے۔

1897 عیسوی۔ باسل میں پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ اس کا مقصد عثمانی صوبے فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا قیام ہے۔

الافغان کی وفات

ان سو برسوں کے تذکرے میں کچھ نام سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔

جیسے سلطان عبدالحمید (61-1839 عیسوی) جس نے مطلق اقتدار میں بہتری اور حکومت کو عثمانی رعایا کی رائے کا تابع بنانے کے لیے فرمان جاری کیا۔

الافغان (جلال الدین افغانی) 1837 سے 1897 عیسوی تک۔ ایک مصلح جنہوں نے مسلمانوں کو متحد ہو جانے کی تلقین کی اور یورپ کے تسلط سے بچنے کے لیے اسلام کو جدید بنانے کی کوشش کی۔

آقا خان کرمانی (96-1853 عیسوی) ایک ایرانی مصلح۔

نام محمد امین علی۔ صوفی مصلح جنہوں نے سنوسی تحریک کی بنیاد رکھی۔ جواب بھی لیبیا میں موجود ہے۔ اس دوران اعادہ کے لیے ایک نظر یورپ کے سلاطین کو بھی دیکھ لیں۔

فرانس

نپولین اوّل۔ 1804 سے 1814 عیسوی۔

لوئس۔ 1814 سے 1824 عیسوی۔

چارلس ولیم۔ 1824 سے 1830 عیسوی۔

لوئس۔ 1830 سے 1848 عیسوی۔

نپولین دوم۔ 1848 سے 1852 عیسوی۔

نپولین سوم۔ 1852 سے 1871 عیسوی۔

اسپین

چارلس چہارم۔ 1808 عیسوی تک۔

نپولین۔ 1808 سے 1812 عیسوی تک۔

فرڈیننان ہفتم۔ 1812 سے 1823 عیسوی تک۔

ایزابیلا دوم۔ 1823 سے 1868 عیسوی تک۔ اس کے بعد جمہوریت قائم ہوگئی۔

جرمنی

فرانسس دوم۔ 1804 عیسوی تک۔

نپولین۔ 1804 سے 1813 عیسوی تک۔

1813 عیسوی میں فیڈریشن بن گئی جو 1848 تک رہی۔

فریڈرک چہارم۔ 1848 سے 1861 عیسوی تک۔

ولیم اوّل۔ دورِ جمہوریت کا آئینی بادشاہ 1861 سے 1888 عیسوی۔

ولیم دوم۔ 1888 سے 1918 تک۔ اس کا وزیراعظم بسمارک تھا۔ اس نے پہلی عالمی جنگ شروع کی تھی۔

برطانیہ

برطانیہ میں 1820 عیسوی تک پرنس آف ویلز ریجنٹ رہا۔

جارج چہارم۔ 1820 سے 1830 تک۔

ولیم چہارم۔ 1830 سے 1837 عیسوی تک۔

وکٹوریہ۔ 1837 سے 1901 عیسوی تک۔

ان جائزوں کے بعد اپنے آبائی خطے کی طرف۔ یعنی برصغیر پاک و ہند کی جانب۔ انگریزوں نے یہاں اپنے قدم جما لیے تھے اور اب وہ مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے۔

1800 عیسوی میں انگریزوں نے میسور کے اضلاع نظام دکن سے انعام کے طور پر حاصل کر لیے۔

1801ء میں نواب کرناٹک پر دباؤ ڈال کر اس کا جاگیر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نیز اودھ کے وزیر پر دباؤ ڈال کر گورکھپور اور بریلی کے اضلاع ہتھیا لیے۔

1802 عیسوی میں مرہٹوں کے پیشوا سے جنگ کر کے بندیل کھنڈ کی سرزمین پر قبضہ جمایا۔ کٹک اور بلاسود برار کے راجا سے حاصل کیے۔

1803 عیسوی میں گوالیار کے مہاراجا سندھیا سے لڑ کر دہلی کی سلطنت کو اپنے قبضے میں لیا اور اس طرح دہلی کا مغل شہنشاہ جو پہلے مہاراجا سندھیا کے زیرِ حمایت زندگی بسر کر رہا تھا۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پناہ میں آگیا۔

1805 عیسوی میں گائیکواڑ کے مرہٹے راجا سے جنگ کی اور اس سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے کچھ حصے ہتھیا /

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

لیے۔

1818 عیسوی میں مرہٹہ راجا ہلکر سے لڑ کر اس نے خاندیس وغیرہ کے علاقے حاصل کیے۔

مہاراجا سندھیا سے پونا اور مہاراشٹر کے علاقے مرہٹہ پیشوا سے لے لیے۔ بھرت پور کا قلعہ وہاں کے مہاراجا سے، پھر آسام، ارکان اور شناسرم کے علاقے ہتھیائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1839 عیسوی میں افغانستان کی تسخیر کے لیے مہم بھیجی تھی۔ امیرانِ سندھ سے اس بات کا انتقام لیا کہ انہوں نے کابل کی مہم کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے۔ سندھ کے اقتدار کا خاتمہ کر کے سندھ کو ہندوستان کی برطانوی مملکت میں شامل کر دیا۔

1846 عیسوی میں انگریزوں نے پنجاب کو نشانہ بنایا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ہر طرف بدامنی پھیل گئی تھی۔ سکھ طرح طرح کی سازشوں کا شکار ہو رہے تھے۔ 1849 عیسوی میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری جنگ ہوئی۔ اس کے بعد سکھوں نے شکست تسلیم کرلی۔

1857 عیسوی پہلی جنگ آزادی۔ اس کی بے شمار وجوہات تھیں۔ مسلمانوں کو تنگ کرنے اور ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ ہندو بھی انگریزوں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ 1855 عیسوی میں مسلمانوں کے قانونِ وراثت کے خلاف ایک نیا قانون سامنے لایا گیا تھا۔ 1855 عیسوی میں پادری ایڈمنڈ نے حکومت کی ایما سے ایک سرکلر جاری کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اب ہندوستان کے ہر شخص کو عیسائی ہو جانا چاہیے۔

انگریز چونکہ تمام ہندو ریاستوں کو اور سکھ ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ختم کرتے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان سے بدظن ہو گئے۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ 1857 عیسوی میں چربی والے کارتوس استعمال کرنے کو دیئے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے انکار کر دیا۔ میرٹھ چھاؤنی سے آزادی کی لہر اٹھی اور دہلی تک پہنچی۔ انگریزوں نے غداروں کا سہارا لے کر اس لہر کو دبا دیا اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1861 عیسوی میں وہ نہایت بے بسی کے عالم میں وفات پا گئے۔

وسط ہند اور بندیل کھنڈ میں انگریزوں کے خلاف جھانسی کی نوجوان رانی لکشمی بائی اور نانا صاحب کے سپہ سالار تانیتا ٹوپے نے صف آرا ہو کر مقابلہ کیا۔ اس بہادر خاتون نے 17 دنوں تک انگریز فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن غداروں کے ساتھ چھوڑ دینے سے وہ میدانِ جنگ میں کام آ گئی۔ تانیتا ٹوپے کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہندو بہت کم ہی عتاب میں آئے تھے۔

1858 عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ عمل میں لایا گیا اور ہندوستان کو براہِ راست تاجِ برطانیہ کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔

مسلمانوں کو پریشانیوں سے نکالنے کے لیے قدرت نے سرسید احمد خان جیسے مدبر کو پیدا کیا۔ انگریز مسلمانوں کو باغی قرار دے کر سزائیں دے رہے تھے۔ سرسید احمد خان نے اسبابِ بغاوت لکھ کر مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی۔

1886 عیسوی میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن بھی قائم کی گئی۔ 1859 عیسوی میں آپ نے مراد آباد میں فارسی کا مدرسہ قائم کیا۔ 1863 عیسوی میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔ 1876 میں علی گڑھ کالج کی بنیاد۔ 1889 عیسوی میں انگریزی مدرسے کی بنیاد رکھی۔

دراصل علی گڑھ کالج وہ اہم موڑ تھا جس نے قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کی اور سرسید نے محسوس کر لیا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں ہیں۔

1885 عیسوی کو کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا۔ 1893 عیسوی میں پونا کے مقام پر دس دنوں تک گنپتی کا میلا کانگریس کے تحت منعقد ہوا۔ اس میں جلوس نکالے گئے جس میں مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کی گئی اور مسجد پر حملہ کیا گیا اور اس طرح برصغیر میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور پاکستان کا وجود ناگزیر دکھائی دینے لگا۔

تاریخ کا سفر 1899 عیسوی تک آ چکا ہے۔ اس کے بعد 1900 عیسوی ہے جو 1999 عیسوی تک چلے گا۔ آپ نے اب تک یہ دیکھ لیا ہوگا کہ کیسے کیسے کردار زندگی کے اسٹیج پر آئے اور اپنا اپنا ایکٹ کر کے رخصت ہو گئے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں طیور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اگلی قسط میں 2015 عیسوی تک کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی۔

(جاری ہے)

www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

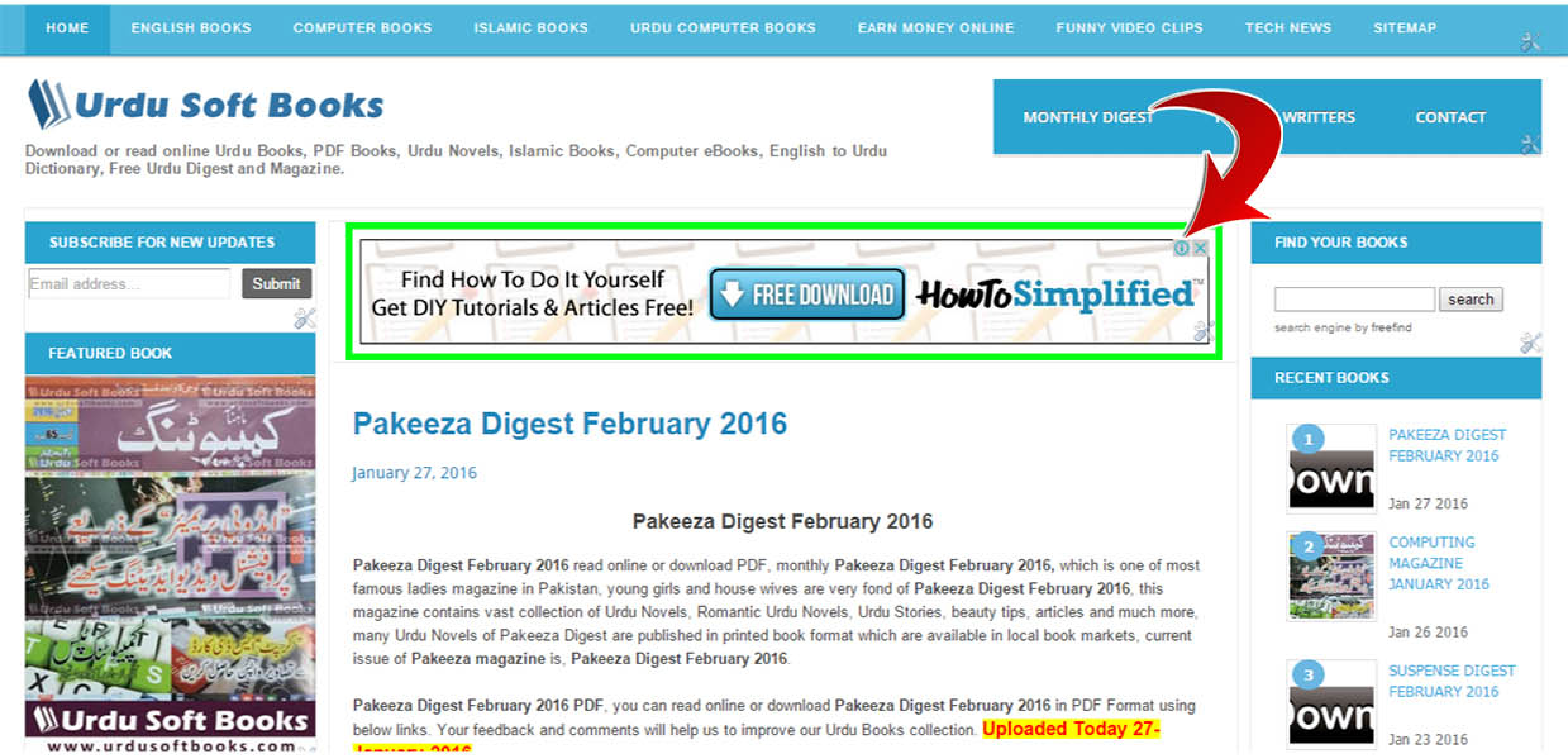

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کرکے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

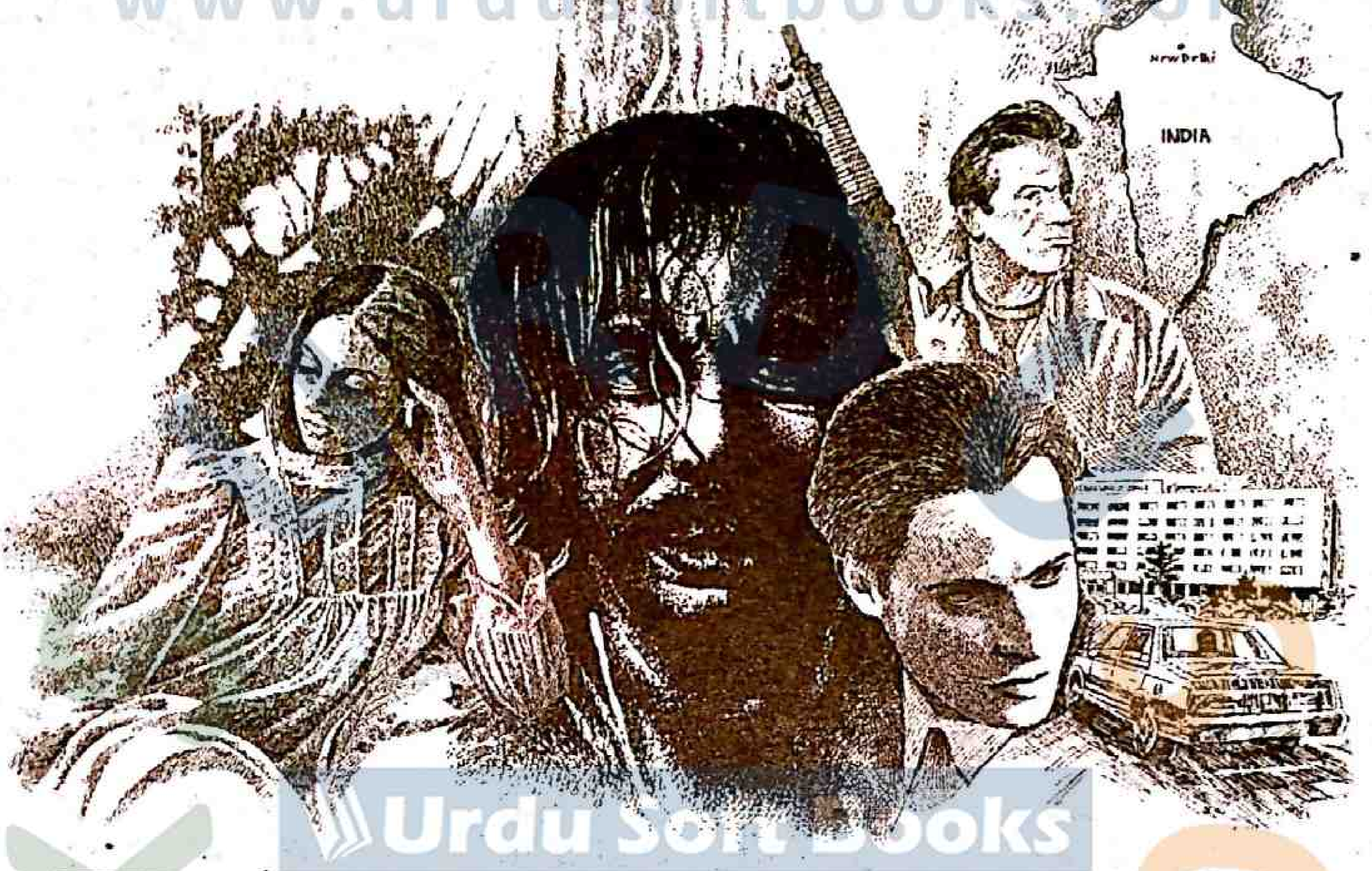

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط: 111

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر دتی تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر...... "مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم آگے چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ وہ مجھے گرفتار کرکے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچایا۔ وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ”اعلان جنگ“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنھیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا سمجھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے زیبک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ... ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شامین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شامین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شامین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زیبی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امدادِ غیبی بن کر آ گیا۔ اس کے ساتھی نے زیبی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدانِ جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ریناٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی کو بلتستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔

(اب آگے پڑھیں) ....

حد نظر برف ہی برف تھی۔ اس برف کے میدان میں چلتے ہوئے پیر دھنس رہے تھے۔ ہم سب نے خود کو ایک رسی سے منسلک کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ رسی دراز کرتا ہے تو بندہ بہکنے لگتا ہے اور یہاں رسی دراز نہ کی جاتی تو کوئی آگے بڑھ نہ پاتا اس لیے کہ سب ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ سب سے آگے میں تھا۔ میرے پیچھے عبداللہ۔ اس کے پیچھے سفیر اور آخر میں وسیم۔ اس طریقہ کار کو تمام کوہ پیما پسند کرتے ہیں کہ ایک سے دوسرے کو سہارا ملتا ہے۔ یہاں تو سہارے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

کی زیادہ ضرورت تھی۔اس لیے کہ یہ خطہ حد سے زیادہ خطرناک تھا۔یہاں وہاں ہر طرف کھڈے تھے۔غار تھے جن کے منہ پر برف جمی ہوئی تھی اور اگر غلطی سے کسی ایسی غار کے دہانے پر پیر پڑ جاتا تو پھر ملک عدم کا ٹکٹ بہ آسانی کٹ جاتا۔ایسے خطروں کی پہچان میں بہ آسانی کر لیتا تھا اسی لیے میں سب سے آگے تھا۔بغور زمین کا جائزہ لے کر قدم رکھتا تھا۔میرا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کے مصداق تھا۔ابھی میں نے قدم آگے بڑھائے تھے کہ مجھے احساس ہوگیا کہ اس جگہ کی برف کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔اور ایسا تبھی محسوس ہوتا ہے جب نیچے کوئی غار ہو یا گہری کھائی کا سرا ہو۔اسی لیے میں نے اس جگہ کو چھلانگ لگا کر پار کرتے ہوئے دوسروں کو بھی ہوشیار کیا مگر دیر ہو چکی تھی۔عبداللہ اور سفیر نے تو دیکھا دیکھی چھلانگ لگا کر پار کیا مگر وسیم سنبھل نہ سکا اس کا پیر بھربھری برف پر پڑا پیر پڑتے ہی پوری پرت پھٹی اور وہ گرتا چلا گیا۔گرتے ہوئے اس نے چیخ ماری تھی گو کہ اس کی چیخ اتنی تیز نہیں تھی پھر بھی سب دہل گئے تھے۔اس پر ستم یہ کہ رسی بھی روک نہ سکی تھی کیوں کہ جھٹکا لگنے سے وہ رسی تنی تھی اور بیلٹ کا کنڈا نکل گیا تھا۔شاید اسے صحیح طور پر وسیم نے لگایا نہیں تھا ورنہ بیلٹ کی پکڑ بہت مضبوط ہوتی ہے، اسے اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ گرنے والے کو گرنے نہ دے۔

جھٹکے سے ہم تینوں ہی لڑکھڑا گئے تھے۔مگر فوراً ہی سنبھل گئے۔میں نے زوردار آواز میں اسے پکارا ''وسیم...وسیم۔''

جواب بھی فوراً آگیا ''میں یہاں ہوں محفوظ ہوں، کوئی چوٹ وٹ بھی نہیں لگی ہے...شاید یہ کوئی غار ہے۔''

اس گڑھے میں جھانکنے کے لیے میں نے اوندھے منہ لیٹ جانا مناسب سمجھا اور سینے کے بل رینگتا ہوا اس گڑھے کے قریب پہنچا پھر نیچے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

وہ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔وسیم اس گڑھے میں کھڑا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں رسی پھینک رہا ہوں تم اس کے سہارے اوپر آنے کی کوشش کرنا۔'' کہہ کر میں نے اپنی کمر سے رسی نکال کر دوسروں کو بھی ہک نکالنے کا اشارہ کیا۔سفیر اور عبداللہ نے فوراً تعمیل کی۔میں نے رسی اندر لٹکائی تھی کہ وسیم نے کہا:

''ایک منٹ مجھے دیکھنے دیں۔یہ غار سیدھا آگے بڑھ رہا ہے۔میں ذرا آگے تک کا جائزہ لے لوں۔'' کہہ کر وہ سیدھے ہاتھ بڑھا۔

میں نے سفیر کی طرف رخ کر کے کہا ''غار کتنا لمبا ہے یہ وہ دیکھنے گیا ہے۔''

''اوپر آسمان کی طرف دیکھیں۔'' سفیر نے میری توجہ مبذول کرائی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔شمال کی جانب سے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔مجھے یاد آیا کہ جب میں چین کی طرف جانے کے لیے نیپال سے چلا تھا تو بیتو کی محبوبہ نے ایسے ہی بادل دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایک خطرناک بات ہے۔ایسے سیاہ بادل آئیں تو سمجھ لینا کہ کوئی غلط بات ہونے والی ہے۔ایسا طوفان آنے والا ہے جو تباہی پھیلاتا ہے۔برف کے ذرات ہی نہیں اڑاتا، بڑے بڑے تودے بھی اکھاڑ پھینکتا ہے۔اسی بات نے مجھے فکر میں ڈال دیا تھا کہ اگر طوفان آگیا تو کیا ہوگا؟ یہاں ایسی کوئی جگہ بھی نظر نہیں آرہی تھی جہاں ہم پناہ کی خاطر بیٹھ سکتے۔میں فکر کے گرداب میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ سفیر کی آواز سنائی دی۔وہ پوچھ رہا تھا ''وسیم کا کوئی جواب آیا۔بادل گہرے ہو رہے ہیں۔''

''میں خود پریشان ہو گیا ہوں اس لیے کہ جنھیں تو بادل سمجھ رہا ہے یہ بادل نہیں ہیں۔یہ برف کے ذرات ہیں اور دور تک اوپر اٹھ رہے ہیں اس لیے پہاڑ کی چوٹیوں پر سایہ سا آرہا ہے جس کی وجہ سے وہ سیاہ دکھائی دے رہے ہیں۔ہمیں جلد از جلد کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنی پڑے گی۔''

''اتنی جلدی کوئی اور پناہ گاہ ملنے سے رہی۔کیوں نا ایسا کیا جائے کہ ہم بھی اس غار میں اتر جائیں اور جب طوفان گزر جائے تو باہر نکل آئیں۔'' عبداللہ نے مشورہ دیا۔

اس کی بات غلط نہیں تھی۔اتنی جلدی اور کوئی پناہ گاہ ملنے سے رہی۔وسیم کے بقول' یہ غار سرنگ نما ہے اور دور تک جا رہا ہے۔غار کے دہانے سے زمین تک زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔تھوڑی سی کوشش سے ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔طوفان جس رفتار سے بڑھ رہا تھا یہ اب تب میں ہم تک پہنچ جاتا اس لیے کہ اب سیاہی معدوم ہو چکی تھی اور ہوا میں اڑتے ذرات صاف نظر آرہے تھے۔دیر کرنا مناسب بھی نہیں تھا اس لیے میں نے غار میں چھلانگ لگا دی۔اندر گرتے ہی میں نے منہ اوپر کر کے کہا ''اب تم دونوں میں سے کوئی ایک کودے۔'' پہلے عبداللہ کودا پھر سفیر۔ہم تینوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا جس طرف ایک سرنگ نظر آرہی تھی۔رہ رہ کر میں وسیم کو

www.urdusoftbooks.com

آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک جواب سنائی نہیں دیا تھا۔ تین چار بار کے بعد اس کی ہلکی سی آواز آئی جیسے وہ کافی دور ہو۔

''کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سیدھے سیدھے بڑھتے چلے آئیں۔ راستے ٹیڑھے میڑھے ہیں۔''

ہم تینوں اسی جانب بڑھتے چلے گئے۔ کافی دور آنے کے بعد احساس ہوا کہ دوسری طرف سے بھی راستہ کھلا ہوا ہے جہاں سے صاف ہوا آرہی ہے ورنہ گھٹن کا احساس ہوتا۔ میں نے وسیم کو آواز دی کہ اب وہ کہاں ہے۔ ادھر سے جواب آیا کہ میں نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا۔ بس آپ آگے بڑھتے چلے آئیں۔

ہم تینوں آواز کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ چلتے چلتے عبداللہ نے پوچھا ''یہ اتنی لمبی سرنگ بنائی کس نے ہوگی؟''

''شاید تم بھول رہے ہو کہ یہ پورا علاقہ لائم اسٹون یعنی چونے کے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ جب یہ سخت ہوا اور کمپریس کے عمل سے گزرا تو ایسے غار وجود میں آگئے۔ غور سے دیکھو اس میں ذیلی سرنگیں بھی ہیں اور ہوا بھی پاس ہو رہی ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس سرنگ کے کئی چھوٹے بڑے دہانے ہیں۔''

''اوہ ..؟'' عبداللہ کے لہجے میں تعجب کا عنصر زیادہ تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں وسیم کھڑا غار کی چھت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے بھی نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ یہاں سے وہاں تک چھت پر رنگین پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیلے چپکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا ''یہ تو قیمتی پتھر ہیں۔ لاکھوں روپے مالیت کے پتھر صرف اس غار میں ہیں۔ یقیناً آس پاس کے غاروں میں بھی ایسے پتھر ہوں گے۔''

''جی ہاں یہ پورا علاقہ قیمتی پتھروں سے بھرا ہوا ہے۔ چین اور انڈیا تو اپنے علاقوں سے پتھر اور دیگر معدنیات نکال کر کام میں لا رہے ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں جو اپنی دولت کو نظر انداز کر کے دوسروں سے امداد مانگ رہے ہیں۔ پورا شمالی علاقہ جات، بلوچستان اور پختون خوا قدرتی امداد سے لبالب بھرا ہے لیکن ہمیں فرصت نہیں کہ ہم کھدائی کریں۔ بھلے چوری سے کوئی لے جا رہا ہو تو کوئی بات نہیں۔''

میری بات پر سفیر کھلکھلا اٹھا ''خوب، چور کو روکنے کی اجازت نہیں۔ واہ۔''

''بھائی میاں.. ان پتھروں کی فکر چھوڑ دو یہ دیکھو کہ باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔'' میں نے وسیم کو مشورہ دیا۔

وسیم نے ہنس کر کہا ''یہ ہماری قومی پہچان بن گئی ہے کہ کام کی بات کوئی نہ کرے جو کرے اسے ٹوک دو۔'' پھر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دائیں بائیں بھی سرنگ مڑ رہی تھی لیکن ادھر اس لیے نہیں جا رہا تھا کہ ادھر سے تازہ ہوا اندر نہیں آرہی تھی۔ پھر جب کچھ آگے بڑھے تو سرنگ کا دہانا نظر آیا۔ ہم سب تیزی سے دہانے پر پہنچے۔ باہر جھانکا تو ادھر بھی وہی منظر تھا۔ دور دور تک برف زار۔ کہیں کوئی آبادی نہیں۔ لیکن ایک فرق نظر آیا کافی فاصلے پر پیڑوں کے کچھ جھنڈ نظر آئے۔ درختوں کو دیکھ کر میں نے کہا ''ہو سکتا ہے کہ ادھر آبادی ہو۔''

''لیکن ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہم پاکستانی حدود میں ہیں، تبت میں ہیں یا انڈیا میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبادی میں پہنچتے ہی کوئی نیا فساد کھڑا ہو جائے۔'' عبداللہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ ہمیں آگے تو بڑھنا ہی ہے۔'' ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ جس پہاڑ کے سرنگ نما غار میں ہم کھڑے تھے اس کے پیچھے سے برف کے ذرات سیلاب کی صورت میں امنڈ امنڈ کر گرنے لگے۔ وہ طوفان جس کے آثار ہم نے دیکھے تھے وہ آچکا تھا۔ اب ہم شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بروقت محفوظ رکھا اگر ہم اس غار میں نہ آتے تو اس طوفان کا شکار ہو چکے ہوتے۔ یعنی زندہ برف میں دفن ہو چکے ہوتے۔ اپنے طوفان کو کولانچ کہتے ہیں اور کولانچ کا مطلب ہے برف میں دفن ہو جانا۔

کافی دیر تک آئس سلائڈنگ ہوتی رہی اور ہم سب اس غار میں بیٹھے قدرت کی کارسازی دیکھتے اور اس آفت سے محفوظ رہ جانے پر شکر خدا کرتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو ہوا کے ساتھ برف کا کوئی چھوٹا ٹکڑا بھی اڑ کر اندر آجاتا جو چہرے سے ایسے ٹکراتا جیسے کنکری، بڑی سی کنکری ٹکرائی ہو۔ جس کے بھی چہرے سے برف کا ٹکڑا ٹکراتا وہ چوٹ والی جگہ کو سہلاتا اور خجل انداز میں مسکرا دیتا۔

طوفان تو آدھے گھنٹے میں گزر گیا لیکن ہم اس ڈر سے باہر نہیں نکلے کہ کہیں آئس سلائڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس لیے کہ طوفان سے چھوٹی چھوٹی چٹانیں اپنی جگہ

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سے کھسک جاتی ہیں اور برف کے ذرات کی وجہ سے ڈھلان پر ہی جم جاتی ہیں۔ اگر تیز ہوا چلی تو وہ چٹان پھسل سکتی ہے۔ اتنا موقع دینا ضروری تھا کہ اگر ایسی کوئی چٹان ہو تو پھسل جائے۔ اس لیے بھی کہ ایک بھی چٹان پھسلتی تو ساتھ میں دھکے سے دوسری چٹانیں بھی گرتی ہیں اور پھر ایک خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

جب کافی دیر انتظار کر لیا اور کسی چٹان کے پھسلنے کی آواز نہیں آئی اور نہ دکھائی دی تو ہم ڈرتے ڈرتے باہر نکلے۔ ہر طرف ایک گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تا حد نظر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھے۔ بڑھنے سے پہلے ہم دوبارہ سے ایک دوسرے سے اسی رسی سے منسلک ہو گئے تھے مگر اس بار سب نے اپنی اپنی بیلٹ کو کھینچ کر چیک کر لیا تھا تا کہ اگر کوئی حادثہ پیش آئے تو دوسرا اس کا سہارا بن جائے۔ پورا میدان بھربھری ریت جیسا ہو رہا تھا۔ برف کے ذرات میں پیر دھنس رہے تھے۔ ہم سب بغیر کسی نشانِ منزل کے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ تین چوٹیاں جنھیں دیکھ کر کہا گیا تھا کہ وہ تبت میں واقع ہیں اس سے بائیں طرف بڑھ رہے تھے۔ اس طرح ہم پاکستانی علاقے کے قریب ہوتے جاتے۔ کچھ آگے بڑھے تو ہمیں وہی پیڑوں کے جھنڈ نظر آئے جس طرف ہم نے جانے کا سوچا تھا۔ ہم انھی پیڑوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

پہلے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جھنڈ دو ڈھائی کیلو میٹر کی دوری پر ہوں گے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہمارا اندازہ غلط ہے۔ اس جھنڈ تک پہنچتے پہنچتے آدھا پہر گزر گیا تھا۔

بالآخر کسی نہ کسی طرح ہم اس جھنڈ تک پہنچ ہی گئے۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی ایک خوشگوار احساس ہوا۔ اس لیے کہ جھنڈ کے درمیان ایک عارضی جھونپڑی نظر آئی جو شاید شکاریوں کی تیار کردہ تھی۔ لومڑیوں کے شکاری اپنے ٹھہرنے کے لیے ایسی ہی پناہ گاہیں بنا لیتے ہیں۔ وہ جھونپڑی بھی کسی شکاری کی بنائی ہوئی ہوگی جو شکار کے موسم میں ان کے کام آتی ہوگی۔ ہم سب اس جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس جھونپڑی میں کچھ خوراک بھی موجود تھی۔ ہم نے رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ عبداللہ نے اِدھر اُدھر تلاش کے بعد چقماق پتھر بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ اس نے چقماق کو رگڑ کر آگ جلا لی۔ باہر کے سرد ترین موسم کے بعد آگ کی حدت نے بہت مزہ دیا۔ ایک طرف کچھ سوکھے ہوئے پھل تھے اور اناج کی کچھ مقدار۔ گوشت کے دھوپ میں سکھائے ہوئے کچھ پارچے بھی تھے مگر ہم نے گوشت کو ہاتھ نہ لگایا کہ پتا نہیں کس جانور کے گوشت ہوں۔ چنے کو آگ پر بھون کر ہم سب نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور پھر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جھونپڑی نے خاموش زبان سے بتا دیا تھا کہ انسانی آبادی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے اُمید بندھ گئی تھی کہ ہم جلد کسی انسانی آبادی میں پہنچ جائیں گے۔

ہم نے کچھ دیر آرام کے بعد پھر سے سفر شروع کر دیا۔ اب ہم ڈھلان پر چل رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سورج اپنا سفر کرتے ہوئے مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا کہ ہمیں دور بہت دور سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً کوئی آبادی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے آبادی صاف نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ کافی دور تھی۔ درمیان میں شاید کھائی یا کوئی بڑی وادی تھی اس لیے کہ برفیلے میدان کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پھر وہ آبادی تھی۔ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی اس آبادی نے ہمارے اندر ایسی خوشی بھر دی تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے ہم اسلام آباد پہنچ گئے ہیں۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے کہا ”آبادی میں پہنچ کر ہمیں انتہائی چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ باتیں کم سے کم کرنا ہوں گی۔ اس لیے کہ ابھی یہ پتا ہی نہیں ہے کہ یہ علاقہ ہمارا ہے یا دشمن ملک کا۔ یہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ پاکستان، چین اور انڈیا۔ ہوسکتا ہے کہ ہم انڈیا کے حدود میں ہوں اور یہ تمہارے علم میں بھی ہے کہ انڈین را میرے پیچھے ہے۔ ان کو میں نے کئی بار شکست دی ہے اس لیے وہ مجھے کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایسے میں اگر میں ان کی حدود میں پایا گیا تو وہ خوشی سے نہال ہو اٹھیں گے۔“

”لیکن جب تک ہم آبادی میں پہنچیں گے نہیں تو پتا کیسے چلے گا کہ ہم کس ملک میں کھڑے ہیں۔“

”سیدھے آبادی میں گھسنے سے اچھا ہے کہ ہم پہلے کہیں پناہ گاہ ڈھونڈ لیں پھر کوئی ایک جا کر پتا کرے۔ ایک ساتھ جانے کا مطلب ہے کہ سب ایک ساتھ پھنسیں۔“

”شہباز کی بات میں دم ہے۔“ سفیر نے کہا ”اس طرف اونچے ٹیلے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں غار بھی ہوں۔ ہم پہلے ان ٹیلوں کی طرف چلتے ہیں۔“

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

سفیر کا مشورہ میں نے مان لیا اور اس طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور و نزدیک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جسے ہم پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکتے۔ ہم چاروں نے پھیل کر پہاڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم آہستہ آہستہ اس پہاڑی کے اوپر چڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر اس نے آواز دی ''شہباز اوپر آجائیں۔''

میں سمجھ گیا کہ اس نے کوئی غار یا چھجا ڈھونڈ لیا ہے اور اس خوشی میں مجھے بلا رہا ہے۔ میں تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔

اب تک ہم میدان میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن اس پہاڑی پر چڑھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس لیے کہ اب تک ہم غلط سمت میں بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی کی دوسری طرف بھی میدان تھا۔ برف سے بھرا میدان اور اس میدان کے پار ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اس ندی کے کنارے بہت سارے مکان نظر آ رہے تھے۔ جس آبادی کی طرف ہم بڑھ رہے تھے یہ آبادی اس سے چھوٹی تھی۔ مکانات کچے تھے۔ ان مکانوں کی بناوٹ بالکل ایسی تھی جیسی بلتستان کے علاقوں میں دیکھ چکا تھا۔ میرے اندر خوشی کی ایک تیز لہر سی اٹھی کہ ہم اپنے ہی علاقے میں ہیں لیکن فوراً ہی خیال آ گیا کہ بلتستان ہو یا چین یا انڈیا ان تمام علاقوں کے مکانات کی تعمیر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

''یہ آبادی نزدیک تو ہے لیکن ہم فوراً ادھر نہیں جائیں گے۔ پہلے یہاں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈیں گے۔'' میں نے کہا تھا کہ ہوا کے دوش پر سوار سفیر کی آواز آئی:

''لو بھائی میں نے ایک ائرکنڈیشنڈ غار ڈھونڈ لیا۔''

سفیر کی آواز پر ہم دوبارہ نیچے آ گئے۔ سفیر نے واقعی ایک غار ڈھونڈ لیا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ غار قدرتی ضرور ہے لیکن اس میں انسانی کاریگری بھی شامل ہے۔ پہاڑی کو کھود کر غار کو آگے تک بڑھایا گیا تھا۔ اس کا ایک دہانہ ادھر سے تھا اور دوسرا دہانہ دوسری طرف تھا۔ ادھر سے آنے والی ہوا ادھر سے نکل رہی ہو گی اسی لیے سفیر نے اسے ائرکنڈیشنڈ کہا تھا۔ میں بھی اس طنز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر میں نے کہا ''ایسا کرو تم تینوں یہاں بیٹھو میں اس آبادی کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر میں ایک گھنٹے میں نہ لوٹوں تب تم میں سے کوئی ایک جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لے گا۔ اندھی چال کوئی نہ چلے۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہے۔''

ان کو ہدایت دے کر میں نکل کھڑا ہوا۔ میں اس آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ انڈیا کا حصہ ہوا تو میں چین کی طرف رخ کر لوں گا پھر وہاں سے پاکستان پہنچنا کم خطرے کی بات ہے۔

ابھی میں برف کے میدان سے اتر کر پتھریلے راستے پر آیا ہی تھا کہ سامنے سے دو آدمیوں کو آتے دیکھا۔ وہ دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے اس لیے کہ مسلسل دونوں کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ آواز مجھ تک پہنچ نہیں پا رہی تھی اسی لیے ان کو بغور دیکھتے ہوئے میں آگے بڑھ رہا تھا۔

دراصل میں ان کے چہرے سے علاقے کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کے چہرے عام طور سے چپٹے ہوتے ہیں۔ تبتی نقش و نگار والے لیکن ان کے چہرے واضح ہوئے تو میں خوش ہو گیا کیونکہ ان کے چہرے کی ساخت پختونوں سے مل رہی تھی۔ لباس بھی پختونوں والا تھا۔ بڑی سے گھیر دار شلوار۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میں پاکستانی علاقے میں پہنچ چکا ہوں۔ میں خوشی سے سرشار انداز میں ان کی طرف بڑھا۔ اب ان لوگوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دونوں رک گئے تھے مگر میں رکا نہیں تھا اور ان کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے کے بعد میں نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے میرے اندازے کی تائید کر دی۔ سلام کا جواب دیتے ہی پشتو لب و لہجے میں پوچھا گیا ''تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے جواب دینے کی بجائے پوچھا ''اس علاقے کا کیا نام ہے؟''

''یہ بلتر گلیشئر کے نزدیک کا علاقہ ہے؟ کیا تم ہیکنگ کے لیے آئے ہو؟ تمہاری پارٹی کہاں ہے؟''

''تم ہمارے لیے خوراک کا انتظام کر سکتے ہو؟'' اس بار پھر میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر دیا۔ ہماری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

''آپ ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ ہمارے ڈیرا پر چلو۔ وہاں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''کیا تم یہاں کے مقامی نہیں ہو؟''

''نہیں جناب ہم ایک ضروری کام سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔ ہم سب اس طرف ایک بڑے سے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ کیونکہ بلتستان کے لوگ امن پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہوتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ جب کہ ان میں سے ایک کی کمر میں اڑسے ہوئے پستول کے ابھار کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ پستول ساتھ رکھنا پختون کلچر کا حصہ ہے۔ لیکن اس علاقے کے لوگ معیوب سمجھتے ہیں۔ پھر یہاں غربت بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہاں والے جتنے پیسوں میں یہ پستول خریدیں گے اس میں کچھ اور ملا کر یاک خرید لینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یاک ان کی زندگی کا جزلاینفک ہے۔ اس سے کھیت جوت لیتے ہیں۔ اس پر سواری کرتے ہیں۔ اس کے دودھ سے بھوک مٹاتے ہیں، گویا یاک ہی ان کی پہلی ترجیح ہے۔ ایسے پرامن علاقے کا کوئی باشندہ پستول رکھ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ کوئی اسمگلر یا غیر قانونی کام کرنے والا ہے۔ میں ہوشیار ہو چکا تھا پھر بھی ان پر آشکار نہیں کیا تھا کہ میں ان کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ بس ان کی تقلید میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئے۔ وہ مکان کچا تھا لیکن اچھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ان میں سے ایک نے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازے کی دوسری جانب کسی کی چاپ ابھری۔ شاید اندر سے کسی نے جھانک کر دیکھا تھا پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر پوچھا ''یہ کون ہے؟''

''سامنے سے ہٹ۔ اندر تو جانے دے۔'' کہہ کر اس نے ہاتھ سے اسے ہٹایا اور مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر استفساریہ انداز میں میرے ساتھ آنے والے سے پوچھا ''یہ کون ہے؟''

بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سندھ کے علاقے کا ہے۔ اب مجھے سو فیصد یقین آ چکا تھا کہ میں وطن کی سرزمین پر ہوں اور مجھے ساتھیوں کو بھی بلا لینا چاہیے۔

''اللہ ڈینو! یہ صاحب ٹریک کرنے آیا ہے۔'' مجھے لانے والے نے ہنستے ہوئے عجیب انداز میں کہا۔

''ریاست خان۔ تم اسے ادھر کیوں لے کر آیا؟'' سوال کرنے والا ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔

''اس سے پوچھو اس کا پارٹی کہاں ہے؟'' مجھے لانے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ زبردستی کرنا چاہ رہا ہے۔ لیکن اسے میری پارٹی سے کیا لینا دینا، یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب جاننا ضروری تھا۔

''اس کی پارٹی سے کیا کرنا ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے جس کام کے لیے آئے ہیں اسے کرو اور واپس چلو۔ مجھ سے اب اس سرد جہنم میں رہا نہیں جا رہا۔'' پہلے سے موجود شخص نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے سے بےزاری عیاں تھی۔ شاید وہ یہاں کی سردی سے گھبرایا ہوا تھا۔

''تم سمجھا نہیں۔ یہ اسی طرف سے آ رہا ہے، جہاں سے وہ آئے گا۔'' ریاست خان نے جواب دیا۔ اس کا انداز مجھے حد درجہ مشکوک لگا۔

ریاست خان کی بات سنتے ہی اللہ ڈینو کے تیور بدل گئے۔ اس نے میرا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ''تم نے سن لیا خان کیا بولا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھی کہاں ہیں اور تم ادھر کیا کرنے گئے تھے۔ اس لیے کہ اس طرف کوئی ٹریک نہیں ہے۔''

''ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس لیے کہ اب مجھے تجسس ہو گیا تھا کہ یہ کس سمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور ان سے ملنے کون آنے والا ہے۔

''جھوٹ مت بولو... ہم لوگ جھوٹ برداشت نہیں کرتے۔ اگر تم نے سچ نہیں بولا تو انجام بہت برا ہوگا۔'' اس نے کڑے تیور سے کہا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔ میں جس ٹیم کے ساتھ تھا وہ لوگ طوفان میں پھنس کر پتا نہیں کدھر چلے گئے۔ میں طوفان سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑا تھا۔ دوڑتے دوڑتے پتا نہیں ان لوگوں کو کہاں چھوڑ آیا۔ طوفان رکا تو میں سامنے والی پہاڑی پر تھا۔ آبادی دیکھ کر ادھر چلا آیا۔''

''بالکل جھوٹ اس لیے کہ ہم یہاں ایک ہفتے سے ہیں اور ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ادھر کوئی ٹریکنگ ...... پارٹی آئی ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ اس طرف کیا کرنے گئے تھے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھی بچھڑ گئے ہیں۔'' میں نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہارے ساتھی کس ملک کے ہیں اور تم کس شہر کے ہو؟''

''میں پنڈی کا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

Urdu Soft Books

''پنڈی کے کس علاقے کے ہو....اس لیے کہ میں بھی راولپنڈی کا ہوں۔'' اللہ ڈینو کے ساتھ بیٹھے شخص نے پوچھا۔

اس کے لہجے نے چغلی کھادی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔اس لیے کہ پنڈی والے کبھی راولپنڈی نہیں کہتے ہمیشہ پنڈی کہتے ہیں۔اس کے بولنے کا انداز بتارہا تھا کہ وہ کراچی کا ہے۔کراچی کے اولڈ ایریا کے لوگ اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔گویا یہاں پورا پاکستان جمع تھا لیکن یہ سب مسخ ذہن والے تھے۔اچھے برے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ہمارے ملک میں بھی اچھوں کے ساتھ کچھ برے لوگ بھی ہیں۔اور ان سب کا تعلق برے لوگوں سے تھا۔اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں سوفیصد یقین ہو چکا تھا۔

''میں ڈھوک چراغ دین کا ہوں۔نالالئی کے قریب میرا گھر ہے۔آپ کسی کو بھی فون کر کے میرے گھر سے تصدیق کراسکتے ہیں۔'' میں نے جواب دینے کے ساتھ اس بات کا اندازہ بھی لگانا چاہا تھا کہ ان کے پاس فون ہے۔اگر فون ہے تو یہاں سگنل آتا ہے یا نہیں۔اگر سگنل آتا ہوگا تو میرا فون بھی کام کرے گا۔جو ابھی تک بیگ کے اندر پڑا اپنی قسمت پر رورہا ہے۔

''ریاست خان اپنا فون دینا ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھادیا۔ریاست خان نے قمیص کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اللہ ڈینو بولا:

''تمہارا نام کیا ہے۔اپنا اور اپنے باپ کا نام بتاؤ ہم ابھی چیک کرتے ہیں۔''

''میرا نام شاہد بٹ ہے۔باپ کا نام ارباب بٹ۔'' میں نے جھوٹ کا ریکارڈ قائم کرنا شروع کردیا۔

''ہاں مجھے یاد آگیا۔ارباب بٹ وہی نا جن کی بڑی سی داڑھی ہے۔''

''جی ہاں۔میرے والد کی داڑھی ہے لیکن بڑی سی نہیں،عام سی۔''

''تب تو تم میرے گرائیں ہوئے۔اب یہ بھی بتادو تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔'' وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھ رہا تھا۔اس نے مجھ سے جواب اگلوانے کے لیے نیا طریقہ اپنایا تھا مگر اسے خبر نہ تھی کہ ایسے چوہے جیسے لوگ میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔اگر میں چاہوں تو ان سب کو دھنک کر رکھ دوں لیکن میں خاموشی سے حقیقت جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔اس لیے کہ یہ ایسی جگہ بھی نہیں ہے کہ لوگ لوٹ مار کے ارادے سے آئے ہوں۔غربت زدہ علاقے میں کوئی اتنی دور سے واردات کرنے نہیں آسکتا یقیناً یہ لوگ کسی اہم کام سے آئے ہیں۔وہ کام کیا ہے یہ جاننا ضروری تھا۔اور مجھے موقع مل نہیں رہا تھا۔میں نے ایک بار پھر پرانی کہانی کو آزمانا چاہا:

''بھائی بہت بھوک لگ رہی ہے۔کچھ کھانے کو ہے تو دے دو۔''

''اللہ ڈینو اسے کھانے کو دے۔'' کراچی والے بندے نے کہا۔

''یار صغیر تو بھی نا...خود ہی اٹھ کر دے دے۔'' اللہ ڈینو نے منہ بنا کر کہا۔مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان میں کوئی بھی اہم بندہ نہیں ہے۔پانچوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔اللہ ڈینو خود اٹھا اور دوسرے کمرے سے بھنا ہوا مرغ اور روٹی لے آیا۔

''لے بھائی صرف دو روٹی بچی ہوئی ہے،اس سے کام چلا۔دوپہر کا کھانا پک جائے تو پیٹ بھر کر کھا لینا۔'' اللہ ڈینو نے پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

واقعی بھوک تھی پھر ان کو دکھانا بھی تھا کہ میں بھوکا ہوں اس لیے میں نے کئی روز کے فاقہ زدہ انداز میں کھانا شروع کردیا۔وہ سب مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔کھانا کھا کر میں نے ڈکار لی اور کہا ''اچھا بھائیو اب مجھے اجازت دو میں اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈنے جارہا ہوں۔پتا نہیں وہ سب طوفان سے بچے بھی یا نہیں۔اس لیے کہ میں الٹی طرف بھاگا تھا۔اگر وہ لوگ بھی ادھر گئے ہوں گے تو بچ جائیں گے ورنہ آئس سلائڈنگ میں دب دبا گئے ہوں گے۔''

''اب تم ادھر سے جا نہیں سکتا۔جب ہم لوگ چلا جائے گا تو شوق سے باہر نکل جانا۔'' ریاست خان نے اکھڑ لہجے میں کہا۔''اب تم ادھر ہی رہے گا۔''

''لیکن میرے ساتھی۔''

''ہم ان کو ڈھونڈے گا اگر وہ لوگ مل گیا تو ان کو بھی یہیں لائے گا۔ادھر باہر کا کوئی آدمی نہیں آتا تم کیسے آگیا۔'' ریاست خان کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔اس نے اللہ ڈینو سے کہا ''منہ کیا دیکھتا ہے اس کا ہاتھ پیر باندھ کر ایک طرف ڈال دے۔''

وہ چار تھے اور میں اکیلا پھر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی کمر میں پستول بھی ہے۔معاملہ نازک تھا۔اگر میں اپنی قوت آزماتا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔میں نے آرام سے اپنے ہاتھ پیر بندھوا لیے۔انہوں نے مجھے باندھتے وقت عام انداز سے باندھا تھا جسے کھولنا میرے لیے کوئی مشکل کام

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

نہیں تھا۔انہوں نے مشکیں کس کے مجھے فرش پر ڈال دیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اپنا ہاتھ دکھا سکتا تھا پھر بھی میں لاچار سا ایک جانب پڑا رہا۔ ریاست خان میری طرف سے مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ جاتے وقت وہ اپنے ساتھ جیدے کو لے گیا تھا۔ پتا نہیں کس چکر میں وہ برفیلے میدان کی طرف گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اللہ ڈینو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک بندہ رہ گیا تھا صغیر جو مجھے ہیروئن چی سا لگا تھا اس لیے کہ وہ جاگتے میں بھی سوتا ہوا لگ رہا تھا۔ اب میں نے اپنی کارسازی دکھانے کی سوچی اور ہاتھ کو اوپر اٹھانے لگا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو باندھا ضرور تھا لیکن پشت کی طرف نہ باندھ کر سامنے کی طرف باندھا تھا جسے کھولنا آسان تھا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور بیٹھے ہوئے بندے کی طرف پیٹھ کر لی۔ اب ہاتھ کو اٹھا کر منہ تک لانا آسان ہو گیا تھا۔ میں نے دانتوں کی مدد سے رسی کی گانٹھ کھولنا شروع کر دیا۔ دو منٹ میں مجھے کامیابی مل گئی۔ بندھن کھلتے ہی میں نے آواز دی ''اللہ ڈینو بھائی بات سنیں۔''

''اوئے شور نہ کر اللہ ڈینو آرام کر رہا ہے۔'' ہیرونچی جیسے شخص صغیر نے جواب دیا۔

''تو بھائی تم ہی ادھر آ جاؤ۔'' میں نے اسے ہی پھانسنے کا سوچا۔

''کیا ہے۔'' وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا اور اٹھ کر میرے قریب آگیا۔ میں یہی تو چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی اور منہ پر بائیاں ہاتھ رکھ کر کہا ''اگر آواز نکلی تو گردن ٹوٹ جائے گی۔''

مجھے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنے کی بھی ضرورت نہ پڑی، وہ ہلکے سے دباؤ سے ہی انٹا غفیل ہو گیا۔ اسے دھکا دے کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جدھر اللہ ڈینو گیا تھا۔ اس کمرے میں بستر بچھا ہوا تھا اور اللہ ڈینو لیٹا ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دن کے وقت سونے کی کیا تک ہے لیکن وجہ بھی نظر آ گئی۔ اس کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بو میرے لیے نئی نہیں تھی۔ جسے میں ہیرونچی سمجھ رہا تھا وہ ہیرونچی نہیں تھا۔ ہیرونچی اللہ ڈینو تھا جو ہیروئن کا مزہ لے کر سویا تھا۔ میں نے قریب پہنچتے ہی اس کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زور ڈالنے لگا۔ وہ نشے میں چور تھا لیکن گلے پر دباؤ پڑا تو پھڑپھڑانے لگا۔ چھٹپٹانے لگا۔ جکڑ سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اس کی کوشش کہاں کامیاب ہونے والی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی انٹا غفیل ہو گیا۔ اس کا جسم جھول گیا۔

ان دونوں پر میں نے اتنی آسانی سے قابو پا لیا تھا جیسے وہ دونوں ننھے بچے ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ لوگ سڑک چھاپ تھے۔ معمولی درجے کے بدمعاش اگر ٹرینڈ ہوتے تو شاید معرکہ سر کرنے میں دیر لگتی۔

ان سے نمٹ کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں میرا موبائل تھا۔ مجھے یہ علم نہیں تھا لیکن اندازہ تھا کہ وسیم اور سفیر کے پاس بھی موبائل ہے۔ میں نے اپنا موبائل نکالا۔ اسے آن کیا لیکن یہ دیکھ کر آہ بھرنے پر مجبور ہو گیا۔ سگنل نہیں تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کاش میرے پاس سیٹ لائیٹ فون ہوتا۔ موبائل کو واپس بیگ میں رکھ کر میں نے بیگ کو دوبارہ کندھے پر لٹکایا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ دور بہت دور۔ اسی برف کے میدان میں دو نقطے سے نظر آنے والے بندے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو ابھی چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں اس غار کی طرف چل پڑا جس میں سفیر وغیرہ ٹھہر گئے تھے۔ چلتے وقت میرے ذہن میں ایک بات بار بار آ رہی تھی۔ میری قسمت بھی عجب ہے۔ زندگی نے مجھے ٹینس کی گیند بنا دیا ہے کہ اچھالتی ہے۔ ٹپا کھاتا ہوں پھر اچھال دیتی ہے۔ کتنی عام سی زندگی تھی۔ ایک سویرا کی خاطر گھر چھوڑا تو زندگی کیسی اچھل کود سے بھر گئی۔ پورے پاکستان کی خاک چھنوا دی۔ نیپال انڈیا اور چین تک پہنچا دیا۔ ابھی ابھی جس سرزمین سے آیا ہوں اس کا ذکر کسی سے کروں تو کون یقین کرے گا؟ لوگ اسے من گھڑت کہانی قرار دیں گے۔ یکایک میرے ذہن میں ایک بات ابھری، کہیں یہ سب کچھ ایلوائیشن تو نہیں تھا۔ میں نفسیاتی بیمار تو نہیں ہو گیا تھا؟ کہ خواب مسلسل دیکھتا رہا۔ کبھی دماغ نے انتباہ دیا۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ وسیم، سفیر اور عبداللہ بھی تو اس عجیب و غریب سرزمین سے آ رہے ہیں۔ کیا وہ بھی خواب دیکھتے رہے ہیں؟ میں اپنے ہی خیال پر مسکرا اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس غار کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

میری نظریں بار بار ادھر بھی اٹھ رہی تھیں۔ اس جانب جہاں دور دور تک پھیلا برفیلا میدان تھا اور اس میدان میں کسی نقطے کی طرح نظر آنے والے وہ دونوں بندے۔ انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا تھا تو توجہ نہیں دی تھی بس وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

جارہے تھے۔

غار کے نزدیک پہنچ کر دیکھا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا۔ ان کے موجود رہتے ایسی خاموشی چہ معنی دارد۔ واقفِ حال ہونے کے لیے اندر داخل ہوا تو اطمنان کی سانس نصیب ہوئی۔ سامنے پتھریلے فرش پر وہ سب بے خبر سو رہے تھے۔ شاید یہ تھکن کا نتیجہ تھا۔

ایک تھکن ہی تو ایسی چیز ہے جو انسان کو ہر غم سے عاری کر کے نیند کی پُرسکون وادیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ سب بھی ہر خطرے کو بھول کر بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی آواز دی۔ پہلی ہی آواز پر سفیر نے آنکھ کھول دی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا ''سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے؟''

''کیا مطلب؟'' وسیم بھی بیدار ہو گیا تھا۔ ''یہ کیسی پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟''

میں نے بغور اس کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا ''مطلب یہ کہ یہاں سے نکلتے ہی اجنبی دشمنوں سے سامنا ہو گیا اور وہ میری خاطرداری پر اتر آئے۔ زبردستی ایک گھر میں لے جا کر قید کر دیا۔''

''کیا... تم قید میں تھے؟'' سفیر کے لہجے میں حیرت تھی ''ایسا کون سورما تھا؟''

''یہی تو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کون لوگ تھے.. بڑی محبت سے لے گئے اور لے جا کر قید کر دیا۔ میں ابھی قید سے چھوٹ کر آ رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔''

''بغیر کسی وجہ کے انہوں نے آپ کو قید کر لیا تھا؟'' وسیم نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پیر کے انگوٹھے کو عبداللہ کی پیٹھ میں چبھاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کہاں کی شرافت ہے۔ اگر میں نے نیند میں ہاتھ چلا دیا تاں۔'' عبداللہ نے کسمسا کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جملہ پورا کیا:

''یہی تو حیران کن بات ہے۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔ وہ لوگ کسی کے انتظار میں ہیں اور آنے والے کو سب کی نظروں سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے مجھے قید کر لیا تھا کہ میں اسی طرف سے آیا ہوں جدھر سے اسے آنا تھا۔''

''میری آنکھ دیر سے کھلی۔ آپ کیا کہہ رہے تھے۔'' عبداللہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اجی جناب یہ فرما رہے تھے کہ ہمارے لیے کام تلاش کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ بیکار بیٹھنے سے ہاتھ پیروں میں زنگ لگ جائے گا۔'' وسیم نے شوخ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے مختصر انداز میں میری بتائی ہوئی باتوں کو دُہرایا۔

''وہ کون لوگ ہیں؟'' عبداللہ نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں خود بھی سمجھ نہیں پایا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میں یہاں سے نکلا تو دو آدمی نظر آئے....'' میں نے اسے بھی پورا احوال سنایا۔ سب کچھ سننے کے بعد عبداللہ بولا:

''یہ علاقہ اسمگلنگ کے لیے بھی استعمال نہیں ہوتا کہ کہا جائے کہ وہ لوگ اسمگلر ہیں۔ ان دشوار گزار پہاڑیوں، برف زاروں میں عام طور پر صرف ٹریکنگ کے شوقین آتے ہیں۔ کلمبر آتے ہیں ورنہ یہ علاقہ تو غربت کی کوکھ میں پلنے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی غیر معمولی بات ہے جس کی پردہ داری ہے۔''

''ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یہاں سے چین بھی نزدیک ہے اور انڈیا بھی، ادھر اس طرف وہ جو پہاڑ نظر آ رہا ہے۔ پانچویں پہاڑی کے پیچھے ایک ہیولا سا اس طرف سیاچن ہے۔ کہیں کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟ انڈیا والوں کی سازش۔'' سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''وہ لوگ ایسی کیا سازش کر سکتے ہیں؟ ان پہاڑوں پر قبضہ کریں گے؟ اگر ایسا ہوا تو ہمارے فوجی ابھی آ کر ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ انیس سو پینسٹھ کی بھولی ہوئی مار کو یاد کرتے ہوئے بھاگیں گے۔'' عبداللہ بولا۔

''شاید تم بھول رہے ہو۔ سیاچن میں بھی وہ لوگ چوروں کی طرح گھس کر چوکی بنا رہے تھے کہ ایک چرواہے نے دیکھ لیا اور اس نے دوڑ کر دس سے بارہ میل کا فاصلہ طے کیا اور فوج کو خبر دی۔ فوجیوں نے آ کر انہیں پیچھے دھکیلا ورنہ وہ قبضہ کیے بیٹھے رہتے۔ کہیں ویسا ہی کوئی ڈراما یہاں بھی نہ کھیل رہے ہوں۔'' عبداللہ نے سمجھایا۔

''بات سو فیصد سوچنے کی ہے۔ پتا لگانا ضروری ہے کہ وہ لوگ اتنی دور سے کیا کرنے آئے ہیں۔ کسی مقامی آدمی سے پتا نہیں کیا کہ یہ لوگ کب سے یہاں مقیم ہیں؟'' وسیم کی آواز میں فکر کا عنصر در آیا تھا۔

''کوئی مقامی ملا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری بستی خالی پڑی ہے۔ ورنہ ان میں سے ایک آدمی مار کھا کر پوری قوت سے چیخا تھا۔ اس کی چیخ دور تک سنی گئی ہوگی لیکن جب میں باہر آیا تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔''

www.urdusoftbooks.com

''ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے مقامی باشندوں کو بھگا دیا ہو۔''

''ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کوئی کھیل کھیلا ہے تو سمجھ لو کوئی بڑی سازش ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''مجھے یاد آرہا ہے کہ ان پہاڑوں کے باشندے موسم کے حساب سے اپنا علاقہ بدلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس موسم میں نیچے کہیں چلے گئے ہوں۔'' سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ایسا ممکن ہے۔ پھر بھی ہمیں سراغ لگانا چاہیے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ اگر یہ متروکہ علاقہ ہے تو وہ یہاں کیوں ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں۔ مقامی لوگ اس ڈر سے علاقہ تیاگ دیتے ہوں گے کہ یہاں آئس سلائیڈنگ کا خطرہ ہے۔ ایسے خطرناک علاقے میں کوئی یوں ہی نہیں چلا آتا۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے، ایسا کرتے ہیں ہم سب اسی گاؤں میں چلتے ہیں۔ تم سب دوسرے جھونپڑوں میں چھپے رہنا۔ میں واپس اسی گھر میں جارہا ہوں تاکہ ان سے اگلوا سکوں کہ وہ کیا کرنے آئے ہیں۔''

''ہاں چلو۔'' کہہ کر سفیر کھڑا ہوگیا۔

''تم سب ایک ایسی جھونپڑی تلاش کروگے جس میں انہیں لے جاکر ہم تفتیش کرسکیں۔''

''اتنی مشقت ضروری ہے کیا؟ وہیں ڈرائی کلین کر لیتے ہیں۔ کافی دنوں سے کسی کو دھوبی پاٹ دیا نہیں ہے۔ وہاں لڑے بھی تو تیر تلوار سے ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔'' وسیم بولا۔

''ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ ہم سب چلتے ہیں۔ پیر توڑ کر ہاتھ میں دیں گے تو ان کی زبان خود ہی چلنے لگے گی۔'' وسیم نے پھر گل افشانی کی۔

''نہیں، ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا ہے۔ صرف ایک بندے کو اٹھاتے ہیں۔ اس سے سوالات کرتے ہیں۔ باقی سب کو اندھیرے میں رہنے دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ مشورہ بھی برا نہیں ہے اس طرح یہ بات آسانی سے سامنے آجائے گی کہ وہ لوگ کس لیے یہاں آئے ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہوں۔'' وسیم نے کسی بزرگ خاتون کے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے پر مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔

وسیم کی یہی بات مجھے اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر حال میں خوش رہنے اور پریشان نہ ہونے والا بندہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہر بات کو مزاح میں اڑا دینے والا تھا۔

''تو پھر دیر کس بات کی۔ چلو، ہم سب چلے چلتے ہیں۔'' سفیر نے کہا اور اپنا بیگ اٹھالیا۔ عبداللہ نے بھی یہی کیا۔ وسیم نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے پھر سوال داغا ''لڑائی بھڑائی کا موقعہ ملے گا نا۔ ہاتھ پیر اینٹھنے لگے ہیں۔''

''چلو اسی بہانے تمہارے ہاتھ پیروں کا زنگ دور کر دیتے ہیں۔ سوالات میں کروں گا اور مرمت تم کرنا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں نے برفزار کی جانب نظر ڈالی، ادھر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ادھر جانے والے اب تک لوٹے نہیں تھے۔ شاید کہیں دور گئے تھے۔ میں نے اپنے قدم اس گھر کی جانب بڑھا دیے جہاں ان لوگوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس گھر کا دروازہ کھلا اور اللہ ڈینو باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر میں نے سفیر سے کہا ''یہ ان کا ساتھی ہے۔ اسے چھاپ لو اور سامنے والے گھر میں کھینچ لے جاؤ۔ ہم اس گھر کو ٹارچر روم بنائیں گے۔ تفتیش کے لیے وہ گھر برا نہیں ہے۔''

''باہر ہی سے کافی بڑا نظر آرہا ہے۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

اللہ ڈینو نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور واپس اندر جانا چاہتا تھا کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اندر گھس کر کہیں دروازہ نہ لگا دے۔ اگر ایک لمحہ کی دیر ہوجاتی تو مجھے دروازہ توڑنا پڑتا۔ میں نے بند ہوتے دروازے کے درمیان پیر اڑا دیا تھا۔ میری کوشش کامیاب ٹھہری۔ وہ دروازہ بند نہ ہو پایا اور میں نے اسے زور لگا کر پیچھے دھکیل دیا، پھر اسے باہر کی جانب کھینچ لیا۔ اس افتاد پر وہ چیخا تھا۔ شاید وہ مدد کے لیے اپنے ساتھی کو بلانا چاہتا ہو۔ اس کی چیخ سن کر اندر سے دوسرا بندہ بھی باہر آگیا۔ جیسے ہی اس نے سر باہر نکالا، باہر کا منظر دیکھنے کو لیکن دیکھ نہ پایا۔ اسے عبداللہ نے گریبان سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور اپنے مضبوط بازو کی جکڑ میں اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی گردن گویا شکنجے میں آگئی تھی۔ دونوں ہی بے بس ہوچکے تھے اس لیے ہم بہ آسانی ان دونوں کو کھینچتے ہوئے دوسرے والے گھر میں لے آئے۔

اندر لاتے ہی وسیم نے اللہ ڈینو کے پیٹ میں گھونسا مارتے ہوئے کہا ''یہ ابتدا ہے۔ ابھی میرا ہاتھ کھلنے دو پھر آرام سے خاطر داری کروں گا۔''

وسیم کا کئی پاؤنڈ وزنی گھونسا اس کے پیٹ پر پڑا تو وہ اوغ کی آواز نکال کر دوہرا ہوگیا تھا۔ وسیم نے اسی پر بس نہ کیا۔ اس کے ٹخنے پر بوٹ سے ٹھوکر بھی ماردی۔ ''یہ بھی!

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

ابتدا ہے۔ابھی ہم تم سے کچھ سوالات کریں گے اگر صحیح جواب نہیں ملا تو پھر بہت معمولی سا کام کریں گے۔جانتے ہو کیا؟'' اس نے جملے کے اختتام پر اپنا رخ دوسرے بندے کی طرف کرلیا تھا۔دوسرا بندہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بغیر پٹے فرفر بولنے لگے گا۔اسے دھمکانے کے لیے اللہ ڈینو پر تشدد ضروری تھا۔میں نے وسیم کو آنکھوں سے اشارہ دیا۔وہ تو گویا منتظر تھا۔اس نے الٹا ہاتھ گھما کر اس کے گال پر جڑ دیا۔چٹاخ کی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔وہ اپنا گال سہلا ہی رہا تھا کہ وسیم نے دوسرے ہاتھ سے مکا رسید کیا۔وہ لڑکھڑا گیا۔اسے عبداللہ نے جکڑ رکھا تھا ورنہ وہ چھٹک کر دور جا گرتا۔تیسرا گھونسا کھا کر وہ بولا'' آخر تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہ ہوئی نا بات...زبان کو کام میں لاؤ اور بتانا شروع کردو کہ یہاں تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟'' کہتے ہوئے وسیم نے اس کے پیٹ میں ایک اور گھونسا مارا۔وہ منہ سے آواز نکالتے ہوئے دوہرا ہوگیا۔

''مج مجھے... کچھ...کچھ پتا نہیں ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''ہاں اور تمہیں۔'' وسیم خونخوار نظروں سے دوسرے بندے کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔وہ وسیم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر ہی کانپنے لگا تھا۔

''ہاں بھئی شروع ہو جاؤ۔'' وسیم نے اس کی گردن پکڑ کر کہا تھا کہ وہ رو دینے والے انداز میں بولا'' مجھے کچھ بھی پتا نہیں۔یہ لوگ مجھے کھانا بنانے کے لیے لے کر آئے ہیں۔''

''نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صغیر۔'' وہ بچ مچ کانپ رہا تھا۔

''اور تم کیا کہتے ہو... تمہیں کس لیے لایا گیا؟'' سفیر نے اللہ ڈینو کے سر پر انگلی تیڑھی کر کے الٹی طرف سے مارتے ہوئے پوچھا۔

''یقین کریں مجھے بھی نہیں پتا کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے۔میں کراچی میں انٹراسٹیٹ بس اسٹینڈ پر بکنگ کرتا ہوں۔اس سے میری گہری دوستی ہے۔ایک دن اس نے کہا کہ چلو ہم لوگ پاکستان ٹور پر چلتے ہیں۔میں نے بھی سوچا کہ عرصہ ہوگیا ہے کہیں باہر نہیں نکلا۔اس بہانے آؤٹنگ ہو جائے گی۔اس سے پوچھا کہ کہاں کہاں جانا ہے تو وہ بولا کہ گلگت بلتستان کافرستان۔یہ سن کر میں خوش ہوگیا کہ وہ شمالی علاقہ جات جانے والا ہے۔برف باری دیکھنے کا اپنا مزہ ہے اسی لیے ہم اس کے ساتھ آگئے۔'' اللہ ڈینو نے جواب میں پوری کہانی بیان کردی۔شاید یہ خوف کا اثر تھا کہ وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے لگا تھا۔

''یعنی تمہیں بھی پتا نہیں ہے کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے؟'' میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں... مجھے کچھ بھی پتا نہیں ہے۔میں تو صرف اس لالچ میں یہاں آیا ہوں کہ برف باری دیکھوں گا۔'' اس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔وہ جس انداز میں بتا رہا تھا اس سے صداقت جھلک رہی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا اس لیے مجھے وسیم کی طرف دیکھنا پڑا۔اس کی طرف مڑ کر میں نے کہا'' بھائی وسیم ذرا اپنی مہارت دکھانا کہ تم کس طرح پیروں کے جوڑ کھولتے ہو۔اس کا پیر حاضر ہے۔کوشش کر کے دکھاؤ نا۔''

وسیم نے جھک کر اس کے ٹخنے کو چھوا اور پھر کہا'' خاصہ مضبوط ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔'' وسیم نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی جیسے واقعی وہ اس کام میں ماہر ہو۔وہ اس کے پیر کو مختلف انداز سے معائنہ کرتا رہا پھر اس نے اس کے ٹخنے پر الٹے گھونسے کو آزما کر کہا۔'' ہاں میں نے اس کے تمام جوڑ کو سمجھ لیا ہے،اس لیے اب میں اسے بہ آسانی کھول لوں گا۔'' اس نے ایک گھونسے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔نہایت تیزی سے مختلف جوڑ پر گھونسا مارتے ہوئے بولا تھا۔

درد کی تیز لہر اللہ ڈینو کے چہرے پر تیرتی نظر آئی۔اس نے درد سہنے کے لیے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا پھر پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

''آپ یقین کیوں نہیں کرتے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔''

''بغیر وجہ کے کوئی گھر سے قدم باہر نہیں نکالتا،میں کیسے یقین کرلوں۔ویسے اب کچھ ہی دیر ہے جب وسیم تمہارے ٹخنے کی ہڈی کو نکال کر فخر یہ کہے گا'یہ لیجئے اسے ٹخنے کی ہڈی کہتے ہیں۔بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔''

اللہ ڈینو نے خوفزدہ نگاہوں سے وسیم کو دیکھا پھر منمنایا'' مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ یہاں اس کا کوئی قریبی دوست آئے گا اور وہ اسے کچھ دے گا۔جسے ہمیں پیٹھ پر لاد کر کہیں لے جانا ہے۔''

''وہ کیا چیز ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کوئی بھاری بھرکم چیز ہے جسے ریاست خان اکیلے اٹھا نہیں سکتا،اسے ہم سب کو مل کر اٹھانا ہے اسی لیے وہ ہمیں ساتھ لے کر آیا ہے تاکہ ہم اس کی مدد کریں۔بدلے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میں وہ ہمیں ٹھیک ٹھاک پیسے دے گا۔ اتنے پیسے جو ہم ایک ماہ میں کما نہیں سکتے۔''

''ہاں یہ ہوئی نا بات۔'' وسیم بولا ''اب باقی باتیں بھی بتاتے جاؤ۔ وہ چیز کیا ہو گی اور کتنی وزن والی ہو گی۔'' اس نے اللہ ڈینو کو چھوڑ کر صغیر کو کندھے سے پکڑ لیا تھا۔ اس نے اتنی مضبوطی سے اس کا کندھا جکڑا تھا کہ صغیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''اس کا علم ہم میں سے کسی کو نہیں۔ جیدے کو بھی نہیں جو اس کے ساتھ گیا ہے۔'' صغیر نے منمنا کر جواب دیا۔

''تم لوگ کتنے دن سے یہاں ہو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سچ تلاش کر رہی تھیں کیونکہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتیں اور جھوٹ عیاں ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اسی لیے مزید کی تمنا میں مسلسل اس پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔

''ہم لوگ پرسوں پہنچے ہیں۔ یہ پورا علاقہ ریاست خان کا دیکھا ہوا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اکثر یہاں آتا رہا ہے۔''

''اس سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ کب سے دوستی ہے؟'' میں نے ایک اور سوال داغا۔

''یقین کریں میں بس اسٹینڈ پر ٹائم کیپر ہوں۔ وہ اکثر اپنی بس لے کر کراچی آتا رہتا ہے۔ وہیں اس سے دوستی ہوئی تھی۔ ایک سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بس کے نیچے غیر قانونی اشیا لے کر آتا ہے اس لیے اس کی آمدنی خوب ہوتی ہے اور وہ ہاتھ کا بھی کھلا ہے۔ دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔''

''یہاں آنے سے پہلے اس نے ایسا کیا کہا تھا کہ تم لوگ آنے پر راضی ہو گئے تھے؟''

''اس نے کہا تھا کہ اس کے ایک دوست نے اسے ایک کام دیا ہے۔ اس کام کے اچھے پیسے دے گا۔ گلگت بلتستان کی سیر مفت میں ہو جائے گی اور لوٹتے وقت جیب میں اچھی خاصی رقم بھی ہو گی۔ کام بہت معمولی ہے۔''

''ایک کی بجائے تین بندوں کو کیوں لے کر آیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اس نے کہا تھا کہ میرا دوست جو دے گا اسے وہیں ایک دوسرے بندے تک پہنچا دینا ہے۔ جو کچھ دے گا وہ وزنی ہے اس لیے اسے مدد کے لیے دو تین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے ہی اللہ ڈینو کو ساتھ ملایا اور یہاں آ گیا۔'' اس نے اپنے ساتھ بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کیا۔

''ریاست خان کب تک لوٹے گا؟''

''کہہ کر نکلا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جائے گا۔ درمیان میں آپ آ گئے اس لیے اسے واپس آنا پڑا۔''

''اسے گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب تو اسے آ جانا چاہیے؟''

''ہو سکتا ہے آ گیا ہو اور ہمیں اس والے گھر میں تلاش کر رہا ہو۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا ''باہر دیکھنا لیکن احتیاط کے ساتھ۔''

عبداللہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور تھوڑا سا اسے کھول کر باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا اندازہ صحیح ہے۔ وہ دونوں آ چکے ہیں اور اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ شاید انہیں ان دونوں کی تلاش ہے۔''

''گویا آپریشن کی شروعات کر دینا چاہیے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں ان دونوں کو باندھ کر ڈال دیتے ہیں پھر باہر نکلیں گے۔'' وسیم بولا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اللہ ڈینو کی گدی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ چکرا کر نیچے گرا تھا کہ سفیر نے برابر میں کھڑے اس کے ساتھی کی گردن ناپی۔

دونوں نیچے گر چکے تھے۔ انہیں بے ہوش دیکھ کر سفیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ عبداللہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے کہ ہم پوری طرح سے مطمئن رہیں گے کہ یہ باہر نکل کر شور نہیں کر پائے گا۔''

ان دونوں کو ہوش سے بیگانا کر کے ہم باہر آئیں لیکن اس احتیاط سے کہ فوراً ہی کسی کی نظر میں نہ آ جائیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت باہر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ شاید وہ دونوں اندر تھے۔ ہم چاروں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے اس مکان تک پہنچے اور دروازے سے اندر جھانکا۔ ریاست خان اور جیدے دونوں فرش پر بیٹھے تھے۔ ریاست خان فکرمند لہجے میں کہہ رہا تھا ''یہ ایک خطرناک بات ہے کہ وہ قیدی غائب ہے، اللہ ڈینو اور صغیر بھی نظر نہیں آ رہے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ قیدی کسی طرح اپنے بندھن کھول کر بھاگا ہو گا۔ اللہ ڈینو اور صغیر اس کے پیچھے گئے ہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔'' جیدے نے اپنا خیال پیش کیا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

""ہمیں اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔"" سفیر نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ آواز سے وہ دونوں چونک گئے۔ میں نے اندر جاتے ہی کہا ""ریاست خان تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔""

ریاست خان نے کمر میں اڑسے پستول کو نکالنے کی کوشش کی تھی کہ سفیر نے اچھل کر اس کے سینے پر ٹکر ماری۔ وہ فرش پر چت گرا تھا کہ وسیم نے اپنا پیر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پستول کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ اگر وہ ٹریگر دباتا تو گولی دیوار میں لگتی۔ ریاست خان کے دوسرے ساتھی کو عبداللہ نے سنبھال لیا تھا۔ سفیر نے اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ کر کہا ""جتنی جلدی بکے گا تیرے حق میں اتنا ہی اچھا ہے۔ توتے کی طرح ٹرٹر شروع کردے۔""

""کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"" اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

""تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟""

""ٹور پر آیا ہوں.... ہر سال آتا ہوں۔ اس موسم میں یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ ہم آرام سے ان کی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں اور دس بارہ دن میں لوٹ جاتے ہیں۔""

""جھوٹ بولنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"" میں نے اس کی پسلی پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

""اگر سچ نہیں بولنا ہے تو پھر موت کے فرشتے کو کہہ دو کہ وہ جلدی آجائے اس لیے کہ اب تم میرے قبضہ میں ہو۔"" وسیم نے پیر سے اس کی کلائی کو مسلتے ہوئے کہا۔ اس کا دباؤ کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا کیونکہ ریاست خان کا چہرہ سرخ ہوچکا تھا۔

""ریاست خان ایک بات یاد رکھنا۔ میں اگر ضد پر اتر آؤں تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ میں ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں سامنے والے برفیلے میدان میں ڈال آؤں گا۔ باقی کام ہوائیں اور برف کے ذرات خود کردیں گے کیونکہ یہاں کے مکین ایک ڈیڑھ ماہ سے پہلے واپس آنے سے رہے۔""

""آپ کو کیسے میں یقین دلاؤں کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔""

""وسیم ایسا کرو کہ اس کی ایک ایک انگلیاں توڑنا شروع کردو۔ جب یہ لولا ہوجائے گا تو میں اس کے پیروں

چارلی چپلن

چارلی چپلن برطانوی مزاحیہ اداکار اور فلم ہدایت کار تھا۔ امریکی سینما کے کلاسیکی ہالی ووڈ کے ابتدائی سے درمیانی دور میں بطور فلمساز اور موسیقار بہت شہرت پائی۔ چارلی چپلن نے خاموش فلموں کے دور میں اپنی فلموں میں نہ صرف اداکاری کی بلکہ ان کا مصنف، خالق، ہدایت کار اور بعدازاں موسیقار بھی خود ہی تھا اس دور کے سب سے بااثر فلمی شخصیات سے تھا۔ چارلی چپلن فرانس کی خاموش فلموں کے مزاحیہ اداکار میکس لنڈر سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک فلم بھی میکس لنڈر کے نام کی۔ چپلن کا تخلیقی کام 75 برس پر محیط ہے جو اس کے بچپن میں ملکہ وکٹوریہ دور میں برطانوی اسٹیج اور موسیقی کے ہالوں سے شروع اور 88 برس کی عمر میں اس کی موت تک جاری رہا۔

مرسلہ: فیض محسن۔ کوٹ ادو

محمد منظور نعمانی

(1904ء۔1996ء)

برصغیر پاک و ہند کے نامور اسلامی دانشور اور محدث، وہ مدتوں ندوۃ العلماء میں تفسیر قرآن، حدیث علم کلام اور فرقہ معروفہ ومنحرفہ پر درس دیتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنوکی مجلس منتظمہ کے رکن اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے بنیادی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے متحرک و فعال سرپرست۔ تبلیغی جماعت کے سرگرم عمل رکن اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا کا شمار راسخین فی العلم میں ہوتا ہے۔ لکھنو میں انتقال کیا۔

مرسلہ: جمیلہ احسن۔ کوئٹہ

منوسمرتی

منو کا دھرم شاستر۔ ہندوؤں کے قانون کی کتاب جس پر عام طور پر ہندو عمل کرتے ہیں۔ اسے منو کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

مرسلہ: زویا احمد۔ کراچی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

کی انگلیاں توڑ دوں گا۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے پستول چھینتے ہوئے کہا۔ اس نے پستول چھوڑنے کی بجائے ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکا ہوتے ہی وسیم جیسے پاگل ہو گیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر داہنا پاؤں پہلے ہی رکھے ہوئے تھا۔ اب وہ بائیں پاؤں کو مشینی انداز میں اس ہاتھ پر مارنے لگا بھاری بوٹ کی ضرب نے ہاتھ کو تقریباً ناکارہ کر دیا۔

''جلدی زبان کھول ورنہ اب میں انگلیاں توڑنے ہی والا ہوں۔'' کہہ کر اس نے ایڑی اٹھا کر سارا زور پنجے پر ڈالا۔ بوٹ کی ٹو نے انگلی کا بھرتا بنانے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ ریاست خان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کے ناخنوں سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

''ریاست خان اب بھی وقت ہے زبان کھول دو۔ تم کس سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ وہ کون ہے جو آرہا ہے۔ اگر سچ بول دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں جان بخش دوں گا ورنہ ایک ایک کر کے میں تمہاری تمام انگلیاں توڑنے کا حتمی حکم دے دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یقین کرو کون آرہا ہے مجھے خود پتا نہیں ہے۔ بس مجھے حکم ملا ہے کہ اس علاقے میں پہنچوں اور ان سے ملوں۔ وہ جیسا کہیں اسی مطابق کام کروں۔'' ریاست خان نے جواب دیا۔

''تمہیں یہ حکم کس نے دیا ہے؟'' وسیم نے ایک بار پھر اپنے پاؤں پر زور ڈالا۔

''میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

''اس سے کبھی ملے نہیں؟''

''نہیں۔ اس سے میرا رابطہ فون پر ہوتا ہے۔ اس کا فون نمبر مجھے سرکار کے ایک مرید نے دیا تھا۔''

''یہ سرکار کون ہے؟''

''مرشد سائیں.... حضرت مرشد علی سائیں سرکار۔''

اس کا اتنا کہنا تھا کہ وسیم نے کہا ''شکر الحمدللہ.. ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم.. ہمیں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ مرشد نے خود ہی رسی دراز کر دی کہ اسے پکڑ کر چلے آؤ۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے وسیم کو خاموش کیا پھر ریاست خان سے بولا ''تم مرشد کو کب سے جانتے ہو؟''

''بہت پہلے سے۔ کئی سال قبل میرے جگری یار فتح خان سے سائیں نے کوئی کام لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ملنے میں بھی سائیں سرکار کے پاس آیا تھا اور میری دنیا بدل گئی۔''

ریاست خان بڑی عقیدت سے مرشد کا نام لے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پوری طرح مرشد کے ٹرانس میں ہے۔

''لگتا ہے دنیا گول ہے، بالکل گول ہے۔ مرحوم فتح خان سے بھی سلسلہ مل گیا۔'' سفیر ہنستے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے ریاست خان سے پوچھا ''مرشد کا وہ مرید کب سے اس آدمی کے لیے کام کر رہا ہے؟''

''میں سائیں سرکار کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ آفاق نامی وہ مرید مجھے لے کر باہر چلا آیا۔ اس نے مجھ سے کہا ''ریاست خانا تم کو ہم ایک کام دینا چاہتا ہے' کرو گے؟'' میں نے پوچھا ''کیسا کام؟'' وہ بولا ''ایک چھوٹا سا کام ہے جو آپ کسی سے بھی کرا سکتے ہو۔ کام کے بارے میں معلومات اس فون نمبر سے ملے گی۔ سائیں سرکار نئی خانقاہ کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا ویسا کام آجاتا ہے تو یہ سوچ کر لے لیتے ہیں کہ ایک اچھے مقصد کے لیے بظاہر برا نظر آنے والا کام کرنا جائز ہے کیونکہ خانقاہ بن گئی تو لاکھوں افراد کی ہدایت کا سامان ہو جائے گا۔ میں خود بھی خانقاہ کی تعمیر کے لیے کچھ دینا چاہتا تھا اس لیے فوراً راضی ہو گیا۔ میں نے اس کو ہاں کر دیا۔ یہ بات تین مہینے پہلے کی ہے۔ اس نے جو کام دیا تھا وہ ایک آدمی تک ایک سوٹ کیس پہنچانا تھا۔ وہ سوٹ کیس یہاں آ کر لینا تھا۔ میں نے وہ کام کر دیا۔ اس کا معاوضہ اتنا ملا کہ ایک بڑی رقم میں نے خانقاہ کے لیے دے دی جسے لے کر سرکار خوش ہو گئے۔ اس کے بعد اس بندے سے پھر بات نہ ہوئی۔ میں اسے بھلا بیٹھا تھا کہ ایک ہفتہ قبل فون آگیا۔ اس نے اس بار جو کام بتایا اور ایڈوانس میں پچاس ہزار روپے اسی مرید سے بھجوائے تو میں بھاگتا ہوا کراچی پہنچا اور وہاں سے ان تینوں کو لے کر یہاں آگیا۔''

میں بر سر مطلب آگیا۔ ''جس کی تلاش میں گئے تھے وہ کیوں نہیں آیا؟''

''گزشتہ بار جس دن کا بولا تھا وہ اس کے دو دن بعد آیا۔ ہو سکتا ہے اس بار تین روز بعد آئے۔'' ریاست خان نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ وسیم نے پیر کا دباؤ کم کر دیا تھا۔

''گزشتہ بار وہ کیا دینے آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''رقم دینے آیا تھا جو میں دو سوٹ کیس میں بھر کر یہاں سے لے گیا تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔ چینی' پاکستانی یا

www.urdusoftbooks.com

انگریز ہے؟‘‘

’’شکل تو بالکل پاکستانیوں جیسی ہے لیکن اردو بہت خراب ہے۔ شین نہیں بولتا اور نہ قاف یا خے بول سکتا ہے۔‘‘

اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ انڈین ہے اس لیے کہ انڈین قاف اور خ بول نہیں پاتے۔ خبر کو کھبر کہیں گے۔ لگتا ہے خانقاہ کی بربادی کے بعد مرشد مزید نیچے گر گیا ہے۔ انڈین مذہبی رہنماؤں کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ ان کو استعمال کر سکیں۔ اسی لیے ان کے ایجنٹ ایسے لوگوں سے دوستی بڑھا کر اپنا کام نکالتے ہیں گویا وہ انڈین کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا ہے اور یہ بات میرے لیے قابلِ نفرت تھی۔ میں اسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کر سکتا۔ ملک دشمنوں کو معاف کرنا میری سرشت میں شامل ہی نہیں۔ اب میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ میں اپنی سوچ میں غلطاں تھا کہ وسیم کی آواز سماعت سے ٹکرائی:

’’یاد رکھنا اگر ایک بات بھی غلط ثابت ہوئی تو اپنی تمام انگلیوں سے ہاتھ دھو لو گے۔‘‘ وسیم کی آواز میں ایسی سفاکیت تھی کہ سننے والے کے جسم میں سرد لہر دوڑ جائے۔

’’میں جھوٹ نہیں بولتا ماں کی قسم۔‘‘

پختون کتنا بھی غلط کام کرلے لیکن ماں کی قسم نہیں کھاتا۔ وہ واقعی سچ بول رہا تھا اس کا مجھے یقین آ گیا تھا اس لیے میں نے کہا ’’وسیم اسے چھوڑ دو۔‘‘

وسیم نے اس کے ہاتھ پر سے پیر اٹھا لیا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس کے چہرے سے کرب کے آثار مٹ گئے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے زخمی ہاتھ کو اٹھایا اور بغور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ تب میں نے سفیر سے کہا ’’اپنے بیگ کو ٹٹولو اگر فرسٹ ایڈ کا سامان ہے تو اس کی مرہم پٹی کر دو۔‘‘

ریاست خان نے ترحم نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ سفیر نے بیگ سے فرسٹ ایڈ کٹ نکالی اور اس کے ہاتھ پر دوا لگا کر پٹی باندھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ’’مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے لیکن سوچ کر دیکھو۔ وطن ہماری ماں ہے۔ اس ماں کی عزت سے کوئی کھیلے تو کیا تم برداشت کر لو گے؟‘‘

اس نے نظر اٹھا کر کہا ’’میرا وطن میری جان ہے۔ ہم چور ہے بدمعاش ہے۔ غلط کام بھی کرتا ہے لیکن کبھی وطن دشمنی نہیں کر سکتا۔‘‘

ریاست خان کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اسے استعمال کیا گیا ہے ورنہ یہ آدمی غدارِ وطن نہیں ہے۔ میں نے گرم لوہے پر چوٹ ماری ’’لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ وطن سے غداری ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ جس سے تم ملنے آئے ہو وہ ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے سازش رچ رہا ہے اور اس کام میں تم ان کے مددگار بن گئے ہو۔‘‘

میری بات پر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ’’جی نہیں ہم وطن کے خلاف ہونے والا کسی سازش کا شکار بن نہیں سکتا۔‘‘

’’مجھے یقین ہے تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے لیکن انجانے میں کچھ لوگ آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ جیسے تم بن گئے ہو۔‘‘

’’اگر یہ بات ثابت ہو گیا تو ہم اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے گا۔‘‘

’’مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس لیے تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ آنے والے کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کی اصلیت جان چکے ہو۔ اس سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرو کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ پھر ہم کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’آپ کو یقین ہے یہ سچ بول رہا ہے؟‘‘ سفیر نے انگلش میں پوچھا۔ اس کا انداز اسپینش تھا کہ اگر ریاست خان انگلش جانتا بھی ہو تو مفہوم آسانی سے سمجھ نہ آئے۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اسی لہجے میں کہا:

’’انسان کتنا ہی بڑا شاطر کیوں نہ ہو مگر اس کی آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ میں پوری گفتگو کے درمیان اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات ہی دیکھتا رہا۔ وہ سو فیصد سچ بول رہا ہے۔ باتوں سے تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ یہ مذہب پرست ہے۔ انتہائی معصوم۔ ایسے لوگ مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے بے وقوف بنا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ مرشد کی وجہ سے بے وقوف بن گیا ہے۔‘‘

’’کیا یہ اب ہمارا ساتھ دے گا؟‘‘

’’ایسے لوگ وطن کے لیے جذباتی ہوتے ہیں۔ بھول گئے۔ 1947 میں یہ پختون ہی تھے جو ایک آواز پر کشمیر کے برادرانِ ایمانی کو ڈوگرا ظلم سے آزاد کرانے کے لیے خود ہی اپنے علاقوں سے نکل کر کشمیر پہنچ کر سری نگر تک گھس گئے تھے۔ ان غیور بہادروں کے بارے میں میرا خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ اب یہ اپنے ہاتھوں سے اس بندے کو شوٹ کرے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

گا۔‘‘میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ریاست خان اپنا زخمی ہاتھ سنبھالے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔اس کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہوگیا۔وہ برفیلے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔سرد ہوائیں مزاج پوچھنے لگی تھیں۔میں نے اتاری ہوئی جیکٹ کو دوبارہ سے پہن لیا۔زِپ لگا رہا تھا کہ ریاست خان نے کہا ’’وہ آگیا؟‘‘

’’اس اندھیرے میں برفیلے میدان کو پار کر کے وہ آرہا ہے۔تعجب کی بات ہے۔‘‘میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

’’گزشتہ بار بھی وہ رات کے وقت آیا تھا۔یہ بات یاد آیا تو میں کھڑکی پر آکر کھڑا ہوگیا۔اور واقعی وہ آگیا۔ٹارچ سے اشارہ کررہا ہے۔‘‘ریاست خان کے کہنے پر میں نے ادھر دیکھا۔سامنے برفیلے میدان میں بار بار ٹارچ جل بجھ رہی تھی۔میں نے پوچھا:

’’اس اشارے کا جواب کیسے دوگے؟‘‘

’’اسی طرح ٹارچ کے ذریعہ۔‘‘اس نے جواب دیا۔

’’تو پھر اشارہ دو۔‘‘میرے کہنے پر اس نے کمرے کے ریک پر رکھے ٹارچ کو بائیں ہاتھ سے اٹھایا اور کھڑکی پر آکر جلانے بجھانے لگا۔ادھر سے تین بار ایک ساتھ جلایا بجھایا گیا اور پھر ٹارچ بند ہوگئی۔

’’وہ مجھے بلا رہا ہے۔‘‘ریاست خان نے کہا۔

’’چلے جاؤ مگر احتیاط سے۔ہم تمہارے قریب ہی ہوں گے مگر کچھ دیر سے نکلیں گے اور ضرورت پڑی تو مدد بھی کریں گے۔‘‘میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بولا:

’’ہماری باتیں کیسے سنیں گے؟‘‘

’’واقعی یہ بات اہم ہے۔‘‘میں نے کہا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا ’’راجا صاحب بغیر تیاری کے تم لوگوں کو لے کر نکلے نہیں ہوں گے۔یقیناً تمہارے پاس واکی ٹاکی ہو گی؟‘‘

’’جی ہاں ہے اور بہت اعلیٰ قسم کی ہے۔‘‘کہہ کر وہ اپنے بیگ کو کھولنے لگا۔زپ کھولتے ہوئے بولا ’’وسیم اور عبداللہ کے پاس بھی ہے۔سب دیکھ لیں کہ چارج ختم تو نہیں ہوا۔‘‘

وسیم اور عبداللہ نے بھی واکی ٹاکی نکال لیا جو بہت ہی چھوٹا تھا۔اسے بہ آسانی کالر میں لگایا جاسکتا تھا۔

میں نے سفیر والا واکی ٹاکی لے کر ریاست خان کی طرف بڑھا دیا۔’’اسے اپنے اوپر والی جیب میں رکھو۔ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم صرف تمہاری باتیں سنیں گے۔اس لیے اسے نکالنے کی بھی ضرورت نہیں۔‘‘

ریاست خان نے اسے قمیص کے گریبان میں رکھا اور پھر بولا ’’اس طرح کوئی دیکھ بھی نہیں پائے گا اور رابطہ بھی رہے گا۔‘‘

’’وری گڈ۔‘‘میں نے اس کی تعریف کی۔وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔اس کے ساتھی جیدے نے ٹارچ ساتھ لے لی تھی جسے وہ جلا کر آگے بڑھ رہا تھا۔شاید یہ بھی اسے انسٹریکشن دیا گیا تھا۔وہ دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سفیر سے کہا کہ وہ وسیم اور عبداللہ سے کنکٹ کردے۔وسیم پہلے ہی کنکٹ ہو چکا تھا۔اس نے رسیور میری طرف بڑھا دیا۔میں نے اسے کان میں لگالیا۔سفیر نے بھی عبداللہ والا اسیٹ لے لیا۔

’’سفیر اور ہم ان کی طرف جارہے ہیں۔‘‘کہہ کر میں نے سفیر کو مخاطب کیا ’’جھک کر آگے بڑھنا ہے۔جب فاصلہ بہت کم رہ جائے تو لیٹ کر کرولنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔‘‘

’’اوکے بوس۔‘‘سفیر نے ہنس کر کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ہم دونوں آگے پیچھے باہر نکلے اور جھک کر چلنے لگے۔ہم نے کوشش کی تھی کہ دور سے اگر کوئی دیکھے بھی تو جانور سمجھ کر نظر انداز کردے۔میرا پورا دھیان کان میں لگے مائیک پر تھا۔اب تک صرف سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی جو اس بات کی تشریح تھی کہ وہ دونوں ابھی آنے والے سے دور ہیں۔باتیں ہوتیں تو آواز آتی نا۔

ہم آگے بڑھتے ہوئے اب اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی اور پھر برفیلا میدان تھا۔ٹھنڈی ہواؤں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔جیکٹ بھی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام تھی، سینے کے سامنے کا حصہ پوری طرح بھیگ چکا تھا اور برف کی ٹھنڈک سینے کو چھید رہی تھی۔سامنے سے اڑ کر آتے برف کے ذرات سینے پر جمع ہورہے تھے اور اس کی ٹھنڈک اندر تک پہنچ رہی تھی۔لیکن ہم نہ سیدھے ہوسکتے تھے اور نہ رک سکتے تھے۔آگے ہی آگے بڑھتے جارہے تھے۔ابھی ہم نے دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ کانوں میں آواز گونجی:

’’آگئے۔ہمیں پوری اُمید تھی کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔‘‘شاید آنے والے نے ریاست خان کو مخاطب کیا تھا۔

''جی ہم وقت پر آ گئے تھے۔ صبح بھی ادھر آئے تھے لیکن آپ پہنچے نہیں تھے۔'' ریاست خان کی آواز سنائی دی۔
''ہم پہلے دیکھتے ہیں کہ کوئی اور تو ساتھ نہیں ہے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو جاتا ہے تب آتے ہیں۔''
''اس موسم میں ادھر کون آئے گا۔ مقامی لوگ جب آبادی خالی کر جاتے ہیں تو نیا کوئی کیا کرنے آئے گا؟'' یہ آواز جیلرے کی تھی۔
''کبھی کبھی کوئی مہم جو آ جاتا ہے۔ ٹریکنگ کے لیے۔'' وہی آواز پھر سنائی دی ''ادھر ہم نے کچھ لوگوں کی آمد محسوس کی ہے۔ کوئی نظر تو نہیں آیا لیکن پیروں کے نشان نظر آئے ہیں۔''
''جی ہاں ایک پارٹی اوپر سے آئی ہے لیکن رکی نہیں۔ نیچے کی طرف چلی گئی۔'' ریاست خان نے کہا۔
''تم نے انہیں نیچے جاتے دیکھا ہے نا؟''
''جی ہاں۔''
''ان کی نظر تم لوگوں پر پڑی؟''
''جی نہیں۔ وہ ہمیں دور سے آتے ہوئے نظر آئے تھے کہ ہم لوگ ایک خالی گھر میں چھپ گئے۔''
''یہ اچھا کیا۔ اب یہ بتاؤ کہ جو سامان میں تم لوگوں کو دوں گا اسے کیسے لے جاؤ گے؟''
''ہم دو کافی ہیں۔ اسے اٹھا لیں گے۔''
''اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سلیج نما گاڑی تیار کرالی ہے۔ اسے بہ آسانی کھینچ لو گے۔''
''کیا اسے شہر تک لے جانا ہے؟''
''نہیں اسے کہیں لے جانا نہیں ہے۔ اس میں جو سامان ہے اسے غاروں میں رکھنا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر غاروں کے اندر یہ والا پیکٹ رکھنا ہے۔'' شاید اس نے کوئی پیکٹ دکھایا تھا۔ ''یہ والا پیکٹ نکال .... کر غار میں رکھنا ہے۔'' اس نے کیا دکھایا تھا یہ میں دیکھ تو نہ سکا لیکن اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی دھماکا خیز مواد ہے۔ تبھی دوسری جانب سے پھر وہی منحوس آواز ابھری ''اور پھر پرسوں عین اس وقت جب برف کا طوفان اٹھے تو یہ ریموٹ دبا دینا ہے۔ لیکن خود کسی محفوظ مقام پر رہنا۔''
اب مجھے اچھی طرح یقین ہو چکا تھا کہ وہ کوئی ٹائم بم ٹائپ کی چیز ہے۔ یہ ایک بہت خطرناک بات تھی۔ میں اندر تک کانپ اٹھا تھا۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت بڑی تباہی پھیلتی۔ غصے سے میرے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ اب ہم ان کے اتنے قریب آ چکے تھے کہ ان کی نظر پڑ سکتی تھی۔ اس لیے لیٹ گئے۔ مجھے لیٹتے دیکھ کر سفیر بھی لیٹ گیا۔ یہ کام مزید اذیت رساں تھا کیونکہ کہنا آسان ہے کہ برف پر لیٹ جاؤ لیکن جب کوئی لیٹتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ برفیلے میدان میں لیٹنا کتنا مشکل ہے۔
جیکٹ ایک منٹ میں شرابور ہو گئی اور سرد لہر پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ جسم کی گرمی بھلے ہی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام رہی ہو لیکن دماغ میں جو گرم لہر اٹھ رہی تھی اس نے میرے اندر بھٹی سی سلگا دی تھی۔ اگر وہ ریموٹ والا جملہ سنا نہ ہوتا تو شاید اتنی دلچسپی سے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش نہ کرتا لیکن یہ میرے وطن کا سوال تھا اور جب وطن کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ اطلاع مجھ تک پہنچ جائے تو میں آگ کے سمندر میں بھی چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ اس وقت تو ثبوت بھی سامنے تھا۔ اس کو سزا دینا ضروری تھا۔ ان آنکھوں کو پھوڑنا تھا جو میرے وطن پر بری نظر ڈال رہی تھیں۔ اس لیے میں پوری دلجمعی سے آگے کی جانب سرک رہا تھا۔
اب وہ مجھ سے بہ مشکل ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ اگر میں کھڑے ہو کر دوڑ سکتا تو اسے دبوچ چکا ہوتا لیکن مجبوری تھی کہ میں دوڑ نہیں سکتا تھا ورنہ وہ بھی دوڑ لگا دیتا۔
مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں سے سرحدی پٹی کتنی دور ہے۔ ''نو مین لینڈ'' ایریا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ عام طور سے ہر سرحدی پٹی پر ایسے نشانات لگا دیے جاتے ہیں جو سرحد کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن ان پہاڑوں پر کہیں بھی ایسے نشانات نہیں تھے جو بارڈر کی نشاندہی کرتے۔ اسی لیے میں احتیاط برت رہا تھا کیونکہ وہ دوڑ کر اپنے حدود میں چلا جاتا تو میں بھی اس کے تعاقب میں دوڑ پڑتا اور پھر ایک نئی کہانی شروع ہو جاتی۔ ویسے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تخریبی کارروائی کے لیے آیا ہے۔ ایسے لوگ معصوم لوگوں کو پھانس کر اپنا کام نکالتے ہیں اور اپنے ہی لوگ نادانستگی میں اپنا نقصان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے بقول ریاست خان کہ گزشتہ بار وہ نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس پہنچا گیا تھا جسے ریاست خان نے راولپنڈی کے کسی شخص کو پہنچایا تھا۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ نوٹ جعلی ہوں گے۔ یعنی نادانستگی میں ریاست خان نے ملک کی معیشت کو بری طرح نقصان پہنچا دیا تھا۔ اس بار تو بہت بڑی سازش کرنے آیا تھا جس کے نقصان کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ چاہ رہا تھا ایسا ہو جاتا تو بہت بڑی تباہی پھیلتی۔ ایسی تباہی جس کا زخم برسوں بھلایا

www.urdusoftbooks.com

نہیں جاسکے گا۔ اس کے پلان کو ناکام بھی کرنا تھا اور اسے انجام تک پہنچانا بھی تھا۔ اس نے میرے وطن کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے اسے سبق دینا ضروری تھا۔

میں نے سرکنے کی رفتار بڑھا دی تھی۔ سانپ کی طرح تیزی سے آگے کی سمت بڑھتا چلا جارہا تھا۔ میری تیز رفتاری کا مقابلہ سفیر بھی کر نہ سکا تھا اس لیے ابھی وہ کافی پیچھے تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ واپس مڑا تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ مجھے کھڑے ہوتے ہوئے وہ دیکھ نہ سکا لیکن جب میں دوڑا تو وہ سرعت سے پلٹا تھا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اسے بھی خطرے کا احساس ہوگیا تھا اسی لیے وہ دوڑا تھا لیکن میرے ساتھ میرا جذبہ بھی تھا اس لیے وہ ناکام رہا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر سر سے اس کی پیٹھ پر ٹکر ماری تھی۔ وہ ٹکر لگتے ہی گرا تھا کہ میں اس پر سوار ہوگیا۔ اب وہ نیچے اور میں اوپر تھا۔ میں نے اس کی گردن پکڑنے کی کوشش تھی کہ وہ بام مچھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اٹھ کر کھڑا بھی ہوگیا تھا کہ میں نے اس کی جیکٹ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ اپنے جیکٹ کو چھڑانے کے لیے جھٹکا مارنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے سامنے کی جانب کھینچ لیا۔ اس کا سر آکر میرے سینے سے ٹکرایا تھا کہ میں نے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کے بیچ ضرب لگائی۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہوگیا۔

اس کا ساتھی بھاگنے کی کوشش کرتا کہ اس پر سفیر آپڑا۔ وہ دونوں بھی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے مدمقابل کی ناک پر سر سے ٹکر ماری اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پسندیدہ داؤ چلا دیا۔ جوڈو کا یہ داؤ خطرناک تو تھا ہی لیکن اگر مدمقابل بھی اس داؤ کو جانتا ہو اس کے توڑ میں داہنی جانب جھک جائے تو داؤ چلانے والے کے لیے مشکل پڑ جاتی ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہ تھا۔ میں نے اسے کمر پر لاد کر زمین پر دے پٹخا تھا۔ اس دھوبی پاٹ نے رہی سہی کسر نکال دی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر کک ماری۔ وہ سنبھلتا کہ اوپر سے میں نے ایک اور بوٹ کی ٹھوکر ماری اور پھر مارتا چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کیسا ایجنٹ تھا جسے اپنے بچاؤ کا بھی علم نہ تھا اور پٹتا چلا جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے سر گرا دیا، اسے بے ہوش دیکھ کر میں نے خود کو روک لیا۔ لیکن سفیر اپنے شکار کی مسلسل پٹائی کیے جارہا تھا۔ اس نے شکار کی بری حالت کر دی تھی۔ کہیں وہ مر نہ جائے اس ڈر سے میں نے کہا ”سفیر اب بس کر دو۔“

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیٹھ پر گرز پڑا ہو۔ میں جھکتا چلا گیا۔ اسی وقت میری کمر پر بوٹ کی ٹھوکر لگی اور میں آگے کی سمت اوندھے منہ گرا تھا لیکن میں گرتے ہی آگے کی سمت پھسلتا چلا گیا تھا۔ برف کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا تھا کیونکہ میں نے خود آگے کی سمت جھولا لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے پے درپے وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے دھوکا دینے کے لیے بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی اور میں اس کے جھانسے میں آگیا جس کی وجہ سے میرے پٹنے کی باری آگئی مگر میں حلوا نہیں تھا کہ کوئی بھی کھا لے۔ اسی وقت میں نے آگے پھسل کر خود کو سنبھالا اور جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہوتے ہی ایک اور جست بھری۔ اس جست نے اس سے دور کر دیا۔

اب میں کھڑا ہو چکا تھا۔ پوری طرح سنبھل چکا تھا کہ اس نے فلائنگ کک چلائی۔ اس کا نشانہ میرا سینا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس کی لات میرے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جھکی ہوئی حالت میں ہی فیٹ چلایا تھا جو سیدھا اس کے پیٹ میں لگا۔ اس کی کراہ سنتے ہی میں نے پھرتی سے پیر اوپر کی سمت گھمائی تھی جو نشانے پر لگی۔ شاید اس نے مجھے عام سا فائٹر سمجھا تھا۔ میں جس طرح برف پر قدم جمائے ہوئے اسے ٹھوکروں سے اڑا رہا تھا یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا مگر سنبھلنے سے پہلے ہی اس پر میری ٹھوکر پڑ جاتی۔ اگر وہ اسی طرح بے ہوش بنا پڑا رہتا تو شاید اس کی بچت ہو جاتی مگر اس نے اٹھ کر غلطی کی تھی۔ یہی نہیں اس نے دوسری غلطی یہ کی تھی کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اب یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلسل پٹ رہا تھا۔ اگر وہ ایسی غلطی نہ کرتا تو شاید اس کی حالت یہ نہ ہوتی جواب ہو رہی تھی اندھیرا تھا پھر بھی مجھے یقین تھا کہ اس کے سامنے کے ایک بھی دانت سلامت نہیں ہوں گے کیونکہ میرے پیروں میں برف پر چلنے والے بوٹ تھے جس کے تلے میں اور ٹو میں لوہے کی کیلیں تھیں تاکہ برف پر قدم جم سکے۔ اس بھاری بوٹ کی ٹھوکر نے اس کے منہ کا بھرتا بنا دیا ہوگا۔ آخری بار میں نے داہنی ایڑی پر زور ڈال کر بائیں پیر کو اٹھا کر پوری قوت سے چکر پھیری کھائی تھی۔ میری گھومتی ہوئی لات اس کی داہنی پسلی پر پڑی تھی اور وہ برف کی وجہ سے پھسل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اچھال بھری تھی اور اس کے جسم پر کودا تھا۔ یہ وار اس کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوا اور اس کی چیخ دور تک گونجی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے میں پوری طرح دیکھ نہیں پایا کہ اس کی حالت کیا ہے۔ میں نے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ریاست خان کو آواز دی۔ ''ٹارچ جلاؤ۔''

اب تک وہ خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا۔ میری آواز پر وہ ایسے چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے پھرتی سے ٹارچ روشن کردی۔ ٹارچ کی روشنی اس پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ دشمنِ وطن کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور منہ سے خون جاری تھا جو برف پر دور تک پھیل رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو ہلایا لیکن اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو میں نے اس کی ناک پر انگلی لگا کر سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی پھر دل کی دھڑکن محسوس کی لیکن تمام علامات نفی کررہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر سفیر سے کہا ''یہ تو گیا کام سے۔''

''خس کم جہاں پاک.... اچھا ہوا ایک دشمن تو کم ہوا۔'' پھر اس نے اپنے شکار کو ٹھوکر مار کر کہا ''اس کا انجام دیکھ لیا نا اب تیری باری ہے۔''

''ہم آپ کے پیر پڑتے ہیں ہمیں جانیں دیں۔''

''ضرور جانے دیں گے لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''یہاں نہیں اسے کھینچ کر اپنے جھونپڑی نما ہیڈ کوارٹر لے چلو وہاں عبداللہ زیادہ آسانی سے معلومات اگلوا لے گا۔'' میں نے کہا تو ریاست اور جیدے نے پھرتی دکھائی اور اسے ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھا لیا اور پھر ہم سب واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

اس بار راستہ تیزی سے طے ہوا اور ہم سب جلد اپنے مرکز پر پہنچ گئے۔ عبداللہ نے قیدی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم اسے کیوں لے کر آئے ہیں۔ اس نے ریاست خان سے کہا ''اسے وہاں لٹا دو اور میرے بیگ سے پلاس نکال کر لاؤ تاکہ میں اس کے ایک ایک دانت نکال کر دیکھوں۔ کہیں کسی طرف جھوٹ تو چھپا نہیں رہ گیا ہے۔'' اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کی ہوا سرد ہو جائے۔ وہ جلاد کی نظر سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ سفیر کی مار نے اسے پہلے ہی ادھ موا کر دیا تھا رہی سہی کسر اس کے ساتھی کی موت نے پوری کر دی تھی۔ اب جو اس نے سنا کہ عبداللہ اس کے دانت نکالے گا۔ وہ باضابطہ رونے لگا۔ وہ کسی بیوہ عورت کی طرح بین کر رہا تھا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں۔ بوڑھی ماں ہے، مجھے جانیں دیں اب ہم کبھی پاکستان نہیں آئے گا۔''

''ابے چپ ورنہ تیری بوڑھی ماں پر بھی ہمیں رحم نہیں آئے گا۔'' وسیم نے جھلا کر کہا ''پہلے یہ بتا کہ تو یہاں کیا کرنے آیا تھا۔''

''سرکار ہمری ڈیوٹی سنگھ صاحب کے ساتھ لگائی تھی۔ ہم کو ان کی سہایتا کرنا تھا۔''

''اچھا وہ سنگھ تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا؟''

''اکھیلیشور سنگھ نام تھا ان کا۔ بہوت بہادر منش تھے۔ ہمیشہ بجئے ہوتے رہے ہیں۔ پتا نہیں کیسے وہ آپ سے مار کھا گئے۔''

''تمہارے بوس کا نام کیا ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''جی ہم نہیں جانتے سنگھ صاحب ہمیں حکم لا کر دیتے ہیں۔''

''ابے تم سب نام تو خوب رکھتے ہو۔ سنگھ یعنی شیر اور دل چوہے جیسا، ہماری قوم کا معمولی آدمی بھی کبھی ایسے روتا نہیں ہے۔''

''ہم کو پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ آپ لوگن کا آئی ایس آئی جس کو پکڑ لیتا ہے اس کا بھرتا بناتا ہے۔''

''فکر نہ کرو ہم تمہارا بھرتا نہیں بنائیں گے اگر تم نے صحیح جواب نہیں دیا تو چٹنی ضرور بنائیں گے۔'' وسیم نے پلاس ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہ سرکار نہ۔ ہم پر دیا کرو ہمرے بچے جندگی بھر تم کو دعا دیں گے۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ تم لوگوں کا پروگرام کیا تھا؟''

''سرکار ہم کو پوری بات معلوم نہیں صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہاں ٹائم بم فیٹ کرنا ہے تاکہ بسفوٹ ہو اور برف کا سیلاب پورے علاقے کو تباہ کر دے۔'' اس نے روتے ہوئے بتایا۔ ''اور راستہ بن جائے۔''

''یہ علاقہ کون سا ہے؟'' روانی میں میں نے ایک احمقانہ سوال کر دیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شک میں پڑ گیا ہے کہ میں آئی ایس آئی کا ہو کر بھی علاقہ نہیں پہچانتا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اب اسے سنبھالنا ضروری تھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

''میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو تاکہ تمہیں جانچ سکوں۔''

''او اچھا اچھا.... یہ بلتر گلیشر کا علاقہ ہے.... آگے ہو پر ہے۔''

''اچھا.. تو تم اس پورے علاقے کو جانتے ہو پھر کہتے ہو کہ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔''

''سر بات یہ ہے کہ میں کسی ایسے کام کے لیے پہلی بار اتنا اندر آیا ہوں ورنہ گلیشر سے نزدیک بھی ایک چھوٹی سی/

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بستی ہے جہاں گاہک بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔وہاں میں کئی بار آچکا ہوں۔"

"سامان خریدتے خریدتے پورے علاقے کو تباہ کرنے پر اتر آئے۔" میں نے غصیلے لہجے میں جواب دیا کیونکہ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی میں ہل کر رہ گیا تھا۔شاید یہ اس صدی کی سب سے بڑی تخریب کاری ہوتی۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے بروقت مجھے بھیج دیا اور میں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔گو کہ یہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے والی بات تھی لیکن کام تو ہو گیا۔میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا"اس تخریب کاری کا پروگرام کس نے بنایا تھا؟ایک ایک کا نام بتا؟"

"مجھے آج صبح ہی حکم دیا گیا' شاید اوپر سے آرڈر آیا ہو۔مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ہم پر کرپا کر دیں جیون بھر دعا دوں گا۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے میرے پیر پکڑ لیے۔

"تجھے چھوڑ دوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔لیکن تجھے ایک کام کرنا ہوگا؟"

"جی بولیں..." وہ اسی طرح روئے جا رہا تھا۔

"جتنے بھی ٹائم بم ہیں ان کو تم واپس لے جاؤ گے اور اپنے علاقہ میں جا کر فٹ کرو گے۔"

"جی کر دوں گا۔" اس نے نہایت آسانی سے وعدہ کر لیا۔

"اور اگر نہیں کیا تو؟"

"آپ خود سوچیں...کوئی آئی ایس آئی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ہمارے ہاں مشہور ہے کہ آئی ایس آئی والوں کی مدد کرنے کے لیے مسلمان پیر فقیر جاپ کرتے رہتے ہیں۔"

اس بے وقوف کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن میں خاموش رہا۔یہ تو کمال ہے کہ ہمارے سرفروشوں کے ڈر سے دشمن کا پتا پانی ہے اور وہ اپنے تئیں کہانیاں بنا بنا کر خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں۔میں نے پوچھا"یہ تم سے کس نے کہا کہ پیر فقیر چلہ کرتے ہیں؟"

"ہمارے ایک جنرل صاحب تھے۔وہ 1965ء کی جنگ میں شریک تھے۔وہ اخبار میں لکھتے تھے کہ ہم گولہ باری کرتے اور کچھ لوگ سبز کپڑے والے ہوا میں اڑتے ہوئے آتے اور گولہ لے کر اڑ جاتے۔سب کا کہنا ہے کہ پاکستانی جاپ بہت کرتے ہیں اس لیے بھگوان کے دوت ان کی مدد کرتے ہیں۔"

"اچھا اچھا...یہ بات یاد رہے کہ اگر تم نے میرے کہے پر عمل نہیں کیا تو میں تمہارے گھر کے ہر آدمی کے لیے اسپیشل عمل کروں گا اور کوئی بھی نہیں بچے گا۔اس لیے جو بیگ تم لے کر آئے ہوا سے اٹھا کر لے جاؤ اور اپنے علاقے میں اسے لے جا کر فیکس کر دو۔"

"جی میں ایسا ہی کروں گا۔بس آپ مجھے چھوڑ دیں۔" اس کے بین سن سن کر مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور حیران بھی تھا کہ انڈین لوگ ایسے بزدل ہوتے ہیں۔میں نے کہا۔

"اب ایسا کرو کہ سو جاؤ صبح بیگ لے کر نکل جانا۔"

"نہیں حکم....اگر میں صبح گیا تو کام نہیں ہو پائے گا۔سب جاگ رہے ہوں گے۔رات کے اندھیرے میں کوئی دیکھ نہیں پائے گا کہ میں بیگ لے کر واپس آگیا ہوں۔"

پتا نہیں وہ رہائی کے لیے جلدی کر رہا تھا کہ وعدہ نبھانے کی جلدی تھی'اس کی بے تابی دیکھ کر میں نے کہا"ٹھیک ہے تمہیں میں چھوڑ دے رہا ہوں لیکن یاد رکھنا جو وعدہ کر کے جا رہے ہو اسے پورا کرنا ہے۔"

"میں بھگوان کی سوگند کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"کیوں، ریٹائرمنٹ کیوں لو گے؟"

"اس لیے کہ میں ماتری بھومی کو پیار کرتا ہوں۔اس سے غداری کروں گا تو اس کا پرائچت تو ہونا چاہیے نا۔"

اس کی باتیں بھی عجیب تھیں مجھے کیا لینا دینا تھا میں نے اس سے کہا"جو کچھ کرنا ہے کرتے رہنا لیکن مجھ سے جو کہا ہے اسے پورا ضرور کرنا ورنہ گھر میں گھس کے ماروں گا۔یہ فلمی ڈائلوگ نہیں ہے۔جیسے کھیم کرن میں گھس کر مارا تھا ویسے ہی دہلی میں گھس کر ماروں گا۔"

"مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میں وعدہ نبھاؤں گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں سے بارڈر کتنی دور ہے؟"

"بارڈر تو بہت دور ہے اگر پیدل چلا جائے تو ایک دن لگ جاتا ہے لیکن یہاں سے ایک ایسا گاؤں ہے جہاں ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔پہلے ہم راجستھان سے آتے جاتے تھے اب ہم ادھر سے راستہ بنا رہے ہیں کیونکہ ادھر چائنا بھی نزدیک ہے اور خطرہ بھی کم ہے چائنا کا مال آسانی سے لا کر ہیلی کاپٹر سے لے جا سکیں گے۔راستہ بن جائے تو اور آسانی ہو جائے گی۔یہاں سے تامل جاتا ہے اس لیے ہم مہینے میں ایک بار آدھا راستہ ہیلی کاپٹر پر اور باقی راستہ برف گاڑی پر پھر پیدل چل کر آتے ہیں۔ہم میٹ لینے ہی آئے تھے کہ پیچھے سے اکھلیشور سنگھ آگیا۔اس نے

کہا کہ اسے کوئی سامان کسی کو دینا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ہم غریب لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے کر چھوٹا موٹا کام کراتے رہے ہیں اس لیے میں راضی ہو گیا۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ رات میں حکم آیا تھا۔"

"ہم جب ادھر آتے ہیں تو وائرلیس پر بوس سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اکھلیشور سنگھ کے آتے ہی ہمارے بوس کا بھی حکم آ گیا۔"

میں نے وسیم کی طرف مڑ کر کہا "اس کی مرہم پٹی کر دینا۔"

"نہیں نہیں... اگر مرہم پٹی کرا کر گیا تو میرے لوگوں کو شک ہو جائے گا۔ بس مجھے ایسے ہی جانیں دیں۔" وہ گڑگڑایا۔

"ٹھیک ہے جا سکتے ہو۔" میں نے کہا اور اپنے بیگ کی طرف جھک گیا۔ میں اس میں ڈیکٹا فون دیکھ رہا تھا لیکن ملا نہیں اتنے میں اس کی آواز سنائی دی "میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اصل میں اب وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا جو پوچھنا تھا پوچھ لیا تھا۔ اب اسے رکھنا بیکار تھا پھر مجھے کوفت بھی ہو رہی تھی کہ ڈیکٹا فون آتے وقت رکھا تھا لیکن اس وقت ملا نہیں اگر مل جاتا تو میں اس کے لباس میں چھپا دیتا۔ وہاں جتنی باتیں ہوتی وہ میں بہ آسانی سن لیتا مگر اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ ننھا سا فون ملا نہیں اور قیدی بھی جا چکا تھا۔ میں نے زپ بند کی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ ایک نقطہ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ جو وعدہ کر کے گیا ہے وہ پورا کرے گا مگر بارود تو ہمارے یہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ شہر پہنچ کر کسی طرح یہ خبر فوج تک پہنچا دوں گا کہ دشمن اب ایسی سازش کرنے پر اتر آیا ہے جو عام نظر میں قدرتی آفت لگے۔ اب تک وہ دریاؤں میں پانی چھوڑ کر سیلابی ریلے کی صورت میں تباہی پھیلاتا رہا ہے اب اس نے یہ راہ اختیار کی ہے۔ اس پر نظر رکھی جائے۔

"بھائی میاں اب سو بھی جاؤ۔ ہمیں صبح ہی یہاں سے نکلنا ہے۔" سفیر نے آواز دی تو میں ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اور بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تھکن اور پھر اطمینان، اس لیے لیٹتے ہی نیند کی رانی نے بانہوں میں بھر لیا اور میں بے خبر ہو گیا۔

کتنی دیر سویا اس کی خبر نہیں۔ جاگا تو رات نے صبح کا چولہ اوڑھ لیا تھا۔ باہر سورج اپنی تابناکی پھیلا رہا تھا۔ سفیر اور وسیم بھی اٹھ چکے تھے۔ ان کی باتوں نے ہی مجھے بیدار کیا تھا۔ عبداللہ بھی کپڑے تبدیل کر کے کھڑا تھا اور وسیم سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا "کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا۔ بس نکل چلتے ہیں۔ پتا نہیں کون کون کس کس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اب تو ایک ایک پل گزارنا سفیر کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔" وسیم نے کہا تو سفیر غرا کر پلٹا:

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ سادی کی یاد دہلا رہی ہے کہ جاتے ساتھ وہ مزاج پرسی کرے گی۔"

"خدا کا خوف کھاؤ۔" وسیم چہکا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ مونا کا خوف سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جاتے ہی وہ پوچھے گی۔ کر آئے آوارہ گردی۔"

"اور تب میں مونا باجی سے کہوں گا کہ آپ انہیں کچھ نہ کہیں، یہ تو سویرا بھابی کی دعا کو اثر دینے گئے ہوئے تھے۔ تا کہ جلد سے جلد ملاپ کا منظر سب دیکھ سکیں۔ ہجر کی غمزدہ شب کو سحر نصیب ہو اور وصال کا موسم قریب آ جائے۔" عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تو سو فیصد صحیح ہے کہ شہباز کا نام آتے ہی سب عورتوں کا غصہ کافور ہو جائے گا۔ سوائے مونا کے۔" سفیر نے کہا "اس لیے کہ مونا بڑی شد و مد سے کہہ رہی ہے کہ کسی بھی طرح شہباز کو دبئی لے کر چلو۔ وہ جب تک پاکستان میں رہیں گے سب پھرکی بنے گھومتے رہیں گے۔" سفیر نے بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"اللہ کے بندوں بھوکے پیٹ کیسے پیدل چلو گے۔ کچھ کھانے پینے کا سامان ہو جاتا تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔

"حضور کے گوش گزار کر دوں کہ صرف چاول پڑے ہیں۔ ان کو پکاتا تو کھاتا کون اس لیے سوچا ہے کہ اب نکل لیا جائے تا کہ جلد از جلد کسی آبادی تک پہنچا جا سکے۔" سفیر نے کہا۔

"آبادی ہے کتنی دور اس کا پتا نہ تمہیں ہے اور نہ مجھے۔ اور اس آبادی کا بھی حال یہی نکلا تو؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ علاقہ گلیشئر سے متصل ہے اس لیے لوگ گاؤں خالی کر گئے ہیں لیکن نچلے حصے کے لوگ اس خطرے سے مبرا ہوں گے اس لیے توی امید ہے کہ وہاں کھانے پینے کا سامان وافر مل جائے گا۔"

"اور اگر نہیں ملا تو؟"

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"ہم پانی پی کر گزارا کرلیں گے۔" اس نے ہنس کر کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

ریاست خان، جیدے، اللہ ڈینو اور اس کا چوتھا ساتھی صغیر بھی ساتھ تھا۔ وہ سب ایک رات میں ہمارے معتقد ہو گئے تھے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا تھا کہ اب وہ غلط کام کبھی نہیں کریں گے کیونکہ غلط کام کرنے والے ہی ملک دشمن قوتوں کے شکار بنتے ہیں۔ ریاست خان فطرتاً شریف آدمی تھا۔ وہ کسی مجبوری میں ہی غلط لوگوں کے ساتھ شامل ہوا ہوگا اسی لیے اتنی جلدی مان گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی خوف سے یا عقیدت سے ہماری تعظیم کررہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

ہم نے صبح کے وقت سفر شروع کیا تھا اور اس وقت سورج سر پر پہنچ گیا تھا لیکن کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آیا تھا۔ ہر طرف پتھریلی چٹانیں اور بے آب و گیا میدان مل رہے تھے۔ سورج کی گرمی دماغ کو پگھلا رہی تھی۔ پیاس کی شدت اب پریشان کرنے لگی تھی۔ گو کہ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا لیکن پانی کی طلب زیادہ پریشان کررہی تھی۔ ہم رک بھی نہیں سکتے تھے کہ کہیں بیٹھ جاتے اور کوئی ایک جا کر پانی کی تلاش کرتا۔ ریاست خان کے لیے یہ علاقہ نیا نہیں تھا۔ وہ برابر آتا جاتا رہا تھا اس لیے وہ جدھر کہتا ہم ادھر مڑ جاتے تھے۔

"اب اور کتنا چلنا پڑے گا؟" عبداللہ کی کراہتی آواز ابھری۔

"مر کیوں رہے ہو۔ انشا اللہ ہم موت کو پیچھے دھکیلنا جانتے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو ہم شادی کس کی کرائیں گے؟" وسیم نے اس کی پیٹھ پر دھپ جما کر کہا۔

"اگر اب ہاتھ چلایا تو میں جواب میں کرانٹے کا ہاتھ چلا دوں گا۔ مجھے کیا کمزور سمجھ رکھا ہے؟" اس بار عبداللہ کی آواز زندگی سے بھرپور تھی میں سمجھ گیا کہ وہ ڈراما کررہا تھا۔

"فضول کی بک بک سے انرجی برباد ہوتی ہے۔ انرجی بچاؤ، اپنے لیے قوم کے لیے۔" سفیر نے اونچی آواز میں کہا۔ اور اپنے قدم مزید تیز کردیئے۔

"واقعی یہ راستہ تو شیطان کی آنت بن گیا ہے۔ ختم ہو کر نہیں دیتا اور نہ کوئی بستی نظر آرہی ہے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا تا کہ ریاست خان بھی سن لے۔ ہم نے اس پر اعتماد تو کرلیا تھا لیکن وہ قابلِ بھروسا ہے بھی یا نہیں ابھی اس بارے میں میری حتمی رائے قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لہجے سے تو سچائی جھلک رہی تھی مگر وہ ڈرامے باز بھی تو ہوسکتا تھا۔ ہماری طاقت سے مرعوب ہوگیا اور اس نے ہمیں شکست دینے کے لیے بھٹکا دیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے۔ کیونکہ ابھی تک اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نزدیکی آبادی کتنی دور ہے۔ ہر بار یہی کہتا تھا کہ بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ اور پیاس جان مارے دے رہی تھی۔

"اس علاقے کا یہی ایک خرابی ہے۔ بے آباد زمین زیادہ ہے۔ آبادی دور دور ہے۔" ریاست خان نے میری بات کا جواب دیا۔

"احمقوں کی جنت میں رہنے والو۔ کبھی سوچ کر دیکھنا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ تھوڑا سا غور کرلو تو وہ سامنے ہریالی نظر آجائے گی۔ کھیت وہیں ہوتا ہے جہاں نزدیک میں آبادی ہوتی ہے۔ ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" وسیم کی چہکار سنائی دی تو میں نے بھی اس طرف دیکھا جدھر اس نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ واقعی پہاڑیوں سے پرے دور دور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اور کھیتوں سے کافی دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما گھر۔ میں خوش ہوا تھا اس لیے کہ اب سفر تمام ہونے والا تھا۔ سورج بھی تو اپنا سفر تمام کرچکا تھا۔ صبح سے ہم مسلسل چل رہے تھے۔ اب جا کر آبادی نظر آئی تھی۔ ہمارے قدم خود بخود تیز ہوگئے۔

وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ اس آبادی میں پہنچتے ہی ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ وہ سب مہمان نواز بھی ہیں۔ انہوں نے یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو۔ کون ہو... اترا ہوا چہرہ دیکھا اور کھانے کا سامان لے آئے۔ بھوک کے عالم میں میٹھی روٹی اور شہد و مکھن نے بہت مزہ دیا۔ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا اور دل بھر کر پانی پیا۔ ذرا ہوش آیا تو پوچھا "یہ کون سا علاقہ ہے۔ یہاں سے نزدیک کوئی شہر ہے؟"

"نگر ہے نا۔ بس کچھ دور ہے۔ ابھی آرام کریں۔ کل صبح آپ کے لیے نگر جانے کا انتظام ہو جائے گا۔" جس گھر میں مہمانداری ہورہی تھی اس کے مالک نے کہا۔

نگر پہنچنے کا مطلب تھا کہ ہم گلگت پہنچ گئے اور گلگت سے پنڈی کے لیے سواری کی کمی نہیں تھی۔ میزبان نے آرام کا پورا بندوبست کردیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ریاست خان کوئی بار مہمان ٹھہرا چکا ہے۔ بدلے میں ریاست خان اس کو کچھ رقم دے جاتا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میزبان ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ جب دشمن کا کوئی واقف کار آرام کا کہے تو اسے شک سے دیکھنا ضروری تھا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا تھا لیکن ہوشیار تھا۔ ریاست خان والی پستول اب میرے پاس تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوتی تو میں مقابلہ کر سکتا تھا۔ تھکن کا اثر سب پر تھا۔ خود میری آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ باقی سب کے سب سو چکے تھے۔ لیکن میں چاہ کر بھی سو نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ رہ رہ کر میرا دل زور سے دھڑک اٹھتا تھا۔ اب یہاں آکسیجن کی بھی کمی نہیں تھی۔ اوپر یہ مسئلہ ہوتا ہے لیکن اب ہم جس علاقے میں تھے وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے دل کی دھڑکن بے ترتیب کیوں ہو رہی تھیں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ میزبان آ گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا ”ایک بندے کی ہائی روف ہے۔ وہ اپنے ایک رشتے دار کو لے کر گلگت اسپتال جا رہا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں۔ وہ آپ کو نگر پہنچا دے گا۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”چار مع مریض۔“

”اور ہم سات لوگ ہیں اس ہائی روف میں اتنے لوگ کیسے آئیں گے؟“

”آدھے لوگ آسانی سے جا سکتے ہیں۔ مریض کے علاوہ اس کے تمام لوگ پائیدان پر کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کے آدمی بیٹھ جائیں گے۔“

”آدھے لوگ جا کر کیا کریں گے؟“

”نگر سے کسی سواری کا انتظام کر لائیں گے۔“

بات اس کی معقول تھی۔ میں نے سفیر، عبداللہ اور وسیم سے کہا کہ وہ چلے جائیں۔

وہ لوگ اس ہائی روف میں چلے گئے۔ ابھی انہیں گئے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ میزبان پھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک سوزوکی گلگت سے آئی ہے۔ وہ واپس جا رہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس سے بات کر لیں۔ اسے واپس تو جانا ہی ہے۔

”چلو، بات کر لیتا ہوں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ باہر آیا، میرے ساتھ ریاست خان بھی باہر آ گیا۔ ہم تینوں سامنے والے اس گھر کی طرف بڑھنے لگے جہاں ایک سوزوکی کھڑی تھی۔ بالکل نئی، چمچماتی ہوئی۔ ہم جیسے ہی اس گھر کے دروازے پر پہنچے، ایک شخص باہر نکل کر آیا۔ اس نے پہلے مقامی انداز میں جھک کر سلام کیا پھر مجھ سے بولا ”اندر آ جائیں۔ مہمانوں کے لیے عارف شاہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“

ہم اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک بڑا سا کمرا تھا جس کو فرشی نشست سے سجایا گیا تھا۔ کئی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کے بعد بولے ”تشریف رکھیں۔“

ہم ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئے تب وہ بولا ”آپ لوگ شاید اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں سے آ رہے ہیں؟“ اس کا لہجہ بھی پختونوں جیسا تھا۔

کراچی
ماہنامہ پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ”باتیں بہار و خزاں کی....“ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جولائی کا
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

منطقہ

خطِ استواء پر سورج کی شعاعیں سارا سال عموداً پڑتی ہیں اور قطبین کے قریب ہمیشہ ترچھی اس لیے قطبین کے قریب سردی اور خطِ استوا کے قریب گرمی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا میں کہیں گرمی اور کہیں سردی پڑتی ہے۔ کرۂ ارض کو حرارت کی اس کمی بیشی کے اعتبار سے پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر حصے کو منطقہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: احمد فاروقی۔ سیالکوٹ

"پنڈی سے آئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا نام امداد شاہ ہے۔ باہر جو سوزوکی کھڑی ہے، وہ میری ہے۔ میں عرصہ دو سال سے گلگت میں ہی رہ رہا ہوں۔" اس نے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ "پہلے میں کراچی میں ٹیکسی چلاتا تھا پھر یہاں آگیا اور اب گلگت میں رہ کر کرایہ پر سوزوکی چلاتا ہوں۔"

میں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے ریاست خان کو دیکھ رہا ہے۔ گوکہ ابھی تک اس نے ریاست خان کو مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے پہچانتا ہے۔ یہ ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ عرصہ دو سال سے گلگت میں ڈرائیوری کر رہا ہے تو یقیناً کبھی نہ کبھی ریاست خان اس کی ویگن یا سوزوکی میں بیٹھا ہوگا۔

"اور ہاں یہ بھی بتا دوں۔" امداد شاہ نے ریاست خان پر ایک نظر ڈال کر کہا "میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اگر آپ مجھ سے رابطے میں رہیں گے تو فائدے میں ہی رہیں گے۔"

"لیکن ہم تو یہاں سے گلگت جائیں گے اور گلگت پہنچتے ہی پنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

"آپ کو ہم جانے دیں گے تب ہی تو آپ جائیں گے۔ گلگت میں ہم ایک دو روز تو مہمان رکھیں گے ہی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے انداز پر میں چونک پڑا تھا لیکن فوراً ہی اس نے تشریح کر دی تھی ورنہ میں اس کی بات کا کچھ اور مطلب لیتا۔ "پنڈی، لاہور یا کراچی سے جب کوئی آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی میرے گھر سے آیا ہے میں اسے ایک دو دن مہمان ضرور ٹھہراتا ہوں۔"

"آپ کب تک واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جس کام سے آیا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب واپسی کا سوچ رہا ہوں۔"

"کتنی دیر میں چلیں گے؟"

"بس یہ سمجھ لیں کہ آپ آئے کہ ہم نکلے۔" اس کا اندازِ گفتگو پختون تھا لیکن وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ خوب لچھے دار باتیں کرتا تھا۔ شاید یہ کراچی میں وقت گزارنے کا نتیجہ تھا۔

"ٹھیک ہے میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نکل لیتے ہیں۔" کہہ کر میں کھڑا ہوگیا۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر میزبان بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ پھر وہاں سے سیدھا اس کے گھر پہنچے۔ جیدے وغیرہ کو ساتھ لیا اور واپس اسی گھر میں آ گیا۔ امداد شاہ جیسے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گھر سے باہر نکل آیا۔ اس نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور ہم نئے سفر پر نکل پڑے۔ وہی پتھریلے راستے۔ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک۔ میرے ساتھ ریاست خان بیٹھا تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر جیدے، اللہ ڈینو اور چوہی جیسی شکل والا اصغیر تھا۔ اس کے پیچھے خالی جگہ پر امداد شاہ کا بندہ اکڑوں بیٹھا تھا جیسے وہ اس قسم کے سفر کا عادی ہو۔ وہ بھی بالکل خاموش تھا۔ جیدے ریاست وغیرہ تو ایسے ہی مجھ سے مرعوب تھے۔

اب مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ ایک ساتھ عبداللہ وسیم اور سفیر کو بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ لوگ ساتھ رہتے تو سفر مزید خوشگوار ہو جاتا۔ راستے بھر وہ سب پھلجھڑیاں چھوڑتے، ایک دوسرے سے الجھتے رہتے جس کا ایک اپنا مزہ ہے۔ میں ونڈ اسکرین سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کافی ... دیر بعد گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ادھر کم کم ہی گاڑیاں آتی ہیں۔ میں نے امداد شاہ سے پوچھا۔ "نگر اب کتنی دور ہے؟"

"بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اس گاؤں سے نگر کا اتنا تو فاصلہ نہیں ہوگا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ اتنی دیر میں تو ہم گلگت پہنچ جاتے۔"

"ہم گلگت ہی تو جا رہے ہیں۔" امداد شاہ نے جواب دیا۔

"لیکن مجھے تو نگر جانا ہے۔"

"نگر جا کر کیا کریں گے؟" امداد شاہ نے عجیب سے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

لہجے میں کہا۔
"میرے کچھ ساتھی وہاں سواری کا انتظام کرنے گئے ہیں۔"
"اچھا اچھا۔ تب تو ہمیں نگر کی طرف مڑ جانا چاہیے تھا اور ہم کافی آگے آگئے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اگلے موڑ سے اس طرف مڑ جاؤں گا۔" پھر اس نے ریاست خان کی طرف دیکھ کر کہا "ریاست خان مجھے جانتے ہو؟"
"نہیں۔" ریاست خان نے جواب دیا۔
"اب جان لوگے۔" پھر امداد شاہ نے سر گھما کر پیچھے دیکھا اور اپنے ساتھی سے بولا "صاحب جی کا کچھ خیال ہی کرلو۔"
"میں ابھی دیتا ہوں۔" کہہ کر اس نے تھرموس اٹھا لیا۔ "تم گاڑی روک لو تبھی تو میں ادھر آؤں گا۔"
امداد شاہ نے گاڑی روک دی۔ وہ تھرموس لے کر پیچھے سے اترا اور میری طرف والی کھڑکی پر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی مشروب دینا چاہ رہا ہے۔ میں نے اپنی سائڈ والی کھڑکی سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ اس مردود نے اس گلاس میں بھرا مشروب میرے چہرے پر پھینکا۔ پتا نہیں اس میں کیا چیز تھی کہ میرے چہرے پر جلن ہونے لگی۔ آنکھوں میں تیز مرچیں سی لگیں۔ تبھی ریاست خان کی آواز سنائی دی "اوئے یہ کیا کیا؟"
"ابھی تجھے بھی اس کا مزہ چکھنا ہے۔" امداد شاہ کی آواز سنائی دی۔ یہی وہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی کیونکہ میں ہوش سے بیگانا ہوتا چلا گیا تھا۔
پتا نہیں میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ اس لیے کہ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اندھیرے کمرے کے فرش پر پایا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ میں کہیں اندھا تو نہیں ہوگیا ہوں۔ مگر نہیں، ہلکا ہلکا سا منظر نظر آیا۔ شاید رات ہو چکی تھی اور کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تب احساس ہوا کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ مضبوط رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں نے گردن گھمانی چاہی تو برابر میں کوئی اور بھی تھا۔ اب میں نے بغور دیکھا تو سمجھ آئی کہ وہ ریاست خان ہے جو اب تک ہوش سے بے گانا ہے۔ میں نے کسمسا کر رسی کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ پلاسٹک کی ڈوری سے باندھا گیا ہے۔ ہاتھ کو دھیرے دھیرے منہ تک لانے کی کوشش شروع کردی۔ میں نے سوچا تھا کہ دانتوں کی مدد سے رسی کھول لوں گا۔ لیکن یہ کوشش رائگاں گئی۔ ابھی ہاتھ سینے تک ہی پہنچا تھا کہ دروازہ کھلا اور باہر کی روشنی اندر آئی۔ باہر لائٹ جل رہی تھی۔ ساتھ ہی چٹ کی آواز ابھری اور کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سامنے امداد شاہ کھڑا تھا اس کے ساتھ دو اور بندے تھے۔ ان میں سے ایک خاصا مضبوط بندہ تھا۔ جسم کسرتی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئیں۔ وہ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا تھا کہ امداد شاہ کی آواز سنائی دی "اچھا تو تم جاگ گئے؟ اب جو پوچھا جائے توتے کی طرح ٹرٹر شروع کردینا۔" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔
میں نے ایک نظر ان سب پر دوبارہ ڈالی۔ سب کے چہرے درشت تھے۔ وہ سب ہی چہروں سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ میں نے جواب میں نیا سوال کردیا "آپ پہلے یہ بتائیں کہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟"
"اس بات کی سزا کہ تم ریاست خان کے ساتھ پائے گئے ہو۔ اور ریاست خان کا جرم بہت بڑا ہے۔"
"وہ مجرم ہے تو ہمیں کیوں سزا دے رہے ہو۔"
"اس لیے کہ اسے جو کام سونپا گیا تھا اس نے وہ پورا نہیں کیا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ جو وعدہ کرتا اسے پورا ضرور کرتا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اس نے غداری کی اور ایسا اس لیے ہوا کہ تم نے اسے بہکایا۔ ہمیں صغیر نے پوری کہانی سنا دی ہے۔ اس لیے ہمارا فیصلہ ہے کہ اس کی سزا دی جائے۔"
"کسی نے کہا اور تم نے یقین کرلیا۔" "صغیر تو خود چرسی ہے۔ اس نے چرس کی طلب میں جھوٹ بک دیا اور تم نے یقین کرلیا۔ میں تو اس علاقے میں بالکل نیا ہوں۔ میں تو سیر کے لیے آیا تھا۔ راستہ بھٹک گیا تھا کہ ریاست نے مدد کا وعدہ کرلیا۔" اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔
"جھوٹ بولتا ہے۔" کہہ کر اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ میری گال پر جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا سخت تھا کہ منہ کے اندر دانت تک ہل گئے۔ میں پہلے سے تیار نہیں تھا۔ اس نے یکایک حملہ کیا تھا اسی لیے چوٹ زبردست لگی تھی۔ شاید زبان دانتوں تلے آگئی تھی۔ منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ شاید خون رسنے لگا تھا۔ میں نے کڑواہٹ کم کرنے کے لیے فرش پر تھوکا۔ لالی صاف نظر آئی تھی۔
"صاف صاف بتادے ورنہ یہ چمڑی ایسی ہوجائے گی کہ اس پر پیوند بھی نہیں لگے گی۔" اس نے جملہ ختم کرکے نہایت پھرتی سے جوتے کی نوک سے میرے سینے پر ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر اتنی شدید تھی کہ میں الٹ گیا۔ بستر سے نیچے جا گرا تھا۔ امداد شاہ نے اپنے ساتھی سے کہا "اسے سیدھا کر ورنہ میں اس کے سینے پر کھڑے ہوکر ڈانس شروع کردوں

www.urdusoftbooks.com

گا۔ بڑا سورما بن کر آیا ہے نا۔ ابھی ایک ایک ریشہ الگ کرتا ہوں۔''

امداد شاہ کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کو پسینا آجائے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہ بندہ ہے جو مجھے گاؤں میں ملا تھا۔ اس وقت وہ درندے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

''میں نے سچ بولا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آرہا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے اسے اٹھا۔'' امداد شاہ نے اپنے باڈی بلڈر ساتھی سے کہا۔

وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے کپڑوں سے پکڑ کر کھینچا اور اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور رڈالا تاکہ آسانی سے اٹھ جاؤں۔ اس نے کھینچ کر مجھے بٹھا دیا۔

''سیدھے سیدھے بول تو کس ایجنسی کا بندہ ہے ورنہ مار مار کر کھال میں بھس بھر دوں گا۔'' وہ اپنے زعم میں بولے جا رہا تھا۔

''دیکھ بھائی سیدھے سیدھے سب کچھ بول دے۔ استاد کا دماغ پھر گیا نا تو سمجھ لے تو ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے گا۔'' باڈی بلڈر نے مشورہ دیا۔

''میں اب تک سمجھ ہی نہیں پایا ہوں کہ یہ پوچھنا کیا چاہتے ہیں تو میں کیا بتاؤں؟''

امداد شاہ نے اسے ڈانٹا ''اپنے کام سے کام رکھ۔ ایسا کر ریاست خان نے ابھی تک سبق نہیں لیا۔ اسے اٹھا۔ وہ ایسے آنکھیں بند کیے پڑا ہے جیسے میں اندھا ہوں۔ دیکھ نہیں رہا کہ وہ اٹھ چکا ہے۔''

باڈی بلڈر نے ریاست خان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر غرایا ''سیدھی طرح سے بیٹھ جا۔ اب تیرا نمبر ہے۔''

''مجھے جو کام دیا گیا تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔'' ریاست خان نے جواب دیا۔

''بکواس بند کر۔ رات صاحب جی کا پیغام آیا ہے کہ جس بندے کو بھیجا گیا تھا اسے ایجنسی والوں نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے نکل پایا ہے۔ ایجنسی والوں کو کیسے خبر ہوئی یہ تُو بتائے گا۔''

''یہ غلط خبر ہے۔ کوئی بندہ آیا ہی نہیں۔'' ریاست خان نے جواب دیا۔ میں اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔ وہ حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے بزدل یا ٹوٹ جانے والا ثابت کرتا۔

''اگر تُو سچا ہے تو پھر صغیر کی بات کو کس خانے میں فٹ کروں۔'' امداد شاہ نے کہا۔

''صغیر جھوٹ بول رہا ہے۔''

''جھوٹ تو بول رہا ہے اور یہ شخص جو تیرے ساتھ ہے یہی ایجنسی کا بندہ ہے۔ اس کی تو میں بوٹی بوٹی الگ کروں گا اور ہر بوٹی ایک ایک بات بتائے گی۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو جان لے گا۔ میں ایجنسی والوں کا سب سے بڑا دشمن ہوں۔''

''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ ایک بار صاحب جی سے میری بات کراؤ۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''صاحب جی اب تجھ سے بات نہیں کریں گے۔''

''تو ٹھیک ہے میری بات مرشد جی سے کراؤ۔'' ریاست خان نے جھنجلا کر کہا۔

''وہ بھی تم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔''

''انہیں خبر تو دو کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی میں تمہاری وہ خبر لوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔'' امداد شاہ نے ہنس کر کہا۔

''تمہیں آج تک میں نے حضرت جی کے پاس دیکھا نہیں اور تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ان کے خاص مرید ہو۔ لاؤ فون مجھے دو میں خود ان سے بات کر لیتا ہوں۔''

''فون بھی دوں گا۔ رہا سوال تم نے مجھے ان کے پاس دیکھا نہیں تو میں کوئی عام بندہ نہیں ہوں۔ مرشد جیسے کئی بندے میرے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ مرشد جیسے لوگوں سے ہم کام لیتے ہیں۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ ایک معمولی بندہ مرشد جیسے شخص کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ جو خود میں ایک دنیا تھا۔ سیاست کا بازی گر۔ قوت کا خزانہ۔ شیطانیت میں سب سے آگے.... تو کیا مرشد خانقاہ کی تباہی کے بعد بالکل صفر بن گیا ہے۔ یا پھر یہ گیم کھیل رہا ہے۔ بات الجھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خود ایجنٹ ہے اور مرشد کو فنڈ دے کر کام لے رہا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو اس کے معنی یہ ہے کہ دشمن نے اندر تک اپنا جال پھیلا رکھا ہے اور اس جال کو توڑنا بہت ضروری ہے۔ کام بہت بڑھ گیا ہے۔

''استاد پہلے اس کو ٹٹولیں... یہ مجھے زیادہ اہم لگتا ہے۔'' باڈی بلڈر نے امداد شاہ کو مشورہ دیا تو وہ پھر میری

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

جانب متوجہ ہو گیا۔ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا ”مجھے اندازہ ہے تو بہت اہم بندہ ہے۔ اب جلدی سے شروع ہو جا۔“

”میں کیا بتاؤں... جو سچ ہے وہ بتا دیا۔“ میں نے جواب دیا تھا کہ اس نے میری ناک پر پنچ مارا۔ گو کہ پنچ ہلکا تھا پھر بھی تکلیف کا شدید احساس میرے اندر درد کی لہر سا اٹھا گیا۔ ابھی میں اس درد کو سہہ بھی نہ پایا تھا کہ اس کی مکروہ آواز سماعت سے ٹکرائی ”ریاست کو لے جا کر الٹا لٹکا دے ایک دو گھنٹے میں اس کا مزاج خود صحیح ہو جائے گا۔“

باڈی بلڈر نے اسے کسی بچے کی طرح گود میں اٹھالیا پھر وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امداد شاہ نے کہا ”ہاں بھئی سورما، اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

”میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں اور کیا بتاؤں۔“

”سمجھ گیا۔ ایسے بتاتے ہوئے تمہیں شرم آ رہی ہے۔ ابھی علاج کرتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارے سے بلایا۔ ”اسے جہنم کا دروازہ دکھانا پڑے گا... شاباش شروع ہو جاؤ۔“

ان دونوں نے مجھے بستر سے اتارا پھر دیوار تک لے گئے اور اس سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسی طرح جکڑے رہے۔ ان میں سے ایک نے میرے ہاتھوں کی بندش کو ڈھیلا کیا۔ میرے لیے یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں نے بندھے ہوئے پیر کی پرواہ کیے بغیر ہاتھ چلا دیا۔ مجھے امداد شاہ سے اس پھرتی کی امید نہ تھی۔ اس نے ہوا میں اچھل کر میرے چہرے پر بوٹ کا بھرپور وار کیا۔ یقیناً میری ناک کا بھرتا بن گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے اسی تیزی سے میری دونوں کلائیوں میں بندھی رسی کو پکڑا اور کھینچ کر چھت سے لٹکتی رسی سے باندھ دیا جیسے یہ ان کا معمول ہو۔

”اب رسی کو کھینچ۔“ امداد شاہ نے جھڑکا۔

ان دونوں نے چھت کی رسی کو کھینچنا شروع کر دیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے۔

”ابھی اور اوپر کھینچنا ہے۔ اس کا قد بھی تو دیکھ۔“ امداد شاہ چیخا۔

ان دونوں نے رسی کو مزید اوپر کھینچا۔ اب میرے ہاتھ اتنے بلند ہو چکے تھے کہ بغلوں میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں پوری طرح رسی کے سہارے کھنچا ہوا تھا۔

”پہلے داہنے پیر کو احتیاط سے۔“ امداد شاہ نے ہدایت دی ”یہ پیر چلانے میں ایکسپرٹ لگتا ہے۔“

ایک بندے نے رسی کا پھندا پھینک کر میرے داہنے پیر کو باندھا پھر پہلے سے بندھی رسی کو کھول دیا۔ اب میرے دونوں پاؤں الگ الگ ہو گئے تھے۔ اس بندے نے داہنے پیر سے بندھی رسی کو لے جا کر بیڈ کے پائے سے باندھ دی۔ اتنے میں دوسرا بندہ جو باہر نکل گیا تھا وہ ایک کنستر کے ساتھ واپس آیا۔ اس کنستر میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس نے کنستر کو میرے بائیں جانب رکھ دیا پھر بائیں پیر کی رسی کو اس کنستر سے باندھ دیا۔ اور اسے کھینچ کر فاصلے پر رکھ دیا۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا کہ جس کی اذیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میرے دونوں پیر دو سمت میں کھنچ گئے تھے۔ ٹانگیں ایسی چری ہوئی تھیں کہ پورا وزن کلائیوں پر پڑ رہا تھا۔ پیر پر وزن ہی نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر امداد شاہ نے کہا ”ابھی نو بج رہے ہیں۔ ہم باہر بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ جب تمہارا دل کرے کہ سچ بتانا ہے تو مجھے آواز دے لینا۔“ وہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی باہر نکل گئے تھے۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس دور افتادہ علاقے کا یہ شخص ایذا رسانی کا طریقہ تو خوب جانتا ہے۔ ایسا شخص معمولی نہیں ہو سکتا۔ میرے دونوں پیر سخت تکلیف میں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درمیان سے پیر الگ ہو جائیں گے۔ میں نے تکلیف پر قابو پانے کے لیے پیروں کو قریب کرنا چاہا۔ اس کے لیے جھٹکا دینا ضروری تھا مگر پہلی ہی کوشش میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور میرا سارا وزن کلائی پر آ گیا۔ رسی کی جکڑ کلائی پر مزید سخت ہو گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے رسی گوشت میں اترنے لگی ہو۔ تکلیف کی شدت سے میں دوبارہ پہلی پوزیشن میں آنا چاہا لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا تھا۔ میں عجیب انداز میں جھول گیا تھا۔ اس تکلیف سے گزرتے ہوئے بھی میں سوچ جا رہا تھا کہ امداد شاہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ ٹرینڈ بندہ لگ رہا ہے۔ کاش میں اپنے ساتھیوں کو ایک ساتھ نہ بھیجتا تو وہ لوگ ایسی کوشش کر لیتے۔ اذیت سے بچنے کے لیے میں مسلسل اِدھر اُدھر کی سوچ رہا تھا لیکن تکلیف کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس تکلیف سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے آخری کوشش کی ٹھان لی اور پھر میں نے اسے آواز دی۔ ”امداد شاہ!“

آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سب ایک ساتھ اندر آ گئے۔

”کیا بات ہے۔ عقل ٹھکانے آ گئی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جاری ہے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

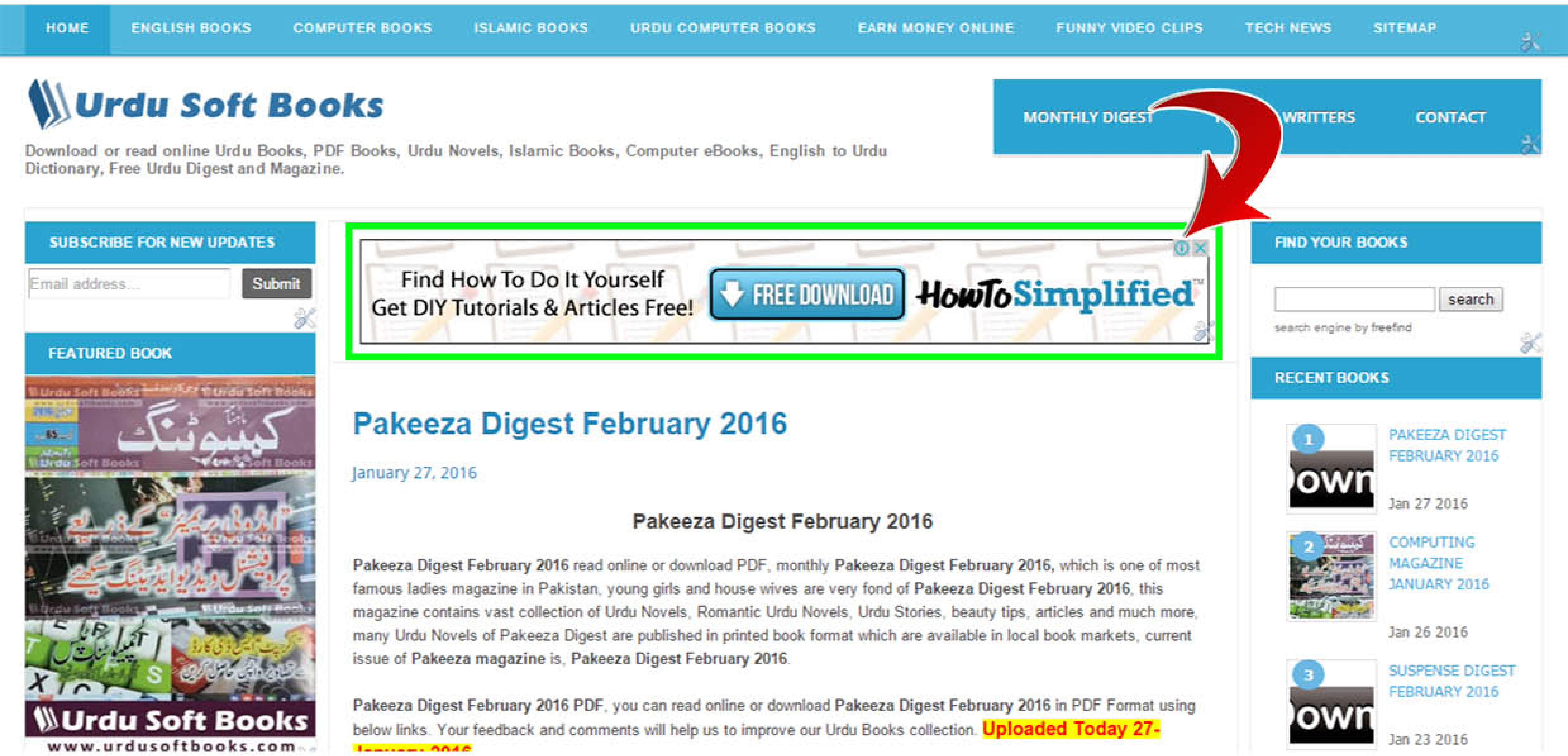

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کرکے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books

بیت بازی

قارئین

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

عجمی رحمٰن.........بریٹ لیٹ یو ایس اے

وہ فراق ہو کہ وصال ہو تیری آگ مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو

حیات مرزا.........حیدر آباد

وہ عشق تجھ سے کیا ہے کہ بیشتر اوقات
ہمیں تو بار گزرتی ہے مہربانی تک

ندیم یامین.........کراچی

واقفِ عزمت کردار نہیں ہے کوئی
لوگ شعبدہ باز ہیں فنکار نہیں ہے کوئی

انجم شاہین.........جھنگ

وحشت کا عنوان ہماری ان میں سے جو نار ٹھہری
دیکھیں گے لوگ تو کہیں گے انشا جی دیوانے تھے

(قائم علی رضوی کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

آج ایک برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان کا جواب)

ضیاء الرحمٰن.........فورٹ عباس

نگاروں کے میلے ستاروں کے جھرمٹ
بہت دلنشیں ہیں بہاروں کے جھرمٹ

داؤد اللہ نیازی.........اوکاڑہ

نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رکے ہوئے ہیں

(ساجد فاروق سرگودھا کا جواب)

عنایت مسیح.........کراچی

وہ جو ملزم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حسن سے غداری کا

(فدا حسین طوری پاراچنار کا جواب دیا)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

اپنے حصے میں بھی آئی آخر چاہت کی سوغات
چین نہ آئے سارا دن نیند نہ آئے ساری رات

انیس احمد.........چنیوٹ

اک تیری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اشرف الدین.........ساہیوال

اُمیدوں کی راہ گزر پر آگے آگے بڑھتے جانا
کانٹے چن چن کر پھول بچھانا نور کی شمع جلائے رکھنا

احمد ذیشان.........کراچی

الفاظ ضروری نہیں اظہار کے لیے
رویے کافی ہیں یہاں پیار کے لیے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

عمیر احمد.........ڈیرہ اسماعیل خان

اگر ہوتا ہے اتفاق تو یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے

اشفاق فرحت.........رحیم یار خان

اجالا بن کے آجاؤ میرے تاریک لمحوں میں کہ
ترے بن سبھی خوشیاں مجھے غمگین لگتی ہیں

اسد عمران.........بہاولپور

اس کے سوا تو میں دو پل کسی کو نہ دوں
دل تو بہت دور کی بات ہے

(زوبیہ الماس کا جواب)

ماہین فاطمہ شاہین.........لیہ

مخلوق خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی

امتیاز اسد.........پاک پتن

ملتی ہے برسوں میں بلندی
گرنے میں پل بھر لگتا ہے

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

عذرا علی.........خانیوال
مایوسیوں نے چھین لیے دل کو ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کے سامان نہ کر سکے

رضیہ شاہین.........حسن ابدال
منزلیں کسی کے گھر حاضری نہیں دیتیں
راستوں پر چلنے سے راستے نکلتے ہیں

کلفر مجیب.........نور پور
میں بہت جلد بھنور میں یاد آؤں گا تجھے
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کر کے

یوسف علی.........کراچی
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
وہ سمجھتا ہے مجھے اس سے گلہ کچھ بھی نہیں

نجمی رحمٰن.........بریٹ لیٹ یو ایس اے
میں طوفاں میں ڈوبا چلا جارہا تھا کہ نزدیک آکر کسی نے پکارا
اگر تو رسولِ خدا کو پکارے تو موجوں میں آجائے بہتا کنارا

زریں مجید بٹ.........لاہور
مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا
میں پختہ شہر کا کچا مکان ہوں

فرحین جاوید.........ملتان
میرے لفظ کی وحشت میں ہے اک عمر کا عشق
یہ کوئی کھیل تماشا نہیں لکھا میں نے
(مہوش صدیقی بھمبر کشمیر کا جواب)

ناعمہ کریم.........بلیر کراچی
وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

ہما اختر.........مظفر گڑھ
وہ زلفیں ہونا بھی چاہیں پریشاں
تو اپنے پاس شانے کون سے ہیں

اسرار احمد.........لاہور
وہ ولولے کہ جن سے عبارت تھی زندگی
غم ہائے روزگار کے سانچے میں ڈھل گئے
(آغا عنایت کوئٹہ کا جواب)

فرحت ندیم.........کراچی
نہ مروت نہ محبت نہ خلوص ہے اقبال
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انسان ہو کر

(محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا جواب)

فرخندہ لودھی.........کراچی
اس کے لہجے میں شرارت ہے نہ ہونٹوں پہ ہنسی
وہ لڑکی اب دکھی سی رہتی ہے

اشفاق احمد.........سکھر
اسے دیکھ لوں تو بھوک مٹ جاتی ہے یارو
میری آنکھوں کا رزق ہے میرے یار کا چہرہ

نازین ناز.........کوٹ ادو
اس بادشاہِ وقت سے کیسی توقعات
بیٹھا ہے تخت پر وہ عنایات بیچ کے

علیم الدین بٹ.........شادی پور
امرت کی مہک تھی باتوں میں نفرت کے شور تھے پلکوں پر
وہ ہونٹ نہایت میٹھے تھے وہ آنکھ بہت زہریلی تھی

ابرار مجیب.........ملتان
اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انساں کی حفاظت نہیں ہوتی

انور زئی.........کوئٹہ
اخلاص کی جاگیر کو ہم اہلِ محبت
تقسیم تو کردیتے ہیں بیچا نہیں کرتے
(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

ناصر خان.........کوئٹہ
یہ آئینہ کسی پتھر پہ توڑنا ہو گا
ضدوں سمیت کبھی دل کو چھوڑنا ہو گا
(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

ساجد فاروق.........سرگودھا
یارب ہر ایک درد کو درماں نصیب ہو
سکھ کی گھڑی کا چین کا ساماں نصیب ہو

نوشین اختر.........سیالکوٹ
یہ حقیقت بھی تمہاری خوب ہے
دوسروں سے بھی ملا کرتے ہو تم

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

www.urdusoftbooks.com

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

علمی آزمائش
127
30 جولائی 2016ء

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جولائی 2016ء تک علمی آزمائش 127 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 87

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

علمی آزمائش۔ 127

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

والد کا نام شہزادہ علی تھا۔ 1957ء میں ملکہ الزبتھ، 1952ء میں شہنشاہ ایران نے خطاب عطا کیے۔ حکومتِ پاکستان نے 1970ء میں نشانِ امتیاز سے نوازا۔ 1967ء میں پشاور یونیورسٹی اور 1970ء میں سندھ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1969ء میں ایک برطانوی دوشیزہ سے شادی کی۔ ان کے مرید تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

علمی آزمائش 125 کا جواب

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ریحانہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر رائل ملٹری کالج سینٹ ہرسٹ انگلینڈ سے ڈگری حاصل کی اور رائل آرمی میں شامل ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر ایک بٹالین کی کمان کی۔ 1951ء میں افواج پاکستان کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔

انعام یافتگان

1- محمد طفیل نیازی۔ ملتان　　2- زاہد شیخ۔ جھنگ　　3- فاخرہ بتول نقوی۔ سیالکوٹ

4- عباس علی سید۔ لاہور　　5- عنایت اللہ جمالی۔ سکھر

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عطاء الرحمن شاہد، اشنا وجاہت وکیل، عثمان خان، محمد خواجہ، سعید احمد چاند، سید عزیز الدین، فہد مصطفی جان، ناصر بیگ، خاقان علی سید، ارباب خان، ناصر الحسن زیدی، تنظیم عباس زیدی، خادم خان، غالب علی، محمد اسلم، مشفع احمد، خادم حسین، کمال دارٹی، عثمان خان، سندس حیات، ارباب حسن، خادم حسین، ایم ناصر، اکبر حیات، سید عباس، صالحہ

www.urdusoftbooks.com

محمود، منیبہ حبیب، سید فرح محمود، عباس خان، اشفاق محمد، فیض محمد، محمد یامین، خالدہ یوسف، شجاع رضوی، دانش قریشی، مرزا سلیم اودھ، توقیر ناصر، طیب خان، محمد اختر، علیم ذکائی، یاسین خان، دانش قریشی، سلطان خان، طیب الحسن، راغب الحسن، ناصر بیگ، منیر الحسن، توقیر عباس اچکزئی، فرحین سلطان۔ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری، افتخار احمد تارا، ارسلان شاہد، ماڈل ٹاؤن۔ عبدالخالق، عباس علی، نگین بھٹ، شیخ محمد سرور جاوید، ناصر علی، نوید اصغر، فہد اللہ، زرینہ ایوب، نواب احسن، یاسین محمد، انیس قائم خانی، ظفر چنیوٹی، آصف خان، چودھری فضل اللہ، محمد اکرام، فرحت مصطفیٰ، برکات اللہ، ظفر قاسم، فاضل اختر، خادم علی، ذیشان علی، کائنات علی، فرحت بٹ۔ ملتان سے خواجہ محمد حسنین، محمد منیب، نازش فاروقی، خضر حیات بھٹی، اقبال انصاری، توقیر عباس، بابر سعید، لبنیٰ ارشاد، اویس سلمان، سلطان فتح علی، شیر علی سید، نوید اصغر بخاری، محمد آصف، اقبال حسن خان، انعام حسن خان، امام بخش ملک، محمد معین، ناصر گواچہ، حنیف محمد، برکات اللہ بخش، اسماعیل آفاق، شیخ نہال احمد، ارشاد حسن کاظمی۔ پشاور سے مظہر حسنین (یونیورسٹی کیمپس)، شاہ نواز گل، وحیدہ خان، شاہ زرولی، غلام عباس طوری۔ سرگودھا سے محمد امیر ماجد (چکیاں اڈہ)، خدیجہ دلاور، ماریہ چودھری، قدرت خان، اشفاق حسن، داؤد عثمانی، فرحت اللہ، رمضان حسن، ظفر مینگل، ہاشم رضا، عمیر علی۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، محمد ریاض راحیل، عبدالاحد، نیلوفر شاہین، انور یوسف زئی، ادریس پاشا، یوسف حمید گل خان، ڈاکٹر فرخندہ لودھی، خرم علی، شیخ فتح یاب، جنید ملک، جہانزیب خان، ملائکہ احسن۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز۔ میرپورخاص سے معیز علی خان، غلام شبیر، حافظ محمد محسن، عابد علی شیخ، ثانیہ عطاری، رخسانہ اکمل، لبنیٰ اکرام، فرحت اعجاز بھٹو، شیخ یاسین، ذوفشاں فاطمہ، محمد منیب، محمد بخش، زویا اعجاز بھٹو، فرحین ثمرہ۔ تلہ گنگ سے ملک طارق رشید، عباس علی۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ کھاٹاں سے سلیم کامریڈ، پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری بنگش، ناہید سلطانہ، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور سے اے کے کاظم علی بھٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید۔ خان بیلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان جعفری، شگفتہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، سرفراز بٹ، وسیع الدین ہمدانی، احمد نیاز، عقیب الدین، عابد الدین، گل فراز میمن، ناہید ابد، فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوحید، نوشاد گجر، محمد حسنین، سلمان نیازی، مسرت بٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیا عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، سبطین ظفر، بدر بگٹی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عنبرین پلیجو، ضیا پلیجو، آفتاب تبٹ، عنایت جعفری سید، مرزا دلدار حسین، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان عثمانی، بدر علی ادریس، حسین ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے نیلو شاہین۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بٹ عرف چھوٹا پہلوان، ظفر الحسین، فیضان بٹ، اسرار علی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضانی، حق فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان خان، مغیث الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، اشرف علی ترمذی، نذر نیازی، ماہا خان، انیس احمد گل، رحمت اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ صوبی کے پی کے سے کوثر اسلام، شمس الاسلام (رزڑ)۔ اٹک سے رضوان ارشد، سید محمد حسین شاہ، حیا علی۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ میانوالی سے ملک رفاقت مسکین (پکی شاہ مردان)، کمال حسن، شاہ مراد۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) اقرار حسن، دین محمد، تاثیر زیدی۔ خوشاب سے ملک نوید اصغر۔ حیدرآباد سے ماہ رخ، ساجد فاروق، حکیم اللہ جان، سلطان علی، سید کاظم علی، نصیر بوترابی، راغب الحسن، روفی انصاری، طیب علی، حسن کاظمی، اختر ہاشمی، نعمان فاروق، منیر حسین، فرحت عثمان، عزیز شیخ، فرخ مرزا بیگ، دانش فتح محمد، اشفاق شیخ، کاظم علی کاظمی۔ لیہ سے ماہین انور، نوید حسن خان، لطیف اللہ۔ حسن ابدال سے خرم حسن۔ ہری پور ہزارہ سے کاظم علی کاظمی، اشرف الماس۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے باسط، سلمان نیازی، ملک دین محمد، ڈیرہ غازی خان سے عباس خان، اشرف حسن، زرین مجید، قبلائی خان۔ خوشاب سے ممتاز حسن۔ بہاولنگر میں ناصر عباس۔ جہلم سے فتح یاب خان، زعیم شریف، انصر عباسی۔ جونیاں سے ملک شاہین۔ کمالیہ سے فرحت خان۔

بیرونِ ملک سے: صالحہ عبدالسلام، عمان سعودیہ۔ ذیشان علی سید، العین یو اے ای۔ حمزہ عباس شانی، مانچسٹر یو کے۔ نعیم اختر، ٹورنٹو کینیڈا۔ انا کاظمی، دبئی یو اے ای۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

فلرٹ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام مسنون!
عورت کی عظمت کو ہمارے معاشرے میں کس طرح سے گرا دیا گیا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ارد گرد بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی معاشرے کا حصہ میں بھی ہوں اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا۔ گو کہ یہ سو فیصد غلط تھا، اس میں سراسر نقصان میرا ہی ہوا لیکن اس سے بہت سی لڑکیاں سبق حاصل کرسکتی ہیں اسی لیے اپنی آپ بیتی لکھ رہی ہوں۔

مہناز
(کراچی)

میں نے ڈرتے ڈرتے دفتر میں قدم رکھا۔ کوریڈور بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گویا مجھ سے پہلے سب لوگ دفتر پہنچ چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے کام کررہے تھے۔ صرف میں ہی تاخیر سے آئی تھی۔ اگر پانچ دس منٹ کی بات ہوتی تو کوئی فکر نہیں تھی لیکن میں مقررہ وقت سے پورے ایک گھنٹا بعد دفتر پہنچی تھی اور اب میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ آج تو رازی صاحب مجھے کچا ہی چبا جائیں گے۔ وہ ویسے ہی بہت سخت گیر انسان تھے۔ اور ڈسپلن کی خلاف ورزی بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر دیر سے آنے والوں کو سرزنش کرنا ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ ان کی اس سختی کا ہی نتیجہ تھا کہ دفتر میں کام کرنے والا ہر شخص وقت سے پانچ دس منٹ پہلے ہی آجاتا تھا کیونکہ کسی کو بھی اپنی بے عزتی پسند نہیں تھی۔ صرف میں ہی وہ واحد فرد تھی جو کوشش کے باوجود وقت پر نہ پہنچ پاتی اور مجھے تقریباً روزانہ ہی رازی صاحب سے کچھ نہ کچھ سننے کو مل جاتا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی مجبوریوں کے اسیر تھے۔ انہیں دفتر میں نظم و ضبط برقرار رکھنا تھا اور میں اپنے شوہر کی زیادتیوں کا شکار تھی۔

جی ہاں، میری شادی کو ابھی ایک سال ہوا تھا لیکن ابتدائی چند ماہ بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میرے شوہر وہ نہیں تھے جیسا کہ ان کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ یہ شادی ہماری ایک دور پرے کی رشتہ دار خاتون نے کروائی تھی اور میرے گھر والوں نے ان پر اعتبار کرتے ہوئے کسی چھان بین کے بغیر ہی یہ رشتہ قبول کرلیا۔ اس وقت میں ماسٹرز کرچکی تھی اور مجھے ایک بڑی فرم میں مارکیٹنگ کی جاب مل گئی تھی لیکن امی کو میری شادی کی فکر اس وقت سے لاحق ہوگئی تھی جب میں نے انٹر پاس کیا۔ دراصل وہ ڈر گئی تھیں کیونکہ میری ایک تایازاد بہن کی شادی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی جبکہ اس کی تینوں بڑی بہنیں مناسب عمر میں بیاہ کر چلی گئی تھیں لیکن اس کی عمر اٹھائیس برس ہوگئی تھی اور اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا جس کی وجہ سے تائی ہی نہیں خاندان کے دوسرے لوگ بھی پریشان تھے اور سب ہی اپنے طور پر اس کی شادی کے لیے کوشش کررہے تھے۔ شادی دفتروں، رشتہ کرانے والی عورتوں، پیروں، فقیروں اور عاملوں سبھی سے رابطہ کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بہرحال تیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی اور سب لوگوں نے سکھ کا سانس لیا لیکن اس کے بعد خاندان کے سبھی لوگوں کے دل میں ڈر بیٹھ گیا اور وہ لڑکیوں کی شادی میں عجلت کرنے لگے۔ تائی سب کی بزرگ تھیں اور یہ انہی کی نصیحت تھی کہ لڑکیوں کی شادی میں غیر ضروری تاخیر نہ کی جائے اور مناسب رشتہ ملتے ہی ان کی شادی کردی جائے۔ اس کے بعد ہمارے خاندان میں کم عمری میں ہی لڑکیوں کی شادیاں ہونے لگیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو تو میٹرک یا انٹر کے بعد ہی رخصت کردیا گیا۔ مجھ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پر بھی ایسا ہی دباؤ تھا لیکن میں بھرپور مزاحمت کررہی تھی اس کے علاوہ مجھے ابو کی بھی حمایت حاصل تھی، لہٰذا میں نے امی کی شدید مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کم از کم چار سال تک مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہا جائے گا اور میں اطمینان سے ماسٹرز کرلوں گی۔

یونیورسٹی میں دن بہت اچھے گزر رہے تھے اور میں دل لگا کر پڑھ رہی تھی۔ مجھ پر دو طرح کا دباؤ تھا۔ ایک تو یہ کہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ تمام کزنز جو شادی کے بندھن میں جکڑ جانے کے سبب میٹرک اور انٹر سے آگے نہ پڑھ سکیں، وہ بھی مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتیں۔ خاندان کی تقریب میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔ اس طرح مجھ میں احساس تفاخر پیدا ہوگیا اور میں اپنے آپ کو خاندان کی دوسری لڑکیوں سے برتر سمجھنے لگی۔ مجھ پر دوسرا دباؤ یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی امتحان میں فیل ہوگئی تو امی کو بہانہ مل جائے گا اور وہ میرا یونیورسٹی جانا بند کردیں گی۔ ویسے بھی وہ کئی مرتبہ یہ کہہ چکی تھیں کہ ٹھیک ہے۔ تم نے اپنی ضد پوری کرلی لیکن اس دوران کوئی اچھا رشتہ آگیا تو فوراً ہی شادی کردی جائے گی اور تعلیم ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

چار سال خیریت سے گزر گئے اور میں نے ماسٹرز مکمل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ امی نے ایک بار پھر مخالفت کی لیکن اس مرتبہ بھی ابو نے میرا ساتھ دیا اور مجھے ملازمت کرنے کی اجازت مل گئی لیکن نوکری ملنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے یونیورسٹی کے دنوں میں جو خواب دیکھے تھے وہ بکھرتے دکھائی دیے لیکن میں بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ ہر ہفتے اخبار میں اشتہار دیکھ کر درخواستیں بھیجتی رہی۔ کئی جگہ انٹرویوز بھی دیے لیکن بات نہیں بنی۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ امی بھی یہی کہتی تھیں کہ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کررہی ہو۔ ملازمت کرکے تمہیں کیا ملے گا۔ شادی کے بعد دہری ذمے داری آجائے گی۔ نوکری بھی کرو اور گھر بھی سنبھالو۔ اوپر سے شوہر کی ناز برداریاں الگ۔ اس معاشرے میں عورت چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہوجائے۔ وہ گھریلو ذمے داریوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ میری مانو تو نوکری کا خیال دل سے نکال دو اور گھرداری میں دل لگاؤ۔ ویسے بھی کمانا مرد کی ذمے داری ہے، عورت کی نہیں۔

میں یہ باتیں ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی۔ وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں۔ اس لیے ان کی باتیں بھی مجھے دقیانوسی لگتیں۔ یہ تو شادی کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کتنی سچائی اور گہرائی تھی۔ بہرحال میری کوشش جاری رہی اور بالآخر مجھے ایک کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر کی ملازمت مل گئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں باہر جانا ہوگا لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ دفتر میں ہی بیٹھ کر منصوبہ بندی، حکمت عملی اور اسٹاف کے کام کی نگرانی کرنا تھی۔ مارکیٹنگ منیجر رازی صاحب بہت سخت گیر تھے اور کام یا ڈسپلن کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ان

Urdu Soft Books

کا کہنا تھا کہ کام میں کوئی غلطی ہو جائے تو اسے برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن ڈسپلن پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ وہ میرے کام سے خوش تھے اور مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے لیکن اگر کبھی دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا دیتے۔ اسی لیے میری کوشش ہوتی کہ انہیں شکایت کا موقع نہ دوں، دفتر نو بجے شروع ہوتا تھا اور میرے گھر سے زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کا فاصلہ تھا لیکن میں آٹھ بجے گھر سے نکل جاتی کیونکہ کبھی بس دیر سے ملتی تو کبھی ٹریفک جام کی وجہ سے زیادہ وقت لگتا۔

میری شادی تک سب ٹھیک چلتا رہا لیکن اس کے بعد مشکلات پیش آنے لگیں۔ یہ شادی جن حالات میں ہوئی ان کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے دو سال ہوگئے تھے اور امی کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اب تو ابو بھی فکر مند رہنے لگے تھے۔ رشتے تو کئی آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے ہم پلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اب ہمارا معیار بدل گیا تھا۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ ایک معقول ملازمت بھی کررہی تھی۔ شکل وصورت میں کئی ایک سے اچھی تھی اور پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی تھا۔ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو بے شمار نگاہیں میرے چہرے اور جسم میں سوئی کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ لہٰذا ان سب عوامل کے پیشِ نظر میں اپنے آپ کو بہت اہم محسوس کرنے لگی اور گھر والوں کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ سوچ پروان چڑھنے لگی کہ میرا ہونے والا شوہر تعلیم و مرتبہ کے لحاظ سے مجھ سے برتر نہیں تو کم تر بھی نہ ہو۔

انہی دنوں خالہ صغریٰ میرے لیے ایک رشتہ لے کر آئیں۔ وہ ہماری دور کی رشتے دار تھیں اور لائنز ایریا میں رہتی تھیں۔ شہزاد کی ماں سے ان کی پرانی جان پہچان تھی۔ وہ لوگ بفرزون میں رہتے تھے لیکن خالہ صغریٰ نے نارتھ ناظم آباد بتایا لیکن میرے گھر والوں کی سادہ لوحی دیکھیے کہ وہ شہزاد کے گھر والوں سے مل کر آگئے لیکن انہوں نے خالہ کی غلط بیانی پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بہرحال شہزاد کے بارے میں جو کچھ خالہ نے بتایا۔ اس کے مطابق وہ انجینئر تھے اور کسی کمپنی میں اچھی ملازمت کررہے تھے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ بظاہر ان میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن وہ عمر میں مجھ سے کم از کم دس سال بڑے تھے۔ چھوٹا قد، گہرا سانولا رنگ، موٹے ہونٹ، پھیلی ہوئی ناک اور جسم قدرے فربہی مائل۔ لیکن میرے گھر والوں کو ان میں کوئی خامی نظر نہیں آئی بلکہ امی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مرد کی شکل نہیں بلکہ کمائی دیکھی جاتی ہے۔ مجھ سے رائے پوچھی گئی تو میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مجھی لوگوں کی باتیں سن کر تنگ آچکی تھی۔ لگتا تھا کہ پورے شہر کو میری شادی کی فکر ستائے جارہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز رازی صاحب جیسے سنجیدہ شخص نے بھی باتوں باتوں میں کہہ دیا۔ ''مس مہناز! آپ نے کیریئر تو بنا لیا۔ اب گھر بسانے کے بارے میں بھی سوچیں۔''

اسی لیے میں نے شہزاد کے رشتے پر رضامندی ظاہر کردی۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ تعلیم اور ملازمت نے مجھے اتنا شعور واعتماد دے دیا ہے کہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرسکتی ہوں لیکن گھر والے میری شادی کے لیے اتنے بے چین تھے کہ انہوں نے شہزاد کے بارے میں رسمی طور پر بھی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جیسا ہے جہاں ہے کی بنیاد پر انہیں قبول کرلیا گیا۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ لڑکے کے بارے میں دفتر اور محلے والوں سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے محلے میں دو گھر چھوڑ کر ایک لڑکی کے رشتے کی بات چل رہی تھی تو لڑکے کی بہنیں ہمارے گھر اس لڑکی کے بارے میں معلومات کرنے آئی تھیں، ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ شادی سے پہلے جتنی مرتبہ شہزاد کی ماں ہمارے گھر آئیں تو ان کے ساتھ صرف شادی شدہ بیٹیاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ بھی انہوں نے اپنے دامادوں یا دوسرے کسی رشتے دار مثلاً شہزاد کے ماموں یا چچا کو ساتھ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن ہمارے گھر والوں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ انہیں تو بس مجھے گھر سے نکالنے کی جلدی تھی۔

شادی کی پہلی رات ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ شہزاد کا تعلق بھی مردوں کے اس قبیلے سے ہے جو عورت کو انتہائی حقیر اور کم درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ہر لڑکی کے ذہن میں سہاگ رات کا مخصوص تصور ہوتا ہے اور وہ توقع کرتی ہے کہ شوہر اس کے حسن کی تعریف کرنے کے علاوہ اسے مستقبل کے سہانے سپنے دکھائے گا اور ہر دکھ سکھ میں اس کا ساتھ نبھانے کا عہد کرے گا لیکن وہ انتہائی غیر رومانٹک ثابت ہوئے۔ انہوں نے میرا گھونگھٹ اٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور میرے قریب آکر بہت ہی سپاٹ لہجے میں بولے۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

''بہتر ہوگا کہ تم لباس تبدیل کرلو۔ اس کے بعد ہم سکون سے باتیں کرسکیں گے۔''

میرے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ شاید ہی کسی دلہن نے شادی کی پہلی رات اپنے شوہر کی زبان سے ایسا مکالمہ سنا ہو لیکن میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

زیورات اتار کر ڈبوں میں رکھے اور میک اپ صاف کر کے واپس اپنے بستر پر آگئی۔ اس کے بعد انہوں نے لیکچر دینا شروع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے اس گھر میں ان کی مرضی اور فیصلوں کا پابند بن کر رہنا ہوگا۔ ان کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہوگی اور مجھے ان کا پورا خیال رکھنا ہوگا۔ انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے۔ ان سے آئے دن میکے جانے کی فرمائش نہیں کروں گی بلکہ مہینے میں ایک مرتبہ والدین سے مل سکوں گی۔ اگر ان کے پاس وقت ہوا تو وہ میرے ساتھ چلے جائیں گے ورنہ مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔ واپس چھوڑنے کی ذمّے داری میرے گھر والوں کی ہوگی۔ کھانا میں بناؤں گی کیونکہ انہیں نوکروں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پسند نہیں۔ ماسی صرف کپڑے، برتن دھونے اور جھاڑ پونچھ کے لیے ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے گھر کے خرچ میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا کیونکہ ان کی آمدنی اتنی نہیں کہ وہ کسی قسم کی فضول خرچی برداشت کر سکیں۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے میری ملازمت کے بارے میں کچھ نہیں کہا ورنہ میں سمجھ رہی تھی کہ اس پر بھی انہیں اعتراض ہوگا۔

شہزاد کا لیکچر سن کر میری طبیعت صاف ہوگئی اور مجھے اپنی آیندہ زندگی کا منظر نامہ واضح طور پر نظر آنے لگا۔ جی میں آیا کہ امی کو فون کر کے اس لیکچر کی کیسٹ انہیں سناؤں اور کہوں کہ یہ ہے شادی کا وہ لڈو جسے کھلانے کے لیے آپ گزشتہ سات آٹھ سال سے بے چین تھیں لیکن یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ ہمارے ملک میں نوّے فیصد عورتیں اسی طرح مردوں کے استحصال کا نشانہ بنتی ہیں۔ مجھے بھی صبر اور سکون کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد معاملات میرے حق میں بہتر ہوجائیں۔

صبح ناشتے کی میز پر ساس صاحبہ نے تلقین فرمائی۔ ''شہزاد غصے کا تیز ہے۔ اس لیے کوشش کرنا کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہونے پائے ورنہ میں بھی کچھ نہیں کرسکوں گی۔''

ساس کی بات سن کر میں سمجھ گئی کہ دونوں ماں بیٹا ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں اور مجھے شوہر کے غصے کے ساتھ ساتھ ساس کی منافقت کو بھی برداشت کرنا ہوگا۔ دس بجے کے قریب رواج کے مطابق میکے والے مجھے لینے آگئے۔ انہیں دیکھ کر شہزاد کا منہ بن گیا لیکن مصلحتاً وہ میری بہنوں اور کزنز سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ میں تیار ہونے کمرے میں آئی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آگئے اور غرّاتے ہوئے بولے۔ ''میں پانچ بجے لینے آؤں گا، تیار رہنا۔ پانچ کا مطلب پانچ ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہونا۔''

میں حیرانی سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی ساتھ جائیں گے لیکن انہوں نے پہلے روز ہی جھنڈی دکھا دی پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔ ''آپ ساتھ نہیں جائیں گے؟''

''پاگل ہوگئی ہو۔'' انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں کیسے جا سکتا ہوں۔ شام کو ولیمہ ہے اور مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہے۔''

میں نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہم بھی نو بیاہتا جوڑوں کی طرح شمالی علاقوں کی سیر کے لیے جائیں گے لیکن شہزاد نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ انہیں بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے اور ویسے بھی یہ اسراف ہے۔ خوامخواہ ہی اچھے خاصے پیسے خرچ ہوجائیں گے۔

میں دل مسوس کر رہ گئی اور تہیہ کرلیا کہ آیندہ اس شخص سے کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔ ایک ہفتے بعد ہی ساس صاحبہ نے مجھے گھر کے کاموں میں لگا دیا اور بولیں۔ ''مجھے معلوم ہے کہ پڑھائی اور نوکری کی وجہ سے تمہیں کچھ سیکھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں میں تمہیں سب سکھا دوں گی۔''

میں نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ مجھے ہر طرح کا کھانا بنانا آتا ہے۔ میں نے اس گھر میں ایک خاموش سامع کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شہزاد اور اس کی ماں کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں کوئی جواب نہیں دوں گی اور نہ ہی اپنی طرف سے کوئی بات کروں گی اور یوں میں نے اس گھر میں ایک باورچن، خادمہ اور شوہر کی ڈانٹ سننے والی بیوی کا روپ دھار لیا۔ میں کام کرنے سے نہیں گھبراتی تھی لیکن شہزاد کی ہر وقت کی لعن طعن نے پریشان کر رکھا تھا۔ غصہ تو

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اور میرے ہر کام میں کیڑے نکالنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جتنی دیر گھر میں رہتے، مسلسل احکامات جاری ہوتے رہتے۔ حالانکہ ان کا دفتر بھی نو بجے شروع ہوتا تھا لیکن انہیں ساڑھے سات بجے ناشتا چاہیے ہوتا۔ میں صبح چھ بجے سے ہی کام میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کپڑے استری کرنا، جوتوں پر پالش کرنا، ناشتا بنانا۔ اس دوران بھی مجھے آوازیں پڑتیں، فلاں ٹائی نہیں مل رہی۔ موزے کہاں رکھ دیے۔ دھلا ہوا رومال دے دو وہ خود ہی اپنی چیزیں اِدھر اُدھر رکھ دیتے اور ڈھونڈنا مجھے پڑتی تھیں۔ یہاں تک کہ گاڑی کی چابی اور والٹ بھی میں ہی تلاش کر کے دیتی۔ اس بھاگ دوڑ میں چائے ٹھنڈی ہو جاتی تو فرمان جاری ہوتا کہ دوسری چائے بناؤ۔

جب تک وہ گھر میں ہوتے۔ میں گھن چکر بنی رہتی۔ ان کے جانے کے بعد بھی سکون نہ ملتا پھر ساس صاحبہ کا چکر شروع ہو جاتا۔ انہیں ناشتے میں انڈے پراٹھے چاہیے ہوتے تھے۔ دس بجے تک تھوڑی سی فراغت ہوتی تو ساس صاحبہ دوپہر کے کھانے کا مینیو بتا دیتیں۔ چھ بجے کے قریب شہزاد کی واپسی ہوتی تو ان کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کرنا ہوتا۔ کبھی سموسے، کبھی پکوڑے تو کبھی سوجی کا حلوا۔ اس کے بعد رات کے کھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان کا حکم تھا کہ رات نو بجے کھانا لگ جائے۔ اس کے بعد وہ ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتے اور میں برتن سمیٹنے اور کچن صاف کرنے میں لگ جاتی۔ ان سب کاموں سے فراغت ہوتی تو ساس صاحبہ کے کراہنے کی آوازیں آنے لگتیں۔ کبھی ٹانگوں میں درد ہونے لگتا تو کبھی کندھوں میں۔ ان کی خدمت کرنے کے بعد گیارہ بجے کمرے میں آتی تو شہزاد یوں گھورتے جیسے میں کہیں سے تفریح کر کے آ رہی ہوں۔ اس کے بعد وہ کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتے اور میں سوچتی رہ جاتی کہ کیا یہی ہے وہ لڈو جسے کھانے کے لیے ہر لڑکی بے چین رہتی ہے۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں تو میں نے ایک بار پھر دفتر جانا شروع کر دیا۔ اب شہزاد نے ایک نیا حکم جاری کر دیا کہ میں دفتر جانے سے پہلے ان کی اماں کے لیے ناشتا اور دوپہر کا کھانا بنا کر جاؤں۔ اتنے کم وقت میں یہ ممکن نہیں تھا پھر مجھے اپنی تیاری بھی کرنا ہوتی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ میں سالن رات کو بنا لیتی۔ اس طرح اپنے اور شہزاد کے کپڑے اور جوتوں پر پالش بھی رات کو ہی کر لیتی۔ پھر بھی مجھے ناشتا بنانے اور اماں کے لیے روٹیاں پکانے میں کافی وقت لگ جاتا۔ اس طرح مجھے دفتر کے لیے نکلنے میں دیر ہو جاتی جس کی وجہ سے آئے دن رازی صاحب کی جھاڑ سننا پڑتی تھی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ میں ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچی اور اپنی سیٹ پر بیٹھی دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ بس اب چند منٹ بعد ہی رازی صاحب کا بلاوا آ جائے گا اور وہ لفظوں کی بمباری شروع کر دیں گے لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی انٹرکام کی گھنٹی نہیں بجی تو مجھے حیرت ہونے لگی۔ رازی صاحب معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خود ہی دفتر نہ آئے ہوں اور یہ ایک انہونی بات ہوتی کیونکہ میں نے اپنی دو سالہ ملازمت کے دوران انہیں کبھی چھٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اونہہ مجھے کیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ مجھے دن میں دس مرتبہ رازی صاحب کے پاس جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس روز بھی دس بجے کے قریب میں نے ایک فائل اٹھائی اور ان کے کیبن کی طرف چل دی لیکن دروازہ کھولتے ہی مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رازی صاحب کی کرسی پر ایک اسمارٹ اور ہینڈسم بندہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر بھی کوئی تیس بتیس کے قریب ہوگی۔ اس نے سفید شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی اور وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں دروازے پر ہی رک گئی اور سوچنے لگی کہ کہیں میں غلط کیبن میں تو نہیں آ گئی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ کیبن میرے لیے اجنبی نہیں تھا اور میں دن میں کئی بار وہاں کا چکر لگاتی تھی۔ پھر میں نے اس بندے کو پہلے کبھی دفتر میں نہیں دیکھا تھا۔ میری آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پلیز، آ جائیے۔“

میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھی تو اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”میں تھوڑی دیر بعد آپ لوگوں کو چائے پر بلانے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی آ گئیں۔ باقی لوگوں سے بعد میں مل لوں گا۔“

میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھی تو وہ بولا۔ ”پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ رازی صاحب کا ٹرانسفر لاہور برانچ میں ہو گیا ہے اور ان کی جگہ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بات آپ کے علم میں ہو گی۔“

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"نہیں۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑے ریزرو آدمی ہیں۔ اپنے معاملات کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔"

"خیر چھوڑیں اس بات کو۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ بہرحال میرا نام شاہد ہے اور مجھے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے تقریباً سات سال ہوگئے ہیں۔" پھر وہ آگے کی طرف تھوڑا سا جھکتے ہوئے بولا۔ "کیا میں آپ کا نام اور ذمے داریوں کے بارے میں جان سکتا ہوں؟"

"مجھے مہناز کہتے ہیں اور اس دفتر میں گزشتہ دو سال سے بطور مارکیٹنگ آفیسر کام کر رہی ہوں۔"

"بہت خوب۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیں گی اور نہ ہی مجھ سے کوئی شکایت ہوگی۔ ہماری کارکردگی اسی وقت بہتر ہوسکتی ہے اگر ایک دوسرے کا احترام کریں۔"

"میں آپ کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔" یہ کہہ کر میں نے فائل اس کے آگے کردی۔ اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور چائے لانے کے لیے کہا۔ یہ ملازمت کے دوران پہلا موقع تھا کہ میں اپنے باس کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔ ورنہ رازی صاحب نے تو کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ وہ صرف کام لینا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا جانتے تھے۔

اس نے فائل کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ "سارا کام تو آپ نے کر ہی لیا ہے مجھے اس پروپوزل میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی۔" یہ کہہ کر اس نے فائل واپس کردی اور بولا۔ "گو اہیڈ۔"

جب میں واپس جانے کے لیے اٹھنے لگی تو اس نے ایک بار مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مس مہناز!"

"مس نہیں مسز!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ سوری، مجھے پہلے ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔" وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہیں تاکہ کام میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ جب چاہیں اور جتنی بار چاہیں، میرے پاس آسکتی ہیں۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرکے اپنی سیٹ پر آگئی اور سوچنے لگی کہ میں ایک گھنٹا تاخیر سے آئی اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔ ایسا بے خبر آدمی اس دفتر میں نہیں چل سکتا کیونکہ یہاں کام کرنے والے ڈنڈے کے یار تھے اور انہیں رازی صاحب جیسا شخص ہی ٹھیک کرسکتا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے معلوم ہو لیکن اس نے پہلے روز باز پرس کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ وہ دن تو خیریت سے گزر گیا بعد میں جوگا دیکھا جائے گا۔

لنچ ٹائم میں معلوم ہوا کہ وہ اتنا سیدھا اور شریف نہیں تھا جیسا کہ میں سمجھ رہی تھی۔ اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو اس نے اپنے کمرے میں بلا کر فرداً فرداً انٹرویو کیے اور ان سے کام کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کیے۔ میرے ایک کولیگ ارشد کا موڈ بہت آف تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "یہ بندہ تو رازی صاحب سے بھی دو ہاتھ آگے معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ بھی ڈرا دھمکا کر کام لینے کا عادی ہے۔"

ان لوگوں کی باتیں سن کر میں سوچ میں پڑ گئی اور مجھے اس کے کہے ہوئے الفاظ میں دھمکی کا عنصر نظر آنے لگا۔ 'امید ہے کہ آپ مجھے شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔' مجھے کام کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی البتہ دیر سے دفتر پہنچنا میری کمزوری تھی اور یہی اس کی شکایت کا سبب بن سکتی تھی۔ پہلے دن تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن شاید آیندہ وہ درگزر نہ کرے۔ اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں صبح اور جلدی بستر چھوڑ دوں تاکہ مجھے اپنے کام نمٹانے کے لیے مزید وقت مل جائے۔ چنانچہ میں نے گھڑی میں ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگایا اور سوگئی۔

الارم کی آواز نے مجھے ہی نہیں بلکہ شہزاد کو بھی جگا دیا۔ وہ وقت سے پہلے آنکھ کھلنے پر آگ بگولا ہوگئے اور جھلاتے ہوئے بولے۔ "اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں؟ ایسی کیا قیامت پڑگئی؟"

مجھے جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے خاموشی سے الارم آف کیا اور باتھ روم میں گھس گئی۔ اس روز کام وقت پر ختم ہوگیا اور میں بھی چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچ گئی۔ لیکن اس روز سارا دن میری طبیعت میں کسلمندی رہی۔ کام میں بھی دل نہیں لگا اور بے چینی سے چھٹی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ گھر جا کر بھی آرام نہیں ملے گا۔ سب کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ بج جائیں گے۔ اس کے بعد سونا نصیب ہوگا اب مجھے امی کی بات یاد آرہی تھی کہ ملازمت کرنے والی عورت پر دُہری ذمے داری آجاتی ہے۔ وہ کام بھی کرے اور گھر بھی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سنبھالے۔ اوپر سے سب کی نظریں اس کے پیسوں پر رہتی ہیں۔

جی ہاں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شادی کے بعد پہلی گرمیاں آئیں تو میں اپنے لیے کچھ لون کے سوٹ خریدنے گئی۔ شہزاد بھی میرے ساتھ تھے۔ میرا ہاتھ ہمیشہ سے کھلا ہوا ہے میں کبھی قیمت کی پروانہیں کرتی۔ ہمیشہ اچھی اور معیاری چیزیں خریدتی ہوں۔ اس روز بھی میں نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ اپنے لیے چار سوٹ، دو جوڑی سینڈل، کچھ میک اپ کا سامان، شہزاد کے لیے ایک برانڈڈ شلوار سوٹ اور ساس صاحبہ کے لیے بھی دو جوڑے خریدے۔ اس طرح میں نے کوئی پندرہ بیس ہزار کی شاپنگ کرڈالی۔ شہزاد حیرت سے مجھے خرچ کرتا ہوا دیکھتے رہے۔ گھر آکر بولے۔ ''تم کچھ بچاتی بھی ہو یا ساری تنخواہ یونہی اڑادیتی ہو؟''

میں نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ ''اتنی مہنگائی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں مستقبل کے لیے کچھ بچت کرنا چاہیے۔ کسی وقت بھی کوئی ایمرجنسی ہوسکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، آج میں نے تمہیں جس طرح خرچ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین نہیں کہ تم کچھ بچا سکو۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اپنی چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ میرے حوالے کردو، تمہیں اپنی ضرورت کے لیے جتنے پیسوں کی ضرورت ہو۔ وہ نکال لینا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس طرح تو میں آپ کی محتاج ہوکر رہ جاؤں گی۔''

''اگر تمہاری ملازمت نہ ہوتی تب بھی میری محتاج ہی ہوتیں۔ اسے میری مہربانی سمجھو کہ تمہیں ملازمت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ یہ اللے تللے نہ ہوتے۔ ویسے بھی میاں بیوی کا پیسا الگ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ہوں گے تو کل کو تمہارے ہی کام آئیں گے۔''

میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسی صورت میں مجھے گھر کا راستہ دکھا دیں گے۔ میری ساس ہر وقت ڈراتی رہتی تھیں کہ شہزاد غصے کے بہت تیز ہیں اور اگر میں نے ان کی نافرمانی یا حکم عدولی کی تو وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ میں طلاق کا ٹیکہ ماتھے پر سجائے والدین کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس معاشرہ میں طلاق یافتہ عورت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے مجھے اپنا گھر بچانے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ اور میں نے وہ دونوں چیزیں شہزاد کے حوالے کردیں۔ اس طرح مجھ میں اور میرے گھر کام کرنے والی ماسی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ چار گھروں میں کام کر کے جو کماتی۔ اس کا نکھٹو شوہر سب چھین لیتا اور وہ غریب مانگ تانگ کر مہینا پورا کرتی۔ اب مجھے شہزاد کی چالاکی سمجھ میں آئی۔ ان کی نظر پہلے دن سے ہی میری تنخواہ پر تھی۔ اسی لیے انہوں نے میرے میکے جانے پر پابندی لگائی۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ میں اپنی آمدنی میں سے گھر والوں کو کچھ نہ دے دوں جبکہ انہیں میرے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر انہیں میرا خرچ کرنا بھی برا لگنے لگا اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بچت کا بہانہ کر کے میرے اکاؤنٹ پر قبضہ کرلیا۔

میرے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے تھے۔ شہزاد نے ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگانے پر پابندی لگادی تھی۔ اس لیے مجھے دفتر پہنچنے میں دوبارہ دیر ہونے لگی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس روز میں حسبِ معمول آدھ گھنٹا تاخیر سے دفتر پہنچی۔ دس بجے شاہد نے بلالیا۔ اس روز وہ کچھ اکھڑا اکھڑا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں خود ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک فائل دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے فائل بند کی اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

''مسز مہناز، میں نے بہت کوشش کی کہ اس تکلیف دہ موضوع پر گفتگو کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن آپ کے طرزِ عمل نے مجھے اس کا نوٹس لینے پر مجبور کردیا ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں سر۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے کام کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن آپ کے دیر سے آنے کی عادت نے پریشان کررکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شادی شدہ عورتوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں اب تک نظرانداز کرتا رہا۔ لیکن اس سے دفتر کے ڈسپلن پر اثر پڑ رہا ہے۔ اگر آپ کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی دیر سے آنا شروع کردیا تو کیا ہوگا؟''

میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا کروں سر!

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کوشش تو کرتی ہوں لیکن دیر ہی ہو جاتی ہے۔“

”مجھے آپ کی مشکلات کا اندازہ ہے۔“ وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ کام رات میں ہی کر لیا کریں۔ مثلاً کپڑوں پر استری وغیرہ۔“

”وہ تو میں رات میں ہی کر لیتی ہوں۔ اس کے بعد بھی صبح میں بہت سے کام ہوتے ہیں۔ پہلے شوہر کو ناشتا دیتی ہوں پھر ساس کے لیے ناشتا اور دوپہر کی روٹیاں پکاتی ہوں۔ اس کے بعد اگر کچھ وقت بچ جائے تو خود ناشتا کرتی ہوں۔ ورنہ کبھی کبھی تو چائے کی پیالی بھی نصیب نہیں ہوتی۔“ میں روانی میں کہتی چلی گئی جبکہ مجھے ایک اجنبی کے سامنے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا۔

اس کا بھی حوصلہ بڑھ گیا اور وہ کریدنے کی خاطر بولا۔ ”کیا آپ کی ساس خدانخواستہ معذور یا بیمار ہیں کہ وہ اپنے لیے دو روٹیاں بھی نہیں ڈال سکتیں۔“

”سوری سر، اس سے زیادہ کھل کر بات نہیں کر سکتی۔ کوشش کروں گی کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”آپ کچھ نہ کہیں تب بھی میں سب سمجھ چکا ہوں۔ بہرحال یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں مزید تفصیل جاننے پر اصرار نہیں کروں گا۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

اسی وقت میرے پیر پر چیونٹی رینگتی محسوس ہوئی۔ میں ذرا سا جھکی تو دوپٹے کا پلو کندھے سے ڈھلک گیا۔ اس روز میں نے کھلے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ جب تک میں دوبارہ پلو سر پر ڈالتی۔ بہت کچھ عیاں ہو گیا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں مجھے اپنے جسم میں گڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں جانے کے لیے اٹھنے لگی تو وہ بولا۔ ”ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آرام سے بیٹھیں۔ ابھی ہم نے کام کی بات تو کوئی نہیں کی۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔“

اسے ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال وہ میرا باس تھا۔ اسے خوش رکھنا ضروری تھا بلکہ اسے خوش رکھنے میں ہی میرا فائدہ تھا۔ چائے پینے کے دوران مجھے اس کی نظریں بدلی بدلی محسوس ہوئیں۔ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اور وہ مرد کی نظروں کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہیں لگاتی۔ پانچ منٹ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس نے مجھے کام کے بہانے روکا تھا لیکن ایک گھنٹے تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تو مجھے پکا یقین ہو گیا کہ وہ محض مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھنا چاہ رہا تھا یہی وہ وقت تھا کہ میں پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی نگاہِ التفات کے جواب میں بے رخی اختیار کر لیتی۔ لیکن میں نے اس کی کمزوری کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس روز شاہد نے مجھے کام کے بہانے کئی مرتبہ بلایا، کام تو کیا ہونا تھا۔ مجھے پاس بٹھانے کا بہانہ تھا۔ میں نے کوئی حیل و حجت نہیں کی اور اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ میں نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس کا بار بار بلانا مجھے ناگوار گزر رہا ہے۔ بلکہ ہر بار اٹھلاتی مسکراتی اس کے کمرے میں گئی اور خوش گوار موڈ میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس دوران کئی بار میرا پلو ڈھلکا۔ کئی بار میں آگے کی طرف جھکی اور اسے پورا موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کرے۔ دراصل میں جاننا چاہ رہی تھی کہ جو کچھ سمجھ رہی ہوں۔ کیا واقعی ایسا ہے اور شام تک اس شبہ کی تصدیق ہو گئی کہ وہ مجھ پر مرمٹا ہے یا فلرٹ کرنا چاہ رہا ہے گو کہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی بے باک نگاہوں نے بہت کچھ بتا دیا چنانچہ میں نے اس کھیل کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور سوچ لیا کہ اگر اس نے پیش قدمی کی تو مزاحمت نہیں کروں گی۔

اس فیصلے کے پیشِ نظر دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ میں اس کی منظورِ نظر بن کر زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کر سکتی تھی۔ پھر میرے دیر سے آنے پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کام کے سلسلے میں چھوٹی موٹی غلطیاں نظر انداز کر دی جاتیں اور پروموشن کا امکان بڑھ جاتا۔ باس اگر مٹھی میں ہو تو نوکری حلوا ہو جاتی ہے اور جب قدرت مجھے ایک موقع فراہم کر رہی تھی تو میں اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتی۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ جس والہانہ انداز میں میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اُمید ہو چلی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ خوشگوار وقت گزار سکوں گی۔ اب تک میری گھٹن زدہ زندگی محرومی میں گزر رہی تھی۔ میں نے شادی کے بعد کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی اور ایک ایسی مزدور عورت کی طرح زندگی کے دن گزار رہی تھی جس سے دُہری مشقت لی جا رہی ہو اور ستم یہ کہ میری کمائی پر بھی شوہر نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ میرے پاس موبائل میں کارڈ ڈلوانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک دو مرتبہ شہزاد سے پیسے مانگے تو انہوں نے فضول خرچ ہونے کا طعنہ دے دیا۔

ایک دو مرتبہ خیال آیا کہ اس طرح میں شہزاد سے بے

وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوں لیکن میرے خیال میں کسی مرد سے ہنس بول کر باتیں کر لینا کوئی جرم نہیں تھا۔ مرد بھی تو غیر لڑکیوں سے آزادانہ اور بے حجابانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی پاک دامنی پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ اور نہ ہی ان کی عزت میں کوئی کمی آتی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ شہزاد دن بھر کیا کرتے پھرتے ہیں اور ان کے کتنی عورتوں سے تعلقات ہیں۔ جب وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتے تھے تو مجھے بھی حق تھا کہ اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹ سکوں۔

دوسرے دن میں نے تیار ہونے میں خاص اہتمام کیا۔ ورنہ شادی کے بعد سے تو میں نے اپنے آپ پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی۔ کس کے لیے بناؤ سنگھار کرتی۔ شوہر کو تو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور طعنے دینے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ ایسے بے حس شخص کے لیے کیا تیاری کرتی۔ اب کسی نے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیا تھا تو مجھے بھی اپنے آپ پر توجہ دینے کا خیال آیا۔ میں نے آسمانی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ بالوں کو برش کر کے کندھوں پر کھلا چھوڑ دیا اور ہلکا سا میک اپ کر کے دفتر کے لیے روانہ ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ راستے میں کئی لوگوں نے مجھے غور سے دیکھا اور دفتر میں بھی لوگ مجھے اس روپ میں دیکھ کر چونک گئے۔ لیکن میرا اصل ٹارگٹ تو شاہد تھا جس کے بلاوے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دس بجے کے قریب انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں بلا رہا تھا۔ میں نے فائلیں اٹھائیں اور لہراتی بل کھاتی اس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’گڈ چینج۔‘‘

میں نے شرمانے کی ایکٹنگ کی تو وہ کہنے لگا۔ ’’اچھی لگ رہی ہیں اسی طرح رہا کریں۔‘‘

میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ’’جب دل ہی مرجھا جائے تو کس کے لیے بناؤ سنگھار کروں؟‘‘

’’مجھے اندازہ ہے کہ آپ کن حالات سے گزر رہی ہیں۔ جب تک آپ خوف کے حصار سے باہر نہیں آئیں گی۔ آپ کا اسی طرح استحصال ہوتا رہے گا۔‘‘

وہ مجھے بغاوت کی ترغیب دے رہا تھا لیکن مجھ میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ’’نو سر، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ نہیں جانتے کہ اس کے کتنے خوفناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’جنگ میں فتح اور شکست کا امکان برابر برابر ہوتا ہے۔ آپ تو جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی شکست تسلیم کر رہی ہیں۔‘‘

’’میں کیا کروں سر، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔‘‘

’’کچھ نہیں، کسی بھی راستے پر چلنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔ فی الحال جیسا چل رہا ہے۔ چلنے دیں۔ البتہ گھر سے باہر جو وقت گزرے۔ اس سے پوری طرح انجوائے کریں۔ اس طرح آپ کا اعتماد بحال ہوگا اور آپ بے خوفی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکیں گی۔‘‘

’’سر! یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘ میں اس کا مطلب سمجھتے ہوئے انجان بن کر بولی۔ ’’میں یہاں کام کرنے آتی ہوں اور چھٹی کے بعد سیدھی گھر چلی جاتی ہوں۔ مجھے زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع کب اور کیسے مل سکتا ہے؟‘‘

’’یہ میں آپ کو بتاؤں گا۔‘‘ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ’’پہلے آپ یہ تو طے کر لیں کہ جو راستہ دکھا رہا ہوں۔ آپ اس پر چلنے کے لیے تیار ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔‘‘ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن فی الحال کسی محاذ آرائی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔‘‘

’’اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔‘‘ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ’’بس میں جیسا کہوں، وہ کرتی جائیں لیکن اس کے لیے آپ کو مجھے اپنے حالات تفصیل سے بتانا ہوں گے تاکہ ان کی روشنی میں آپ کو گائیڈ کر سکوں۔‘‘

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ’’آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ آپ کا ہر راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔‘‘

میں پھر بھی خاموش رہی تو اس نے کہا۔ ’’آپ شاید یہاں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہیں۔ ٹھیک ہے میں کل ایک کلائنٹ سے میٹنگ رکھ لیتا ہوں۔ واپسی پر ہم کسی ریسٹورانٹ میں لنچ کریں گے۔ وہیں باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔‘‘

اس کی تجویز سن کر میں تھوڑی سی پریشان ہوگئی کیونکہ اس سے پہلے بھی کسی میٹنگ کے سلسلے میں دفتر سے باہر نہیں گئی تھی۔ رازی صاحب خود ہی سارے معاملات نمٹا لیتے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ باس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی ہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’کیا یہ مناسب رہے گا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔‘‘

’’دراصل یہ آپ ہی کا کام ہے۔ رازی صاحب کو

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سامنے رہنے کا شوق تھا۔ اس لیے وہ خود میٹنگ میں چلے جاتے تھے ورنہ اصولاً تو آپ کو جانا چاہیے تھا۔ اب آئندہ سے آپ ہی میٹنگ میں جایا کریں گی۔ میں ایک دو دفعہ آپ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔''

اس نے بڑی ہوشیاری سے میرے دفتر سے باہر جانے کا بندوبست کرلیا۔ اب میں بلا روک ٹوک میٹنگ کے بہانے کہیں بھی جا سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سہ پہر میں تمام اسٹاف کو بلایا اور انہیں بھی بتا دیا کہ اب مسز مہناز کلائنٹ سے میٹنگ کیا کریں گی۔ لہٰذا ان کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ اسٹاف کے لوگوں کے لیے بھی یہ ایک حیرت انگیز اطلاع تھی لیکن کوئی کچھ نہیں بولا اور نہ ہی ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق تھا۔ البتہ وہ حیران ضرور ہوئے ہوں گے کہ مجھے اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جارہی ہے۔

رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو ذہن انہی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دل اور دماغ میں کشمکش چل رہی تھی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ یہ شوہر سے بے وفائی ہے اور کسی غیر مرد کا عورت سے خلوت میں ملنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ جبکہ دل بغاوت پر آمادہ تھا کہ یہ بے وفائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے ہمدردی کررہا ہے اور میری مدد کرنے پر آمادہ ہے تو مجھے اس کی پیشکش قبول کرلینا چاہیے۔ میں اس گھٹن اور حبس زدہ ماحول سے فرار چاہ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر حالات اسی نہج پر چلتے رہے تو کسی بھی وقت میرے دماغ کی رگ پھٹ سکتی ہے۔ بہر حال دل نے دماغ کی ہر دلیل مسترد کردی اور میں نے شاہد کے مشوروں پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے دن ایک بار پھر میں بن سنور کر تیار ہوئی۔ لگتا تھا جیسے دفتر نہیں بلکہ ڈیٹ پر جارہی ہوں اور حقیقت بھی یہی تھی میٹنگ کا تو بہانہ تھا۔ میں واقعی شاہد کے ساتھ ڈیٹ پر جارہی تھی۔ دفتر پہنچ کر میں نے متعلقہ اسٹاف سے میٹنگ کے بارے میں بریفنگ لی اور گیارہ بجے کے قریب شاہد کے ہمراہ میٹنگ کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہ خود ڈرائیونگ کررہا تھا۔ میں برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ میرا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی نئی نویلی محبوبہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جارہی ہو۔ شاہد نے کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے تعریفی نظروں سے میری جانب دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔'' آج تو آپ غضب ڈھارہی ہیں۔''

میں بری طرح شرما گئی۔ اس سے پہلے کسی مرد نے میری اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔ شوہر تو انتہائی غیر رومانٹک واقع ہوئے تھے۔ انہیں اس طرح کے جملے بولنا نہیں آتے تھے اور اگر آتے بھی ہوں گے تو کم از کم انہوں نے میرے لیے ایسا کوئی جملہ نہیں بولا۔ میٹنگ مقررہ وقت پر شروع ہوئی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہوگئی اور شاہد لنچ کے لیے مجھے کلفٹن پر واقع ایک ریسٹوران میں لے گیا۔ اس وقت وہاں بہت کم لوگ تھے۔ اس نے بیٹھنے کے لیے اور نسبتاً پرسکون گوشہ منتخب کیا اور بیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد مجھ سے بولا۔''جی، اب بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا مسائل ہیں؟''

میں نے اسے الف سے لے کر یے تک پوری کہانی سنا دی اور شادی کے بعد سے اب تک مجھ پر جو گزر رہی تھی وہ سب بلا کم و کاست بیان کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔''واقعی آپ بڑے مشکل حالات سے گزر رہی ہیں۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات کیا ہوگی کہ آپ کی محنت کی کمائی بھی وہ اپنے قبضے میں کرلیتا ہے۔''

''کس کس زیادتی کا ذکر کروں۔'' میں منہ بسورتے ہوئے بولی۔''میری زندگی تو ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلوں۔''

''نہیں، اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے حالات بھی ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''آپ نے کبھی اپنے شوہر سے ملازمت چھوڑنے کی بات کی ہے۔''

''نہیں۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''بس تو پھر پہلے آپ یہی پتا پھینک کر دیکھیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس کا ردعمل تو معلوم ہوجائے۔''

اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ پھر اس نے آئسکریم منگوائی۔ پھر وہ بولا۔''مجھے آپ کے شوہر کی قسمت پر رشک آتا ہے لیکن وہ بہت ناشکرا انسان ہے۔ اگر میری بیوی آپ جیسی ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں دھو کر پیتا۔''

جی میں آیا کہہ دوں کہ میرے بھی ایسے ہی جذبات ہیں۔ کاش تم میرے شوہر ہوتے تو زندگی کتنی آسان ہوجاتی لیکن یہ بات میری زبان پر نہ آسکی۔ اس کے ساتھ بیٹھنا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے اور میں اُسے دیکھتی رہوں، لیکن کافی دیر ہوگئی تھی اس لیے اٹھنا پڑ گیا۔

اس روز شام کو گھر آنے کے بعد میں نے پلان کے مطابق لباس تبدیل کیا اور کچن میں جانے کی بجائے بستر پر لیٹ گئی شہزاد دفتر سے آچکے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے چائے کا انتظار کررہے تھے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے وہیں سے چلّاتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھئی، کیا بات ہے۔ چائے کیوں نہیں بنی اب تک؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ غصے میں بھرے ہوئے بیڈروم تک آئے اور مجھے بستر پر لیٹا ہوا دیکھ کر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولے۔ ''کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''ہاں۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''سر اور ٹانگوں میں شدید درد ہورہا ہے۔ دفتر میں کام زیادہ تھا اور واپسی میں کھڑے ہوکر آنا پڑا۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔ میں امی سے کہتا ہوں۔ وہ چائے بنالیں گی۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے چادر تان لی اور آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی۔ کھانا بھی ساس نے ہی بنایا۔ رات کو جب وہ کمرے میں آئے اور انہوں نے میرا حال پوچھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اب تو بہتر محسوس کررہی ہوں۔ لیکن بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تم تھوڑا سا کھانا کھالو۔ اس کے بعد کوئی ٹیبلٹ لے لینا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولے۔ ''تم دو چار دن کی چھٹی لے لو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''دفتر میں کام بہت زیادہ ہے۔'' میں نے لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے کہا۔ ''چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ جاب ہی چھوڑ دوں۔ اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ سارا دن دفتر میں سر کھپاؤ۔ شام کو گھر کے کام کرو۔ میرے تو اعصاب جواب دیتے جارہے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ مضطرب لہجے میں بولے۔ ''اگر تم نے ملازمت چھوڑ دی تو گزارہ کیسے ہوگا؟''

''جیسے پہلے ہورہا تھا۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ ''آخر ان گھروں میں بھی تو لوگ زندہ ہیں جہاں عورتیں ملازمت نہیں کرتیں۔''

''تم جانتی ہو کہ میری تنخواہ اتنی نہیں کہ تمام اخراجات برداشت کرسکوں۔ چند ماہ کی بات اور ہے میری پروموشن ہو جائے تو بے شک جاب چھوڑ دینا۔ تم چاہو تو کھانا پکانے کے لیے کوئی ملازمہ رکھ سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو یہی سہی لیکن میں بہت تھک چکی ہوں اور میرے لیے زیادہ عرصہ جاب کرنا ممکن نہیں۔ آپ کی پروموشن کے بعد میں گھر بیٹھ جاؤں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی لیکن فی الحال تم کسی ملازمہ کا بندوبست کرلو تاکہ تمہارا بوجھ کچھ کم ہوجائے۔''

دوسرے دن میں نے شاہد کو یہ بات بتائی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا۔ اسے تم سے نہیں بلکہ تمہاری تنخواہ سے دلچسپی ہے۔ اب آپ اس صورتِ حال کو اپنے حق میں استعمال کرسکتی ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''پروموشن تو ایک بہانہ ہے۔ وہ کبھی بھی آپ کو ملازمت چھوڑنے نہیں دے گا۔ البتہ اس کے عوض آپ کو چھوٹی موٹی رعایتیں ملتی رہیں گی جیسے کل آپ نے کام کی زیادتی کا شکوہ کیا تو اس نے فوراً ہی ملازمہ رکھنے کی بات کر دی۔ اب اس کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری بات لکھ لیں کہ اس کے رویے میں مزید بہتری آتی جائے گی۔''

شاہد کا کہنا حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ نہ صرف ملازمہ رکھ لی گئی بلکہ شہزاد نے اپنے کام خود کرنا شروع کر دیے۔ اس طرح مجھے اس کے کپڑے استری کرنے اور جوتے پالش کرنے سے بھی نجات مل گئی۔ اب میرے پاس شام میں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ میں صرف رات کو کھانا گرم کرکے میز پر رکھ دیتی اور دو چار برتن دھوکر فارغ ہوجاتی۔ صبح کو بھی صرف ناشتا بنانا ہوتا تھا۔ اس طرح مجھے کافی سکون مل گیا لیکن میرے دل میں شہزاد کی وقعت اور کم ہو گئی۔ شاہد کی بات میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی کہ شہزاد کو تم سے نہیں بلکہ تمہاری تنخواہ سے دلچسپی ہے۔

اب میں بیک وقت دو مردوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ شہزاد کو میں نے نوکری چھوڑنے کی دھمکی دے کر اپنے لیے بہت سی رعایتیں حاصل کرلی تھیں۔ اس کا رویہ بھی پہلے سے بہتر ہوگیا تھا۔ دوسری طرف شاہد پوری طرح میرے حسن کا اسیر ہو چکا تھا اس کی وارفتگی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ دیر سے دفتر آنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا تھا بلکہ بات اس سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن

میٹنگ کے بہانے اپنے ساتھ باہر لے جاتا۔ کسی اچھے ریسٹوران میں لنچ کرواتا اور ہم ایک دو گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد واپس آجاتے۔

ایک دن میں دفتر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر آئی تو شاہد وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس طرف کیسے آگیا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اسی راستے سے گزرتا ہوں۔ آج سوچا کہ آپ کو بھی ساتھ لے لوں۔“

”آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں بس سے چلی جاتی ہوں۔“ میں نے رسماً کہا حالانکہ دل میں خوش ہو رہی تھی کہ چلو کم از کم ایک دن تو بس کے دھکے کھانے سے نجات ملی۔

”تکلیف کیسی۔ مجھے تو خوشی ہے کہ آپ کے کسی کام آسکا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ میری تو خواہش ہے کہ آپ روزانہ میرے ساتھ جایا کریں۔“

”جی نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو میرا تماشا بن جائے گا۔“

”اگر لوگوں کا اتنا ہی ڈر ہے تو چہرے پر نقاب ڈال لیا کریں۔ کوئی نہیں پہچان سکے گا کہ میرے ساتھ کون خاتون سفر کر رہی ہیں۔“

اس کی تجویز معقول تھی۔ چادر تو میں ویسے بھی لیتی تھی۔ اب میں نے اسی کے ایک کونے کو نقاب کی طرح چہرے پر لیتا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ کار میں جانے لگی۔ واپسی میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا البتہ یہ احتیاط ضرور کرتی کہ پہلے میں دفتر سے نکل کر پیدل چلتی ہوئی بس اسٹاپ تک آتی اور وہ دس پندرہ منٹ بعد آتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہونے لگا کہ واپسی میں ہم تھوڑی دیر کے لیے کسی ریسٹوران یا آئس کریم پارلر پر رک جاتے کیونکہ اب مجھے بس سے سفر نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے تیس چالیس منٹ بچ جاتے تھے اور اگر گھر پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو بھی جاتی تو دفتر میں کام کرنے کی زیادتی کا بہانہ موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ دو تین مرتبہ ڈیفنس میں بنے ہوئے منی سینما میں بھی جا چکی تھی۔ اس طرح میں رفتہ رفتہ اس کے سحر میں ڈوبتی چلی گئی اور شہزاد میرے لیے ثانوی ہو گیا جس کی حیثیت ایک شوپیس سے زیادہ نہ تھی۔

ایک دن میں نے باتوں باتوں میں اس سے ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھا تو وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ”میرا حال بھی آپ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ دیکھنے میں خوش باش اور زندہ دل نظر آتا ہوں لیکن اندر سے بہت دکھی ہوں۔ شاید آپ کے علم میں ہو کہ میں بھی شادی شدہ ہوں لیکن میری ازدواجی زندگی بہت بری گزر رہی ہے۔ والدین نے اپنی مرضی سے میری شادی کی تھی۔ رشتے میں وہ میری کزن ہے۔ کہنے کو وہ گریجویٹ ہے لیکن میری نظر میں جاہلوں سے بدتر ہے۔ اسے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا اس کا معمول ہے۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی وہ لڑ جھگڑ کر میرے گھر والوں سے الگ ہو گئی لیکن پھر بھی اسے چین نہیں آیا۔ اب بھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر میکے گئی ہوئی ہے۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں لیکن آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہوں۔ البتہ آپ سے ملنے کے بعد میرا یہ احساسِ محرومی کسی حد تک دور ہو گیا ہے۔ کاش آپ مجھے پہلے مل جاتیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہم ریسٹوران کے کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں مکمل پرائیویسی تھی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تو اس کی جسارت بڑھ گئی۔ وہ میری زلفوں سے کھیلنے لگا پھر اس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر مجھے اپنے سے قریب کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرتا۔ بیرے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں فوراً ہی سنبھل گئی۔

شاہد کے حالات جاننے کے بعد مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ پہلے وہ میرا ہمدرد تھا۔ اب میں اس کی ہمدرد، مونس وغم گسار اور نہ جانے کیا کچھ بن گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہونے لگا جب شام کو وہ مجھے گھر کے پاس اتارتا تو جی چاہتا کہوں مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کی بیوی کا پتا صاف نہ ہو جائے اور مجھے شہزاد سے طلاق نہ مل جائے۔ ہمارا ملاپ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان دونوں محاذوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ میں جتنی دیر شاہد کے پاس بیٹھتی، اس کے حالات پر ہمدردی کرتی رہتی۔ اس کی بیوی کو برا بھلا کہتی کہ اس نے شاہد جیسے ہیرے کی قدر نہیں کی۔ جواب میں وہ بھی میری تعریفوں کے پل باندھ دیتا۔ اور ہمیشہ ایک ہی جملہ دہراتا کہ کاش میں اسے پہلے مل گئی ہوتی۔

دوسری جانب میرا رویہ شہزاد کے ساتھ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ مجھے اس کی شکل بری لگنے لگی تھی۔ پہلے وہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور لعن طعن کیا کرتا تھا۔ اب میں اسے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بات بات پر جھڑکنے لگی تھی۔ میرے دل سے اس کا ڈر خوف نکل گیا تھا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ اب میرے پاس اس کا متبادل شاہد کی صورت میں موجود تھا۔ اگر شہزاد میری زندگی سے نکل جاتا تو بہ آسانی شاہد سے شادی کر سکتی تھی۔ اس کی وارفتگی اور جنون کو دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہ میرے اشارے کا منتظر ہے اور میں جب کہوں گی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لے گا۔

اس روز میرا شہزاد سے بہت زبردست جھگڑا ہوا۔ ہوا یوں کہ عید قریب آ رہی تھی اور میں چاہ رہی تھی کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے گھر کی تزئین و آرائش ہو جائے کیونکہ دروازوں اور دیواروں کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ پردے، قالین، صوفے سبھی بوسیدہ حالت میں تھے۔ انہیں بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ میرے اکاؤنٹ سے کچھ پیسے نکال کر یہ سارے کام کروا لیے جائیں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ سراسر اسراف ہے۔ صوفے، پردے اور قالین بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ وہ رنگ روغن کروا دے گا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور تیز لہجے میں بولی۔

''یہ میرا پیسا ہے۔ میں جیسے چاہوں خرچ کروں۔ تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو؟''

''میں نے کب انکار کیا ہے۔ شوہر ہوں تمہارا۔ اس طرح اللے تللے کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر میں اپنی مرضی سے پیسے خرچ نہیں کر سکتی تو میں یہ نوکری ہی چھوڑ دیتی ہوں۔''

''چھوڑ دو۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن تم ہی رل جاؤ گی۔ میں تمہاری بے جا فرمائشیں پوری نہیں کر سکوں گا۔''

دوسرے دن میں نے شاہد کو یہ واقعہ سنایا تو وہ لاتعلقی کے انداز میں بولا۔ ''کوئی بات نہیں، تم اس کے پیچھے لگی رہو۔ تنگ آ کر وہ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔''

وہ یکایک ہی آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے رویے پر خاصی حیرت ہوئی لیکن سنبھلتے ہوئے بولی۔

''نہیں سر، وہ بے حد ڈھیٹ اور ضدی انسان ہے۔ اس کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتی۔ اب تو اس پر نوکری چھوڑنے کی دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں نے اس سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میں اس کا ردِعمل جاننے کے لیے لمحہ بھر کو رکی پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟''

''میں!'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟'' میں بے شرمی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''جب میں اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہوں تو آپ بھی اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ پھر ہم دونوں مل کر ایک نئے سفر کا آغاز کر سکیں گے۔''

''دیکھو مہناز! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور اگر پہلے مل جاتیں تو شاید تمہیں پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تمہارے حالات جان کر مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اسی لیے تمہاری دل جوئی کرتا رہا تاکہ تم خوش رہو اور دل لگا کر دفتر کا کام کرو لیکن تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اشارتاً بھی ایسی کوئی بات کہی ہو۔ ویسے بھی میری بیوی واپس آ گئی ہے اور بچوں کی خاطر میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے شوہر کی وفادار بن کر رہو۔ ہمارے معاشرے میں ہزاروں لاکھوں عورتیں اس سے بھی برے حالات میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ جو عورت اپنے شوہر سے وفا نہیں کرتی۔ کوئی دوسرا مرد بھی اسے قبول نہیں کرتا۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ مجھ میں شاہد سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں تو خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ میں نے واپس اپنی سیٹ پر آ کر استعفیٰ لکھا لیکن شاہد نے اسے منظور نہیں کیا اور مشورہ دیا کہ میں چند روز کے لیے چھٹی لے لوں۔ میں نے بھی گھر آ کر یہی سوچا کہ نوکری چھوڑنے کے بعد گھر میں میری رہی سہی وقعت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ایک ہفتے بعد دوبارہ کام پر واپس آ گئی۔ اب میرے اور شاہد کے درمیان صرف باس اور ماتحت کا رشتہ ہے۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی کہے لیکن میں تو اسے فلرٹ ہی سمجھوں گی۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے
لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں
صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب
ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن
حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے
۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox
کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے
Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause
ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

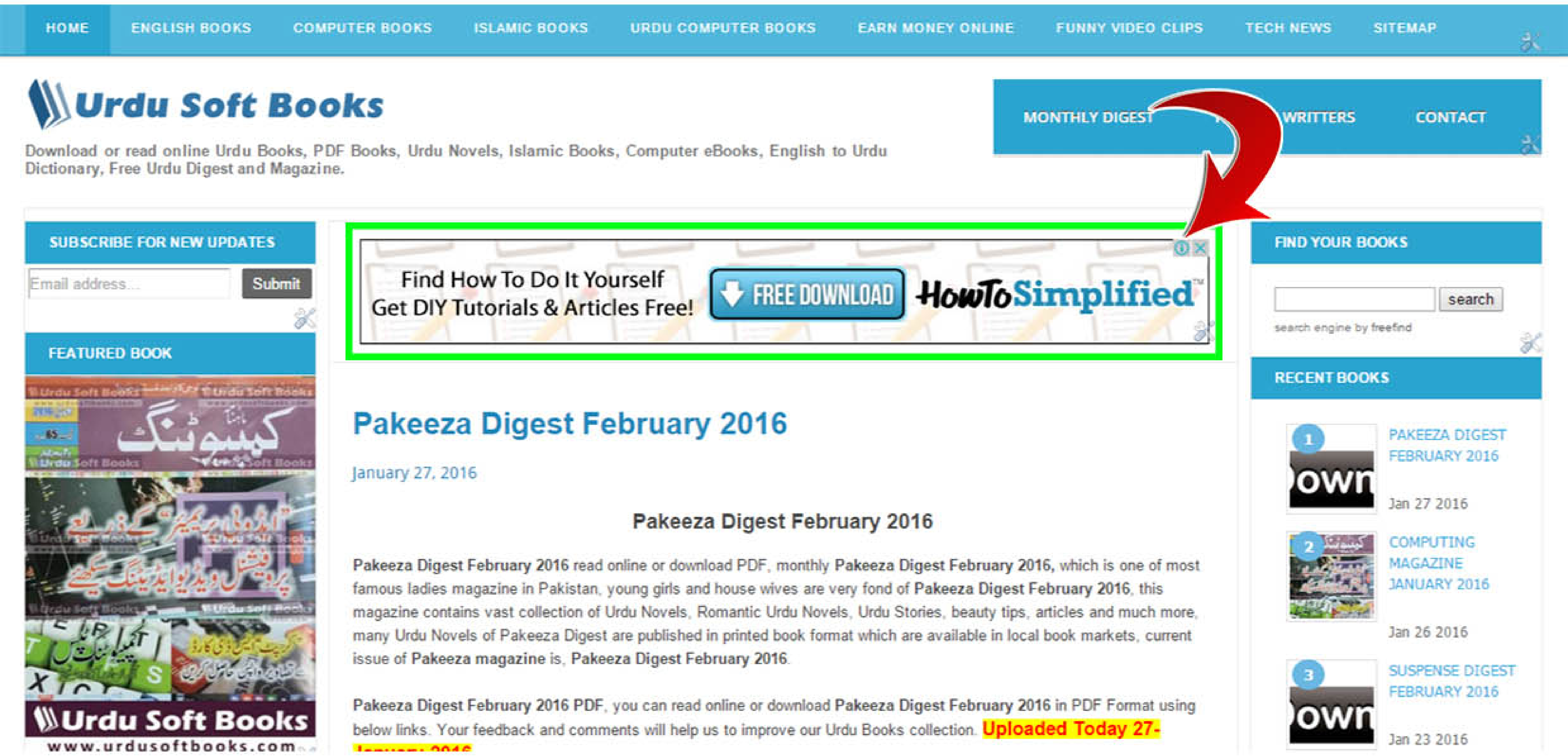

نیچے نظر آنے والے بٹن پر کلک کر کے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آپ ہماری ویب سائٹ پر جا سکتے ہیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میں اپنے ماحول سے بے خبر کہانی میں کھویا ہوا تھا، بلکہ یہ میری عادت تھی کہ کہانیاں پڑھتے ہوئے میں پوری طرح کہانی میں گم ہو جاتا۔ اس کے کرداروں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا، ان کے ساتھ ہی خوشی اور غم محسوس ہوتے۔ ایسے میں وہ اپنے ماحول سے اس قدر بیگانہ ہو جاتا کہ اردگرد کا شور وغل بھی مجھے ڈسٹرب نہ کرتا۔ ویسے بھی جو کہانی اس وقت میں پڑھ رہا تھا، وہ ایک دلچسپ موڑ پر تھی جہاں ایک عورت اپنی بیٹی کا گناہ چھپانے کے لیے اپنی بیٹی

بے حسی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
آداب و نیاز
زیرِ نظر روداد کافی پرانی ہے، ایک بار پہلے بھی لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس طرح سے بیان نہیں کر پایا تھا اس لیے دوبارہ نئے زاویے سے لکھ رہا ہوں۔ یہ انداز آپ کو بھی پسند آئے گا۔ انسان کس قدر بے حس ہو چکا ہے یہی بتانا چاہتا ہوں۔

اختر شہاب
(کراچی)

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کے ہمراہ بیٹی کے نوزائیدہ بچے کو ٹھکانے لگانے جارہی تھی۔

کہانی کے اس موڑ پر مجھے مصنف کے الفاظ سے اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ آیا ٹھکانے لگانے سے اس کی مراد بچے کا گلا گھونٹ کر دفن کردینا ہے یا وہ اسے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینکے گی یا پھر ایدھی ہوم کے باہر گہوارے میں ڈالے گی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ عورت راز داری سے یہ بچہ اپنی کسی بے اولاد سہیلی کو دینے جارہی ہو۔ میں اس قدر کہانیاں پڑھ چکا تھا کہ کسی کہانی کے انجام کے بارے میں میرا اندازہ عموماً درست ہوتا تھا مگر اس کہانی میں مصنف نے مجھے الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا تھا لہٰذا کہانی میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی مگر جب میں کہانی کے اس موڑ پر پہنچا جب ان ماں بیٹیوں کو قانون کے محافظ گھیر لیتے ہیں، ان کا جرم عیاں ہوجاتا ہے اور وہ انھیں تھانے لے جانے کی بجائے وہیں مک مکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور رشوت میں اس لڑکی کا بدن طلب کرتے ہیں۔ لڑکی کو جرم کرنے پر مزید گناہ کے لیے مجبور کرتے ہیں، تب اس لڑکی کی ماں، لڑکی کو ان کی بات مان لینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتی ہے۔

"ان کی بات مان لے۔ یہاں تو وہ دو ہیں، تھانے میں بہت ہوں گے۔" تو مصنف کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے شاک سا لگا۔ اس سے آگے پڑھا بھی نہیں گیا اور میں نے رسالہ بند کردیا۔

"یہ ہمارا معاشرہ آخر کدھر جارہا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے ہوئے سوچا۔ ادیب جو معاشرے کے نباض ہوتے ہیں اور معاشرتی برائیوں کو کبھی کھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کرکے وہ معاشرے کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی ادیب جب ایسے الفاظ لکھنے پر آجائیں جن سے معاشرے کی بے حسی کی عکاسی ہوتی ہو اور لوگ تب بھی ان کے الفاظ کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ خود کو سنبھالنے اور معاشرے کو بگڑنے سے بچانے کی اجتماعی کوشش نہ کریں تو اس معاشرے کے بکھرنے اور تباہ ہونے میں بس تھوڑا ہی وقت رہ جاتا ہے۔

مجھے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ میں اٹھا، میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور کرسی پر بیٹھ کر پینے لگا تو میری نظر سامنے رکھے اخبار پر پڑی۔ جس بات سے متاثر ہوکر میں نے رسالہ بند کردیا تھا، اخبار میں زیادہ تر خبریں اسی بات کے بارے میں تھیں۔ شہر بھر میں ڈاکوؤں کی خبریں، اجتماعی آبروریزی کی خبر، قانون کے محافظ کی نابالغ لڑکی پر مجرمانہ حملے کی خبر، سیاسی رہنماؤں کی بداعمالیاں اور اللے تللوں کی خبریں۔ میں نے اخبار اٹھا کر دور پھینک دیا۔

"آخر یہ قوم کے لیڈر ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟" میں نے سوچا۔ "بحیثیت مسلمان ہمیں ایک قوم ہونا چاہئے تھا، مگر لوگ زبانوں کے حوالے سے، تہذیبوں کے حوالے سے، علاقے کے حوالے سے فرقوں کے حوالے سے اور نہ جانے کتنے حوالوں سے تقسیم در تقسیم ہوتے جارہے ہیں۔ ہم لوگ اس قدر کم عقل ہیں کہ محض سیاسی لیڈروں کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہیں اور یہ سیاسی حضرات بجائے اس کے کہ اس ملک کو ایک فلاحی ریاست بنائیں، قانون کی بالادستی قائم کریں، محض اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے، اپنی حکومت مضبوط کرنے کے لیے، قانون کے رکھوالوں کو چھوٹ دے کر اس ملک کو پولیس اسٹیٹ بنا چکے ہیں۔ کیا ہم مکمل تباہی کی طرف جارہے ہیں یا واپسی کا کوئی راستہ ہے؟ خیر مجھے کیا؟" میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے سوچا۔ "میں کون سا قوم کا مصلح ہوں۔ میری بلا سے جو ہوتا ہے ہو۔ مجھ پر تو اللہ کا فضل ہے۔ اچھی نوکری مل گئی ہے۔ ہنگاموں سے دور، پُرسکون علاقے میں رہ رہا ہوں۔ زکوٰۃ بھی دیتا ہوں اور حسبِ توفیق غریب غربا کی امداد اور خیرات بھی کرتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو شادی بھی جلد ہی ہوجائے گی، پھر بھی جیسے حالات بگڑتے جارہے ہیں، ان میں تو یہاں رہنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ مجھے امریکا نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ بقول ایک صاحب کے وہاں کے قاعدے قانون دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہاں مسلمان نہیں ہیں مگر اسلام ضرور موجود ہے۔"

"آہ یہ میری سوچ کیسی خود غرضانہ ہے۔" میں نے خود کلامی کی اور مزید سوچنے لگا۔ "صرف میں ہی یہ نہیں سوچتا بلکہ پورے معاشرے میں ہی شعوری یا لاشعوری طور پر یہی سوچ کارفرما ہوگئی ہے کہ اگر کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے تو ہمیں کیا؟ ہم تو محفوظ و مامون ہیں۔ اگر کسی دوسرے کا گھر جلا ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں؟ آگ کے شعلے ابھی گھر سے بہت دور ہیں۔ اگر کسی کے گھر ڈاکا پڑا ہے، کسی کی عزت لٹی ہے تو ضرور ان کی کوئی غلطی ہوگی۔ گو ظاہری طور پر اور زبانی لوگ ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار ضرور کرتے ہیں مگر عملی طور پر ان کے دل مردہ ہوگئے ہیں اور درد کا صحیح احساس ان کے دلوں میں نہیں جاگتا اور نہ وہ اجتماعی طور پر ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

خالی باتیں کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتیں۔ کسی کے تن پر کپڑا نہیں ڈال سکتیں۔ کسی مظلوم کو اس کا حق نہیں دلا سکتیں' جب تک اس کے لیے متحد ہو کر عملی جدوجہد نہ کی جائے۔

ان حالات میں جب کسی کا گھر جلتا ہے، کسی کی عزت لٹتی ہے یا کسی کے ہاں ڈاکا پڑتا ہے تو وہ یہ ضرور سوچتا ہے کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا؟ میرے ساتھ یہ کیوں ہوا؟ میں نے تو کسی کا حق نہیں مارا، میں نے تو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی میں تو کسی برائی میں ملوث نہیں ہوں تو پھر مجھے کس بات کی کس جرم کی سزا مل رہی ہے حالانکہ یہ سوچتے ہوئے وہ فطرت کے اس قانون کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے کہ قدرت کی مہربانیاں اور قہرمانیاں سب کے لیے یکساں ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو سب کے لیے' خوشبو پھیلتی ہے تو سب کے لیے ، بارش سرسبز یا بنجر ہر زمین پر ہوتی ہے اور طوفان آتا ہے تو امیر' غریب' بچے' بوڑھے' گناہ گار اور بے گناہ سبھی اس کا شکار ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

لہٰذا کسی کی تمام اچھائیوں کے باوجود اس کے ساتھ کوئی برائی ہوتی ہے تو اس میں اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے برائیوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا۔ شترمرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر خود کو محفوظ و مامون تصور کیا اور برائیوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ کسی ظالم کا ہاتھ نہ پکڑا، کسی برائی کو دیکھ کر منع نہ کیا۔ معاشرے کی خرابیوں کو برا نہ سمجھا اور کسی مظلوم کے ساتھ ہمدردی نہ کی بلکہ اپنی جان کے خوف سے ، اپنی رسوائی کے ڈر سے مظلوم سے آنکھ بچا کر گزر گیا۔ سو اب وہ بھی اس سلوک کا مستحق ہے اور اب اس کی مدد کو کوئی نہ آئے گا۔

''تم ان رسالوں کا پیچھا چھوڑ کر کچھ دین دنیا کی بھی خبر لو گے یا نہیں؟'' اماں بی اندر سے آتے ہوئے بولیں۔ ''جاؤ باہر دیکھو کون آیا ہے۔''

ماں کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور سیدھا باہر آ گیا۔ باہر دروازے پر ٹیلی گراف آفس کا ملازم تھا۔ ''صاحب یہ ایکسپریس ٹیلی گرام آیا ہے۔'' وہ بولا۔ اسی کی دہائی میں رابطے کا تیز ترین اور ہر ایک کی پہنچ کا واحد ذریعہ ٹیلی گرام ہی تھا۔

میں تار لے کر رسید پر دستخط کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید یہ ٹیلی گرام ابو کی طرف سے ہے۔ وہ آج کل دوسرے شہر میں دورے پر گئے ہوئے تھے انھوں نے شاید اپنی واپسی کی اطلاع دی ہو۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے لفافے میں سے کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔ ''میں کل کی ٹرین سے سول سروس کے انٹرویو کے لیے آ رہی ہوں۔ انٹرویو پرسوں ہے۔ مزید معلومات حاصل کر کے رکھنا۔

''شہلا''

میرے ذہن میں جیسے خوشگوار یادوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ شہلا کے والدین 1965 میں ہمارے پڑوسی تھے اور ہم بچپن میں ساتھ ہی کھیلے تھے۔ پھر وہ لوگ والد کے ٹرانسفر کی وجہ سے دوسرے شہر چلے گئے تھے مگر دونوں گھروں کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ برقرار تھا۔ پھر اچانک کافی عرصے بعد وہ لوگ دو سال پہلے یہاں آئے تھے اور یہاں سال بھر رہنے کے بعد شہلا کے والد کا ٹرانسفر دوبارہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس عرصے میں بچپن کی دوستی واضح پسندیدگی کا روپ دھار گئی تھی۔

گو دونوں میں سے کسی نے بھی اس پسندیدگی کا، اس محبت کا اظہار ایک دوسرے سے نہیں کیا تھا مگر یہ پسندیدگی اس قدر واضح اور شفاف تھی کہ دونوں گھر والوں کی نظر میں آ گئی تھی اور دونوں گھروں میں یہ خاموش معاہدہ ہو گیا تھا کہ اس کے یعنی میرے نوکر ہونے کے بعد شادی ہو جائے گی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا تھا کہ اسی دوران میں شہلا نے سول سروس کے مقابلے کا امتحان دیا تھا۔

''گویا وہ اس میں پاس ہو گئی۔'' میں نے سوچا۔ ''ویری گڈ۔''

''امی شہلا آ رہی ہے۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولا۔ ''اسی کا ٹیلی گرام تھا۔''

''اچھا!'' وہ خوش ہو گئیں۔ ''کب؟''

''کل صبح کی ٹرین سے۔''

''بھائی جان! آپ تو انھیں لینے نہیں جا سکیں گے۔'' اس کی چھوٹی بہن عارفہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

''کیوں؟'' اس نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

''اس لیے کہ آپ نئی نئی نوکری کی وجہ سے چھٹی نہیں کر سکتے' تبھی تو مجھے شاپنگ کو نہیں لے گئے تھے۔'' اسے پرانی بات یاد تھی۔

''نہیں بھئی اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اس وقت تو نوکری کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا اور اب تو تین ماہ ہو گئے نوکری کو۔ اب ایک آدھ دن کی چھٹی تو میں کر سکتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' بہن بولی۔ ''اب تو ایک آدھ دن

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کیا ہفتے بھر کی بھی چھٹی کر سکتے ہیں۔ آپ سوچ لیں امی ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ابھی سے یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو ماں باپ کو بھی بھول جائیں گے۔" بہن نے وضاحت قبول نہیں کی اور پھر چھیڑ دیا۔

"ارے تمھیں شاپنگ بھی کرادوں گا، چائنیز بھی کھلادوں گا۔"

"اچھا مجھے رشوت دینے کی کوشش کررہے ہیں۔" وہ بولی۔ "چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گے مگر ایک شرط ہے، میں بھی اسٹیشن جاؤں گی۔"

"پاگل ہوئی ہو کیا؟" میں نے کہا۔ "اکیلا تو میں بس میں بھی چلا جاؤں گا اور تمھارے ساتھ ٹیکسی کرنا پڑے گی۔ تم میرا ڈبل خرچا کراؤ گی اور پھر تم چلی گئیں تو کھانا کون پکائے گا؟"

"پکانے کی کیا ضرورت، وہ جو آپ مجھے باہر کھلاتے، وہی گھر لے آئیں گے اور گھر میں کھالیں گے۔"

"مگر وہ وعدہ تو تنخواہ ملنے پر ہے اور ابھی تنخواہ ملنے میں پورا ہفتہ باقی ہے۔"

"اچھا چلیں معاف کیا مگر تنخواہ پر چائنیز کے علاوہ میں ایک سوٹ بھی لوں گی۔"

"اچھا بابا لے لینا۔" اس نے بات ختم کی اور بولا۔ "اب میری جان چھوڑو۔"

شہلا کے آنے کی خبر سن کر مجھ پر اضطراب سا طاری ہوگیا تھا کیونکہ میں اسے کافی عرصے بعد دیکھنے والا تھا۔ "اب وہ آئے گی تو اس سے پوچھوں گا کہ وہ اس رشتے پر خوش بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ دور رہ کر اس کے خیالات میں تبدیلی ہی نہ آگئی ہو۔" میں نے سوچا۔ "خیر یہ تو آئندہ کی باتیں ہیں میں کیوں نہ ابھی جا کر اپنے کولیگ انور کو بتا آؤں کل میں نہ آسکوں گا۔" ابھی میں تیار ہو کر نکلنے ہی والا تھا کہ انور خود ہی آگیا۔

"یار میں تمھاری طرف ہی آرہا تھا۔" میں اسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ "اچھا ہوا جو تم خود ہی آگئے۔"

"میں تمھارے پاس کل کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

"ہیں؟" میں حیران ہوگیا۔ "اسے میرے کل پروگرام کا پتا کیسے چل گیا؟" میں نے خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔ "ہوسکتا ہے یہ بھی چھٹی کرنا چاہ رہا ہو۔ پھر تو بڑا مسئلہ ہوگا۔ نئی نئی نوکری ہے کون میرا کام دیکھے گا؟ مجھے کل جانا بھی ضروری ہے۔"

"یعنی تمھیں کل کے بارے میں کچھ پتا نہیں!" انور میری "ہیں" کا دوسرا مطلب لیتے ہوئے بولا۔ "میں تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ کل زبردستی کی چھٹی ہے اور تمھیں دفتر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ تمھیں علم ہوگا کہ، ابھی پچھلے دنوں ہمارے شہر میں کچھ بااثر شخصیتوں نے ایک لڑکی کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا اور پولیس ان کے خلاف کارروائی کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے، تو اسی سلسلے میں ایک سیاسی تنظیم کی کال پر مکمل ہڑتال ہے۔"

"یار یہ تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔" میں پریشان ہوگیا۔

"تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دفتر میں یہ پالیسی غیر سرکاری طور پر طے شدہ ہے کہ ہڑتال کی صورت میں ڈیوٹی پر آنے کا رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ تم نئے ہو، کہیں زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دفتر جانے کی کوشش میں اپنی جان خطرے میں نہ ڈال دو، اسی لیے تمھیں بتانے آگیا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"کل مجھے اسٹیشن جانا ہے۔"

"خیریت؟"

"یار کل میری منگیتر یعنی تمھاری مستقبل کی بھابی آرہی ہے۔"

"تو یوں کہونا۔" وہ ہنسا اور بولا۔ "مگر اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے......! انھیں تمھارے گھر کا پتا تو معلوم ہے نا! وہ لوگ خود ہی مینیج کرلیں گے۔"

"یار گھر کا پتا تو انھیں معلوم ہی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اکیلی آرہی ہے اور ایسی صورتِ حال میں اسٹیشن سے گھر تک اکیلی لڑکی کا آنا بڑی پریشانی والا معاملہ ہوجائے گا۔ عام حالات میں تو اور بات تھی۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" وہ بولا۔ "اچھا خیر کل اگر تھوڑی سی بھی گنجائش ہوئی تو میں تمھارے پاس آجاؤں گا اور دونوں گلیوں گلیوں نکل چلیں گے۔"

"یار کل کی صورتِ حال کا کچھ پتا نہیں، میں ایسا کرتا ہوں کہ آج رات نکل جاتا ہوں۔ رات وہیں اسٹیشن پر ہی گزار لوں گا۔"

"چلو پھر میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

"رہنے دو یار، تم کہاں خوار ہوگے۔"

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"اچھا! جیسے تمھاری مرضی۔"

انور تو چلا گیا مگر مجھے پریشان چھوڑ گیا۔ سو دو سو سے ذہن میں مچل رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسٹیشن پر تو میں چلا جاؤں گا مگر رات کہاں گزاروں گا۔ ویٹنگ روم میں یا نزدیکی ہوٹل میں۔ کہیں پولیس والے رات کو ویٹنگ روم وغیرہ تو چیک نہیں کرتے۔ خوامخواہ آوارہ گردی کے الزام میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔

"خیر رات تو گزر ہی جائے گی مگر اسٹیشن سے واپسی کا کیا ہوگا؟ کیا شام تک وہیں رہنا ہوگا۔" میں نے سوچا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس سیاسی تنظیم کے ارکان ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ گاڑیوں پر پتھراؤ اور ٹائر جلانا تو معمولی سی بات ہو گئی تھی، اب تو راہ چلتوں پر بھی فائرنگ ہونے لگی ہے۔ افغانستان کی بدولت ہر قسم کے اسلحے آرام سے ملنے لگے ہیں۔ "خیر کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔" میں نے یہ سوچا "اللہ تعالیٰ ضرور کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔"

"امی کل ہڑتال ہے اور میں رات کا کھانا کھا کر ہی اسٹیشن چلا جاؤں گا تاکہ شہلا کو کسی نہ کسی طرح گھر لا سکوں ورنہ اس اکیلی کے لیے تو بڑا مسئلہ ہوگا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اماں بی نے کہا۔ "مگر ہم رات بھر اکیلے رہیں گے۔ تمھارے ابو بھی نہیں ہیں۔"

"آپ ایسا کریں کہ پڑوس کے کسی بچے کو سلانے کے لیے بلا لیں۔"

رات کا کھانا کھاتے کھاتے 10 بج گئے تھے۔ ویسے بھی مجھے اسٹیشن جانے کی جلدی نہ تھی، جتنی دیر سے جاؤں گا اتنا ہی کم وقت انتظار گاہ میں گزارنا ہوگا لہٰذا رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہی گھر سے نکلوں گا۔

میں ابھی جانے کے لیے تیار ہی ہو رہا تھا کہ دو تین فائروں کی آواز سنائی دی، مجھے محسوس ہوا کہ جیسے یہ فائرنگ گلی میں ہی ہوئی ہے۔ میں جلدی سے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو مجھے پڑوسیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

"جلدی کرو کھڑکی دروازے بند کرو۔ ڈاکو آ گئے ڈاکا ڈالنے۔" اور پھر چاروں طرف کھڑکیاں دروازے بند کرنے کا شور گونجنے لگا۔

میں حیران و پریشان سا صحن میں کھڑا تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکو واقعی آئے بھی ہیں اور آئے ہیں تو کس گھر میں آئے ہیں کہ اماں بی نے جلدی جلدی تمام کھڑکیاں دروازے بند کرنا شروع کر دیئے۔

"امی یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے احمقانہ سا سوال کیا۔

"پڑوس میں ڈاکو آ گئے ہیں۔" وہ بولیں۔

"تو آپ اپنا گھر کیوں بند کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔"

"تم ان کی کیا مدد کر سکتے ہو؟ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ہتھیار ہے تمھارے پاس؟ لاٹھی ڈنڈے کا معاملہ ہوتا تو کوئی اور بات تھی۔ اَن دیکھی موت کے سامنے جانا حماقت ہوتی ہے، بہادری نہیں۔"

"واقعی!" میں نے سوچا۔ "اسلحے کے نام پر تو ہمارے گھر میں سبزی کاٹنے والی چھری ہی ہے اور وہ بھی کُند سی۔"

"چلو اندر یہاں سے۔" اماں بی وہیں کھڑا دیکھ کر بولیں۔ "فوراً اندر چل کے بیٹھو، میں صحن کی گرل بھی بند کر رہی ہوں۔"

وہ صحن سے چل کر اندر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکو واقعی بائیں طرف والے پڑوسی کے گھر میں موجود تھے اور وہاں سے فائرنگ اور جوابی فائرنگ کی آوازیں مجھے اور گھر والوں کو خوف زدہ کر رہی تھیں۔ پریشان اور خوف زدہ ہونے والی بات تو تھی کہ دونوں گھروں کے درمیاں چھوٹی سی دیوار تھی اور ڈاکو وہاں سے ناکام ہو کر دیوار پھاند کر ادھر بھی آ سکتے تھے۔ ناکامی کی بات پر، مجھے ڈاکوؤں کے دو واقعات یاد آ گئے جو میں نے حال ہی میں سنے تھے، یعنی ڈاکو کسی گھر میں ڈاکا ڈالنے گئے۔ سامان زیور اور نقدی وغیرہ لوٹنے کے بعد وہاں سے جانے لگے تو اس گھر میں موجود لڑکی نے کہا۔

"بھیا تم یہ سب لوٹ کر لے جا رہے ہو تو مجھے بھی گولی مارتے جاؤ۔ ان میں زیادہ سامان میرے جہیز کا ہے اور میرے سسرال والے یہ بات نہ مانیں گے کہ ہم لٹ گئے، وہ جہیز کے بغیر مجھے قبول نہیں کریں گے اور میرے باپ میں اب اتنی ہمت نہیں کہ وہ دوبارہ اتنا جہیز بنا سکیں۔ میں یوں جو گھٹ گھٹ کر مروں گی تو اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم مجھے گولی مار دو۔"

پتا نہیں کیسے یہ باتیں ان ڈاکوؤں کے دل کو لگ گئیں اور ان میں سے ایک نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے، لو یہ سب سامان پڑا ہے اور ہم جاتے ہیں۔" تو انھوں نے سب سامان وہاں چھوڑا اور تیسرے گھر جا کر ڈاکا ڈال دیا۔

دوسرے واقعے میں ڈاکو اسی گھر میں آ گئے جو ماہ ڈیڑھ ماہ پہلے ہی لٹ چکا تھا اور شروع کے پانچ سات منٹ کے ہنگامے کے بعد جب انھوں نے گھر والوں کو ڈرا دھمکا کر ایک کونے میں بند کر دیا اور چھوٹی چھوٹی چیزیں قبضے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میں لینے کے بعد گھر والوں سے کہا کہ زیور نکالو۔

"زیور اب کہاں؟" گھر والوں نے جواب دیا۔ "ایک ماہ پہلے تو تمھارے بھائی بند سب لوٹ کر لے جا چکے ہیں۔"

"کیا یہ صحیح کہہ رہے ہیں؟" ایک ڈاکو نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے استاد بات صحیح ہے۔ میں نے سنا تھا کہ دوسرے گروپ نے اس علاقے میں ڈاکا مارا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ یہی گھر ہو۔"

یہ بات سن کر ڈاکوؤں نے ان کی ایک ایک چیز واپس کر دی۔ بلکہ ان کے گھر میں آئے ہوئے ایک مہمان کی جیب سے جو پندرہ سو روپے نکالے تھے وہ بھی واپس کر دیے اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئے "باہر کا گیٹ بند رکھا کریں۔"

پڑوسیوں کے گھر سے ابھرنے والی ایک تیز چیخ نے مجھے پھر باہر کی صورتِ حال کی طرف متوجہ کر لیا۔ وہاں سے اب خوفزدہ سی روئی روئی ہوئی آوازیں آرہی تھیں۔

"ارے چابی کہاں ہیں؟"

"جلدی سے چابی لاؤ۔" کوئی ڈپٹ رہا تھا۔ "ہمیں مت مروا بھی دے رہے ہیں۔"

پھر دنادن دو تین فائر ہوئے اور آواز آئی۔ "اکبر صاحب آپ خیریت سے ہیں؟"

یہ سب باتیں سن کر میرا خون کھول رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرے پاس بھی اسلحہ ہوتا تو میں کم از کم ان کا مقابلہ تو ضرور کرتا۔ موت تو ایک دن آنی ہے۔ کیوں نہ بہادری سے حق کی خاطر جان دے دی جائے۔ مجھے اپنے محلے داروں پر بھی غصہ آرہا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی گھر میں اسلحہ ضرور ہوگا مگر وہ سب اپنے بلوں میں کبوتر کی طرح دبکے ہوئے تھے۔ صرف ایک واحد شخص تھا جو فائرنگ کر رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکنے کا ارادہ کیا تا کہ دوسری طرف کے حالات سے آگاہی ہو مگر پڑوس سے آئی ہوئی ایک گولی نے جب کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تو اماں کی چیخ اور بہن کی التجاؤں نے مجھے واپس آنے پر مجبور کر دیا مگر محفوظ جگہ پہنچنے پر بھی مجھے قرار نہ تھا۔ میں گھر میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے پڑوسیوں کی کیسے مدد کروں۔ مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آرہا تھا۔ "میرے گھر میں فون بھی نہیں ہے جو میں پولیس کو بلا لیتا" میں نے سوچا۔ پولیس کے نام پر میرے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا اور میں تیزی سے دوڑ کر اندر گیا کیونکہ مجھے یاد آگیا تھا کہ کل ہی تو میں اپنی بہن کے بچے کو سالگرہ کا تحفہ دینے کے لیے پولیس سائرن والی گاڑی لایا تھا۔ گاڑی نکال کر میں باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس پہنچا اور سائرن کی آواز کھول دی ساتھ ہی پڑوس کے گھر سے آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ "پولیس آگئی بھاگو۔" اور ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی کی آواز سنائی دی اور سکوت چھا گیا۔

خوف، دہشت کے اس ہنگامے کے بعد جب وہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے باہر نکلا تو اسے علم ہوا کہ جوابی فائرنگ اس پڑوسی کا کرائے دار اپنی سائیڈ سے کر رہا تھا اور اس فائرنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ بات صرف چھ چوڑیوں پر ٹل گئی تھی۔

مجھے یہ بھی علم ہوا کہ سائرن کی آواز سن کر ڈاکو کہہ رہے تھے۔ "پولیس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ ان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔"

باہر کھڑے ہوئے لوگ پڑوسی سے اظہارِ ہمدردی کے ساتھ ساتھ تبصرے بھی کر رہے تھے مگر میں صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ "صاحب میں آپ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہوں کہ آپ کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ کاش میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو صورتِ حال دوسری ہوتی۔"

"میاں صاحبزادے!" ایک صاحب طنزیہ بولے۔ "جن کے پاس ہتھیار تھے انھوں نے کیا کر لیا جو تم کچھ کرتے۔"

"بڑے صاحب! یہ تو اپنے اپنے حوصلے اور ضمیر کی بات ہے۔" میں بولا۔ "بہر حال میں کل ہی لائسنس حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دوں گا۔"

"ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔" ایک اور نے کہا۔ "تم کون سے جاگیردار، سرمایہ دار یا ڈرگ مافیا کے کارندے ہو۔ لائسنس والا ہتھیار رکھ کر خود کو مصیبت میں ڈالو گے۔ گولی کہیں چلے گی، ہتھیار تمھارا ضبط ہوگا۔ ہر تیسرے دن تو تمھیں تھانے جانا ہوگا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی اور کا معاملہ تمھارے گلے منڈھ دیا جائے۔ بلا لائسنس خرید لو، سکھی رہو گے۔"

"مگر بلا لائسنس تو مزید پریشانی کا باعث ہے کہ آدمی رکھ تو سکتا ہے چلا نہیں سکتا۔ پکڑے جانے کا خدشہ الگ۔"

"تو جنہوں نے نہیں چلائے ان کے پاس کون سا لائسنس تھا۔ یہ تو انھوں نے اپنی جان کی حفاظت کو اپنا حوصلہ بڑھانے کو رکھے ہیں۔ اپنی جان کو کوئی مسئلہ ہو تو شاید چلا بھی دیں گے۔"

Urdu Soft Books

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

''جو دوسروں کے لیے حوصلہ نہیں کرتا، وہ اپنا وقت پڑنے پر بھی بزدل ہی ہوتا ہے۔ اب اکرم صاحب نے بھی تو حوصلہ کیا۔ چاہے ہوائی فائرنگ ہی کی۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کا نقصان تو کم ہوگیا ناں۔''

''میاں اصل کمال تو تمھارا ہے۔ جو تم نے پولیس والا سائرن بجا دیا، ورنہ تو نہ جانے اور کتنا نقصان ہوتا۔'' دائیں طرف والے پڑوسی نے کہا۔

میں باہر سے اندر آیا اور والدہ کو تمام حالات سنانے کے بعد بولا۔ ''امی کافی دیر ہوگئی ہے۔ اب آپ کسی کو بلالیں تاکہ میں اسٹیشن چلا جاؤں۔'' مگر لگتا تھا کہ گزرے ہوئے چند منٹوں نے برسوں کا اعتماد ختم کردیا تھا۔ تحفظ کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ بے یقینی حاوی ہوگئی تھی۔ تبھی تو اماں بی نے جو بڑے حوصلے والی خاتون تھیں مجھے اسٹیشن جانے سے منع کردیا۔

''اب میں تمھیں اسٹیشن نہیں جانے دوں گی۔'' وہ بولیں۔ ''ڈاکو یہاں سے ناکام واپس گئے ہیں۔ ان کا کیا پتا، کہیں دوبارہ آجائیں اور اس دفعہ ہمارے یہاں ہی آئیں تو گھر میں ہم عورتیں کیا کریں گی؟''

''کرنا کیا ہے۔'' میں ماحول بدلنے کو مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''گھر میں جو ہوگا وہ دے دیجیے گا۔ ویسے بھی ہمارے یہاں کیا ہے، خالی ہاتھ ہی جائیں گے۔ بلکہ ایسا کریں پڑوس سے کچھ زیور وغیرہ نہ منگوالیں۔ کیونکہ سنا ہے ڈاکو خالی ہاتھ جانے کو برا شگون سمجھتے ہیں۔''

''چپ کرو۔'' اماں بی نے کہا۔ ''منہ سے بدفالیں مت نکالو۔''

''مگر وہ شہلا......'' میں نے اماں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔

''وہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ پڑھی لکھی سمجھدار بچی ہے۔ اللہ خیر کرے گا اور صبح انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سلسلہ اسٹیشن جانے کا ضرور بن جائے گا۔''

''بس بھیا میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔'' چھوٹی بہن نے ہاتھ پکڑلیا۔ ''مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

رات بھر میں سکون سے نہ سوسکا۔ آنکھ لگی بھی تو ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ ایک دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پھر ڈاکو آگئے ہوں اور باہر فائرنگ ہورہی ہے۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو دیکھا والدہ اور بہن ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ میں پھر جا کے کمرے میں لیٹ گیا۔ مگر فجر کی اذان پر میں اٹھ بیٹھا۔

''میں نماز پڑھ کر نکل جاتا ہوں۔ ابھی تو کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔'' میں نے سوچا اس وقت تک اماں بی بھی کافی حد تک نارمل ہوچکی تھیں۔ سو انہوں نے میری بات کی تائید کی اور ناشتا بنانے چلی گئیں۔

ناشتا کر کے میں جب گھر سے نکلا اور کچھ دور تک پہنچا تو دیکھا... ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ سڑک دور تک ویران نظر آرہی ہے اور سواری تو کیا کوئی شخص پیدل چلتا بھی نہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں گھر واپس چل دیا۔

''اچھا چلو پڑوسی سے گاڑی مانگ لیتا ہوں۔'' میں نے سوچا ''وہ یقیناً انکار نہیں کریں گے کیونکہ میں بھی ان کے کام آتا رہتا ہوں۔'' پڑوسی نے جاگنے میں کافی وقت لیا اور مسلسل بیل بجانے کے بعد جب وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکل کر گیٹ پر آئے تو مدعا سن کر بولے۔

''دیکھو جاوید میاں! عام حالات میں تم میری گاڑی

منقلب گردباد

وہ ہوا جس کا سب سے زیادہ دباؤ مرکز میں ہوتا ہے اور چاروں طرف بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہوائیں اندر سے باہر کی طرف چلتی ہیں۔ گرد باد کے مخالف رخ ہونے کی وجہ سے انہیں منقلب گرد باد کہا جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے یہ ہوائیں شمالی نصف کرے میں گھڑی کی سوئیوں کے مطابق اور جنوبی نصف کرے میں ان کے برعکس چلتی ہیں۔ یہ ہوائیں چونکہ اندر سے باہر کی طرف چلتی ہیں اس لیے خشک ہوتی ہیں اور بارش نہیں برسا سکتیں بلکہ مطلع صاف اور خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے اور سردیوں میں کم ہوجاتا ہے۔ پاکستان میں سردیوں میں کچھ دنوں کے لیے گرد باد چلتے ہیں۔ یہ گرد باد چونکہ خلیج فارس اور بحیرۂ روم سے اٹھتے ہیں اس لیے ان میں نمی ہوتی ہے اور یہ کوہ ہندوکش سے ٹکرا کر پاکستان میں بارش برساتے ہیں۔

مرسلہ: زویا برکاتی۔ کراچی

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

لے جاتے رہے ہو اور میں نے کبھی انکار نہیں کیا، مگر آج نہیں۔ آج تمھیں گاڑی دے کر مجھے گاڑی سے ہاتھ دھونا منظور نہیں۔"

"انکل کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی صبح ہے۔ میں خیریت سے اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور آپ کی گاڑی کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم ابھی بچے ہو۔" وہ بولے۔ "مجھے شہر کے تمام حالات کا علم ہے، اسی لیے کہہ رہا ہوں اگر میری گاڑی تباہ ہوگئی تو میں گیا کام سے کیونکہ میرا تو بزنس ہی گھومنے پھرنے کا ہے۔"

"انکل آپ کی گاڑی کو کچھ ہوا تو میں ذمے دار ہوں گا۔"

"پھر وہی بات، میاں اگر گاڑی چلی گئی تباہ ہوگئی تو ہفتہ دس دن تو گئے نا اس کو صحیح کرانے میں۔ یا اگر بالفرض تم مجھے نئی بھی لے دو تو وہ بھی ایک آدھ دن میں تو نہ مل جائے گی۔ لہٰذا میرے بزنس کا تو ہوگیا کباڑا اور پھر میں تمھیں وجہ بتاؤں کہ میں کیوں گاڑی نہیں دینا چاہتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ تمھیں علم ہے کہ بطور اسٹیٹ ایجنٹ مجھے تقریباً سارے ہی شہر میں گھومنا پڑتا ہے اور بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لیے مجھے شہر کے حالات سے آگاہی زیادہ ہے۔ لہٰذا آج کی یہ ہڑتال دراصل کسی کی بے حرمتی پر احتجاج نہیں ہے۔ یہ دراصل حکومت کے خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ ہے اسی لیے ان لوگوں نے یہ طے کیا ہے کہ سڑک پر گاڑی نام کی کوئی چیز نہیں چلنے دیں گے چاہے اس میں دو چار جانیں بھی چلی جائیں۔ لہٰذا میں تمھیں بھی یہ مشورہ دوں گا کہ باہر نکلنے کا خیال چھوڑ کر گھر میں بیٹھو کیونکہ یہ ہنگامہ مزید تین چار دن چلے گا۔"

میں وہاں سے بڑا دل گرفتہ سا گھر آیا۔ والدہ کو تمام صورتِ حال بتائی اور بولا۔ "گاڑی تو کوئی مل نہیں رہی۔ لہٰذا میں پیدل ہی اسٹیشن جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید رستے میں کوئی لفٹ دے دے ورنہ اُمید ہے کہ گاڑی کے آنے تک میں اسٹیشن پہنچ ہی جاؤں گا۔"

"جاؤ بیٹا! خدا کے حوالے۔" اماں بی نے کہا۔ "اسٹیشن پہنچ جاؤ تو حالات دیکھ کر ہی واپس آنے کی کوشش کرنا۔" آیت الکرسی پڑھ کر اماں مجھ پر دم کرتی ہوئی بولی۔

گھر سے نکل کر مجھے اندازہ ہوا کہ پڑوسی کی بات کس قدر حقیقت پر مبنی تھی کیونکہ کافی دور چلنے کے بعد بھی گاڑی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی، پھر بھی میں چلتا رہا اور جب ایک گلی کے نزدیک پہنچا تو مجھے ایک سفید کار آتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے لفٹ لینے کی کوشش کروں گا، مگر جونہی وہ کار نزدیک پہنچی۔ نہ جانے کہاں سے تین چار لڑکے اچانک نمودار ہوگئے اور انھوں نے گاڑی پر پتھراؤ شروع کردیا۔ کار والے نے اچانک اسپیڈ بڑھا کر اپنی گاڑی اس طرح لہرائی کہ وہ الٹتے الٹتے بچی مگر پھر بھی وہ پتھراؤ سے محفوظ نہ رہا۔ گاڑی کے نکلتے ہی وہ لڑکے بھی گلی میں غائب ہوگئے اور میں سڑک پر خوفزدہ سا تنہا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس ڈر سے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لوگ آ گئے تو کہیں مجھے بھی ہنگامہ کرنے کے الزام میں نہ پکڑ لیں، میں بھاگ کر نزدیکی گلی میں گھس گیا۔

اس حادثے کے بعد میں نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کی اور بجائے سڑک کے راستے جانے کے میں گلیوں گلیوں اپنا راستہ طے کرنے لگا، پھر بھی دو چار گلیاں طے کرنے کے بعد مجھے سڑک تو عبور کرنا ہی پڑتی تھی۔ مین روڈ سے گزرنا ہی پڑتا تھا۔

ابھی تین چار بلاک عبور کرکے میں مین روڈ کے نزدیک پہنچا ہی تھا اور اس خیال میں تھا کہ بھاگ کر تیزی سے سڑک کراس کروں اور سامنے گلی میں چلا جاؤں کہ اسی مین روڈ پر پولیس کی ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں سہم کر ایک مکان کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا تاکہ گاڑی نکل جائے تو میں سڑک کراس کروں مگر جیسے ہی گاڑی گلی کے نزدیک پہنچی اس پر دو اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ پولیس والوں نے بھی اپنی گاڑی تیزی سے گھمائی اور جوابی فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ میں گھبرا کر واپس بھاگا اور پناہ لینے کی کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"یہاں تو میرا کوئی واقف بھی نہیں۔" میں نے سوچا۔ "میں یونہی بھاگتا ہوا پولیس کے ہاتھوں مروں گا یا دہشت گردوں کے۔ میں نے بڑی بے وقوفی کی جو گھر سے نکل آیا۔ یا اللہ میری جان بچا۔"

یہی سوچتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ اچانک ایک مکان سے ایک لڑکے نے سر نکال کہا۔ "کہاں بھاگ رہے ہو؟ کیا مرنے کا ارادہ ہے؟ جلدی سے اندر آجاؤ۔"

فوراً ہی اس مکان میں گھس گیا اور لڑکے نے دروازہ بند کردیا تو تیزی سے دھڑکتا ہوا دل آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگا۔ میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں دو تین لڑکے لوڈو کھیل رہے تھے مگر اس وقت

www.urdusoftbooks.com

کھیلنا بند کر کے متجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔
میں نے انھیں اپنی تمام رام کہانی سنائی تو وہ بھی اس صورتِ حال پر افسوس کرنے لگے۔ ابھی میری داستان ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر فائرنگ کے ساتھ سائرن کی بھی آوازیں آنے لگیں، اسی لڑکے نے جس نے مجھے اندر بلایا تھا پھر باہر جھانکا اور اپنے ساتھیوں کو بتانے لگا۔ ''پولیس کی تین چار گاڑیاں آ گئی ہیں اور لگتا ہے انھوں نے علاقہ گھیرے میں لے لیا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔'' وہ لڑکا مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جو میں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر جھانکا اور تمھیں اندر بلا لیا، ورنہ اس وقت یا تو تم پولیس کی گاڑی میں پڑے مار کھا رہے ہوتے یا پھر تمہارے بارے میں ایدھی کو فون کیا جا رہا ہوتا۔'' وہ ہنسا۔

کوئی چار گھنٹے اداسی، خوف اور پریشانی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا اور باہر قانون کے محافظوں اور دہشت گردوں میں آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ مجھے اب باہر کی اتنی فکر نہ تھی بلکہ میرے ذہن میں ایک بڑا سوال ڈنک مار رہا تھا کہ گاڑی تو آ گئی ہوگی اور اب شہلا کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہوگی؟ خدا کرے وہ نہ آئی ہو۔ خدا کرے کسی وجہ سے اس کا پروگرام کینسل ہو گیا ہو۔

جب صورتِ حال کچھ معمول پر آئی تو ان لڑکوں کے مشورے پر میں نے آگے جانے کی بجائے گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا کیونکہ آگے تو ابھی بہت رستہ پڑا تھا جبکہ گھر واپسی کا رستہ آسان اور نزدیک تھا، ویسے بھی گاڑی کو اسٹیشن پر آئے ہوئے دو گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔

شام ہوتے ہوتے میں گھر پہنچا تو اماں بی نے مجھے تنہا پا کر متوحش نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی ناکامی کی تمام داستان سنا دی۔

رات کی خبروں میں حکومت نے ہڑتال کی خبر کو نا کام قرار دیا تھا مگر مجھے علم تھا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے اور چونکہ اس ہڑتال میں چند افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ لہٰذا ہنگامہ اور بڑھ گیا تھا اور ایک دن کی ہڑتال بڑھ کر تین چار دنوں کی ہنگامہ آرائی، توڑ پھوڑ اور خونریزی پر محیط ہو گئی تھی۔ پہلے ہی دن کا تجربہ اتنا ہولناک تھا کہ پھر میں نے گھر سے نکلنے کی ہمت نہ کی البتہ فون پر ریلوے والوں سے رابطہ ضرور کیا تھا اور ان کے پاس صرف ایک جواب تھا کہ ٹرین وقت پر آ گئی تھی۔ مسافروں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ اس ناکامی کے بعد شہلا کے گھر فون کر کے رابطہ کیا گیا تھا اور وہ لوگ بھی یہ خبر سن کر پریشان ہو گئے کہ شہلا وہاں سے روانہ ہونے کے بعد ابھی تک ان کے گھر نہیں پہنچی تھی۔

☆......☆

تیسرے دن حالات کچھ حد تک معمول پر آ گئے تھے میں نے پتا کر لیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر رک گئی ہو گی۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور روانہ ہو گیا۔ اِدھر اُدھر بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی تب میں نے خونچے والوں سے معلومات لینی شروع کی۔ ان سے جو باتیں معلوم ہوئیں اس کو اگر الفاظ کا پیرہن دوں تو واقعات کچھ یوں بنتے ہیں۔

وہ پڑھی لکھی اور عقلمند لڑکی تھی مگر اسٹیشن پر آ کر جب اچانک اسے اس صورتِ حال سے واسطہ پڑا کہ اسے ریسیو کرنے والا کوئی نہیں ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہاں سے شہر جانے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہڑتال کی وجہ سے اسے کوئی لینے نہیں آیا مگر یہ مسئلہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ یہاں سے جائے گی کیسے اور اگر یہاں سے نکل نہ سکی تو یہاں ٹھہرنے کا کیا انتظام ہو گا؟

اس طرح اور بہت سے لوگ بھی وہاں پریشان بیٹھے ہوئے اپنے اپنے انداز سے اس صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے کیونکہ اسٹیشن پر موجود قلیوں کا کہنا تھا کہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ ویسے بھی اسٹیشن سے اترتے ہی سب لوگ اپنے اپنے اہل و عیال سمیت اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے اور وہ تنہا پریشان سی کھڑی تھی۔ تنہا لڑکی کو دیکھ کر شہدوں نے اِدھر اُدھر منڈلانا شروع کر دیا اور یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ اور بھی پریشان ہو گئی تھی۔ آخر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک فیملی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تاکہ دیکھنے والے اسے بھی ان کا ایک حصہ سمجھیں اور ان غنڈوں سے نجات ملے مگر وہ کب تک وہاں کھڑی رہ سکتی تھی۔ آخر اس نے ریلوے کے افسران سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور وہاں سے گزرتے ہوئے سفید کوٹ میں ملبوس ایک ٹی ٹی کو روک لیا۔

''سنیں! آپ لوگ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟''

''بی بی آپ کا دماغ تو صحیح ہے؟'' وہ بولا۔ ''پی آئی اے والے ہی ٹرانزٹ مسافروں کا خیال کرتے ہیں۔ منزل پر پہنچانا ان کی بھی ذمے داری نہیں ہوتی اور پھر یہ تو غریب سا ریلوے کا محکمہ ہے۔''

''مگر ایسی ہنگامی صورتِ حال میں آپ انسانی ہمدردی کی

www.urdusoftbooks.com

بنیاد پر کم از کم مسافروں کو ٹھہرانے کا مسئلہ تو حل کر سکتے ہیں؟"

"اس کے لیے ویٹنگ روم ہے۔ آپ وہاں چلی جائیں۔"

کیا رات بھی وہیں بسر کروں گی؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"وہاں آپ مہینا بھر بھی ٹھہریں تو ریلوے کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ بولا اور آگے بڑھ گیا۔

تبھی ایک فیشن ایبل سی عورت اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ "سنو! میں کافی دیر سے تمھیں تنہا اور پریشان کھڑا دیکھ رہی ہوں۔ کیا کوئی لینے نہیں آیا؟"

"آپ سے مطلب؟" اس نے اسے گھورا۔

"ارے بھئی ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں کوئی ایری غیری عورت نہیں ہوں۔ مشہور سماجی کارکن ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے دیکھ لو۔" اس نے پرس سے کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔

"میں یہاں اپنے ایک عزیز کو لینے آئی تھی۔" وہ اسے کارڈ پڑھتا دیکھ کر بولی۔ "وہ تو آئے نہیں، شاید انھیں ہڑتال کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ سو میں گھر جا رہی تھی کہ تم پر نظر پڑی۔ تم دور ہی سے پریشان نظر آ رہی تھیں۔ میں اس خیال سے رک گئی کہ اکیلی لڑکی اور زمانہ خراب ہے۔ بہر حال اگر تم چاہو تو میں تمھاری مدد کر سکتی ہوں۔" بات کرتے ہوئے وہ لڑکی کو بھی دیکھتی جا رہی تھی جس کے چہرے کا تناؤ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

"مگر......"

"اگر مگر نہیں۔ تم اکیلی لڑکی ہو۔ یہاں کہاں وقت گزارو گی؟ اور ہڑتال کا پتا نہیں کب ختم ہو۔ کب کوئی تمھیں لینے آئے اور کب تم حفاظت سے گھر جاؤ۔ اسی خیال سے میں نے تمھیں پوچھ بھی لیا کہ خدانخواستہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو میں کل خدا کو کیا جواب دوں گی۔ اگر تم میری مدد لینا نہیں چاہتی تو تمھاری مرضی۔ میرا فرض ادا ہو گیا۔ میرے ضمیر پر اب کوئی بوجھ نہیں رہا۔" وہ بڑے غیر محسوس طریقے سے لڑکی کو اپنی جانب سے مطمئن کر رہی تھی۔ اس کے شکوک دور کر رہی تھی۔ "ویسے اگر تمھیں مجھ پر اعتبار نہ ہو کیونکہ ظاہر ہے ایک انجان عورت پر کون اعتبار کرے گا بلکہ میں بھی تمھاری جگہ ہوتی تو شاید اعتبار نہ کرتی۔" اس نے ایک اور حملہ کیا۔ "تو اس کا حل یہ ہے کہ تم کسی اگلی ٹرین سے واپس چلی جاؤ۔ میں تمھارے ساتھ اس وقت تک یہاں ٹھہر جاؤں گی جب تک تم گاڑی میں سوار نہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد میں چلی جاؤں گی۔"

اس کا یہ وار کبھی خالی نہیں جاتا تھا۔ کوئی شخص گھر سے کسی کام کے لیے نکلتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ کام پورا کر کے ہی لوٹے اور ویسے بھی یہ لڑکی کسی مجبوری کسی کام کے باعث ہی تنہا سفر کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" وہ اس کو چپ دیکھ کر بولی۔ "تم میری لڑکیوں کی طرح ہو۔" لڑکیوں کا لفظ اس نے ایک خاص انداز میں ادا کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں تمھیں ہڑتال ختم ہوتے ہی جہاں کہو گی چھوڑ آؤں گی بلکہ ایسا کرنا کہ وہاں سے فون کر کے میرے گھر کا پتا بتا دینا۔ ان کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور تم بھی آرام اور خیریت سے رہو گی، اگر تم واپس جانا چاہو اور پیسوں کا مسئلہ ہو تو شرم نہیں کرو، میں تمھیں رقم بھی دے سکتی ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔"

"نہیں نہیں، پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو نہیں جانتی اور......"

"نہیں جانتیں، تو میرے ساتھ مت آؤ۔" اس نے ناراض ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔ "تم اگر مجھے نہیں جانتیں تو ایک زمانہ مجھے جانتا ہے۔ بہر حال تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ واپس چلی جاؤ۔" اس نے جانے کے لیے قدم اٹھائے اور واپس مڑ کر فیصلہ کن حملہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو جا رہی ہوں مگر جاتے جاتے ایک اور بات تمھیں بتا دوں کہ میرے گھر میں، میں اور میری لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ مرد صرف چوکیدار ہے۔"

"اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" وہ اعتماد کے فریب کا شکار ہوگئی تھی۔ "مگر یہ تو بتائیں کہ باہر ہڑتال ہے، ہم یہاں سے کیسے جائیں گے۔"

"ہم جیسوں کے لیے کوئی ہڑتال نہیں ہوتی۔ ہڑتال تو غریب عوام کے لیے ہے۔" اس نے معنی خیز انداز سے جواب دیا۔

☆......☆......☆

اتنا تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ایک اکیلی لڑکی جس کا حلیہ بھی شہلا سے ملتا جلتا تھا وہ کسی فیشن ایبل عورت کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ اگر وہ شہلا ہی تھی تو اب تک تو......

......اسے گھر آ جانا چاہیے تھا مگر آج ہڑتال کو گزرے ہوئے پندرہواں روز تھا۔ ان پندرہ دنوں میں، میں کہاں کہاں نہ خوار ہوا تھا۔ کہاں کہاں میں نے شہلا کو نہ ڈھونڈا تھا۔ تھانوں میں، اسپتالوں میں، رکشا ٹیکسی ڈرائیوروں سے میں شہلا کا حلیہ

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

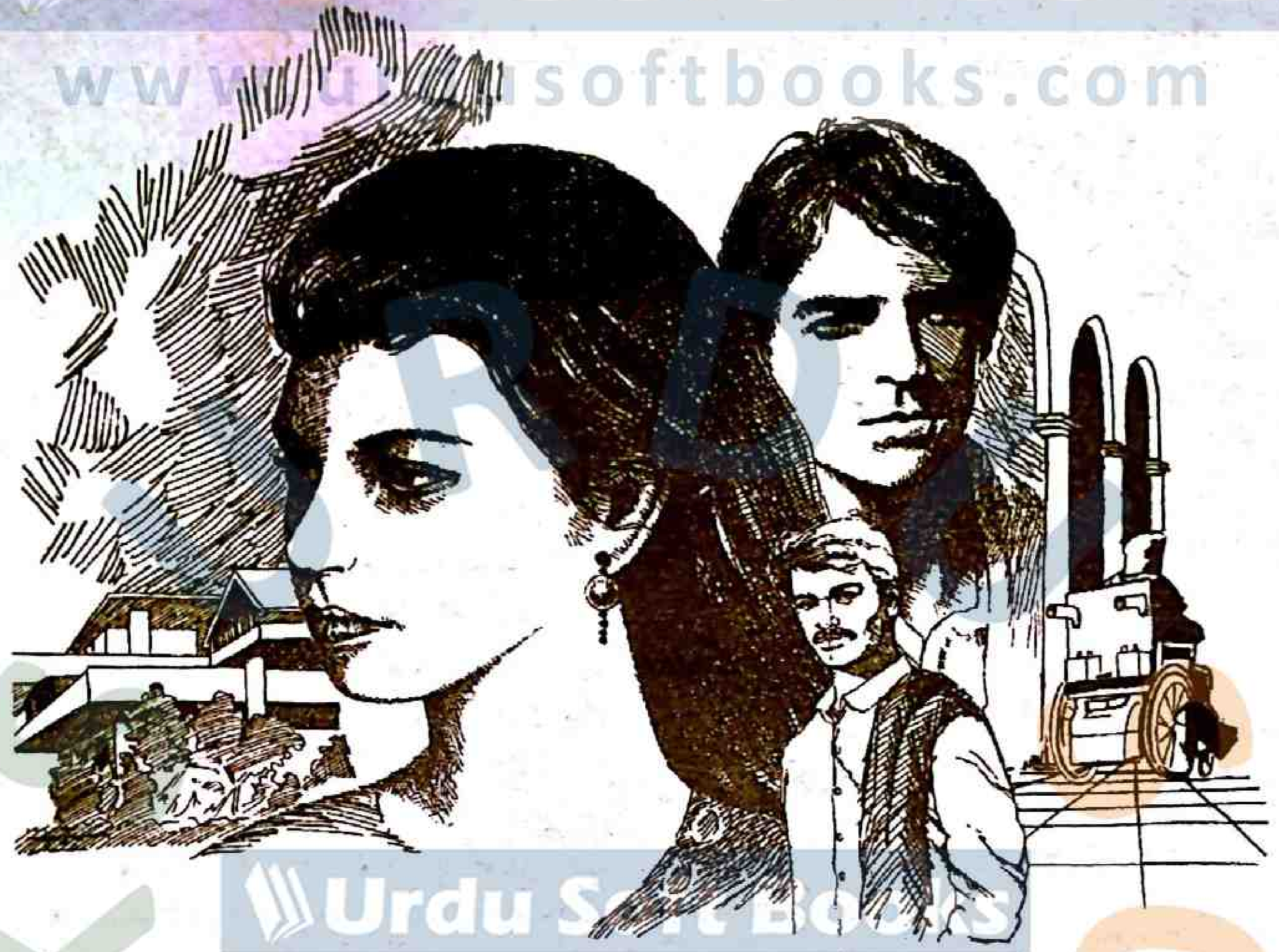

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سزا

محترمی عذرا رسول
السلام علیکم
میں ایک اور ناقابلِ فراموش واقعہ کو کہانی کی شکل دے حاضر ہوں۔ اس تحریر میں سبق ہی سبق ہے یہی وجہ ہے کہ اسے میں نے سرگزشت کے معیار کا سمجھا ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

شہناز احمد
(لاہور)

"میرا نام نورزمان ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میں ایک خانساماں ہوں۔ جو کہانی میں آپ کو سنانے والا ہوں۔ وہ بالکل سچی ہے۔ صرف کرداروں کے نام تبدیل کیے ہیں۔ تاکہ ان کی شناخت کو صیغۂ راز میں رکھا جاسکے۔" کہتے ہوئے نورزمان نے میری طرف دیکھا۔
میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا۔ "بلا جھجک پوری کہانی سناتے چلے جاؤ میں اسے بلا کم و کاست شائع کراؤں گی۔"

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”یہ کوئی چودہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اور میری بیوی حمیدہ ایک کوٹھی میں کام کرتے تھے۔ مالک کا نام صدیق احمد تھا۔ وہ ایک انجینئر تھے۔ ایک کنال پر بنا ہوا گھر تھا۔ جہاں وہ اپنی بیگم طلعت اور تین بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ جب میں نے اور حمیدہ نے کام شروع کیا تو دونوں بیٹیوں صائمہ اور عائشہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ صائمہ کینیڈا میں اور عائشہ دبئی میں رہائش پذیر تھیں۔ بیٹا نعمان ابھی کنوارہ تھا۔

وہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتا ہوا انجینئرنگ کر رہا تھا۔ نعمان جنہیں ہم چھوٹا صاحب کہتے تھے۔ بہت خوش شکل، اسمارٹ اور اچھے قد کاٹھ کے مالک تھے۔ مزاج میں گرمی اور ضد تھی۔ جس چیز پر ہاتھ رکھتے تھے وہ لے کر چھوڑتے تھے۔ وہ بیگم صاحبہ کی آنکھ کا تارا تھے۔ صدیق صاحب اگر کسی چیز کے لیے منع بھی کر دیتے تو وہ چھپ کر ان کو بتائے بغیر انہیں دے دیتی تھیں۔“

☆......☆......☆

چھوٹے صاحب کو پرانا ڈرائیور محمد دین کالج چھوڑنے جاتا تھا۔ واپسی پر وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ آتے تھے۔

”ابو مجھے اپنے لیے گاڑی چاہیے۔“ ناشتے پر انہوں نے یہ دھماکا کیا۔

صدیق صاحب کا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔ ”کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مجھے ڈرائیور کے ساتھ جانے میں شرمندگی ہوتی ہے۔ اور پھر واپسی کے لیے کسی نہ کسی دوست کی منت کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ یہ میرے لیے کس قدر شرمندگی کا باعث ہے؟“ انہوں نے باپ سے کہا۔ وہ تو دنگ رہ گئے۔

”دیکھو میاں! میں تقریباً ریٹائرڈ ہونے والا ہوں۔ تمام عمر عزت سے نوکری کر کے ہی اس قابل ہوا ہوں کہ تم لوگوں کو اچھی رہائش دے سکوں۔ گاڑی بھی میں نے بہ مشکل قسطوں میں خریدی ہے۔ تمہیں تو شاید اندازہ بھی نہ ہوگا۔ سوری۔ یہ خواہش میں آپ کی پوری نہ کر سکوں گا۔“ کرسی زور سے پیچھے گھسیٹتے ہوئے غصے سے انہوں نے کہا تو چھوٹے صاحب اور بیگم صاحبہ ذرا گھبرا گئے۔

دراصل صدیق صاحب ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے لیکن جب سال چھ ماہ میں غصے میں آتے تو ان سے خوف آتا تھا۔ اس دن بات آئی گئی ہوگئی لیکن اگلے دن بیگم صاحبہ نے دبی دبی زبان سے خواہش پر کم از کم غور کرنے کے لیے کہا تو بدک گئے۔ ”رزلٹ آنے کے بعد اسے کہو نوکری کے لیے اپلائی کرے اور پھر اپنے لیے جو مرضی چاہے خریدتا رہے۔“

”اس ملک میں نئے ڈگری یافتہ کو کون اتنا دے گا کہ وہ گاڑی لے سکے۔“ وہ منمنائیں۔

”تو ٹھیک ہے ملک سے باہر چلا جائے۔ وہاں اس کی ڈگری کی مانگ ہے۔ بہت سے نوجوان آج کل جا رہے ہیں۔ محنت کرنی ہوگی تو صاحبزادے کو ہوش آ جائیں گے۔“

یہ بات چھوٹے صاحب کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ آئیڈیا بے حد پسند آیا۔ غیر ملکوں میں نوکریاں کافی مل رہی تھیں۔ اب بس رزلٹ کا انتظار تھا۔

چھوٹے صاحب کا کافی اچھا رزلٹ آیا۔ بہت بڑی پارٹی دی گئی۔ صدیق صاحب کے ایک دوست سعودی عرب میں ایک شخص کو جانتے تھے۔ ان سے نوکری کی بات کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایک آدھ مہینے کے اندر پتا کر کے اطلاع کریں گے۔

چھوٹے صاحب نے تیاریاں شروع کر دیں۔ پاسپورٹ، نئے کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ جس دن ان کو نوکری ملنے کی خوشخبری ملی۔ خوشی کے مارے برا حال ہوگیا۔

جوں جوں جانے کا وقت نزدیک آ رہا تھا بیگم صاحبہ کا غم اور فکر کے برا حال تھا۔ وہ ان کے لاڈلے بیٹے تھے۔ جنہیں اپنا کوئی کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ کبھی گھر سے باہر نہیں رہے تھے اور اب یوں پورے ایک سال کے لیے؟ جگر کا ٹکڑا آنکھوں سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ تو دن میں کوئی دسیوں بار روتیں۔

☆......☆......☆

چھوٹے صاحب نے سعودی عرب پہنچ کر فون کیا۔ ماں سے بات کی، بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں تب ماں کو تسلی ہوئی۔ مجھے یاد ہے شروع شروع میں ان کے کافی فون آتے تھے۔ پھر کم ہوگئے۔ پھر ایک دن فون پر بالکل رونے والے ہوگئے۔ ”ابو...... میرا دل بالکل نہیں لگ رہا۔ باہر سائٹ پر اس قدر گرمی ہے کہ برداشت سے باہر ہے۔ یوں بھی تفریح کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔“

صدیق صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بیوی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

سے بات نہ کی، نہ کرائی۔ بس سمجھاتے رہے کہ نوکری کنٹریکٹ کی ہے۔ ایک سال کے اندر واپس آنا ناممکن ہے۔ بس تھوڑا صبر سے کام لو۔ شروع شروع میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ بعد میں دل لگ جائے گا۔ تنخواہ بھی اچھی خاصی مل رہی ہے۔'' دونوں میں کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ لیکن اب صدیق صاحب بھی پریشان رہنے لگے۔ بیٹے کے دل کا حال جان چکے تھے۔ خدا خدا کرکے وہ وقت گزرا۔ اس عرصہ میں بیگم صاحبہ نے بستر پکڑ لیا۔ چپ چاپ، گم صم سی رہنے لگیں۔ ایک دن میری بیوی حمیدہ سے کہنے لگیں۔

''میداں۔ تمہیں پتا ہے کہ میرا بیٹا بہت ارمانوں، دعاؤں سے مجھے ملا ہے؟ میری اوپر تلے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں تو سسرال والوں نے ناک میں دم کردیا۔''

''تین......!'' حمیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

کیونکہ ہمیں تو صرف دو کا پتا تھا۔

''ہاں! تین۔ جب میری تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو میری نند نے کہا کہ اس کا نام بشریٰ رکھ دیں۔ شرطیہ بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کے بعد۔'' وہ رکیں، گہرا سانس لیا۔ حمیدہ ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

''خیر! تیسری کا نام ہم نے بشریٰ رکھا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی دس ماہ کی ہوئی تو ماشاء اللہ بیٹھ تو سکتی تھی ہی کبھی کبھی چیزیں پکڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش بھی کرتی۔ میں اس کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ پھر ایک دن......'' بیگم صاحبہ بالکل خاموش سی ہوگئیں۔ نظریں جیسے خلا میں گاڑھ دیں۔ ''میں اس کو نہلانے کے لیے غسل خانے میں لے گئی۔ چھوٹا کپڑے دھونے والا ٹب تھا۔ اس میں نیم گرم پانی ڈالا اور اس میں تھوڑا سا صابن ڈال کر گھولا تو جھاگ بن گئی۔ بشریٰ کو اس میں بٹھایا۔ وہ بہت زیادہ خوش ہوکر جھاگ سے کھیلنے لگی۔ میں نے نیل پالش کی بند شیشی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ کلکاریاں مارتے ہوئے کھیلتی رہی۔ اندر میرے کمرے میں فون بج رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ میری بڑی پرانی دوست کا فون تھا۔ وہ کراچی سے اپنے ماں باپ کے گھر لاہور آئی ہوئی تھی۔ مجھے باتوں باتوں میں دھیان ہی نہ رہا کہ میری دس ماہ کی بچی ٹب میں اکیلی بیٹھی ہے۔ جب احساس ہوا تو لپک کر باہر آئی۔ بشریٰ کا منہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی۔ پریشان ہوکر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو میری پیاری بیٹی۔ لاڈلی بشریٰ مر چکی تھی۔''

اب بیگم صاحبہ نے باقاعدہ سسکیوں سے رونا شروع کردیا۔ ہم دونوں میاں بیوی کو بہت افسوس ہوا۔

''کیسے؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''میری نیل پالش کی بوتل پانی میں گری تو اس نے جھک کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پانی میں صابن کی وجہ سے پھسلن تھی وہ اپنا آپ سنبھال نہ سکی اور الٹے منہ پانی میں جا پڑی۔ ابھی باتیں کرنے کے قابل نہ ہوئی تھی۔ وہ غریب مجھے آواز بھی نہ دے سکی۔ منہ، حلق میں صابن والا پانی جاچکا تھا۔ یوں میری بشریٰ ہمیں چھوڑ گئی لیکن اگلے سال مجھے اپنا بھائی نعمان تحفے میں دے گئی۔ میرا قیمتی۔ لاڈلہ بچہ۔

☆......☆......☆

خدا خدا کرکے چھوٹے صاحب واپس آئے تو بدلے بدلے تھے۔ رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ ذرا سنجیدہ سے ہوگئے تھے۔ جسم بھی کمزور لگ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ رقم بچا کر ضرور لائے تھے۔ کتنی؟ میں نہیں جانتا۔

بیگم صاحبہ تو جیسے پھر سے جی اٹھیں۔ ''بھئی! میں اب اپنے بیٹے کو کہیں نہیں جانے دوں گی یہیں کہیں لاہور میں ہی نوکری ڈھونڈے۔''

صدیق صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ نوکری جلد ہی مل گئی۔ باہر کے ملک کا تجربہ تھا۔ چھوٹے صاحب کو بھی اچھا لگا کام پر جانا۔ ایک تو والد صاحب کی گاڑی مکمل اختیار میں آگئی تھی کیونکہ وہ ریٹائرڈ ہوچکے تھے اور دوسرے، جاب پر لڑکے لڑکیاں مل کر کام کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے تھے کہ چھوٹے صاحب خوب تیار ہوکر آفس جانے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو گھر میں گنگناتے بھی تھے۔ ماں باپ خوش ہوگئے۔

''میں اب اپنے چاند کی شادی کروں گی۔'' بیگم صاحبہ نے کہنا شروع کیا۔

خاندان میں لڑکیوں کی بھرمار تھی۔ بھائی کی تین۔ دیور، بہن کی بیٹیاں۔ ایک آدھ تو بہت پسند تھی۔ بیٹے سے رات کھانے پر ذکر کیا۔ دبی زبان سے بھائی کی بیٹی عفت کی بات کی تو وہ جیسے بدل سے گئے۔

''عفت؟'' وہ ذرا غصے سے بولے۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں نا امی؟'' انہوں نے پرانی عادت اپناتے ہوئے ماں سے بدتمیزی سے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

"کیوں۔ عفت میں کیا برائی ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "خوش شکل ہے۔ پڑھی لکھی ہے..... اور......"

"بس امی۔ پلیز۔ میں خاندان میں کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ نہ عفت سے، نہ ارم سے اور نہ باقی کسی سے۔" اس نے بہت بدتمیزی سے ہاتھ اٹھا کر ماں سے کہا۔

وہ بے چاری بجھ سی گئیں۔

"میں اپنی مرضی سے شادی کروں گا۔ اس لیے مہربانی کر کے اس کا ذکر دوبارہ نہ کریں۔"

کرسی کو پیچھے گھسیٹ کر انہوں نے ڈھیٹ پن سے کہا۔ ماں باپ منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

"اب چھوٹے صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ تقریباً ہر تیسرے روز گھر پر فون کرتے، میں فون اٹھاتا تو کہتے۔ نور زمان۔ امی سے کہنا کہ آفس کے دوست کھانے کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ میرا کھانے پر انتظار نہ کریں۔"

ماں باپ خوش ہو جاتے کہ بیٹے نے اچھے دوست بنا لیے ہیں سوشل ہو گیا ہے۔

وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے نئے موبائل پر گزارتے جو وہ اپنے لیے سعودی عرب سے لائے تھے۔

ایک دن میں سائیکل پر ڈبل روٹی لے کر آ رہا تھا کہ میں نے چھوٹے صاحب کو مارکیٹ کے پاس گاڑی روک کر جوس پیتے دیکھا۔ برابر میں ایک جوان لڑکی تھی۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

میں حیران رہ گیا۔ لڑکی کو زیادہ غور سے نہ دیکھ سکا۔ بس منہ چھپا کر گھر کی طرف چل دیا۔ بیگم صاحبہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ حمیدہ سے بات کی۔ وہ بھی ذرا پریشان ہو گئی۔

"جوان لڑکی کا کیا کام کسی غیر مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا۔" اس نے ذرا نفرت سے کہا۔

"بھئی بھاگوان۔ نئے زمانے کے امیر لوگ ہیں ہو سکتا ہے ساتھ کام کرتی ہو۔"

برا تو مجھے بھی لگا۔ لیکن بات بنائی۔

☆......☆......☆

آخر ہمارا شک سچ ثابت ہوا۔ چھوٹے صاحب نے ایک دن شام کے وقت ماں باپ سے میٹنگ کی۔

"امی۔ ابو۔" انہوں نے ذرا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ تھوڑے نروس سے لگ رہے تھے۔ "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے واقعی؟" اماں، ابا اس طرح اچھلے جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

"کون ہے لڑکی۔ کس خاندان سے ہے۔ کہاں دیکھی ہے۔؟" امی نے پوچھا۔

"وہ۔ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتی ہے۔ نام شازیہ ہے۔ بہت اچھی اور نیک لڑکی ہے۔" اب وہ بھی شیر ہو گئے۔ "خاندان بھی اچھا ہے۔ پڑھے لکھے سادہ سے لوگ ہیں۔ میں اس کو کافی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی اچھی لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ مذہبی ہو، ماڈرن نہ ہو تو بس اب سوچیے کہ سب خوبیاں اس میں موجود ہیں۔"

امی سوچ میں پڑ گئیں کہ اتنا کچھ اتنی جلدی پتا چل گیا؟ وہ دل میں کہنے لگیں۔

"آپ لوگ رضامند ہو جائیں تو وہ اپنے گھر والوں سے بات کر لے گی۔ آپ ان سے مل لینا۔ پتا کروا لینا اور پھر رشتے کی بات کر لینا۔ ایک آدھ دن میں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے۔

ماں باپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اللہ کرے لڑکی اچھی ہو، اچھے خاندان سے ہو۔ ہماری تو نسل اس سے چلے گی۔" امی نے ابو سے کہا۔

"آمین۔"

"تو پھر کب چلنا ہے بیگم؟" صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جب وہ کہے گا۔" اگلے دو دن خیریت سے گزر گئے۔

"امی میں آپ کو شازیہ کی امی کا فون نمبر دیتا ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں اور کوئی دن جانے کے لیے مقرر کر لیں۔" چھوٹے صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ "یہ لیں یہ نمبر ہے۔ ان کا نام مسز جمیل ہے۔"

بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں نمبر دے کر وہ باہر نکل گئے۔

کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے نمبر گھمایا۔

مسز جمیل صاحبہ سے بات ہوئی۔ ملاقات کے لیے اجازت مانگی جو فوراً مل گئی۔ اگلے دن کے سہ پہر کا وقت دیا گیا۔

چھوٹے صاحب کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

"آپ لوگ کیا لے کر جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کیک وغیرہ۔" انہوں نے ماں سے پوچھا۔

"عام طور پر تو رشتہ دیکھنے جاتے ہیں تو کچھ بھی لے کر نہیں جاتے۔" امی نے سادگی سے کہا۔

"کیا بات کر رہی ہیں امی۔ خالی ہاتھ جائیں گی آپ؟ اچھا بڑا سا کیک لے کر جائیں۔"

☆......☆......☆

شام پانچ بجے پہنچنے کے لیے انہیں پونے پانچ پر نکلنا پڑا۔ گھر ایسے علاقے میں تھا جس سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ محمد دین ڈرائیور ساتھ تھا۔

جب چھ بجے گاڑی واپس گیٹ میں داخل ہو رہی تھی تو چھوٹے صاحب کی بے چینی دیدنی تھی۔ صاحب اور بیگم صاحبہ گاڑی سے نکلے۔ ذرا چپ چپ سے تھے۔

"کیا ہوا۔ گھر آسانی سے مل گیا۔ کیسے لوگ تھے۔ لڑکی آپ کو کیسی لگی؟" سب سوالات ایک ہی سانس میں انہوں نے داغ دیئے۔

"ٹھہرو تو سہی۔ اندر تو آنے دو۔" امی نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

وہ ذرا ٹھٹک سے گئے۔ "کیا ہوا؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے آپ کو لوگ اچھے لگے؟"

"ٹھیک تھے۔"

"اور گھر بار؟"

"ٹھیک تھا۔" سادہ سا جواب آیا۔

"شازیہ ملی؟" بے چینی سے پوچھا گیا۔

"ملی۔ ٹھیک تھی۔" جوش کا فقدان تھا امی کے جواب میں۔

"اوہ۔"

"آپ مجھے پوری بات کیوں نہیں بتا رہے ہیں؟" تنگ آکر صاحب نے پوچھا۔

"بھئی اور کیا بتاؤں۔ تم نے ان کا گھر دیکھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ کیوں؟ چھوٹا سا ہے؟ شازیہ بے چاری مجھے بتا رہی تھی کہ ان کا گھر بہت بڑا نہیں ہے۔ اس کے والد کی حلال کی کمائی سے بن اتنا ہی بن سکا۔"

"گھر تو چھوڑو۔ بیگم۔ کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔"

صاحب نے بیٹے کے چہرے پر افسردگی دیکھ کر بات سنبھالی۔ "ہم نے ان کے والدین سے بات کی بھی رشتے کی۔ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔"

"اوہ۔ کتنا سوچ کر؟"

"بھئی۔ ہمیں کیا پتا میاں صاحبزادے۔ یہ ان پر منحصر ہے۔" صاحب اور بیگم کمرے میں چلے گئے۔ میں گھر سے باہر آیا جہاں ڈرائیور محمد دین گاڑی پر کپڑا مار رہا تھا۔ وہ کافی گندی ہو رہی تھی۔ شاید کافی دور سے آئی تھی۔

"یار نور زمان۔ یہ ہمارے چھوٹے صاحب کو کیا ہوگیا ہے؟" اس نے میرے قریب آکر ہولے سے کہا۔ پھر بتانے لگا کہ ان کا گھر کافی دور تھا۔ گلیاں بھی تنگ تھیں گھر چھوٹا سا تھا۔ ملازم بھی شاید کوئی نہ تھا۔ بی بی نے گیٹ بھی خود ہی کھولا تھا۔

"یار۔ میں نے اس بی بی کو صاحب کے ساتھ کافی دفعہ دیکھا ہوا ہے۔" محمد دین نے ذرا مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

"بات سن یار محمد دین۔ تم ذرا اس سے دور ہی رہو۔ ہمارا تمہارا معاملہ نہیں ہے یہ لوگ جانیں اور ان کے کام۔" میں نے دین محمد کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

یہ تو ابتداء تھی۔ دو دن بعد مسز جمیل نے فون کر کے کہا کہ ان کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

"جمیل صاحب تو کہہ رہے تھے کہ آپ لوگوں کا پتا تو کروالیں۔ لڑکے کا پتا کرلیں۔ لیکن میں نے کہا کہ نہیں جی۔ کوئی ضرورت نہیں مجھے تو لڑکی کی والدہ بہت پسند آئی تھیں۔" وہ جوش سے کہہ رہی تھیں۔

بیگم صاحبہ کا چہرہ زرد سے زرد ہوتا رہا۔ دل بیٹھ سا گیا۔ ہلکی سی اُمید تھی۔ کہ شاید ادھر سے انکار ہوجائے۔

☆......☆......☆

رشتہ پکا ہونے کی دیر تھی کہ زیور۔ کپڑے۔ چیزیں وغیرہ دھڑا دھڑ آرڈر ہونے لگیں۔ دونوں بہنوں کو اطلاع دے دی گئی۔ دونوں اپنے بچوں سمیت آگئیں۔ رات میٹنگ ہوئی۔ لڑکی والوں کے خاندان کے متعلق بحث ہوئی۔ ان میں صدیق صاحب جیسے خاندان کی طرح کوئی بھی چیز روایتی نہ تھی۔ کسی چیز پر اعتراض تو چھوڑو۔ تنقید بھی نہ ہوسکتی تھی۔ ذرا سی بات پر ہی چھوٹے صاحب کا پارہ... آسمان پر چڑھ جاتا۔

"ابھی سے اس کا یہ حال ہے تو بعد میں تو یہ بالکل جورو کا غلام بن کر رہ جائے گا۔" صائمہ بی بی ذرا فکر سے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

بولیں۔

آخر کار شادی کا دن آن پہنچا۔ سردی بے پناہ تھی۔ برات میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ بڑے صاحب وضع دار قسم کے لوگوں میں سے تھے کہ برات کے بجائے ولیمہ پر سب کو بلایا جائے تاکہ لڑکی والوں پر بوجھ نہ پڑے۔ شازیہ بی بی بہو بن کر گھر میں داخل ہوگئیں تو سب کو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ وہ بہت محبت، عزت سے سب سے پیش آتیں۔ صائمہ بی بی کی بڑی بیٹی نائلہ سے بھی جیسے فوری دوستی ہوگئی۔ وہ صرف پندرہ برس کی تھی۔ اسی طرح عائشہ بی بی کا چھوٹا بیٹا احسن جو صرف چار برس کا تھا وہ بھی مامی مامی کرنے لگا۔

''چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ لڑکی اچھی سبھاؤ والی ہے؟'' میں اور حمیدہ بی بی ریلیکس ہوگئے۔ دونوں دولہا دلہن شمالی علاقہ جات میں ایک ہفتہ کے لیے چلے گئے تو بچوں نے واقعی انہیں مس کیا۔

وہ لوگ واپس آئے تو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آئے۔ چھوٹے صاحب بھی بہت خوش تھے کہ ان کی پسند سب کو پسند آئی تھی۔

☆......☆......☆

شادی کے دو ماہ کے اندر کچھ عجیب سی باتیں رونما ہونے لگیں۔ چھوٹے صاحب بڑی بیگم سے بری طرح الجھتے۔ ہر بات پر نکتہ چینی، بحث۔ اس موقع پر شازیہ بی بی ان کو بہت نرمی سے سمجھاتیں۔ ''ایسے اپنی ماں سے بات نہ کریں۔ ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے۔'' وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر کہتیں۔

بیگم صاحبہ جی ہی جی میں سراہتیں۔ محبت پاش نظروں سے دیکھتیں۔ کتنی اچھی بچی ہے۔ وہ سوچتیں۔ میں خوامخواہ اس کے حق میں نہ تھی۔

یہ بات مجھے اور میری بیوی حمیدہ کو کچھ عرصے بعد پتا چلی کہ چھوٹے صاحب جب ماں سے بحث کرتے تو شازیہ بی بی ہی ان کے کان بھرتیں۔ وہ عادت سے مجبور بھڑک جاتے اور وہ ان دونوں کے درمیان صلح صفائی کرانے لگ جاتیں۔ ملازموں سے بدتمیزی۔ الزام تراشی ان کی عادت تھی۔ بیگم صاحبہ تو سب کے سامنے ان کی تعریفوں کے پل باندھتے نہ تھکتیں۔ لیکن ہم نے ان کو اچھی طرح جان لیا تھا۔

☆......☆......☆

پہلے سال ان کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ لیکن ہم نے نوٹ کیا کہ شازیہ بی بی، بیگم صاحبہ اور صدیق صاحب کو بچے کو زیادہ پکڑنے نہیں دیتی تھیں۔

''آپ چھوڑ دیں۔ وہ رو رہی ہے۔ آپ سے نہیں سنبھلے گی۔'' وہ بے بی فاطمہ کے متعلق کہتیں۔ زیادہ تر اپنے میکے میں بیٹھی رہتیں۔ پیدائش کا خرچ حالانکہ ان لوگوں نے کیا۔ دفتر سے گھر آنے کی بجائے نعمان صاحب بھی وہیں چلے جاتے۔ پھر رات دیر تک وہاں رکنے کے بعد گھر لوٹتے تو دونوں ماں باپ سو چکے ہوتے۔

انہی دنوں بڑی بیگم صاحبہ بیمار پڑ گئیں۔ پہلے تو بخار تھا۔ پھر شوگر کا مرض ہوگیا۔ جوڑوں کا درد، سب کچھ ہی تو جیسے ایک دم ہوگیا۔ وہ بستر سے لگ گئیں۔

ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی نہ تھا۔ میری بیوی حمیدہ سر وغیرہ دبا دیتی۔ لیکن اصل خدمت تو اپنی اولاد کرتی ہے۔ وہ کوئی نہ کر رہا تھا۔ صدیق صاحب بے چارے خود بھی کمزور ہو رہے تھے۔ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اب بیوی کی بیماری پر خرچوں پر خرچے۔ کبھی دبی زبان سے بیوی سے شکایت کرتے۔ ''دیکھو ذرا اپنے لاڈلے کو۔ تمہارے پاس دو پل بھی آ کر نہیں بیٹھتا۔ سسرال میں گھسا رہتا ہے۔''

''چلیں۔ ایسے نہ سوچیں۔ بچہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔'' متعدد بیماریوں نے آخر ان کی جان کو لے کر چھوڑا۔ چھ ماہ کے اندر۔ ایک رات اچانک طبیعت بگڑ گئی۔ صدیق صاحب نے بیٹے کو فون کیا۔ انہیں اسپتال لے جانا تھا۔ وہ سالے کے بیٹے کی سالگرہ میں تھے۔ جو شہر سے کافی دور کسی ہوٹل میں منائی جا رہی تھی۔

''آپ ایمبولینس منگوا لیں ابو۔ مجھے پہنچنے میں کم از کم ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔'' سرگوشی میں کہا گیا۔ کیونکہ پیچھے میوزک کا کافی شور تھا۔

صاحب کی گاڑی چھوٹے صاحب کے پاس تھی۔ پریشانی میں پڑوس میں جا کر میں خواجہ صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے گاڑی نکالی۔ بیگم صاحب کو ڈالا۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے کار میں دم توڑ دیا۔

صدیق صاحب تو جیسے صدمے سے سن سے رہ گئے۔ اسپتال والوں نے بھی تصدیق کر دی۔ ہمیں بھی بہت افسوس ہوا۔ بہت اچھی خاتون تھیں وہ۔ بے ضرر۔ نرم دل اور جلدی ہی اعتماد کرنے والی۔

چھوٹے صاحب ماں کے مرنے کے دو گھنٹے بعد پہنچے۔ وہ بھی صدمے سے گنگ رہ گئے۔ لیکن جو حیرت انگیز

بات تھی۔ وہ شازیہ بی بی کی تھی۔
بھٹر کیلئے کپڑے بدل کر سفید سادہ جوڑا پہن کر انہوں نے جو زارو قطار۔ دھواں دھار رونا شروع کیا۔ بین ڈالے۔ ''ہائے امی۔ ہائے امی۔ آپ کیوں چلی گئیں۔ ابھی تو میں نے آپ کی خدمت بھی نہ کی۔ اب فاطمہ کس کو دادو کہے گی۔'' وہ اتنی اونچی آواز میں بین ڈال رہی تھیں کہ پاس بیٹھی ہوئی خواتین بھی معترف ہو گئیں۔
''کتنی خوش قسمت تھی طلعت، کتنی فرمانبردار بہولی۔''
''دیکھو۔ کتنا پریشان ہو رہی ہے۔''
عائشہ بی بی تو آگئیں۔ صائمہ بی بی نہ آسکیں۔ کینیڈا دور جو بہت ہے۔

☆......☆......☆

بیگم صاحبہ کے جانے سے گھر میں عجیب سا خلا پیدا ہو گیا۔ صاحب بہت تنہا ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے ماں کا صدمہ تو بہت لیا لیکن بیوی اور چھوٹی بچی نے توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ان کے وہی ڈھنگ شروع ہو گئے۔
چھوٹی بی بی نے اب ذرا گھر کے سروسامان کو دیکھنا شروع کیا۔ مثلاً کھانے کے کمرے میں پڑے قیمتی، خوبصورت برتن۔ ڈیکوریشن پیس غائب ہونے لگے۔ ایک دن دیکھا تو ایک ڈبہ بند کر کے ٹیپ لگا رہی تھیں۔ میں اچانک آ گیا تو ذرا گھبرا سی گئیں۔
''نور زمان۔ یہ ڈبہ گاڑی کی ڈگی میں رکھ دو۔ احتیاط سے ڈبہ بہت وزنی تھا۔
مجھے اٹھانے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔ تو بولیں۔
''احتیاط سے پکڑو۔ برتن ہیں۔ ٹوٹ نہ جائیں۔'' ان کے منہ سے نکل گیا۔
میں ملازم آدمی۔ حیران۔ پریشان ہو کر رہ گیا۔ یہ نہ پوچھ سکا کہ اس گھر کے برتن کہاں جا رہے ہیں۔ بغیر اجازت کے۔
بڑے صاحب کی تنہائی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ نوکری بھی نہیں تھی کہ گھر سے نکل جاتے۔ پنشن لگ تو گئی تھی لیکن شاید زیادہ نہ تھی۔
گھر کے تمام اخراجات وہی اٹھاتے تھے۔ چھوٹے صاحب کی تنخواہ کہاں جاتی تھی۔ پتا نہ چلتا تھا۔ گرم موسم ہوتے ہی بجلی کے بل بھی بڑھنے لگے تو ایک دن چھوٹے صاحب سے کہنے لگے۔ بھئی خرچے بہت زیادہ ہیں۔ آپ ذرا ان میں اپنا تھوڑا سا حصہ ڈال دیں تو اچھا ہے۔''

جاوا

انڈونیشیا کا ایک اہم جزیرہ۔ رقبہ: 51024 مربع میل یا 132187 مربع کلومیٹر۔ اس میں کئی آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ آب و ہوا گرم اور ساحل غیر صحت بخش ہے۔ پہاڑ گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان میں ساگوان کی لکڑی بافراط پائی جاتی ہے۔ میدانی علاقہ زرخیز ہے۔ ربر، کافی، چائے، نیشکر اور تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ کپڑوں کی سجاوٹ کے باتک کے طریقے کے لیے مشہور ہے۔ جاوا دنیا کا گنجان آباد جزیرہ ہے اور صدیوں سے انڈونیشیا کا سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مرکز چلا آ رہا ہے۔ یہاں سے کونین، چینی، کھوپرا، ربر اور ساگوان کی لکڑی باہر بھیجی جاتی ہے۔ شمالی مشرقی جاوا میں تیل کے کنوئیں ہیں۔ گندھک، سونا اور فاسفیٹ بھی معمولی مقدار میں نکلتی ہے۔ اندرونی علاقے میں شیر، گینڈا، بن مانس، چیتے اور مختلف قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم انسان کا ابتدائی مسکن جاوا ہی تھا۔ ساحلی علاقے پر عرب اور چینی تاجر آباد ہیں۔ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن ان پر ہندو اور بدھ مت کا خاصا اثر ہے۔ سب سے بڑا شہر جکارتا ہے۔ یہ انڈونیشیا کا دارالحکومت بھی ہے۔ پہلے اس کا نام بٹیویا تھا۔ تیرہویں صدی میں یہاں مسلمان اور 1596ء میں ولندیزی آئے۔ 1619ء میں ولندیزوں نے یہاں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور بعد میں یہاں کے حاکم بن گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاوا جمہوریہ انڈونیشیا میں شامل ہو گیا۔
مرسلہ: نسیم زبیری۔ چنیوٹ

''ابو۔ کمال بات کرتے ہیں آپ بھی۔ میرے پاس فالتو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ہمارے اپنے اخراجات بہت ہیں۔ فاطمہ کا اسکول خرچ۔ پٹرول۔ پھر کبھی کبھی دوستوں کو کھانے پر لے کر جانا۔ سوری۔ میرے پاس تو بالکل بھی پیسے نہیں ہیں۔'' بہت غصیلے لہجے میں بدتمیزی سے انہوں نے کہا۔ اور چلتے بنے۔
بڑے صاحب بے چارے حیران رہ گئے۔

☆......☆......☆

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور شاید پوری زندگی /

نہ بھولے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شازیہ بی بی بڑے صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ چھوٹے صاحب دفتر گئے ہوئے تھے۔ میں نے گرم روٹی صاحب کو دی تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ''جاؤ دیکھو۔ نورزمان کون آیا ہے۔'' میں باہر نکلا تو باہر چوکیدار بل لے کر کھڑا تھا۔ بجلی کا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑا۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود میں نے نظر ڈالی تو دھک سے رہ گیا۔ عام دنوں سے دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ وہ ہی ہاتھ میں پکڑے پکڑے میں بے دھیانی میں اندر آیا۔ صاحب کھانا کھا رہے تھے۔

''نورزمان کون تھا۔'' صاحب نے کھانا کھاتے کھاتے پوچھا۔

''وہ چوکیدار تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''بل لے کر آیا تھا۔ بجلی کا۔'' میں نے ذرا رک کر کہا۔

''بجلی کا؟'' لاؤ دو مجھے دیکھوں کتنے کا ہے۔'' صاحب نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

''آپ پہلے کھانا کھالیں تو پھر۔'' میں نے بل ذرا پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں کھانا بعد میں کھاؤں گا۔ لاؤ دو بل مجھے۔'' میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بل آگے کیا۔ نظر کی عینک وہ لگا چکے تھے۔ نظر ڈالی۔

''کیا؟'' وہ جیسے بے یقینی سے بولے۔ ''پندرہ ہزار نو سواتی روپے؟''

شازیہ بی بی نے بھی کھانا روک کر ان کی طرف دیکھا۔ ''سنا تم نے۔ بل کتنا زیادہ آیا ہے۔'' ذرا غصے سے انہوں نے ان کو مخاطب کیا۔ ''میں تو یہ بل نہ دے سکوں گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غضب خدا کا میں نے ابھی اپنے کمرے کا اے سی تک آن نہیں کیا کہ بل زیادہ نہ آجائے۔ بے انتہا غصے سے بڑبڑاتے ہوئے صاحب نے کھانا یونہی چھوڑ دیا۔''

کرسی گھسیٹ کر پیچھے کی۔ ''بتا دینا صاحبزادے کو کہ یہ بل اتنا آیا ہے۔ جب وہ آئے تو فوراً میرے کمرے میں بھیجنا۔'' بے پناہ غصہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ لہجہ سخت تھا۔

''صاحب جی۔ آپ کھانا تو کھالیں؟'' میں نے آگے بڑھ کر ان سے کہا۔

''رہنے دو نورزمان! میری بھوک ہی مرگئی ہے۔'' افسردگی سے انہوں نے کہا۔ اپنے کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کرلیا۔

''ہوں۔ بل زیادہ آیا ہے تو ہمارا کیا قصور ہے؟'' بہت بدتمیزی سے شازیہ بی بی نے کہا۔ ''ہم تو خود اوپر جہنم کی طرح گرم کمرے میں وقت گزارتے ہیں۔ تمام رات ہم تینوں جاگتے رہتے ہیں۔ دماغ خراب ہوگیا ہے بوڑھے کا۔'' بات دبی زبان میں کہی گئی لیکن مجھے آواز سنائی دے گئی۔ بہت افسوس ہوا ان کے لہجے پر۔

''تم کیا یہاں کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ میرے لیے گرم پھلکا بنا کر لاؤ۔'' غصے سے مجھے کہا۔

میں کچن میں آگیا۔ ان کی بات پر غور کرنے لگا۔ وہ بالکل غلط کہہ رہی تھیں کہ ان کا کمرا گرم ہے۔ میں جب بھی انہیں اوپر جا کر کھانے کے لیے بلاتا تو کمرا باہر تک ٹھنڈا ہوتا۔ اے سی دن رات چلتا رہتا۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ باہر لگے ہوئے پائپ میں سے پانی نکلتا رہتا ہے۔

☆......☆......☆

شام ہوگئی۔ عام طور پر چھوٹے صاحب پانچ بجے تک گھر آجاتے تھے۔ اس دن نہ آئے۔ بڑے صاحب نے تین مرتبہ مجھ سے پوچھا۔ رات آٹھ بجے ان کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو چہرے پر خفگی اور غصہ عیاں تھا۔ سیدھا اوپر جانے لگے۔ تو بڑے صاحب نے اچانک دروازہ کھولا۔ اور باہر آگئے۔

''آگئے آپ؟'' ذرا طنز سے انہوں نے کہا۔

''آپ کو بیگم صاحبہ سے فون پر پتا تو چل گیا ہوگا کہ بجلی کا بل بہت زیادہ آگیا ہے۔'' انہوں نے بیٹے کے سامنے بل کرتے ہوئے کہا۔

''ابو۔ معاف کیجیے۔ میں صبح کا گیا ہوا اب واپس آرہا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دیں۔ بل کی بات بھی کرلیں گے۔'' بل باپ کے حوالے کرتے ہوئے بہت بدتمیزی کی اور بل پر نظر نہ ڈالی پھر دھڑ دھڑ کرکے اوپر چلے گئے۔ دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز آئی۔

بڑے صاحب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ حیران پریشان۔ تقریباً دو گھنٹے بعد نیچے آئے تو بیوی بچہ بھی ساتھ تھے۔ نہا دھو کر فریش ہو کر لیکن چہرے پر بہت غصہ عیاں تھا۔

''ہاں۔ اب بتایئے کیا بات کررہے تھے آپ؟''

www.urdusoftbooks.com

''میں تم سے بجلی کے بل کی بات کررہا تھا۔ اس دفعہ پہلے سے ڈبل آیا ہے۔ آخری تاریخ بھی تین دن بعد کی ہے۔'' بڑے صاحب نے وہیں میز پر پڑے بل کو ان کے سامنے لہرایا۔

''تو میں کیا کروں۔؟ بل کی ادائیگی میری سردرد نہیں ہے۔ یہ آپ کے کام ہیں۔'' بہت غصے۔ بدتمیزی سے جواب ملا۔

''میرے کام ہیں؟'' اب ان کی آواز میں بھی غصہ آ گیا۔ ''تم لوگ بجلی استعمال نہیں کرتے ؟''

''ہم نے کیا بجلی استعمال کرنی ہے۔ ہمارے کمرے میں ایک پرانا، بابا آدم کے زمانے کا اے سی لگا ہوا ہے۔ جس سے ٹھنڈی ہوا تو کیا آتی ہے گرم ضرور آتی ہے۔ ہم تینوں تمام رات اس جہنم میں جاگ کر گزارتے ہیں۔ ہاں البتہ آپ کے پاس تمام سہولیات ہیں اے سی، فریج، کولر۔ پنکھے۔'' بہت نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے ابھی تک اپنے کمرے کا اے سی آن نہیں کیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بل میری استطاعت سے زیادہ آئے گا۔ میرا خیال ہے اب سے تم کم از کم آدھا بل ضرور دو۔ میری پنشن میں اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔''

''آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ کیا بات کررہے ہیں آپ۔ میں آدھا بل پے کروں۔ پہلے ہی اپنی بچی اور بیوی کا مشکل سے خرچا برداشت کرتا ہوں۔'' بدتمیزی اور گستاخی کی حد پار ہو چکی تھی۔ ''میرا اپنا باپ مجھے پاگل بنارہا ہے۔ مجھ سے آدھے پیسے مانگ رہا ہے۔'' اپنی بیگم صاحبہ کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''بکواس بند کرو نعمان۔ حد سے نہ بڑھو۔ کہیں میرا ہاتھ نہ اٹھ جائے۔'' بڑے صاحب کو میں نے اتنا مشتعل کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کا ہاتھ واقعہ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

''آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے؟'' وہ خطرناک حد تک نزدیک آ گئے۔

''بس کریں۔ نعمان پلیز۔'' شازیہ بی بی نے خاوند کو کندھے سے پکڑ کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ''چلیں۔ بات ختم کریں۔''

''بات ختم تو یوں ہوسکتی ہے کہ یہ مجھ سے کبھی بھی کسی قسم کی مالی مدد کا ذکر نہ کریں۔'' بڑی نفرت سے کالر جھاڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''نور زمان۔ ہم کھانے کے لیے باہر جارہے ہیں۔ ہو گیا۔

''ٹھہرو جان! ذرا مجھے ان سے بات تو کرنے دو۔ بیوی کو ایک طرف دھکیل کر وہ باپ کی طرف پلٹے جن کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

''آپ۔ آپ ابو اتنا گرسکتے ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' انتہائی بدتمیزی سے وہ باپ کے قریب آ گئے۔ لگتا تھا کہ ہاتھا پائی کا ارادہ ہے۔

''یہ بکواس کررہی ہے نعمان۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو؟ اپنے باپ کو۔ وہ ایسی گھناؤنی حرکت کرسکتا ہے؟'' انہوں نے دکھ اور غصے سے کہا۔

''میری بیوی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ ایسی بات کیوں کہے گی۔ جس میں صداقت نہ ہو؟ جھوٹے آپ ہیں۔''

''میں نے اسے کہا تھا کہ آپ سے کہہ دے کہ ہمارے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ وہ بے چاری پہلے ہی ڈری ہوئی تھی کہ آپ اسے ڈانٹیں گے۔ میں نے بھیجا تھا آپ کے پاس۔ اور آپ نے کیا کیا؟'' انتہائی نفرت بھرے لہجے میں انہوں نے کہا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' وہ کانپ رہے تھے۔ ''میں کمرے میں آرام کررہا تھا اس نے دستک کے بغیر دروازہ زور سے کھول دیا۔ میں گھبرا گیا پوچھا کیا بات ہے تو کافی بدتمیزی سے کچھ پیسوں کی بات کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ باہر جاؤ.....'' وہ رکے۔ ''میں نے کہا اپنے میاں کو بھیجو وہ ہی مجھ سے بات کرے گا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ میں تو اسے چھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' بہت غصے اور افسوس سے انہوں نے کہا۔

اس عرصہ میں شازیہ بی بی اوپر جا چکی تھیں۔ ''تم اس کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لو۔''

''مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کی ہر بات پر یقین ہے۔ افسوس تو مجھے آپ پر آرہا ہے۔ گھن آرہی ہے۔ آپ کے بظاہر نیک وجود سے۔ اُف۔ میں تو اب اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ میری تو ایک بیٹی بھی ہے۔ اگر آج آپ نے میری بیوی کو نہیں بخشا تو ہوسکتا ہے کل میری بیٹی کو بھی نہ بخشیں۔'' اس قدر بدتمیزی اور گستاخی سے انہوں نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا اور دھپ دھپ کرتے اوپر چلے گئے۔

''نعمان۔ میری بات سنو۔ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

سراسر بکواس۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ صدمے سے گر رہے تھے۔ میں نے جلدی سے تھاما۔

''نورزمان۔ اللہ گواہ ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں؟'' وہ صوفے پر ڈھے سے گئے۔ رنگ پیلا پڑگیا۔ ماتھے پر بے تحاشا پسینا آگیا۔

میں جلدی سے پانی لے کر آیا۔ پلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بے چارے یوں ہی نڈھال پڑے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد چھوٹے صاحب اپنی بیگم اور بچی کے ساتھ نیچے اترے۔ تین چار کپڑوں کے بیگ سیڑھیوں سے نیچے دھکیلتے ہوئے۔

''ہم جارہے ہیں۔ کبھی نہ آنے کے لیے؟'' انہوں نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے لہجے میں باپ سے کہا جو نقاہت کے باعث آنکھیں بھی نہ کھول سکے۔

☆......☆......☆

ان کو گئے ہوئے تین چار دن ہوئے تھے۔ صاحب بستر پر پڑ گئے۔ دیوانوں کی طرح مجھے بلا کر بار بار یہی بات دہراتے رہے۔ کہ وہ سچے ہیں۔

میں اور حمیدہ بھی یہی سوچتے کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ وہ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ مجھے ان کے گھر بارہ سال ہوگئے تھے۔ اتنا تو مجھے بھی پتا چل گیا تھا کہ یہ سب ایک گھناؤنا ڈراما تھا۔ گھر سے الگ ہوجانے کا۔

میں نے ان کے سسرال کے نمبر پر فون پر بات کرنی چاہی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

صاحب کے حالات خراب سے خراب ہورہے تھے۔ ہم میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ چھوٹی بی بی کا نمبر ڈھونڈ کر دبئی فون کرنا چاہا نمبر کنیکٹ ہی نہ ہوسکا۔ برابر والے پڑوسی کو بلا کر لائے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔

''بے پناہ پریشانی اور اسٹریس ہے۔'' انہوں نے کہا۔ دوائیں لکھ کر دیں۔ میرے پاس چھوٹے صاحب کا موبائل نمبر تھا جب بھی گھماتا جواب آتا کہ اس نمبر سے بات نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے نمبر بدل لیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کریں۔ دس دن اسی طرح گزر گئے۔ گیارہویں دن بی بی کا نمبر دبئی میں مل گیا۔ وہ تو بے حد پریشان ہوگئیں۔

''نورزمان! میں فوراً آرہی ہوں۔'' تیسرے دن وہ بے چاری پریشان حال اکیلی بچوں کو چھوڑ کر آگئیں۔ باپ

انتظار نہ کرنا۔'' بچی کو گود میں لیتے ہوئے انہوں نے بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر لگی ہوئی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گئے۔

''یہ بجلی کا آدھا بل تو آپ کو ہر حال میں دینا ہوگا میاں صاحبزادے۔ میرے پاس اس وقت بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اگر کل کلاں کو بجلی کٹ گئی تو مجھے نہ کہنا۔'' بہت اونچی آواز سے صاحب نے ان کو پکار کر کہا۔ انہوں نے سنایا نہیں؟ میں نہیں جانتا۔

☆......☆......☆

چھٹی کا دن تھا۔ میں باورچی خانہ میں آکر چائے کا پانی رکھ رہا تھا۔ بڑے صاحب ابھی اپنے کمرے میں ہی تھے۔ میں نے دیکھا کہ شازہ بی بی تیز تیز قدموں سے صاحب کے کمرے میں جارہی ہیں۔ اچانک مجھے ان کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ میں دھک سے رہ گیا۔ ذہن میں آیا کہ کہیں بڑے صاحب خدا نہ کرے انتقال نہ کر گئے ہوں۔

''پلیز انکل۔ مجھے نہ ٹچ کریں۔ میں آپ کی بیٹیوں کی طرح ہوں۔ چھوڑیں مجھے۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے ہانپتے ہوئے نکلیں۔

میں بھی کچن سے باہر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ حیران، پریشان۔

''نعمان۔ نومی نیچے آؤ۔'' انہوں نے چیختے ہوئے چھوٹے صاحب کو پکارا۔

بڑے صاحب اب باہر آچکے تھے۔ ''یہ کیا بکواس کررہی ہو تم۔'' نفرت سے انہوں نے کہا۔

دو۔ دو، تین تین سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چھوٹے صاحب نیچے آگئے۔ ''کیا ہوا میری جان۔ کیا ہوگیا؟'' وہ لپک کر بیوی کو تھامنے لگے جو ان کے ہاتھ لگتے ہی جھول سی گئیں۔

''آپ کے ابا نے۔ مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔'' شدت سے روتے ہوئے انہوں نے اپنے میاں سے کہا۔

''کیا ہوا۔ کیا؟'' نفرت سے بھرپور نظر بوڑھے باپ پر ڈالی۔ جواب تھرا سے گئے تھے۔

''انہوں نے مجھے ایسی جگہ چھوا جو میرے لیے باعثِ شرم ہے۔ میں مرجاؤں گی لیکن اب یہاں نہیں رہوں گی۔ جہاں میری عزت تار تار ہوسکتی ہے۔'' سسر کی طرف اشارہ کرکے یہ گھناؤنا الزام انہوں نے لگایا۔ تو میں بھی پاگل سا

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

آخری دموں پر تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا بیٹا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ دہرا رہے تھے۔

"کیا ہوا تھا۔ نورزمان۔ بتاؤ مجھے۔" وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھیں، میں کیا بتاتا۔ تھوڑا بہت اٹک اٹک کر بتایا۔

"پاگل ہے وہ لڑکی۔ کمینی۔ ایسی حرکت میرا باپ کبھی نہیں کرسکتا اور وہ ہمارا بھائی۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر۔ ایسے لڑکوں پر جن کو دو تین سال میں بیوی اتنی عزیز ہوجاتی ہے کہ ماں باپ پر بھروسا نہیں کرتے۔ ان کی غلط سلط بات کا یقین کرلیتے ہیں۔"

"اللہ اس کو غارت کرے۔ اگر میرے باپ کو کچھ ہوگیا تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" رو رو کر وہ باپ کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ اسی شام صدیق صاحب کا انتقال ہوگیا۔

وہ اپنے کردار پر لگے ہوئے دھبے کو برداشت نہ کرسکے اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ہمارے لیے بھی یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ کسی نے نعمان صاحب کو باپ کی وفات کا بتادیا تھا۔ وہ بھی جنازے پر آئے تو غم سے بے حال تھے۔ بیوی بچی کو نہ لائے۔ بہن کے نزدیک روتے ہوئے بڑھے۔

"خبردار۔ مجھ سے دور رہو میرے باپ کے قاتل۔ جاؤ اپنی چہیتی کے پاس۔ تم نے میرے باپ کو مار دیا بدبخت۔ ایسا گھناؤنا الزام اپنے بوڑھے باپ پر؟ لعنت ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں ایک لڑکا ضرور دے اور وہ بھی بالکل تمہاری بیوی اور تمہاری طرح ہو۔ بے حیا۔ بدکردار۔ نافرمان۔" ہسٹریائی انداز میں عائشہ بی بی بھائی کو کہہ رہی تھیں۔

رشتہ داروں نے بیچ میں پڑ کر چپ کرایا۔ وہ سر جھکا کر چلے گئے۔

اسی دن ڈرائیور دین محمد نے مجھے بتایا۔ "نورزمان۔ میں بہت دنوں سے یہ بات سوچ رہا تھا کہ تمہیں کہوں یا نہ کہوں لیکن میرا خیال ہے کہ کہہ دوں۔" ہم دونوں قبرستان سے واپس آئے تھے۔ بھاری دل کے ساتھ۔

"یاد ہے وہ دن جب چھوٹے صاحب شازیہ بی بی اور بچی کو لے کر غصے سے گھر سے باہر نکلے تھے؟ مجھے گاڑی نکالنے کو کہا۔ سامان ڈگی میں رکھوایا اور پھر مجھے اپنے سسرال کی طرف گاڑی موڑنے کو کہا۔ ابھی تھوڑی دیر چلے تھے تو شازیہ بی بی نے شوہر کو لگاوٹ سے کہا۔ "کیوں کیسا تھا میرا پلان۔ میری ایکٹنگ" وہ بہت کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

"بھئی مان گئے۔ تمہاری اداکاری پر تو انعام ملنا چاہیے۔" وہ بھی اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "تھوڑی دیر کے لیے تو میں بھی گھبرا گیا تھا۔ تمہاری چیخوں کی آوازیں سن کر۔"

"بھئی! اور کیا طریقہ کیا جاسکتا تھا۔ اس منحوس گھر سے نکلنے کا۔ خرچا دو، خرچا دو۔" وہ بہت بری شکل بنا بنا کر کہہ رہی تھیں۔ میں گاڑی چلاتا رہا۔

"وہ تو بے چارے سو رہے تھے مجھے ایک دم کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ جب میں نے کہا کہ ہم ابھی بل نہیں دے سکتے تو انہوں نے ہاتھ سے ذرا غصے سے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں باہر چلی جاؤں اور تمہیں بھیجوں۔ بس مجھے غصہ آگیا۔ اور باقی کی کہانی تو آپ جانتے ہی ہیں۔" اس نے ایک عجیب سا قہقہہ لگایا۔

یقین کرنا۔ مجھے کراہیت سی شروع ہوگئی اس کی شکل دیکھ کر۔

"اب جنازے پر کیا کرنے آیا ہے۔ اس کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ چلے گئے ہیں۔ ویسے یار نورزمان ایک بات ہے۔ میری تین بیٹیاں ہیں اور ہر وقت اپنی بیوی کو اپنی قسمت کی خرابی کی شکایت کرتا ہوں کہ بیٹا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت سے مسئلوں سے بچالیا۔"

☆......☆

"بی بی جی" نورزمان یہ کہتے ہوئے رو دیا۔ "آپ سمجھ رہی ہوں گی کہ کہانی ختم ہوگئی۔ نہیں۔ کہانی تو بعد میں شروع ہوئی۔ دبئی والی باجی نے بنگلا فروخت کردیا اور تمام پیسے رفاہی ادارے کو دے دیے۔ میں نے ایک دوسرے بنگلے میں نوکری کرلی۔ پھر آپ کے پاس آگیا۔ رات میں آپ جس برات میں مجھے بھی لے گئی تھیں وہاں میں نے چھوٹے صاحب کو دیکھا۔ کس بے چارگی سے وہیل چیئر پر پڑے تھے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ دو ماہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور بیوی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ آپ کی وہ دوست جن کی شادی میں ہم گئے وہ ترس کھا کر اپنے ہاں لے آئی ہیں۔ یہی سب دیکھ کر میں رات سے مسلسل رو رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

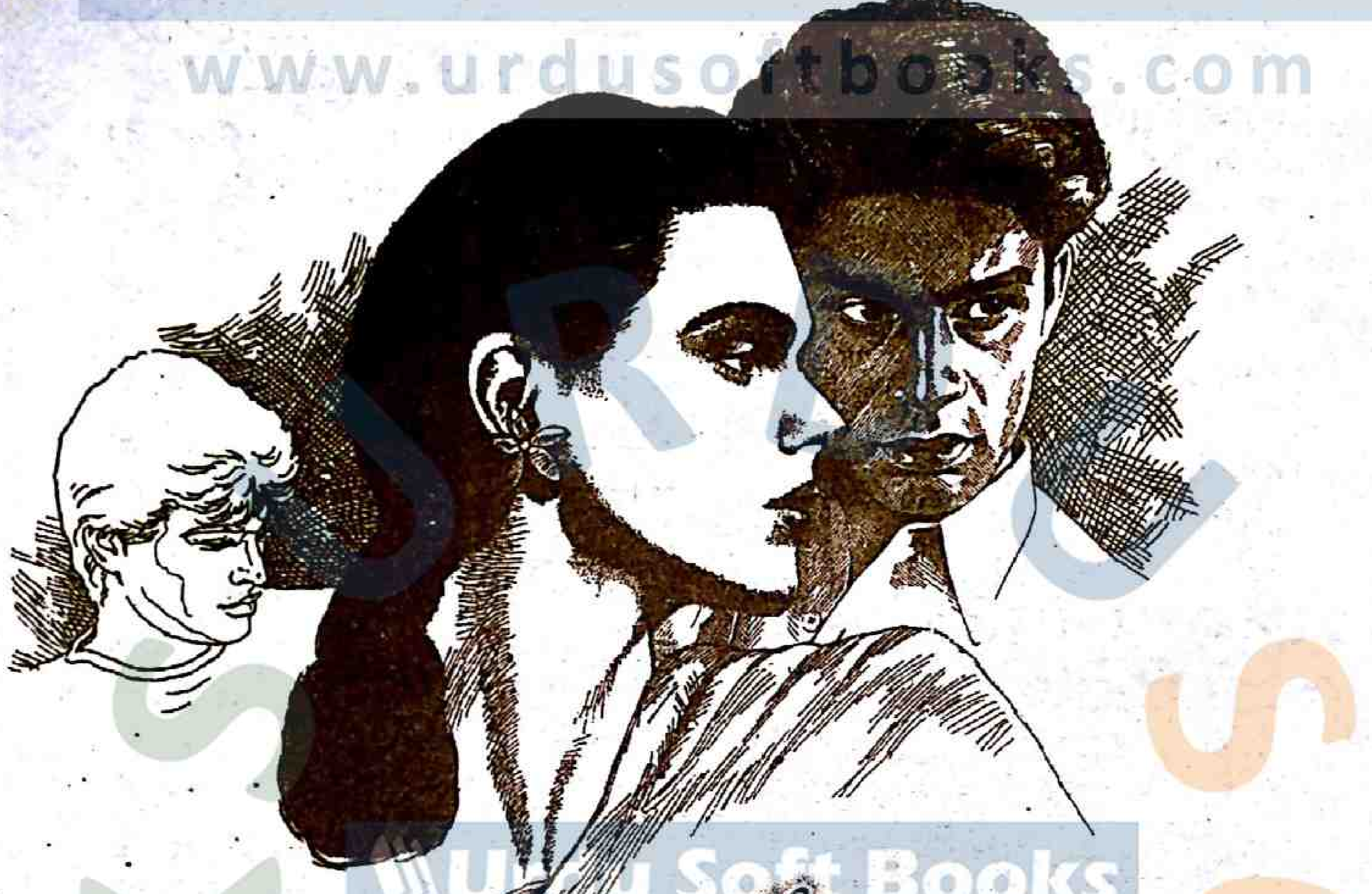

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

صحیح راستہ

محترم مدیر

السلام علیکم! ایک ایسی روداد ارسال کررہاہوں جس کا ایک کردار میں خود بھی ہوں بلکہ اصل ہیرو ہی میں ہوں، اگر میں عقل مندی سے کام نہ لیتا تو شاید وہ کچھ ہو جاتا جو عادل چاہتا تھا۔ ویسے اس کہانی کو نیا اختتام دینے کا سہرا میری بیگم کے سر ہے۔ اس نے ہی یہ راہ سجھائی تھی۔

اسلم فاروق

(حیدر آباد)

رات کا وقت، شاید بارہ سوا بارہ بجے ہوں گے۔

دروازے کی گھنٹی نے چونکا دیا تھا۔ کون ہو سکتا تھا۔ بیوی برابر میں سوئی ہوئی تھی۔ دو دنوں سے اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ میرے پاس عام طور پر اتنی رات گئے کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔ بہرحال جو بھی تھا، ٹل جانے کے ارادے سے نہیں آیا ہوگا۔ دوبارہ بجنے والی گھنٹی یہی بتا رہی تھی۔

میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

”کون ہے بھائی۔“

”یار میں ہوں عادل۔“ باہر سے میرے دوست عادل کی آواز آئی۔

عادل کا اتنی رات گئے آنا حیرت کا سبب تھا۔ بہرحال میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست تھا۔

اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آرہی تھی جو کچھ یوں تھی ایک صاحب نے رات گئے اپنے دوست کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں کچھ دیر لگی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو صاحب خانہ اس شان سے کھڑا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی دوسرے ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی تھی اور خود اس کے پیچھے اس کی کنواری بہن حجاب میں کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ''دیکھو کسی کا اتنی رات گئے کسی کے دروازے پر دستک دینے کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ نمبر ایک پیسوں کی ضرورت ہے۔ تو اس کے لیے اشرفیوں کا ایک توڑا لے آیا ہوں۔ جاؤ لے جاؤ اور اپنی ضرورت پوری کرلو۔ نمبر دو، کسی دشمن کے حملے کا خوف ہے۔ تو اس کے لیے بھی تیار ہو کر آیا ہوں۔ یہ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ چلو میرے ساتھ دیکھتا ہوں کون ہے دشمن۔ نمبر تین یہ کہ تمہیں خواہشات نے پریشان کیا ہے۔ تو تم یہ جانتے ہو کہ میری یہ بہن کنواری ہے۔ باحیا ہے، ابھی چلو اور اس سے اپنا نکاح پڑھوالو۔''

تو یہ تھا دوستی کا معیار، لیکن یہ بات اگلے وقتوں کی تھی اور میرے دوست عادل نے آج کے زمانے میں میرے دروازے کی گھنٹی بجائی تھی۔

کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ میں اسے اندر لے آیا۔ ''بتاؤ خیریت تو ہے ناں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کچھ الجھے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''یار میں اس وقت ایک پرابلم میں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور تم کو میرا ساتھ دینا ہے۔ میں اس وقت تم پر ہی بھروسا کر سکتا ہوں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''یار مجھے شادی کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا!'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''شادی کرنی ہے! یار تمہاری شادی تو ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ اچھی بیوی ہے تین بچے ہیں پھر کیسی شادی؟''

''سمجھا کرو۔ مجھے اسی وقت نکاح پڑھوانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے نکاح خواں کو تیار کر رکھا ہے۔''

وہ پرانی حکایت یاد آگئی۔ یا تو پیسوں کی ضرورت ہوگی یا دشمن کا خوف ہوگا یا نفسانی۔۔۔ خواہش۔ واہ پرانی حکایتیں بھی کمال کی ہوتی تھیں۔

انسانی زندگی کے کیسے کیسے گوشوں پر اس کی نگاہ ہوتی تھی۔

''آخر کس سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟''

''وہ لڑکی گاڑی میں بیٹھی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہاری مسز کی بھی مدد چاہیے اس وقت۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ......! میرا مطلب ہے ذرا اس کا میک اپ کردیں۔ وقتی طور پر دو چار چوڑیاں پہنادیں۔''

''یار عادل، تم سنجیدہ ہو۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں بھائی، بالکل سنجیدہ ہوں۔ پلیز تم ذرا بھابی کو یہ سچویشن سمجھادو۔''

''تم مجھے بتاؤ وہ لڑکی ہے کون؟''

''یہ سب اطمینان سے بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ اس کا نام رضوانہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میری فرم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ پلیز تم ذرا بھابی کو یہ سچویشن بتادو۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ ہاں لیکن اس نکاح سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''کیا پیسوں وغیرہ کی ضرورت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھائی پیسے تو میرے پاس ہیں۔'' اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دکھاتے ہوئے بتایا۔ ''گھر سے پچاس ہزار لے کر چلا ہوں۔''

''تو پھر کیا کام ہے۔''

''رضوانہ کے گھر جانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے گھر والوں کو انفارم کرنے۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ جاؤ اب بھابی کو اٹھادو۔ سوری لیکن اس وقت ایمر جنسی ہے۔''

''اچھا تم اسے لے کر آؤ۔ میں جب تک چندا سے بات کرتا ہوں۔'' چندا میری بیوی کا نام تھا۔

وہ اس لڑکی کو لینے چلا گیا۔ جب کہ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے جب چندا کو اٹھا کر یہ سچویشن بتائی تو وہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے یہ کیا سوجھی ہے عادل بھائی کو۔''

ہم چونکہ ایک دوسرے سے گھریلو تعلقات رکھتے تھے اس لیے چندا عادل کی بیوی راحیلہ کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کے پاس چلی جایا کرتی تھی اور کبھی راحیلہ ہمارے یہاں آجاتی۔

''میں تو ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ نہ جانے وہ کم

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

بخت کون ہے۔ عادل بھائی کیسے اس کے چکر میں پڑ گئے۔ میں ابھی راحیلہ بھابی کو فون کر کے بتا دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں ایسا مت کرو۔" میں نے اسے منع کر دیا۔ "وہ بہت بھروسے سے ہمارے پاس آیا ہے۔ اس طرح راحیلہ کو بتانا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔ کسی طرح اسے روکنا تو ہو گا۔"

"فی الحال تو وہی کرو جو وہ کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی آئے تو اس کا استقبال کرنا۔ اس کو ہلکا سا تیار کر دینا۔ جب تک میں سوچتا ہوں کہ کس طرح اس قصے کو ختم کر سکتے ہیں۔"

دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ عادل اس لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ لڑکی اس کے پیچھے کھڑی تھی جس کا نام اس نے رضوانہ بتایا تھا۔

میں ان دونوں کو اندر لے آیا۔ اس دوران چندا بھی کمرے سے نکل کر آ گئی تھی۔ عادل نے بہت لپک کر چندا کو سلام کیا تھا۔ "بھابی! اس وقت آپ لوگوں کو ہم دونوں کا ساتھ دینا ہوگا۔" اس نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت چندا کے سینے میں کیسی آگ دہک رہی ہوگی لیکن وہ خاموش رہی۔

"چندا، رضوانہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس کو ہلکا سا تیار کر دینا۔"

"ہاں بھائی! لیکن ذرا جلدی۔" عادل نے چندا کی طرف دیکھا۔ "ہمیں نکاح بھی پڑھوانا ہے۔"

چندا اس لڑکی کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ میں اور عادل ایک طرف بیٹھ گئے۔ "ہاں اب بتاؤ کیا سچویشن ہے؟" میں نے پوچھا۔ "یہ لڑکی تمہارے ہاتھ کیسے آئی؟"

"یار بتایا نا کہ یہ میرے ساتھ فرم میں کام کرتی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کے ماں باپ اس کی شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص اس کو پسند نہیں ہے۔ مجبوراً اسے یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ قدم تو دن میں بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ اتنی رات گئے کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"اسے رات دس بجے پتا چلا کہ کل اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے بوکھلا کر مجھے فون کر دیا۔ میں نے کہا کہ فوراً گھر سے نکل آؤ۔ میں گاڑی لے کر اس کے گھر کے پاس پہنچ گیا۔ ہم بہت دیر تک گاڑی میں گھومتے رہے۔ اس دوران ہم نے پوری پلاننگ کر لی۔"

"اور وہ پلاننگ یہ تھی کہ فوری طور پر نکاح پڑھوا لو۔"

"ہاں۔" اس نے گردن ہلا دی۔ "اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک جاننے والے نکاح خواں کو پکڑا۔ اس نے کہا لڑکی کو لے آؤ میں نکاح پڑھوا دوں گا۔ باقی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی۔ اس وقت فوری طور پر تمہارا اور بھابی کا خیال آ گیا۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ گیا۔ یہ ہے پوری کہانی۔"

"تم کیا کہہ رہے تھے کہ میں اس کے گھر جا کر اس کے گھر والوں کو بتا دوں۔"

"ہاں، ان کو صرف انفارم کرنا ہے کہ ان کی بیٹی خیریت سے ہے اور وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا رہی بلکہ اپنا نکاح پڑھوا رہی ہے۔ صرف یہ بتانا ہے، ان سے اجازت وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو صرف انفارم کر دینا ہے۔"

"اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس کے گھر والوں سے جا کر بھڑ جاؤں تا کہ وہ سب مل کر میری پٹائی کر دیں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے گھر والے بہت ہی مرنجاں مرنج قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے لیے یہی اطمینان بہت ہوگا کہ ان کی بیٹی زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم سیدھے طریقے سے اس کے گھر والوں سے اپنا رشتہ نہیں مانگ سکتے تھے؟"

"یار! کیسی بات کر رہے ہو۔ پوری کہانی بتا دی کہ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج ہی رات کو دس بجے خود رضوانہ کو اس بات کا پتا چلا ہے کہ اس کا نکاح ہونے والا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو بھی اس کے گھر والے مجھ سے اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ میں شادی شدہ بھی ہوں اور میرے بچے بھی ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا۔ "خیر دیکھا

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

جائے گا۔"

ابھی تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں اس نکاح کو رکوانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے عادل کی بیوی راحیلہ کا خیال آرہا تھا۔ بے چاری بہت اچھی عورت تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ بچے بھی بہت پیارے پیارے تھے۔

اس دوران چندا اس لڑکی کو تیار کر کے لے آئی۔ اچھی خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ ہلکے میک اپ کے بعد وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

عجیب سچویشن تھی۔ ہم سب گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ میں عادل کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھا۔ جب کہ چندا اور وہ لڑکی پچھلی سیٹ پر تھی۔

"پہلے ہم رضوانہ کے گھر کی طرف جارہے ہیں۔" عادل نے کہا۔ "میرا خیال یہ تھا کہ پہلے نکاح ہو جائے۔ اس کے بعد جا کر بتا دیں گے لیکن رضوانہ اس بات پر اصرار کر رہی ہے کہ پہلے گھر والوں کو بتایا جائے۔"

اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ رضوانہ اس بات پر کیوں اصرار کر رہی تھی۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ اس کے والدین کسی طرح پہلے سے باخبر ہو کر اس نکاح کو رکوا دیں۔ ورنہ یہی کام تو نکاح کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن اس صورت میں ہاتھ پاؤں کٹ کر رہ جاتے۔ کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔ یقیناً یہی بات ہو گی۔ کسی طرح اس نے عادل کا ساتھ دینا قبول کر لیا تھا اور اب پچھتا رہی ہو گی۔ کوئی راستہ تلاش کر رہی ہو گی۔

اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا تھا۔ مجھے تو یہ شادی کرانی تھی۔ چاہے رضوانہ کی مرضی کچھ بھی ہو۔ ہم سفر کرتے ہوئے ایک کالونی میں آگئے۔ اس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ بجلی کے کھمبوں کے بلب بھی روتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

بہت اداسی کا سا عالم تھا۔ عادل نے ایک مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ "جاؤ یار وہ سامنے والا مکان ہے۔" عادل نے بتایا۔

"میں بھی چل رہی ہوں۔" رضوانہ اچانک بول پڑی۔

"کیوں تم کیوں جاؤ گی؟" عادل نے حیرت سے پوچھا۔

"سمجھا کرو، میں جب اس طرح دلہن بنی ہوئی اس روپ میں ان کے سامنے بیٹھوں گی اور انہیں احساس دلاؤں گی کہ آپ لوگ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے تھے اور اب میں اپنی مرضی سے نکاح کرنے جا رہی ہوں تو پھر شاید انہیں احساس ہو۔"

"بے وقوفی کی بات ہے۔ تم کو دیکھتے ہی وہ تم پر جھپٹ پڑیں گے۔" عادل نے کہا۔ "تم کو زبردستی اندر لے جائیں گے۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گی۔"

رضوانہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔

"یار! اسلم اب تم چلے جاؤ۔" عادل نے میری طرف دیکھا۔ "سلیقے سے بات کرنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

میں گاڑی سے اترا اور اپنی خیریت کی خیر مناتا ہوا اس گھر کی طرف چل دیا۔ یہ ایک رسک تھا۔ اس کے گھر والے میرے پیچھے بھی پڑ سکتے تھے۔ دنیا بھر کے سوالات ہو سکتے تھے۔

بہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی گھنٹی بجا دی اور خدا سے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔

دس منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گیٹ پر روشنی ہو گئی تھی۔ وہ پچاس کی عمر کے لگ بھگ ایک معقول صورت شخص تھے جو پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ عادل نے مجھے رضوانہ کے باپ کے نام سے آگاہ کر دیا تھا۔

"معاف کیجیے گا کیا آپ ساجد صاحب ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں میں ہی ساجد ہوں لیکن آپ کون ہیں؟"

"پریشان نہ ہوں۔ سب خیر ہے۔ میں آپ کو کچھ سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ پلیز ذرا دو منٹ سنجیدگی سے میری بات سن لیں۔ میں آپ کا ہمدرد ہوں۔"

"جی ہاں سن رہا ہوں فرمائیں۔"

"رضوانہ کیا آپ کی بیٹی کا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

www.urdusoftbooks.com

وہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گئے۔ پھر سخت لہجے میں بولے۔ ''کون ہوتے ہو تم رضوانہ کے بارے میں پوچھنے والے۔''

''آپ ذرا اطمینان سے میری بات سن لیں۔'' میں نے کہا۔ ''یقیناً یہ کوئی خوشگوار لمحہ نہیں ہے لیکن میری بات سن لیں۔ اسی میں بھلائی ہے۔''

اس دوران گھر کے دوسرے لوگ بھی گیٹ پر آگئے تھے۔ ایک نوجوان تھا۔ جو شاید رضوانہ کا بھائی ہو گا۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک عورت تھی جو اس کی ماں ہو گی۔ یہ سب کے سب سیدھے سادے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔

''دیکھیں رضوانہ بالکل خیریت سے ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کو تھوڑا سا ڈراما کرنا ہو گا اس کے بعد حالات آپ کے قابو میں آجائیں گے۔''

''کیسا ڈراما؟''

''دیکھیں وہ بے وقوف لڑکی ایک شادی شدہ مرد کے چنگل میں پھنس کر اس سے نکاح کرنے جا رہی ہے۔ جب کہ میں اس شخص کا دوست ہوں .... میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہو۔ آپ میری بات سنتے رہیں آپ کو تھوڑا سا ڈراما کرنا ہو گا۔''

''کیسا ڈراما بتاؤ تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔'' اس بار ان کے لہجے میں نرمی گھلی ہوئی تھی۔

''اب آپ جائیں اور اس شخص سے کہیں کہ آپ اس رشتے کے لیے تیار ہیں لیکن یہ انداز مناسب نہیں ہے کہ اس طرح رات گئے کوئی لڑکی گھر سے بھاگ کر کسی سے نکاح کر لے۔ تم ایک ہفتے کے بعد باقاعدہ رخصت کر کے لے جاؤ میں خاندان والوں کو سمجھا دوں گا۔''

''اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا وہ مان جائے گا۔''

''آپ یہی بات اپنی لڑکی سے بھی کہیں۔ ایک بات بتا دوں۔ میری بیوی بھی آپ کی بیٹی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اس نے راستے میں اچھا خاصا سمجھا دیا ہو گا۔ یعنی لوہا گرم ہو گا۔ آپ اپنی بیٹی سے بھی یہی کہیں اس کے لیے آپ کو پوری اداکاری کرنی ہو گی۔''

''ہاں ہاں وہ میں کرلوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا۔''

''اس کے بعد یہ ہو گا کہ آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ آجائے گی۔ آپ کو ایک ہفتے کا موقع مل چکا ہو گا۔ اس دوران آپ اس کی شادی کر دیں لیکن خدا کے لیے اس سے مت پوچھیے گا جس کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔''

''اگر ایسا تھا تو اس پاگل کو بتا دینا چاہیے تھا۔''

''آپ لوگ سنتے کہاں ہیں۔ والدین تو اولاد کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ بس آجائیں میرے ساتھ اور ڈرامے کے لیے تیار رہیں۔''

''میں بھی چلتا ہوں۔'' اس کے بھائی نے کہا۔

''نہیں تم نہیں ورنہ وہ گاڑی لے کر بھاگ جائے گا۔'' میں نے سمجھایا۔

لڑکی کا باپ کچھ ہچکچاتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔ عادل نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہوئی تھی۔ پھر وہی سب کچھ ہوا جس کی میں نے ہدایت کی تھی۔ رضوانہ کے باپ نے عادل کو گلے لگا لیا تھا۔ ''تم لوگ یہ کیا حماقت کر رہے تھے۔ دیکھو رشتے اس طرح نہیں بنتے۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد باقاعدہ برات لے کر آؤ اور رضوانہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کیا...... کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' عادل نے خوش ہو کر پوچھا۔

''میں ایک باپ ہوں اور کوئی شریف باپ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی بیٹی اس طرح بھٹکتی پھرے۔ اگر اس نے تم کو پسند کر لیا ہے تو پھر یہ اس کی مرضی۔ اب انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

رضوانہ نے چندا سے لیے ہوئے زیورات اتار کر چندا کے حوالے کر دیئے۔ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس چلی گئی۔

اس کہانی کا یہ ایک انجام تو ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بظاہر تو سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ لیکن آگ اب بھی لگی ہوئی تھی۔

ہم گھر واپس آگئے۔ عادل آنے والے دنوں کے خیال سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اپنے اطمینان کے لیے مجھ سے پوچھ لیتا۔ ''یار اس کے باپ نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے نا، ایک ہفتے کے بعد وہ ہماری شادی تو کر دے گا نا؟''

”ہاں اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ خود بھی بہت معقول آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہو گا۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ کل یا پرسوں تم باقاعدہ پیغام لے کر اس کے گھر جاؤ۔“ عادل نے کہا۔

”اب اس کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت ہے نا۔ تم دن اور تاریخ طے کرو گے۔ وہی جس طرح ہوا کرتا ہے۔ نکاح کہاں ہو گا، کتنے لوگ شریک ہوں گے، کیا نکاح کے بعد ہی رخصتی کا ارادہ ہے یا کچھ دنوں کے بعد رخصتی ہو گی۔“

”ہاں یہ سب تو طے کرنا ہو گا۔“ میری بیوی چندا بھی بول پڑی۔ ”بلکہ آپ اکیلے نہیں میں بھی جاؤں گی۔ پتا تو چلے کہ فیملی رشتہ مانگنے آئی ہے۔“

”گڈ، بھابی نے بالکل ٹھیک کہا۔ تم دونوں چلے جانا۔ کچھ لے جانا ہو تو مجھے بتاؤ۔“

”کیا لے جانا ہے۔ بس مٹھائی وغیرہ۔ راستے سے لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور اتنا تو خود میں بھی کر سکتا ہوں۔“

عادل کچھ دیر کے بعد چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد چندا نے کہا۔ ”اب یہ عادل صاحب سر ہی پیٹتے رہ جائیں گے۔“

”ہاں خدا کرے اس لڑکی کو عقل آگئی ہو۔“

”آگئی ہے عقل میں نے راستے بھر بھڑکایا ہے اس کو۔“ چندا نے بتایا۔ ”اسے احساس ہو گیا ہے کہ وہ بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔“

”تو کیوں نہ چل کر دیکھا جائے کہ کیا حالات ہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن عادل بھائی سے کیا کہا جائے گا۔“ چندا نے پوچھا۔

”وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے زیادہ ناراض تو وہ مجھ سے ہو گا کیونکہ میرے ہی کہنے پر اس نے لڑکی کو واپس جانے دیا تھا۔“

دوسری شام کو ہم دونوں میاں بیوی اس لڑکی کے گھر پہنچ گئے تھے گھر والوں نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ لڑکی کا باپ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ ”جناب جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے جو ترکیب بتائی تھی وہی ترکیب کام آگئی۔“

”رضوانہ کیسی ہے وہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بھی ہوش ٹھکانے آگئے ہیں۔“ باپ نے بتایا۔ ”اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس بات پر راضی ہو گئی ہے کہ گھر والے جہاں بہتر سمجھیں وہاں رشتہ کر سکتے ہیں۔“

”اور آج جس نکاح کا پروگرام تھا اس کا کیا ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو ختم کر دیا ہے۔“

”ختم کر دیا۔“

”جی ہاں کیونکہ رضوانہ کی مرضی نہیں تھی۔ دراصل اب اس واقعے کے بعد ہمیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ چیک اینڈ بیلنس دونوں طرف ہونا چاہیے۔ اولاد کی طرف سے بھی اور والدین کی طرف سے بھی۔ والدین کو اپنی مرضی اور انا کی خاطر اولاد کو کسی امتحان میں نہیں ڈال دینا چاہیے۔ اسی طرح اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے وقت وقتی جنون اور جوش میں نہ آئے بلکہ والدین کو بھی اپنی مرضی میں شامل کر لینا چاہیے۔“

”یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے رشتے باہمی مشاورت سے ہوں۔“

”بالکل، باہمی مشاورت، دونوں غور کریں کہ اس رشتے میں بھلائی یا بہتری ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو بسم اللہ۔ چاہے وہ رشتہ والدین کی طرف سے آیا ہو یا خود اس لڑکی نے کسی کو پسند کر لیا ہو۔ دونوں دیکھیں سوچیں سمجھیں ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔ پھر اپنی انا اور ضد کو ایک طرف رکھ کر فیصلہ کر لیں۔“

یہ بہت اچھی بات تھی۔ اس کہانی کا انجام ہی یہی ہے۔ یہ ایک راستہ ہے ہر گھرانے کے لیے والدین کے لیے بھی اور اولاد کے لیے بھی۔

”تو اب آپ نے کیا کرنا ہے؟“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”میری بیٹی نے عادل کو پسند کر لیا ہے۔ اس لیے مجھے ہاں کر دینا چاہیے۔“

میں سر ہلاتے افسوس کرتے ہوئے واپس آگیا۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پولیوزدہ محبت

جناب مدیراعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم
انسان کی بے چارگی کو لوگ کس طرح ”کیش“ کراتے ہیں اس کا بھرپور احاطہ کرتی روداد ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین سرگزشت کو بھی پسند آئے گی۔

محمد جمیل اختر
(راولپنڈی)

صبح کا وقت کتنا شاندار ہوتا ہے یہ چڑیا کتنا خوبصورت گاتی ہیں۔ اسفندیار دس سال کا ہے اور پولیو کا مریض ہے وہ سارا دن ایک بیکار سامان کی طرح کبھی گھر میں تو کبھی باہر پڑا رہتا ہے گویا وہ کوئی قابلِ توجہ چیز ہی نہ ہو صبح سویرے اٹھتا ہے۔ رینگتا رینگتا غسل خانے جاتا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر ایک پیڑھی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ خود ناشتے کا مطالبہ نہیں کرتا پہلے اُس کے بھائی ناشتا کرتے ہیں جو کہ اُس کے ابا کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اُس کا باپ مستری ہے اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی یہ ہنر سکھا رہا ہے اگر اسفندیار کو پولیو نہ ہوتا تو شاید وہ بھی یہ ہنر سیکھ رہا ہوتا، کبھی کبھار اسفندیار یہ سوچتا تو اداس ہو جاتا کہ کاش اُس کی ٹانگیں ٹھیک ہوتیں تو وہ کیسی اچھی اچھی عمارتیں بناتا۔ ایسی عمارتیں کہ گاؤں میں کسی نے دیکھی نہ سنی ہوں گی وہ سارا دن دماغ میں رنگ برنگی عمارتیں بناتا رہتا، وہ ناشتے کا مطالبہ خود نہ کرتا کہ اُس کا باپ کریم بخش ایک سخت مزاج آدمی تھا کہ جس کو اسفندیار سے سخت چڑ تھی یا شاید وہ اِس سے نفرت کرتا تھا، سو ایک بار ناشتا مانگنے پر اُس کا باپ غصے میں آ گیا، اسفندیار نے ابھی کہا ہی تھا۔

”اماں ناشتا......“

”ہاں ہاں اس نواب زادے کو پہلے ناشتا دو اس نے کام پر جانا ہے نا۔“

”نہیں ابا وہ میں تو ویسے ہی......“

”جانتا ہوں جانتا ہوں سارا دن گھر میں ہی رہنا ہے نا،

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

"توڑتے رہنا روٹیاں گھر بیٹھ کر۔"

سو وہ خود ناشتا نہیں مانگتا تھا جب ملتا کھالیتا۔ اُس کی ماں کافی خیال رکھنے والی عورت تھی لیکن وہ اُس کے باپ کے سامنے کبھی نہ بول سکتی تھی، اُس کے باپ کے سامنے بھلا کیسے کوئی بولے۔ اُس کا غصہ ایسا تھا کہ سب چپ کر کے بیٹھ جاتے، وہ ایک بیکار آدمی تھا کہ جو سارا دن کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد اس کا باپ اور دونوں بھائی کام پر چلے جاتے اور ماں گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو جاتی اور وہ رینگتا ہوا باہر کے دروازے تک آجاتا پھر باہر لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا، اُس کے بھائیوں نے اُسے ایک بار دو چھڑیاں بنا کر دی تھیں کہ جن کے سہارے وہ کھڑا ہو کر چل سکتا تھا لیکن وہ گھر کے دروازے پر وہ چھڑیاں لے کر کبھی نہ آتا۔ اسکول کے بچے جب چھٹی کر کے لوٹ رہے ہوتے تو وہ اُس کی چھڑیاں چھین لیتے اور مذاق اڑاتے کہ اب لے کے دکھاؤ، جب وہ رینگتا ہوا ان کے پیچھے پہنچتا تو وہ اور دور بھاگ جاتے اور دور بہت دور گلی کے سرے پر چھڑیاں رکھ کر چلے جاتے پھر اس کے لیے یہ بڑی مصیبت ہوتی اور وہ رینگتا ہوا گلی کے سرے سے چھڑیاں اٹھا کر لاتا۔

"دن اسی طرح بیکار سے گزر رہے تھے کہ ایک دن دروازے پر بیٹھے بٹھائے اُس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نا میں بھی ان بچوں کے ساتھ اسکول جاؤں لیکن اُسے اسکول کون جانے دے گا اس بات کا اُسے بھی کچھ یقین نہیں تھا، وہ ماں کے پاس آیا، اماں جی یہ بچے جو اسکول جاتے ہیں کتنے اچھے کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔"

"ہاں تو؟"

"وہ، وہ اماں میں بھی اسکول جایا کروں۔"

"تو وہاں کیا کرے گا، اور کیسے جائے گا، چل تو تو سکتا نہیں۔"

"نہیں نہیں اماں میں چل لوں گا بس مجھے اسکول بھیج دے۔"

"اسکول جانے کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں، تیرا ابا راضی نہیں ہوگا۔"

بہت سے پیسے اب وہ کہاں سے لاتا، وہ بڑا پریشان ہوا، ایک بار پرائمری اسکول کے استاد اشرف گلی سے گزرے جو ہمیشہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے گزرتے تھے، آج جب ان کا ہاتھ سر پر تھا تو اسفندیار نے استاد جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"استاد جی!"

"جی بیٹا۔"

"استاد جی ایک بات بتائیں؟"

"پوچھو۔"

"یہ اسکول جانے کے لیے کتنی رقم چاہیئے ہوتی ہے؟"

"کیوں تم نے آنا ہے کیا؟"

"جی آنا تو ہے پر اماں کہتی ہیں اسکول جانے لیے بڑی رقم چاہیئے جو میرے ابا کے پاس نہیں ہے۔"

اس دوران کریم بخش بھی ادھر آنکلا۔

"سلام استاد جی۔"

"وعلیکم السلام کریم بخش۔"

"کریم بخش ذرا یہ کل اپنے بیٹے کو اسکول لے آنا۔"

"کس بیٹے کو جی؟"

"یہی اس اسفندیار کو۔"

"اوہ کیوں جی۔"

"اسکول میں داخل کرانا ہے۔"

"او نہ کریں استاد جی کیوں ظلم کر دیے ہو، ایک لولا آدمی بھلا کیا پڑھے گا۔"

"پڑھ لے گا کچھ نا کچھ تم بھیج تو دو۔"

"اچھا استاد جی۔"

اس کے باپ نے استاد جی کے سامنے اُسے کچھ نہ کہا لیکن جیسے ہی استاد جی گئے اِس کے باپ نے وہ سنائیں کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔" اب نواب صاحب اسکول جائیں گے۔ بڑے افسر بنیں گے۔"

اُس کا باپ اُسے نواب صاحب ہی کہتا اصل میں کریم بخش نے اس کا نام چودھری صاحب کے بیٹے چودھری اسفندیار کو دیکھ کر رکھا تھا۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں تھا کہ نام ایک رکھنے سے قسمت ایک نہیں ہوتی، اور یوں بھی اگر اس کے باپ کو پتا ہوتا کہ اس نے معذور ہونا ہے تو وہ نام بھلا کیوں رکھتا لیکن اب تو نام رکھا جا چکا تھا۔

"استاد جی کہتے ہیں پیسے نہیں لگیں گے۔" اسفندیار منمنایا۔

"نہیں کیسے نہیں لگتے پیسے، یہ امیروں کے شوق ہیں پڑھائی لکھائی۔"

"بیچارے کو جانیں دیں۔" اس کی ماں نے کہا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ہاں ہاں تو حمایت کرلے، کرلے یہ بھی شوق پورا۔ چار دن میں اس کا شوق پورا ہو جائے گا جب دو کلومیٹر چل کے جائے گا تو لگ پتا جائے گا۔

☆......☆

روز ڈوبتا سورج شاید یہ پیغام دیتا ہے کہ یہاں سب کا قیام عارضی ہے، اس عارضی قیام میں کسی کو آسانی میسر آجاتی ہے تو کسی سے یہ زندگی گزرتی نہیں، اسے گزارنی پڑتی ہے۔
اس کی زندگی ہمیشہ سے جدوجہد بھری رہی تھی۔
بچپن سے پولیو کا مریض، چھڑی کے سہارے جسم گھسیٹتا ہوا اسفند یار۔ آپ اگر گھر میں بھی بیٹھے ہوں تو بھی اسے اس کے چلنے کی آواز سے پہچان لیں گے۔
وہ دھند میں لپٹی صبح تھی جب وہ گورنمنٹ پرائمری اسکول چک 21 میں داخل ہوا۔ سارے لڑکوں نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا کہ اب یہ لنگڑا بھی ہمارے ساتھ پڑھے گا؟
وہ چپ کر کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔
''اسفند یار پتر شاباش تو اسکول آیا، ادھر آ پہلے تیرا نام رجسٹر میں داخل کردوں۔''
''اسفند یار۔''
''واہ بچے کیا خوبصورت نام ہے، چل اب بیٹھ جا۔''
اور اسفند یار کو محسوس ہوا کہ نام حاضری کے رجسٹر میں آنا بہت ہی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ بعض باتیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں لیکن وہ محسوس کی جائیں تو بہت بڑی ہوتی ہیں، جیسے اسفند یار اُس رات دیر تک جاگتا رہا تھا اُسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا، نیند آتی بھی تو تھوڑی دیر بعد آنکھ کھل جاتی۔ چھت کے پاس بنے روشندان سے اُس نے جب بھی دیکھا باہر اندھیرا ہی تھا یہ صبح کیوں نہیں ہوتی۔ یہ صبح کب ہوگی کہ اُس نے اسکول جانا تھا۔ اسکول جانا مشکل کام تھا لیکن وہ لڑھکتا دھکے کھاتے تین سال لگاتار اسکول جاتا رہا اب اُسے پڑھنا بھی آگیا تھا اور وہ کچھ جملے لکھ بھی سکتا تھا، اُسے پڑھنے کا ایسا شوق تھا کہ گاؤں کی دیواروں پر لکھے اشتہارات سے لے کر، دکانوں کے نام تک اُس نے سب کچھ پڑھ ڈالا۔
ایک روز کا قصہ ہے کہ کریم بخش، شیدے ہوٹل والے کے پاس بیٹھا تھا کہ بات چل نکلی صدیق ترکھان کی۔ ''ارے کریم بخش سنا ہے، صدیق ترکھان گھر میں نیا کمرا بنوا رہا ہے'' شیدے نے کہا۔

''واہ جی واہ اُس کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آگیا؟''
''سنا ہے لکڑی کی قیمت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، مجھے تو لگتا ہے آگے جا کر لکڑی سونے کے بھاؤ بکے گی، تم دیکھنا ایک دن صدیق ترکھان اور حمید زرگر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ دونوں پیسے میں کھیلیں گے اور ہم ادھر دودھ پتی ہی بناتے رہیں گے، میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اُسے ضرور ترکھان بناتا۔''
کریم بخش کے دونوں بیٹے اب راج مستریوں کا کام پوری طرح سیکھ چکے تھے سو وہ انہیں کیسے دوسرا ہنر سکھاتا، تبھی اُسے یاد آیا کہ اُس کے دو نہیں تین بیٹے ہیں۔ یہ اسفند یار بھی تو اُس کا بیٹا ہی تھا۔
''اچھا تو شیدے ایک بات بتا، کیا کوئی لنگڑا آدمی ترکھان بن سکتا ہے؟''

''او بھئی کریم بخش، ترکھان کو کون سا بھاگنا دوڑنا ہوتا ہے، ایک ہی جگہ بیٹھ کر کام کرنا ہوتا ہے، مجھے لگتا ہے تم اپنے منجھلے لڑکے کو ترکھان بنانا چاہتے ہو جو اسکول میں بابو بن رہا ہے۔''
''ہاں یار، بچہ ضد کر بیٹھا تو داخل کرادیا اسکول میں، کتابیں اسے استاد اشرف ہی لے کر دیتے ہیں، اُسے ابھی نہیں پتا کہ غریب کا بیٹا کبھی بابو نہیں بن سکتا، چلو جو وقت ضائع ہوا سو ہوا، اب میں اُسے کل ہی صدیق کے پاس لے کر جاتا ہوں۔'' گھر آتے ہی اس نے حکم جاری کردیا۔
''وعلیم بخش کی ماں کل سے یہ اسفند یار اسکول نہیں جائے گا۔''
''کیوں اب کیا ہوگیا؟''
''بس کل سے اسے صدیق ترکھان کے پاس بٹھانا ہے کوئی ہنر سیکھ لے گا تو زندگی سنور جائے گی۔''
''لیکن ابا میں نے سنا ہے پڑھ لکھ کر بھی ہم بڑا آدمی بن سکتے ہیں، میں بہت دل لگا کر پڑھوں گا، قسم لے لو ابا میں بہت پڑھوں گا اور بڑا آدمی بن کے دکھاؤں گا۔''
''اوئے کاکے بات سن، کل سے تُو میرے ساتھ چلے گا، تین جماعتیں پڑھی ہیں اور زبان ابھی سے چلنے لگی ہے، چل اب سو جا۔''
''لیکن ابا کل سے امتحان ہیں۔''
''اوئے تجھے ایک دفعہ سمجھ نہیں آتی۔''
اور لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس نے اپنے باپ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور اُس کے بعد اُس نے کچھ نہیں کہا تھا کہ

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

اُسے سارے جواب مل گئے تھے۔

☆......☆

صدیق ترکھان سے اُس کے باپ نے بات کرلی تھی سو اگلی صبح وہ لنگڑاتا ہوا صدیق ترکھان کی دکان پر پہنچ گیا، صدیق ترکھان ویسے تو بہت اچھا استاد تھا پر جب بھی اُسے غصہ آتا تو جو چیز بھی اُس کے پاس پڑی ہوتی اٹھا کر اسفندیار کو دے مارتا، اور اسفندیار بیچارہ کیا کہتا اور وہ کہہ ہی کیا سکتا تھا، اُس کو بھی کبھار اسکول اور کتابیں بہت یاد آتیں لیکن اب اسکول کا قصہ ماضی ہوگیا تھا، وہ دو سال لگاتار صدیق ترکھان کی دکان پر کام کرتا رہا، اُس کا خواب تھا قلم تراشنا اور وہ دروازے اور کھڑکیاں تراش رہا تھا، یقیناً ہر خواب کو تعبیر کا راستہ نہیں ملتا، اور ایک غریب اور مجبور انسان کے بھلا کون سے خواب؟

ان دو سالوں میں اور تو کچھ نہ ہوا بس اُس نے نئی بیساکھیاں ضرور بنالی تھیں۔

پھر ایک روز کریم بخش کو پوسٹ ماسٹر نے نئی صلاح دے دی ڈاکخانے کا ڈاکیا عرصہ چھ ماہ کے لیے کہیں جارہا تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر بھی رہنا چاہتا تھا چونکہ وہ پوسٹ ماسٹر کا رشتے دار بھی تھا سو اُس نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ کام پر بھی نہ آئے اور دفتر میں حاضری بھی لگتی رہے، اور اُس کی تنخواہ کا کچھ حصہ اُس کی جگہ ڈیوٹی کرنے والے ملازم کو دے دیے جائیں لیکن اتنی کم اُجرت پر کون کام کرنے پر راضی ہوتا، یہ 1963ء کا قصہ ہے کہ جب اسفندیار بارہ سال کا تھا، کریم بخش کو جب پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ وہ پورے پانچ روپے ہر ماہ اسفندیار کو دے گا تو کریم بخش کو یہ سودا زیادہ منافع بخش لگا، اور وہ ساری باتیں جو اُس نے دو سال پہلے ترکھان کی اہمیت بیان کرنے کے لیے کی تھیں سب بیکار ہوگئیں، اور وہ صدیق ترکھان سے لڑ پڑا کہ اُس نے دو سال میں اسفندیار کو کوئی کام کیوں نہیں سکھایا، صدیق نے بہترا کہا کہ ہنر آہستہ آہستہ آتا لیکن کریم بخش نے ایک نہ سنی اور اسفندیار کو وہاں سے اٹھا کر پوسٹ ماسٹر کے حوالے کردیا کہ جناب اب یہ آپ کی امانت ہے،

اسفندیار سے بھلا کس نے پوچھنا تھا، اُس کی رائے بھلا کون سی رائے تھی، پولیو زدہ رائے۔

☆......☆

ڈاک کا کام کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا، اُسے صبح تین بجے ملتان سے آنے والی ٹرین سے ڈاک کا لفافہ لینا ہوتا تھا اور پھر سارا دن خطوں کی تقسیم کا تکلیف دہ کام، ریلوے اسٹیشن اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ رات کو اگر ایک بجے لنگڑانا شروع کرتا تو تین بجے ضرور پہنچ جاتا لیکن اُسے رات میں کتوں سے خوف آتا تھا سو وہ سرِ شام ہی ریلوے اسٹیشن چلا جاتا اور ایک بینچ پر سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں رہتا۔ پھر تین بجے ڈاک کا لفافہ لے کر گرتا پڑتا وہ ڈاک خانے آتا، اُن دنوں اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ دن بہت طویل ہوگئے ہیں اور راتیں طویل تر۔

چھ ماہ تک وہ مسلسل انہی طویل روز و شب کے درمیان لڑھکتا رہا اور جب چھ ماہ بعد ڈاکیا واپس آیا تو اس کی زندگی میں سکون آیا، لیکن کچھ لوگوں کی زندگی میں سکون بالکل بھی نہیں ہوتا۔

☆......☆

اُس کے باپ نے مولوی نصیر کی جذبات سے لبریز تقریر سنی تو مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا کہ میں بھی اپنے بچوں کو آپ جیسا عالم بنانا چاہتا ہوں، مولوی صاحب نے کہا ضرور یہ تو بہت بڑی سعادت ہے، تم بھی اپنے بیٹے کو سرگودھا کے بڑے مدرسے میں داخل کرادو کہ جہاں سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے، اور مولوی صاحب نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مدرسے کے منتظم کے نام ایک خط بھی لکھ دیا۔

سو کریم بخش گھر آیا اور اسفندیار کو یہ خبر دی کہ وہ کل سرگودھا جارہا ہے۔

اسفندیار کے پاس کچھ سوال تھے لیکن جواب کس کے پاس تھے۔ سارے سوال پولیو زدہ تھے اور ایسے سوالوں کے کوئی جواب نہیں ہوتے۔

☆......☆

اسفندیار اب مدرسے آگیا وہ دن رات اب پڑھتا رہتا اور اس نے کتابوں کو زندگی بنالیا اور اس سے باہر وہ کچھ بھی نہیں سوچتا تھا، پھر سن 1965ء کی جنگ کا نقارہ بج اٹھا اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں تعطیلات ہوگئیں، اسفندیار بھی مدرسے میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد واپس آگیا، پھر جنگ ختم ہوگئی لیکن اسفندیار کبھی بھی واپس نہ جاسکا اور نہ اُسے کسی نے کہا کہ وہ واپس جائے۔ وہ سارا دن گلی میں بیٹھا رہتا، بچے اُسے چھیڑتے ہوئے گزر جاتے اور وہ انہیں کچھ بھی نہ کہتا، یہی وہ دن تھے جب اُس کے دل میں محبت نے گھر کر لیا، یہی وہ دن تھے جب اُسے محسوس ہوا یہ پھول، کلیاں کتنی خوبصورت ہیں، یہی وہ دن تھے جب اُسے محسوس ہوا کہ یہ چڑیاں اور کوئلیں کتنا خوبصورت گاتی ہیں اور یہی وہ دن تھے

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

جب اُسے محسوس ہوا کہ دن اور رات کچھ بدل سے گئے ہیں، یہی وہ دن تھے جب اُسے ثریا سے محبت ہوگئی۔ وہ اُس کے تایا کی بیٹی تھی، جب ایک بار وہ گلی میں بیٹھا تھا اور لڑکے اُس کی بیساکھیاں اٹھا کر بھاگ رہے تھے تو اُس وقت ثریا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی یہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے آئی اور لڑکوں سے وہ بیساکھیاں لے کر اسے دے دیں پھر لڑکوں سے بولی کہ خبردار آج کے بعد کسی نے اسفندیار کو کچھ کہا، پہلی بار ہاں زندگی میں پہلی بار اسفندیار کو محسوس ہوا کہ وہ ہے۔ کوئی تو ہے جو اس کی بھی حمایت کر سکتا ہے، کوئی تو ہے جو اس کی خاطر اوروں سے لڑ بھی سکتا ہے اور پھر اس دن کے بعد اسفندیار دن رات ثریا کے خواب دیکھنے لگا۔ ثریا اُسے جب بھی دیکھتی مسکرا دیتی اور اسفندیار کو لگتا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی ہے۔

انہی دنوں کریم بخش کو اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے لیے قرض چاہیئے تھا سو وہ اینٹوں کے بھٹا مالک کے پاس گیا اور قرض کا مطالبہ کیا لیکن اس کے پاس رہن رکھوانے کو کچھ نہیں تھا، کریم بخش نے آہ سرد کھینچ کر بھٹے پر کام کرتے مزدوروں کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''چودھری صاحب اگر میں اپنا ایک بیٹا آپ کے پاس رکھوا دوں، مزدوری بھی کرتا رہے گا اور تنخواہ بھی نہیں لے گا، تو کیا مجھے قرض مل جائے گا؟''

''چودھری کے لیے اس سے زیادہ منافع بخش اور کیا ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''ہاں پر دو سال کام کرنا ہوگا، منظور ہے؟''

''ہاں جی ہاں جی بڑی مہربانی، مجھے منظور ہے کل میں بچہ دے جاؤں گا اور قرض لے جاؤں گا۔''

اور ان دنوں جب اسفندیار محبت کے خواب دیکھ رہا تھا اُسے اس کے باپ نے بھٹا مالک کے پاس دو سال کے لیے رہن رکھوا دیا۔

☆......☆

غریب اور مجبور کی بھلا کیا رائے ہوتی ہے، بے وقعت سی بے معنی سی رائے، اسفندیار بھٹا مزدوروں کے ساتھ سارا دن کام کرتا اور پھر شام کو ایک کچے جھونپڑے میں کہ جس کے فرش پر تمام مزدور سویا کرتے تھے پڑ رہتا، رات دیر تک وہ گاؤں کے بارے سوچتا رہتا، اُس کی ماں بھلا اب کیسی ہوگی، وہ بھائی کہ جس کی شادی کی خاطر وہ یہاں کام کر رہا تھا نہ جانے کیسا ہوگا۔ اُس کی شادی بھی ہوگئی ہوگی، نہیں شاید شادی نہ ہوئی ہے ورنہ اُسے بھی تو کوئی بلانے آتا کہ آخر اُس کی قربانی ہی کی بدولت تو انہیں قرض ملا تھا، اُس کا دل کہتا تھا کہ ابھی شادی میں کچھ روز ہیں اور اُس بیچارے کے دل کی کیا بات کہ اُس کا دل تو ثریا کے خواب بھی دیکھا کرتا، اُسے رہ رہ کر خیال آتا کہ ثریا ضرور اُسے یاد کرتی ہوگی، کیوں یاد کرتی ہوگی وہ اِس لیئے کہ وہ ثریا کو یاد کرتا ہے اور یوں بھی ثریا اُسے محبت سے بھی دیکھتی تھی۔ بھلا جب لڑکے اُس سے اُس کے چھڑی کھینچ کر بھاگتے تھے تو وہ کیسے لپک کر آتی اور ان لڑکوں کو بھگا دیتی تھی۔ یقیناً ثریا اِس کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔

بھٹے پر دن سے رات کرنا کچھ آسان نہیں تھا، جاگیردار کے ملازم چوکیداران تمام مزدوروں کو صبح منہ اندھیرے ہی اٹھا دیتے برائے نام ناشتا دیتے کہ سانس چلتی رہے اور پھر کام، چوکیدار جو سارا دن درختوں کے نیچے بیٹھ کر تاش کھیلتے اور چرس کے سگریٹ پیتے رہتے تھے دوپہر کو جب سورج سوا نیزے پہ ہوتا تو مزدوروں کے آگے کھانا رکھ دیا جاتا۔ دن بھر کے بھوکے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ایسے حالات میں کبھی کسی کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ پکا ہوا کیا ہے انسانوں پر ایسے حالات بھی آتے ہیں کہ جب چکھنے کی حس ختم ہو جاتی ہے، اور مدعا صرف پیٹ کا ایندھن بھرنا رہ جاتا ہے سو وہ یہی ایندھن پورا کرتے تھے، رات کو بھی ایندھن پورا کیا اور فرش پر بازوؤں کا تکیہ بنا کر سب سو جاتے تھے، اسفندیار رات گئے تک سوچتا رہتا کہ ان مزدوروں کو ایسی جلدی نیند کیسے آجاتی ہے۔ سر رکھتے ہیں سو جاتے ہیں تھکن سے ٹوٹ تو اُس کا جسم بھی رہا ہوتا ہے لیکن بہت تھک جاؤ تو بھی نیند مشکل سے آتی ہے اور وہ تو زندگی بھر کی مشقت کے بعد بے حد تھک چکا تھا سو وہ رات گئے تک سوچتا رہتا۔

☆......☆

وقت نے گزرنا ہوتا ہے سو گزر گیا اور اسفندیار گھر واپس آگیا۔ اُس کا باپ بہت خوش تھا کہ اُس نے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ دو سال بھائی کی خاطر بھٹے پر کام کیا تھا۔ وہ بھی خوش تھا کہ اُس کا باپ پہلی بار کسی بات پر خوش تھا لیکن اُسے دکھ بھی تھا کہ جب وہ اینٹوں کے بھٹے پر کام کر رہا تھا تو اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے بڑے بھائی کی شادی کر دی گئی تھی اور اُس سے چھوٹے کی منگنی بھی ہو چکی تھی وہ سوچتا کہ اُس کی قربانی سے تو قرض ملا تھا شادی کے لیے پھر اُسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

وہ اب سارا سارا دن گلی میں بیٹھا رہتا بس کبھی کبھار ثریا اُس کے گھر آجاتی۔ وہ جب بھی اِس کی خیریت پوچھتی تو ا

اُسے لگتا کہ اُس کے دکھ کم ہونے لگے ہیں اور وہ سارے زخم جو بھٹے پر کام کرنے کی وجہ سے ہوئے تھے آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے ہیں، کیا لفظوں میں جادو ہوتا ہے ہاں لفظوں میں جادو ہوتا ہے، اُسے یہی لگتا تھا کہ ثریا کی باتیں ہی کچھ ایسی تھیں۔

انہی دنوں ثریا کا ابا یعنی اسفندیار کا چچا بہت بیمار ہوا جب اُسے لگا کہ اُس کی زندگی کے دن کم ہیں تو اُس نے ایک دن کریم بخش کو بلایا اور اُسے کہا کہ دیکھ کریم بخش مجھے لگتا ہے۔ اب جانے کا ویلا ہے پر ثریا کا بھار ہے سر پر، سوچتا ہوں تو پریشان ہوجاتا ہوں۔ ساری رات نیند نہیں آتی۔''

''بھائی جان آپ فکر کیوں کرتے ہیں ثریا جیسے آپ کی دھی ہے ویسے میری دھی ہے۔''

''تو نے میرا بڑا بوجھ کم کردیا پر تیرے تو بڑے بیٹے کی شادی ہوچکی ہے جب کہ چھوٹے کا تو نے اپنے دوست دلاور کی بیٹی سے نکاح کردیا ہے تو اب کیا ہوسکتا ہے؟''

''بھائی جان میرا ایک اور بیٹا بھی تو ہے اسفندیار۔''

''لیکن وہ تو......''

''وہ کیا بھائی جان۔''

بوڑھے بیمار باپ نے ایک بار پھر سوچا پھر اپنی بیماری پر دھیان دیا تو کہا۔ ''اچھا چل ٹھیک ہے جیسے تو مناسب سمجھ، بس نکاح میرے سامنے ہی کردے رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔''

''کل ہی نکاح کرالیتے ہیں بھائی جان۔''

نکاح کی خبر جب اسفندیار کو معلوم ہوئی تو اُسے سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ ان ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ سارے گاؤں میں کیسے بھاگتا پھرے، کاش اُس کے پر لگ جاتے اور وہ پوری دنیا کا چکر لگاتا، وہ خوش ہی اتنا تھا زندگی میں پہلی بار اتنا خوش، اُدھر ثریا بھی خوش تھی کہ اُسے اسفندیار سے بچپن ہی سے ایک لگاؤ تھا بیچارہ اتنا اچھا تو تھا۔

اس رشتے سے اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ ثریا کی ماں تھی جس نے سارا دن واویلا مچائے رکھا کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دے گی لیکن بیمار شوہر کے آگے زیادہ ضد نہ کرسکی اور یہ نکاح ہوگیا۔ . .

نکاح کے چند روز بعد ہی ثریا کا باپ چل بسا۔

یہ اُس سے کچھ ماہ بعد کی بات ہے کہ کریم بخش کو دوسرے بیٹے کی شادی کے لیے قرض لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اب کی بار بھی رہن رکھوانے کو پاس کچھ نہ تھا۔

''اسفندیار پتر صرف دو سال کی بات ہے، جیسے پہلے تو نے محنت کی اور بڑے بھائی کی شادی ہوگئی اب تھوڑی سی اور محنت کرے گا تو دوسرے بھائی کی شادی بھی ہوجائے گی، دیکھ تو نے اس گھر کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔''

اسفندیار پچھلے دو سال کے شب و روز سوچتا تو پریشان ہوتا کہ کیا نیندیں پھر پریشان ہوجائیں گی۔ کیا دن ویسے ہی بے سکون ہوجائیں گے اور پھر دن رات ویسے ہو گئے کہ اُس کی بھلا کون سی مانی تھی۔

☆......☆

دو سال اتنے ہی پریشان کن اور مشکلات سے لبریز گزرے جیسے کہ اس سے پہلے سال گزرے تھے اور جب وہ واپس آیا تو دوسرے بھائی کی شادی بھی ہوچکی تھی، سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اُس کی چچی اب اس رشتے کے لیے رضامند نہیں تھی۔ وہ روز ان کے گھر آتی اور کہتی کہ اسفندیارے کو کہیں کہ وہ ثریا کو طلاق دے۔ میں نے نہیں کرنی ایک لنگڑے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی۔

گھر والوں سے لے کر سارے گاؤں کے لوگوں نے اسفندیار کو کہا کہ وہ ثریا کو طلاق دے دے۔ بھلا اُس کا تمہارے ساتھ جوڑ ہی کیا ہے لیکن اسفندیار نے کبھی طلاق نہ دی کہ ثریا اُس کی زندگی کی پہلی خوشی تھی۔ پہلی اور اکیلی محبت تھی۔ اُسی محبت کے خوابوں میں اُس نے چار سال قیدیوں سے بدتر حالات میں زندگی گزاری لیکن وہ صرف اپنے لیے ثریا کو یہ اذیت نہیں دے سکتا تھا سو ایک روز اُس نے ثریا سے پوچھا تھا۔

''تم کہو تو میں طلاق دے دیتا ہوں۔''

''یہ تم نے سوچا ہی کیوں۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ یہ ظلم ہے میں تمہارے قابل نہیں۔''

''لوگ تو کچھ بھی کہتے ہیں لوگوں کا کیا ہے۔''

''لوگ ہمیں کبھی ایک نہیں ہونے دیں گے تمہاری ماں ابھی بھی اس شادی کے خلاف ہے۔''

''میں انتظار کروں گی، کیا تم انتظار کرو گے۔''

''میں منتظر ہوں۔''

اور پھر زندگی انتظار میں گزر تی رہی ہے۔ دونوں بوڑھے ہوگئے مگر کبھی باپ نے گھر کی دہائی دے کر اور کبھی محلے والوں کی سازشوں نے انہیں ایک ہونے نہیں دیا۔

میں نے انہیں بڑھاپے کی آخری حدوں میں دیکھا اور ٹھان لیا کہ ان کی کہانی لکھوں گا۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

مظلوم ظالم

محترم مدیر السلام علیکم

میں سرگزشت کی مستقل قاری ہوں۔ لکھنے لکھانے کا شوق کم عمری میں تھا۔ گزشتہ ماہ ایک سچ بیانی پڑھتے ہوئے یاد آیا کہ میں نے بھی ایک ایسا کردار دیکھا ہے جو خود میں منفرد ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں کہ وہ لڑکی کیسی عجیب و غریب فطرت کی تھی۔

کلثوم اشفاق
(کراچی)

میری شادی ہوئی تو میرے شوہر کا ذاتی مکان نہیں تھا۔ وہ کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے، ایک پرائیویٹ فرم میں خاصی معقول ملازمت کرتے تھے۔ ان کا مستقبل ابو کو بہت تابناک نظر آیا اس لیے ان کا رشتہ قبول کرلیا ورنہ پہلے بیٹی والے یہ ضرور دیکھتے تھے کہ ذاتی گھر ہے یا نہیں۔ اماں کو یہ رشتہ اس لحاظ سے پسند تھا کہ میرے شوہر کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ان کے والدین کا کئی برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

صرف ایک بہن تھی، اس کی بھی دو ماہ قبل شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ دبئی جا چکی تھی۔

میں خود بھی پڑھی لکھی تھی اور بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی لیکن امتحان کا نتیجہ آنے سے قبل ہی میری شادی ہوگئی۔

اشفاق بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ اس دور کے عام مردوں کی طرح نہیں تھے جو عورتوں کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں۔

مجھے وہاں سب سے زیادہ تکلیف مکان کی تھی۔ مالک مکان عجیب بد دماغ قسم کا آدمی تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ٹوکتا تھا۔ اوپر کا مکان تھا اسی لیے ہمارے زور سے چلنے پر بھی اعتراض ہوتا تھا۔ ہم شادی کے بعد دو سال میں تین مکان بدل چکے تھے۔ اس دوران میں اللہ نے ہمیں ایک ننھے پھول سے نوازدیا تھا۔

مکان بدل بدل کر میں شدید کوفت میں مبتلا ہوگئی تھی اور اب میری زندگی کا واحد مقصد ذاتی مکان بنانا تھا۔ میں نے اس مقصد کے لیے کمیٹیاں ڈالیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان ہی دنوں نارتھ ناظم آباد کا علاقہ آباد ہو رہا تھا۔ وہاں کچھ بلاکس میں دو دو، چار چار مکان نظر آنے لگے تھے۔

ایک دن میرے شوہر آفس سے آئے تو بہت خوش تھے۔ وہ خود ہی بولے۔ ’’کلثوم! اللہ نے آخر تمہاری سن ہی لی۔ ہمارے منیجر یاسین صاحب امریکا شفٹ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں نارتھ ناظم آباد میں ایک مکان کی تعمیر شروع کی تھی لیکن ابھی اس کا صرف ڈھانچا ہی کھڑا ہوا تھا کہ ان کا ویزا آگیا۔ وہ ادھورا مکان میں ان سے خرید رہا ہوں، ہم اس میں رہ کے بھی اسے بنا سکتے ہیں۔ اچھا خاصا بڑا چھ سو گز کا پلاٹ ہے۔‘‘

’’لیکن اشفاق، اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟‘‘ میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

’’یاسین صاحب کو پیسوں کی فکر نہیں ہے۔‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’وہ کہہ رہے تھے کہ فوری طور پر آپ جو کچھ دے سکتے ہیں، دے دیں۔ بقیہ رقم بعد میں ادا کر دیں۔‘‘

میرے پاس جمع پونجی، زیورات اور کمیٹی وغیرہ ملا کر پچیس ہزار روپے ہوں گے۔ یاسین صاحب اس ادھورے مکان کے چالیس ہزار مانگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی کراچی میں نہیں تھا جو اس مکان کی دیکھ بھال کرتا۔ خالی مکان پر تو لوگ یونہی قبضہ کر لیتے ہیں۔

آخر وہ اشفاق کی تجویز... مان گئے کہ پچیس ہزار روپے ابھی لے لیں بقیہ رقم اشفاق ایک سال بعد ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں گے۔

یوں ہمیں اپنا مکان نصیب ہوا۔ وہ مکان رنگ و روغن اور پلاسٹر سے محروم تھا۔

اس میں صرف کھڑکیاں اور دروازے لگے ہوئے تھے۔ بجلی، پانی اور گیس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں ان مشکلات کی پروا کیے بغیر فوراً ہی اس ادھورے مکان میں شفٹ ہوگئی۔ بعد میں اشفاق کو اپنے دفتر سے قرض بھی مل گیا۔ اس سے ہم نے نہ صرف نیچے کا مکان مکمل کرایا بلکہ اوپر بھی ایک منزل بنالی۔ دفتر کا قرض چکانے کے لیے بھی ہر ماہ ایک معقول رقم کی ضرورت تھی۔ اشفاق نے اس مقصد کے لیے مکان کا گراؤنڈ فلور کرائے پر اٹھا دیا اور ہم لوگ اوپر چلے گئے۔

میں خود فرعون قسم کے مکان مالکان کی ڈسی ہوئی تھی اس لیے مجھے کرائے داروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں ان سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی۔ کرائے کے لیے کبھی تقاضا نہ کرتی۔ اکثر الیکٹرک اور گیس کا بل بھی وہ لوگ وقت پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر کرائے داروں کے بچے اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے گھر میں ادھم مچاتے رہتے تھے۔

اب اللہ نے مجھے مزید دو بیٹوں سے نواز دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور اشفاق کرائے داروں کی بے تکلفی بلکہ ڈھٹائی سے تنگ آکر ان سے مکان خالی کراتے رہے۔

اس وقت تک میرا بیٹا فرخ اور جہانگیر بھی بڑے ہو چکے تھے، ان کے بعد سعدیہ تھی جو اب دوسری یا تیسری میں پڑھ رہی تھی۔

ہمارے مکان کی حالت اب بہت بہتر ہوگئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں مکانات کی قیمتیں اور کرایوں میں بھی بہت اضافہ ہوا تھا۔ کرائے کی مد میں بھی خاصی معقول آمدنی ہو جاتی تھی لیکن اشفاق کو میرا کرائے داروں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں تھا۔ بے تکلف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کرائے دار اور وہ مالک مکان ہیں۔

اشفاق کو میری اس عادت سے اب چڑ ہوگئی تھی۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اب تو فرخ بھی اس بات پر غصہ کرنے لگا تھا۔
اس وقت جو کرائے دار تھے ان سے بہ مشکل اشفاق نے مکان خالی کرایا اور کہنے لگے۔ ”کلثوم، اب میں مکان کرائے پر نہیں دوں گا۔“
”ولیکن اس سے ہمیں خاصی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ فرخ، جہانگیر اور سعدیہ کے تعلیمی اخراجات نکل آتے ہیں۔ کچھ رقم پس انداز بھی ہو جاتی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔
”بس میں اب ایک شرط پر مکان کرائے پر دوں گا۔“ اشفاق نے کہا۔ ”تم کرائے داروں سے کسی قسم کا میل جول نہیں رکھو گی۔ ورنہ لوگ یونہی سر پر چڑھتے رہیں گے۔“
”چلیے آپ یہ چاہتے ہیں تو یہی سہی۔“ میں نے کہا۔
میں زینے کے اس دروازے میں تالا ڈال دوں گا، جس کے ذریعے تم نیچے والے حصے میں جاتی ہو، اس کے علاوہ کرایہ بھی میں خود ہی وصول کروں گا۔ تمہیں کرائے داروں سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔“
”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ان سے ملنے کی۔“ میں نے برا مان کر کہا۔ ”وہ کوئی میرے سگے ہوں گے۔“
”امی برا نہ مانیں، ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ فرخ نے ہنس کر کہا۔
پھر کئی لوگ مکان کرائے پر لینے آئے۔ اشفاق ہر آدمی سے خود ملتے تھے اور انکار کر دیتے تھے۔ آخر انہیں محمود صاحب پسند آ گئے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ چھوٹی فیملی تھی۔ دو بچے اور دو میاں بیوی۔ ایک بیٹی تقریباً چودہ، پندرہ برس کی رہی ہوگی۔ بیٹا بہت چھوٹا تھا اور صرف دو سال کا تھا۔
مجھے ایک لمحے کو حیرت ہوئی تھی کہ بچوں کی عمروں میں عموماً اتنا فرق نہیں ہوتا۔
”تم اپنا تجسس رہنے دو۔“ اشفاق نے میری بات سن کر کہا۔ ”ان کے بچوں کی عمر میں بارہ سال کا وقفہ ہے یا چوبیس سال کا، تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“
انہوں نے زینے کے درمیانی دروازے پر تالا ڈال دیا۔
آنے والے کرائے دار بہت سلجھے ہوئے نظر آتے تھے لیکن کرائے دار کی بیوی ساجدہ کچھ عجیب فطرت کی مالک تھی۔

جامی نور الدین عبدالرحمن

(1414ء_1492ء)

ایرانی شاعر اور صوفی۔ خراسان کی ولایت جام کے ایک قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں باپ کے ساتھ ہرات اور سمرقند گئے۔ جو ایک زمانے میں اسلامی علوم اور ایرانی ادب کے مراکز تھے۔ تعلیم کے بعد سلوک و عرفان سے رجوع کیا اور سعد الدین محمد کاشغری اور خواجہ علی سمرقندی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ علم عرفان میں اتنی ترقی کی کہ بہاء الدین نقشبندی کے حلقۂ طریقت میں ان کا شمار خلفاء میں ہونے لگا۔ 1472ء میں حج کیا۔ مختلف شہروں کی سیاحت کر کے ہرات واپس آئے اور وہیں انتقال کیا۔ سلطان ابو سعید گرگانی، سلطان حسین مرزا، میر علی شیر انوائی، اوزون حسن، آق قیونلو، سلطان یعقوب آق قیونلو، سلطان محمد فاتح اور سلطان بایزید دوم مولانا جامی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گوشہ نشین اور درویش منش تھے۔ نظم و نثر کی تصنیفات 49 ہیں۔ نظم میں سات مثنویاں (ہفت اورنگ) سلسلۃ الذہب، سلامان والبسال، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، فرد نامہ اسکندری اور غزلوں کے تین مجموعے آپ کی یادگار ہیں۔ نثر میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔

مرسلہ: نوروز فیروز۔ پشاور

اس سے ابھی تک میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی اس وقت جب وہ لوگ مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ عجیب سی روکھی طبیعت کی عورت تھی لیکن اس کا شوہر بہت شریف اور مسکین لگ رہا تھا۔ ان کی بیٹی بھی خاصی سہمی ہوئی تھی اور بات کرتے ہوئے خوف زدہ سی نظر آ رہی تھی۔
شوہر صبح دفتر چلا جاتا، عورت بھی تھوڑی دیر بعد بعد تیار ہو کر گھر سے نکل جاتی۔ گھر میں ان کی نوخیز بیٹی اور چھوٹا بیٹا رہ جاتا۔ وہ بچی گھر کی صفائی سے لے کر دیگر تمام کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے بھائی کا بھی خیال رکھتی تھی۔ خیال کیا رکھتی تھی۔ وہ اکثر مجھے اس کی کمر پر لدا ہوا نظر

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

آتا تھا ورنہ بلند آواز میں رونا شروع کر دیتا۔

ان کے یہ تمام معمولات میں اوپر گیلری سے دیکھتی رہتی تھی۔

اس لڑکی نے بھی کئی مرتبہ مجھے دیکھا تھا اور مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے سلام بھی کیا تھا۔

تین چار گھنٹے بعد ساجدہ واپس آجاتی اور گھر میں چیخ پکار شروع ہو جاتی۔ وہ اپنی بیٹی پر بہت سختی کرتی تھی۔ مجھے بعد میں اس کا نام شاہدہ معلوم ہوا تھا۔ وہ گھر میں آتے ہی شاہدہ پر برسنے لگتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی برتن گندے دھونے پر، کبھی کسی اور بات پر۔

ایسے موقعوں پر شاہدہ آنسو بہاتی رہتی اور کام کرتی رہتی۔ بعض اوقات تو ساجدہ اسے معمولی سی بات پر دھنک کر رکھ دیتی۔ وہ بچی مار کھانے کے بعد کچھ دیر کسی کونے کھدرے میں بیٹھی روتی پھر دوبارہ کام میں جت جاتی۔

آہستہ آہستہ مجھے اس بچی سے ہمدردی ہونے لگی۔ میں نے ایک دن اشفاق سے کرائے داروں کے بارے میں بات کرنا چاہی تو وہ بری طرح بگڑ گئے اور بولے۔ ”نہیں کلثوم، تم ان لوگوں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گی۔ نہ کسی قسم کی ہمدردی کرو گی۔“

میں بھی اس وقت خاموش ہو گئی لیکن اپنی عادت سے مجبور ہو کر تاک جھانک سے باز نہیں آئی۔

میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ ساجدہ ٹھیک نو بجے گھر سے نکلتی تھی اور ایک بجے دوپہر تک واپس آتی تھی۔ اس نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے لیکن وہ مجھے اتنی تعلیم یافتہ نہیں لگتی تھی، ممکن ہے کسی چھوٹے سے اسکول میں چھوٹے بچوں کو پڑھاتی ہو۔

میری بیٹی سعدیہ اس وقت بارہ سال کی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے ضد کرتی کہ میں نیچے والی آنٹی کے گھر جاؤں گی لیکن اشفاق اور فرخ کے خوف سے ہمیشہ اسے منع کر دیتی تھی۔

ان ہی دنوں محلے کے ایک گھر سے میلاد شریف میں شرکت کا بلاوا آیا۔ آنے والی محلے کی دو تین لڑکیاں تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم لوگ ہمارے کرائے داروں کو بھی دعوت دے دو۔

میرے کہنے پر وہ نیچے بھی چلی گئیں۔ دستک کے جواب میں دروازہ ساجدہ نے کھولا۔ میں اوپر گیلری کی ایک جھری سے سب دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ ساجدہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

اس نے رسما بھی ان بچیوں کو گھر میں نہیں بلایا لیکن بچیاں خود ہی اندر گھس گئیں۔

”آنٹی۔“ ان میں سے ایک لڑکی نے کہا۔ ”ہمارے گھر میں پرسوں میلاد ہے، امی نے کہا ہے کہ آپ ضرور آئیں۔“

ساجدہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاہدہ بول اٹھی۔

”امی، میں چلی جاؤں گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ساجدہ نے درشت لہجے میں کہا۔ پھر وہ ان بچیوں سے بولی۔ ”بیٹا! مجھے وقت ملا تو میں ضرور آنے کی کوشش کروں گی۔“

بچیاں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے آگئیں۔

ان کے جاتے ہی ساجدہ، بیٹی پر برس پڑی۔ ”تجھے کیا ضرورت تھی بکواس کرنے کی؟ میں نے تجھے سمجھایا تھا نا کہ تجھے محلے میں کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”امی، میں تو......“

”بس دور ہو جا یہاں سے۔“ ساجدہ نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔

میں نے نفرت سے سوچا، عجیب عورت ہے۔ ہر وقت اپنی بچی کو جھڑکتی اور مارتی رہتی ہے۔

کچھ دن مزید گزر گئے۔ ساجدہ کا وہی معمول برقرار رہا۔ وہ اب شاہدہ پر کچھ زیادہ ہی سختی کرنے لگی تھی۔

ایک دن میری بیٹی سعدیہ نے مجھ سے کہا۔ ”امی، میں رابعہ کی گڑیا سے اپنے گڈے کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی دشمن نہیں ہوں۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

بچیوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سعدیہ نے اس شادی میں محلے کی تمام بچیوں کو شرکت کا بلاوا دیا۔ وہ بے چاری ساجدہ کے گھر میں جا پہنچی، اس وقت ساجدہ اپنے معمول کے مطابق گھر میں نہیں تھی۔

لڑکیوں کو دیکھ کر شاہدہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔ ”میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ میں بھی دوسرے گھروں میں جاؤں لیکن امی مجھے کہیں جانے نہیں دیتیں۔ میں رات کو ابو سے بات کروں گی۔ وہ مجھے ضرور اجازت دے دیں گے۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور ساجدہ اندر داخل ہوئی۔ میں اوپر کی جھری سے سب دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر شاہدہ پریشان ہو گئی۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ساجدہ نے اپنی چادر ایک کرسی پر پھینکی اور شاہدہ سے بولی۔ ''یہ لڑکیاں یہاں کیوں آئی ہیں، تو میرے لیے پانی لے کرآ۔''

وہ بےچاری جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔

میری بیٹی نے ہمت کر کے کہا۔ ''آنٹی! ہم لوگ گڑیا گڈے کی شادی کر رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ شاہدہ بھی اس میں شریک ہو۔''

''نہیں بیٹا، شاہدہ کہیں نہیں جائے گی۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں جاسکے۔''

بچیاں مایوس ہو کر واپس آ گئیں۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ میں اب ساجدہ کو زیادہ اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی اور ان لوگوں سے مکان خالی کرالوں گی۔

اس کے دوسرے ہی دن صبح کی بات ہے۔ اشفاق آفس اور بچے اسکول جا چکے تھے۔ اچانک شاہدہ کے گھر سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا گئی۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ ساجدہ اپنی بیٹی کو بری طرح مار رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں مداخلت کرتی، وہ اپنی چادر اوڑھ کر باہر نکل گئی۔

شاہدہ کچھ دیر تک وہیں صحن میں بیٹھی رہی، پھر وہ بھی اٹھ گئی، کیونکہ اس کا چھوٹا بھائی بری طرح رو رہا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر باہر لے آئی لیکن وہ اس کے باوجود مسلسل روتا رہا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ اس دن بجلی کا بل آیا تھا۔ میں نے کرائے داروں کا بل اٹھایا اور زینے والے دروازے کی چابی لے کر نیچے پہنچ گئی۔ میں نے تالا کھولا تو معلوم ہوا کہ دروازہ دوسری طرف سے بھی بند ہے۔ میں نے دروازے پر ہولے ہولے دستک دی۔

فوراً ہی شاہدہ کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

''بیٹا! میں تمہاری مالک مکان ہوں، بجلی کا بل لے کر آئی ہوں۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ شاہدہ دروازہ کھولے گی۔ اس نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد دروازہ کھول دیا۔ میں بجلی کا بل لے کر اندر چلی گئی۔

''کیا ہوا تھا بیٹی، تمہاری امی تمہیں کیوں مار رہی تھیں؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

میرے منہ سے ہمدردی کے دو بول سنتے ہی شاہدہ سسک سسک کر رونے لگی اور بولی۔ ''آنٹی! میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ امی کو مجھ سے زیادہ گڈو کی فکر ہے۔''

گڈو، شاہدہ کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ وہ اب بھی بہت بری طرح رو رہا تھا۔ ''امی سمجھ رہی تھیں کہ میں جان بوجھ کر اسے رلا دیتی ہوں، بس اسی بات پر انہوں نے مجھے دھنک کر رکھ دیا۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ گڈو کے پیٹ میں درد ہے۔ پیٹ میں درد ہو تو بچے اسی طرح بلک کر روتے ہیں۔ تم فکر مت کرو، میں ابھی اوپر سے پیٹ کے درد کی دوا بھجواتی ہوں۔'' مجھے یاد آ گیا کہ پچھلے دنوں میری بھتیجی ناہید آئی تھی اپنے بچے کی دوا یہیں بھول گئی تھی۔

''لیکن آنٹی، امی ناراض ہوں گی کہ......''

''تم امی کو کچھ مت بتانا۔ اس وقت تمہارا بھائی تکلیف میں ہے۔ اس کی تکلیف دور کرو ورنہ یہ شام تک یونہی روتا رہے گا، ہاں دوا کھلانے کے بعد اس کے پیٹ کی سینکائی بھی کر دینا۔'' پھر میں نے اپنے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔ ''تمہاری امی کس اسکول میں پڑھاتی ہیں؟''

''امی پڑھاتی نہیں ہیں۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ ایک اسکول میں دستکاری سکھاتی ہیں۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔''

''اچھا، میں تمہارے بھائی کے لیے دوا لے کر آتی ہوں۔'' مجھے اس بچے کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے ساجدہ کے بارے میں سوچا کہ عجیب ماں ہے، اپنے بیمار بچے کا بھی خیال نہیں ہے۔

اس کے بعد اکثر موقع دیکھ کر میں شاہدہ کے پاس جانے لگی۔ میں نے سختی سے اسے منع کر دیا تھا کہ تم اپنی امی کو

شمارہ جون 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: بزدل..........محمد یوسف (جہلم)

☆دوم: تہی داماں..........ظہیر مرزا (کراچی)

☆سوم: حاصل عشق..........سبین (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔ مجھے اس کی ماں سے زیادہ اشفاق اور فرخ کی طرف سے پریشانی تھی۔ ان دونوں کو بھنک بھی مل جاتی کہ میں کرائے داروں سے میل جول بڑھا رہی ہوں تو وہ لوگ گھر میں ایک قیامت کھڑی کر دیتے لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ میں خود مالک مکانوں کی حرکتوں کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ کرائے داروں کو کسی بھی طرح تکلیف نہ پہنچے۔ اس چکر میں خود میں کئی دفعہ نقصان اٹھا چکی تھی۔

ایک کرائے دار بغیر ڈپازٹ کے رہنے آگئے۔ انہوں نے اپنی ایسی مجبوری روئی کہ میرا دل پسیج گیا۔ پھر چند ماہ بعد انہوں نے کرایہ روکنا شروع کر دیا۔ ہر دفعہ اپنی مجبوری کا رونا روتے تھے۔ آخر ایک رات وہ لوگ خاموشی سے گھر خالی کر گئے۔ وہ تو شکر ہے کہ انہوں نے گھر میں کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی تھی۔ اشفاق خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔

دوسرے کرائے داروں کے بچے سارا دن ہمارے گھر میں دندناتے پھرتے اور ان کی ماں سوتی رہتی۔ وہ ہر وقت چائے کی پتی، چینی اور آٹا وغیرہ مانگتے رہتے تھے۔ اکثر کرائے دار کی بیوی مجھ سے ادھار نقد رقم بھی لے جاتی تھی۔ ان سے تنگ آ کر اشفاق نے بہت مشکل سے مکان خالی کرایا۔

اسی قسم کے کئی واقعات کے بعد اشفاق نے مجھ پر پابندی لگا دی تھی۔ میں اسی لیے خوف زدہ تھی کہ اشفاق اور فرخ کو میرے اس میل جول کا علم نہ ہو پائے۔

اب شاہدہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس دن صبح صبح اس کی پھر پٹائی ہوئی تھی۔ میں پہنچی تو اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ میں نے ہمدردی کی تو وہ پھر رونے لگی۔ میں نے بہت مشکل سے اسے چپ کرایا اور اس سے پوچھا۔

''شاہدہ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ماں تمہیں اتنی بے رحمی سے کیوں مارتی ہے؟''

''چھوڑیں آنٹی، کوئی اور بات کریں۔'' شاہدہ نے کہا۔

میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم اپنی ماں سے بدتمیزی کرتی ہو؟''

''آنٹی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر آپ وعدہ کریں کہ میری بات کسی کو نہیں بتائیں گی تو میں کچھ بولوں۔''

''میں بھلا کسی کو کیوں بتانے لگی؟'' میں نے کہا۔

''نہیں آنٹی، پہلے آپ قسم کھائیں فرخ بھائی کی۔''

میں نے قسم کھالی۔ ''اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ عورت میری سگی ماں نہیں ہے۔'' شاہدہ نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

میں حیران رہ گئی۔ ''سگی ماں نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ میری سوتیلی ماں ہے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اور تمہاری ماں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کہاں گئی؟''

''ان کا انتقال تو اس وقت ہو گیا تھا جب میں صرف تین سال کی تھی۔ ابو نے عہد کیا تھا کہ اب میں شاہدہ کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کروں گا۔''

''پھر...... یہ...... شادی......؟''

''میرا باپ بہت شریف آدمی ہے، لاہور میں ابو کا کراکری کا بزنس تھا۔ پھر کچھ غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ کر وہ ہیرا منڈی جانے لگے۔ میری ماں سے وہیں ایک کوٹھے پر ابو کی ملاقات ہوئی تھی۔''

میں حیرت سے منہ پھاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''ابو شریف آدمی تھے اس لیے وہ اس عورت کو عزت دینے کی خاطر بیاہ لائے لیکن طوائف بھی کبھی سدھری ہے۔ اس کے چکر میں ابو کا بزنس تو پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ مجبوراً انہیں نوکری کرنا پڑی اور ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔''

''تم اسکول کیوں نہیں جاتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جب لاہور میں تھی تو نویں میں پڑھ رہی تھی۔ پھر جب ابو کراچی آ گئے تو میری سوتیلی ماں نے مجھے مزید نہیں پڑھنے دیا اور گھر بٹھا لیا۔ وہ ابھی تک نہیں سدھری ہے۔'' شاہدہ نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ وہ صبح بن ٹھن کر کسی اسکول جاتی ہے، وہ اپنے ملاقاتیوں سے ملنے جاتی ہے۔'' شاہدہ نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''لیکن آنٹی آپ کو اللہ کا واسطہ، یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو ورنہ میری سوتیلی ماں میری جان لے لے گی۔''

میں کچھ دیر بیٹھ کر اوپر آ گئی کیونکہ ساجدہ کے آنے کا بھی وقت ہو گیا تھا۔

اب مجھے اس معصوم بچی پر کچھ زیادہ ہی ترس آنے لگا

Urdu Soft Books

تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر ہوگئی تھی کہ ساجدہ ایک طوائف ہے جو شادی کے بعد بھی اپنی روش تبدیل نہیں کر سکی۔ اگر محلے والوں کو علم ہوگیا تو ان کا ردِعمل بہت شدید ہوگا۔ وہ میرے کہنے سے پہلے ہی ساجدہ کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔"

میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ ایسی کوئی نوبت آئے، میں خود ہی اشفاق سے بات کرتی ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ شاہدہ نے مجھے فرخ کی قسم دی ہے کہ میں اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کروں گی۔ میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھی۔

دو، تین مہینے اسی اضطراب کے عالم میں گزر گئے۔ میں نے ایک آدھ دفعہ دبی زبان میں اشفاق سے کہا بھی کہ مکان خالی کرالیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ان کے کرائے دار بہت شریف ہیں، پابندی سے کرایہ دیتے ہیں، کسی بات میں مداخلت نہیں کرتے۔ مجھے ایسے کرائے دار پھر کہاں ملیں گے؟

"لیکن وہ ساجدہ تو پوری جلاد ہے وہ اپنی نوجوان بیٹی کو......"

"اس کی بات چھوڑو کلثوم۔" اشفاق نے بیزاری سے کہا۔ "یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے، ہم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟"

"ابو!" فرخ نے ہنس کر کہا۔ "امی کو شاید یہ اعتراض ہے کہ ساجدہ آنٹی ان سے گھلتی ملتی نہیں ہیں۔"

"تم زیادہ بک بک مت کیا کرو، میری بلا سے، وہ اپنے بچوں کو ذبح کردے۔"

ان سب باتوں کے باوجود میں نے شاہدہ سے تنہائی میں ملنا نہیں چھوڑا۔

ایک دن میں گئی تو شاہدہ خلافِ معمول بہت اداس تھی۔ میں نے اداسی کا سبب پوچھا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"ارے ارے، کیا ہوگیا؟" میں نے اسے سینے سے لگا کر اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"آنٹی، امی میری شادی ایک ایسے آدمی سے کرا رہی ہیں جو نہ صرف عمر میں مجھ سے بہت بڑا ہے بلکہ بالکل جاہل ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "شکور عمر میں مجھ سے کم سے کم پندرہ سال تو بڑا ہوگا۔ یہ سمجھ لیں مجھ سے دگنی عمر کا ہے۔ وہ بالکل جاہل اور اجڈ آدمی ہے اور رکشا چلاتا ہے۔"

"تمہارے ابو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابو تو وہاں میری شادی کرنا نہیں چاہتے ہیں لیکن

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

میری سوتیلی ماں انہیں مجبور کررہی ہے۔ شاید اس نے ان جاہل لوگوں سے اچھی خاصی رقم لے لی ہے۔ اسی لیے ابو پر دباؤ بڑھا رہی ہے کاش...... کاش، میری سگی ماں زندہ ہوتی۔'' یہ کہہ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دلاسے دیے کہ تم فکر مت کرو، تمہارے ابو ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

''وہ امی کے دباؤ میں ہیں، وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتے۔''

''بیٹا، تم نے تو قسم دے کر مجھے خود ہی منع کر دیا ہے ورنہ میں تمہاری زندگی برباد نہ ہونے دیتی۔''

''نہیں آنٹی!'' وہ آنسو پوچھ کر بولی۔ ''آپ تو بہت اچھی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ میری ماں آپ کے ساتھ بدسلوکی کرے۔ میرے مقدر میں جو بھی ہے، وہ ہو کر رہے گا۔''

میں دل گرفتہ سی گھر آگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس مظلوم بچی کی مدد کیسے کروں؟ میں تو اشفاق یا فرخ سے یہ بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ شاہدہ نے مجھے قسم ہی ایسی دی تھی۔

چند دن بعد مجھے شاہدہ نے روتے ہوئے بتایا کہ کل ابو نے اس رکشا والے سے میری منگنی کر دی ہے اور تین ماہ بعد شادی ہے۔

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ شام کو ساجدہ دروازے پر دستک دے کر ہمارے گھر آئی تو میں حیران رہ گئی۔

''میں مٹھائی لائی ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ میں نے اس پورے عرصے میں اسے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''کیسی مٹھائی ہے؟'' میں بھی اخلاقاً مسکرا کر بولی۔

''کل میری بیٹی کی منگنی ہوگئی ہے۔'' یہ کہہ کر ساجدہ وہاں سے روانہ ہوگئی اور میں مٹھائی کی پلیٹ کو گھورتی رہ گئی۔

میں شدید خلجان میں مبتلا تھی کہ اس مظلوم بچی کو اس کی سوتیلی ماں سے کیسے بچاؤں؟

دوسرے دن میں موقع پا کر پھر شاہدہ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بہت اداس اور مغموم تھی، بات بات پر رو رہی تھی۔ روتے ہوئے بولی۔ ''آنٹی، میں اس جاہل آدمی سے کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔ آپ دیکھیے گا، میں کچھ کھا کر اپنی زندگی ختم کرلوں گی، شادی کے بعد بار بار مرنے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی مرتبہ جان دے دی جائے۔''

''ایسی بات نہیں کرتے بیٹے۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''اور میں کیا کرسکتی ہوں؟'' وہ پھر رونے لگی۔ میں رخصت ہونے لگی تو وہ بولی۔ ''آنٹی، ہوسکتا ہے کہ اب ہماری ملاقات نہ ہو، کل سے میری ماں کے اسکول کی چھٹیاں ہورہی ہیں۔ اسکول کی چھٹی تو مجبوری ہے ورنہ ابو کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ چھٹیوں کے باوجود کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے؟'' وہ گلے لگ کر روتی رہی اور بولی۔ ''خدا حافظ آنٹی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

میں بوجھل دل کے ساتھ واپس آگئی۔ میں دل ہی دل میں اس کے الفاظ سے ہول رہی تھی کہ میں کچھ کھا کر اپنی زندگی ختم کرلوں گی، رخصت ہوتے وقت بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ سے آخری ملاقات کر رہی ہو۔

میں اسی کشمکش اور اضطراب میں تھی کہ اشفاق آفس سے لوٹ آئے۔ انہوں نے میری شکل دیکھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے کلثوم، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بس سر میں شدید درد ہے۔''

رات کو میں نے اشفاق سے کہا۔ ''آپ کی نظر میں کسی ایسے شریف لڑکے کا رشتہ ہے جس کا تعلق پنجاب سے ہو؟''

''کیوں بھئی، خیریت؟'' اشفاق نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تم نے رشتے کرانا کب سے شروع کر دیے؟''

''ایک بہت ہی شریف اور معصوم بچی کے لیے رشتے کی ضرورت ہے۔'' میں نے شاہدہ کا نام لیے بغیر کہا۔ ''لڑکی بہت خوب صورت اور گھریلو کام کاج میں طاق ہے لیکن اسے زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ میٹرک میں اسے اسکول چھوڑنا پڑا۔''

''ایک رشتہ ہے تو۔'' اشفاق نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں کل اس کے باپ سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔''

میں خوش ہوگئی کہ اشفاق نے زیادہ جرح نہیں کی۔

''دوسرے دن اشفاق نے مجھے بتایا کہ میرے اسسٹنٹ حنیف صاحب کا تعلق گجرات سے ہے۔ ان کا بیٹا ڈپلوما ہولڈر ہے اور دبئی کی کسی کمپنی میں سپروائزر ہے۔ سلجھے

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ہوئے معقول لوگ ہیں، اکلوتا بیٹا ہے۔ انہیں اس کے لیے پنجاب ہی کی لڑکی کی تلاش ہے۔''

پھر میں نے ڈرتے ڈرتے انہیں بتایا کہ شاہدہ کے والدین اس کی شادی ایک جاہل رکشا ڈرائیور سے کررہے ہیں اگر اس بچی کی شادی حنیف صاحب کے بیٹے کے ساتھ ہوجائے تو بہت اچھا رہے گا۔

''لیکن کلثوم، شاہدہ کی تو منگنی ہوچکی ہے۔'' اشفاق نے کہا۔

''آپ شاہدہ کے باپ سے بات تو کریں۔ منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ یوں بھی وہ لوگ شاید ساجدہ کے رشتے دار ہیں، اس لیے شاہدہ کا باپ مجبور ہوگیا ہے۔''

اشفاق نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے یہ سب تفصیل کیسے معلوم ہوئی۔

دوسرے دن اشفاق نے شاہدہ کے باپ کو گھر بلالیا اور انہیں حنیف صاحب کے بیٹے کے بارے میں بتایا۔

وہ خوش ہوگیا اور بولا۔ ''اشفاق صاحب! اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مجھے بھی سعودی عرب میں جاب مل رہی ہے۔ میں جانے سے پہلے شاہدہ کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جوان بچی کے سر پر باپ موجود نہ ہو تو کیا کچھ ہوسکتا ہے بس میں اسی مجبوری کی بنا پر راضی ہوگیا تھا۔ آپ حنیف صاحب سے ضرور بات کریں۔''

دوسرے دن حنیف صاحب، اشفاق کے ساتھ خود ہی آگئے۔ اشفاق نے شاہدہ کے باپ کو بھی بلالیا۔ ان لوگوں میں کچھ دیر بات ہوتی رہی۔ پھر وہ لوگ چائے پی کر خوشی خوشی رخصت ہوگئے۔

دو دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ شاہدہ کی منگنی شکور سے توڑ دی گئی ہے۔ اب اس کی شادی حنیف صاحب کے بیٹے عرفان سے ہورہی ہے۔

اتفاق سے عرفان اگلے ہی مہینے پاکستان آرہا تھا۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق ایک ماہ کے اندر اندر نہ صرف شاہدہ کی شادی ہوگئی بلکہ وہ رخصت ہوکر دبئی چلی گئی۔

حنیف صاحب بہت خوش تھے کہ انہیں اتنی سگھڑ، خوب صورت اور فرمانبردار بہو ملی ہے۔ میں بھی بہت خوش تھی کہ میں نے ایک مظلوم کی زندگی تباہ ہونے سے بلکہ اسے بے موت مرنے سے بچالیا تھا۔

موتی

سیپیوں میں لعاب آمیز مواد جو سخت ہوکر موتی بن جاتا ہے کافی قیمتی ہوتا ہے اور جواہرات کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ موتی کی پیداوار کے بڑے بڑے مراکز سری لنکا، خلیج فارس، جاپان، شمال مشرقی بورنیو، کیلےفورنیا کے ساحل اور خلیج میکسیکو ہیں۔

مرسلہ: عبادت علی۔ سیالکوٹ

موتی جھرا

ایک بیماری۔ ابتدا میں دردِ سر اور طبیعت بوجھل رہتی ہے۔ عام طور پر پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ گلے اور سینے پر باریک باریک سرخ دانے سے نکل آتے ہیں۔ جن کے ساتھ ہی بخار بھی ہوجاتا ہے۔ علاج کے طور پر سچے موتی منقیٰ کے ساتھ کھلائے جاتے ہیں تاکہ اندرونی گرمی دانوں کی صورت میں باہر نکل آئے۔ بے احتیاطی کی صورت میں یہ مرض مہلک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر ٹھنڈ لگ جائے تو پھیپھڑوں پر بہت جلد اثر ہوجاتا ہے۔ نمونیہ وغیرہ قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا احتیاط رکھنی چاہیے کہ کھانسی وغیرہ نہ ہو۔ ٹھنڈ سے بچنا چاہیے۔ چوتھے یا پانچویں روز یہ دانے مرجھانے لگتے ہیں اور مریض اچھا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

مرسلہ: سلیم فرمان نیازی۔ سیالکوٹ

اشفاق کہتے تھے، کلثوم! تم نے اپنی پوری زندگی میں نیکی کا یہ ہی کام کیا ہے۔ اس کا اجر تو تمہیں اللہ ہی دے گا۔

کچھ عرصے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔ ساجدہ بھی ہمارا مکان چھوڑ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ دوبارہ لاہور شفٹ ہوگئے ہیں، شاہدہ کے باپ کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی تھی۔

پھر کئی سال گزر گئے، میرے تینوں بچوں کی شادیاں ہوگئیں۔ فرخ شادی کے بعد امریکا شفٹ ہوگیا، پھر اس نے چھوٹے بھائی کو بھی وہیں بلالیا۔ سعدیہ کی شادی ایک سرکاری افسر سے ہوگئی۔ وہ ان دنوں اسلام آباد میں مقیم تھی۔

گزشتہ ہفتے اچانک میرے داماد تسلیم نے اسلام آباد سے ٹیلی فون کیا کہ سعدیہ کی طبیعت خراب ہے۔ اس کی ڈیلیوری میں کچھ پیچیدگی ہے، آپ اسلام آباد آجائیں تو میری ڈھارس بندھی رہے گی۔ گھر میں کسی بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔

میں اس کا ٹیلی فون ملتے ہی اسلام آباد کے لیے روانہ

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

ہو گئی۔

بہاولپور سے ٹرین میں تین چار عورتیں سوار ہوئیں۔ سفر کے دوران میں عورتیں ایک دوسرے سے بات کر کے اپنا وقت گزار لیتی ہیں، وہ مجھ سے بھی بات کرنے لگیں۔ وہ کسی شادی کی تقریب سے آرہی تھیں۔ اسی شادی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔

وہ مجھ سے بھی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔ میری بیٹی بیمار ہے۔

''اللہ شفا دے گا بہن۔'' ایک عورت خلوص سے بولی، پھر وہ دوسری عورت سے مخاطب ہوئی۔ ''سائرہ بہن، مجھے شادی کی تصویریں تو دکھاؤ۔''

''ہاں، تصویروں کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔'' سائرہ نے کہا۔

میں نے سائرہ کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟

اس نے ایک البم اس عورت کے حوالے کر دیا جو میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

وہ البم دیکھنے لگی تو غیر ارادی طور پر میری نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں۔

ایک گروپ فوٹو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھی۔ اس گروپ فوٹو میں شاہدہ بھی بیٹھی تھی۔

میں نے اس خاتون سے پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ میری بہو ہے شاہدہ۔'' خاتون نے جواب دیا۔ ''عرفان رشتے میں میرا بھتیجا ہے۔''

میں نے ان عورتوں کو بتایا کہ شاہدہ چند برس پہلے کراچی میں میرے ہی گھر میں کرائے پر رہتی تھی۔ میرے شوہر ہی نے عرفان کے ساتھ اس کی شادی کرائی تھی۔ بہت پیاری بچی ہے لیکن اس کی ماں بہت ظالم تھی۔

میری اس بات پر سائرہ چونک کر بولی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ اصل میں اس بے چاری کی ماں سوتیلی تھی، اس لیے اس پر بہت ظلم ڈھاتی تھی۔ اس نے ایک طرح سے شاہدہ کو گھر میں قید کر رکھا تھا۔ وہ اصل میں اچھے خاندان کی عورت نہیں تھی۔''

''بی بی ذرا منہ سنبھال کر بات کرو۔ شاہدہ کی کوئی سوتیلی ماں نہیں ہے۔ وہ میری سگی بہن کی بیٹی ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ ساجدہ باجی اس پر ظلم کرتی تھیں۔''

''میں تو یہی دیکھتی تھی کہ وہ اسے کہیں آنے جانے نہیں دیتی تھی۔'' میں نے خفت سے کہا۔

''ارے بہن، شاہدہ بہت آفت کی پرکالہ لڑکی تھی۔ اسے بات اِدھر کی اُدھر لگانے میں تو کمال حاصل تھا۔ اس نے اپنے سگے ماموں اور ماں میں ایسی لگائی تھی کہ ماموں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور باجی سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ لیا۔ وہ لوگ لاہور میں تھے تو کوئی ان سے نہیں ملتا تھا۔ پھر رمضان بھائی نے اپنا تبادلہ کراچی کرا لیا۔''

''تو کیا رمضان صاحب کا کراکری کا بزنس نہیں تھا؟''

''بزنس!'' سائرہ طنز سے بولی۔ ''انہیں تو ملازمت بھی بہت معمولی سی ملی تھی۔ پھر ان کا تبادلہ کراچی ہوا تو باجی نے بھی اسکول میں بچیوں کو دست کاری سکھانا شروع کر دی اس چکر میں شاہدہ کی پڑھائی مکمل نہ ہو سکی۔''

''لیکن شاہدہ نے تو کہا تھا کہ......''

''شاہدہ نے کچھ بھی کہا ہو وہ اوّل درجے کی جھوٹی ہے۔'' عرفان کی رشتے دار خاتون بولیں۔ ''اس نے اپنی لگائی بجھائی سے پورے سسرال میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ یہ تو عرفان ہی کا دل ہے کہ اسے برداشت کر رہا ہے، اس کی ماں شاید اسی لیے اسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی کہ وہ قصے کہانیاں گڑھ کر سنسنی پھیلانے کی عادی تھی۔ ابھی شادی کے موقع پر اس نے عرفان کے چچازاد اور اس کی بیوی کے درمیان ایسا فساد ڈالا ہے کہ میں کیا بتاؤں؟'' سائرہ نے کہا۔ ''عجیب مزاج کی لڑکی ہے۔ وہ نہ جانے کیوں شروع ہی سے باجی کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ وہ بات بات پر باجی سے زبان درازی کرتی تھی۔ باجی غصے میں آکر اسے مار بیٹھتی تھی۔ یوں، اس کے ذہن میں ماں سے دشمنی پلتی رہی۔''

وہ عورتیں لاہور اتر گئیں میں دیر تک سوچتی رہی کہ شاہدہ اور ساجدہ میں ظالم کون اور مظلوم کون تھا؟ سائرہ کی یہ بات بھی درست ہی تھی کہ وہ ساجدہ کی سگی بہن تھی۔ میں اسے دیکھ کر اس لیے چونکی تھی کہ اس کی شکل ساجدہ سے بہت ملتی تھی۔

بس اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شاہدہ کس قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا تھی۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

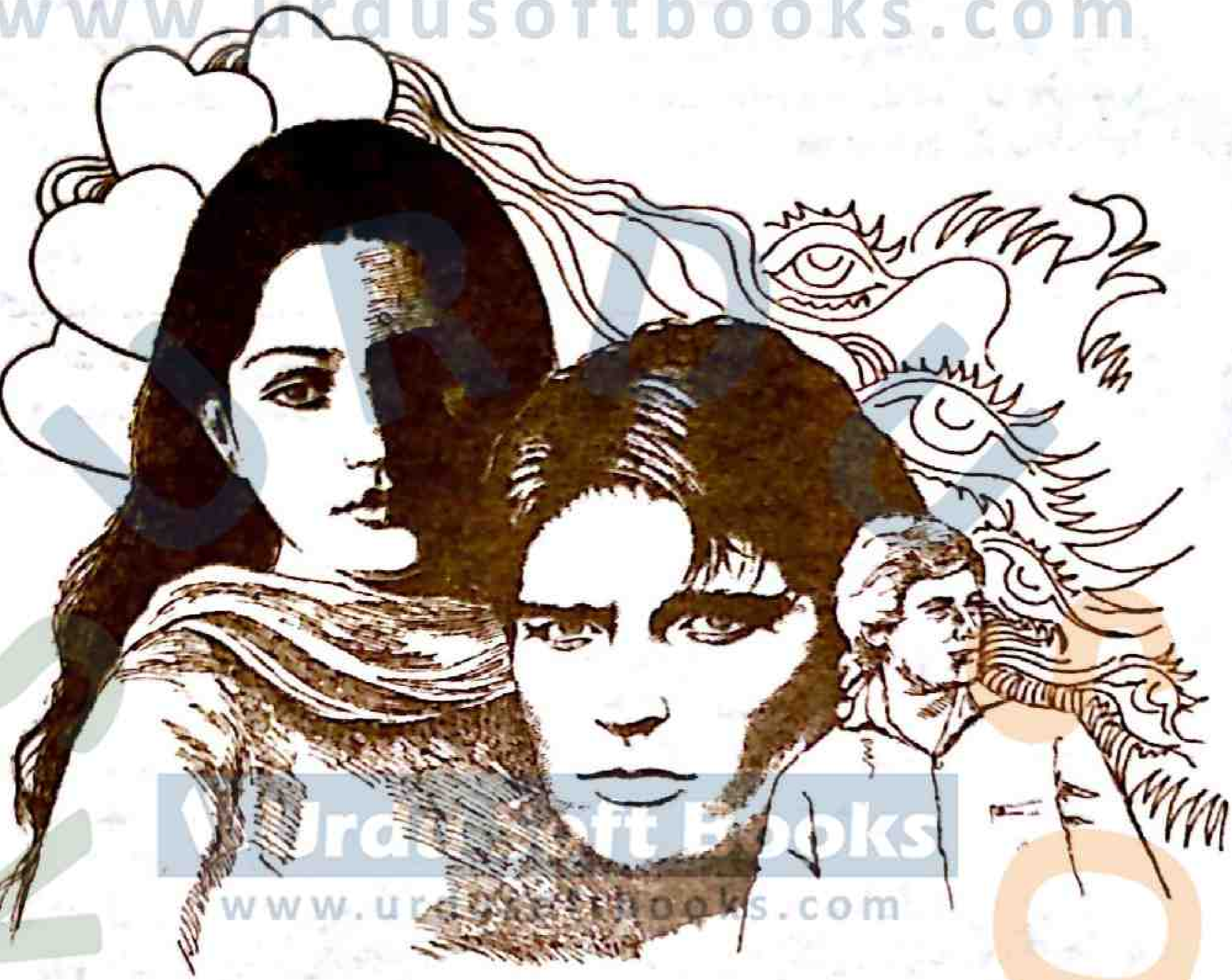

فریبِ نظر

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک اور واقعہ کہانی کے انداز میں بھیج رہا ہوں۔ گزشتہ تحاریر کی طرح قارئین اس تحریر کو بھی پسندیدگی کی سند عطا کریں گے۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جو دیکھتے ہیں سوچتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جو میرے دوست واصف کی ہے۔ ہم پاکپتن شریف کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

واصف اور میرا بچپن اکٹھا گزرا۔ وہ گاؤں کے ایک چھوٹے زمیندار کا بیٹا تھا۔ ہم سارا دن اکٹھے کھیلتے تھے۔ مجھے آج بھی سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بڑا اسنہرا دور تھا۔ واصف کے گھر کے صحن میں ایک بیری اور شہتوت کا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

درخت تھا۔ جن کی چھاؤں میں ہم گرمیوں کی چھٹیوں کا کام کیا کرتے تھے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہمارے والدین نے پانچویں کلاس کے بعد ہمیں ساتھ والے گاؤں کے ہائی اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ وہاں ہم آٹھویں تک اکٹھے پڑھتے رہے پھر ابو جان نے مجھے شہر کے اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ میں صبح اسکول جاتا اور شام کو گھر واپس آتا تھا۔ میری اور اس کی ملاقات جمعہ والے دن ہوتی تھی۔

وقت کا پہیا دھیرے دھیرے گردش کرتا رہا۔ میٹرک کے ایگزام قریب تھے۔ ایک شام واصف ہمارے گھر آیا۔ ہم کافی دیر گپ شپ لگاتے رہے، باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بتا رہے تھے کہ گورنمنٹ ہائی اسکول تحصیل نور پور میں پیپر ہوں گے۔ میں یہ سن کر خوش ہو گیا کیونکہ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر اپنے گھر چلا گیا۔ امتحان سے ایک ماہ قبل ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور وہیں رہنے لگے۔ ہمارے استاد ارشاد صاحب بھی ہمیں وہیں ٹیوشن پڑھانے آجاتے تھے۔ وہ ہمیں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور میتھ پڑھاتے تھے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے میں گھر آیا تو واصف سے میری ملاقات ہوئی۔ میں اسے بیٹھک میں بٹھا کر گھر چلا گیا اور چائے کا کہہ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

''اعجاز یار آپ کا بھائی علی بتا رہا تھا کہ آپ اب شہر میں رہتے ہو۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ میں بھی ادھر آجاؤں کیونکہ جو وقت شہر آنے جانے میں لگے گا۔ وہ بھی بچ جائے گا اور میں اتنی دیر میں پیپر کی تیاری بھی کرلوں گا۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں بھی پیپرز کے دوران وہاں رہوں گا۔ آپ ایسا کریں کہ میرے ساتھ ہی ادھر رہ لیں۔''

''شکریہ یار میں آج ہی اپنے ابو کو جاکر بتاتا ہوں، اور آپ واپس کب جاؤ گے؟''

''میں کل سیکنڈ ٹائم جاؤں گا۔ صبح جمعہ ہے۔ اسکول بند ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ اتنی دیر میں میرا بھائی چائے لے کر آگیا۔ واصف اور میں نے اکٹھے چائے پی۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھا رہا پھر اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے دن ہم اکٹھے شہر والے مکان میں چلے گئے۔ رول نمبر سلپ ہمیں مل گئی تھی۔ ہمارا پہلا پیپر انگلش اے کا تھا۔ ہم سب دوست انگلش کے پیپر کی تیاری کرنے لگے۔

آج جب مجھے وہ دن یاد آتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے۔ وہ اس لیے کہ اسٹوڈنٹس جتنا ان دنوں پڑھتے ہیں، اگر سال بھر اسی طرح پڑھیں تو کامیاب ہو جائیں۔ ہم دن کو پیپر دے کر واپس آتے، کچھ دیر آرام کرتے پھر اگلے پیپر کی تیاری شروع کر دیتے اور رات کا کھانا کھا کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے۔ اگلے دن چھٹی ہوتی تھی۔ وہ دن بھی پیپر کی تیاری میں گزر جاتا تھا۔ میں اور واصف رات کو ایک ہی چارپائی پہ سوتے تھے۔ ہم رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر گپ شپ لگاتے تھے۔ اس دن میرا تیسرا پیپر جو کہ فزکس کا تھا۔ جبکہ واصف کا اسلامیات اختیاری کا پیپر تھا۔ ہم پیپر دے کر کمرے میں واپس آکر میتھ کی تیاری کرنے لگے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اور واصف چارپائی پہ لیٹے ہوئے تھے۔

''یار اعجاز آپ کو ایک بات بتاؤں؟'' وہ میری طرف کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

''ہاں بتاؤ؟''

''مجھے لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں'' وہ بولا۔ ''میرا دل چاہتا ہے دنیا کی سب لڑکیاں میرے اردگرد بیٹھی ہوں اور میں کسی بادشاہ کی طرح ان کے درمیان بیٹھا رہوں۔''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں یار یہ حقیقت ہے اور اب بھی دو لڑکیوں کے ساتھ میری فرینڈشپ چل رہی ہے۔ ان سے اکثر ملتا بھی ہوں۔''

آخری فقرہ اس نے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ واصف میرا ہم عمر تھا۔ میری عمر گو کہ اس وقت اٹھارہ سال تھی ۔۔۔ مگر ۔۔۔ میں ان باتوں سے دور رہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ ابو جان کا ڈر تھا۔

''کمال ہے یار۔'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔

''آپ سناؤ کسی لڑکی کو دوست بنایا ہے؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یار۔'' میں نے جھینپے جھینپے انداز میں جواب دیا۔

پھر وہ اپنی باتیں بتانے لگا۔ میں بھی سنتا رہا۔ جب

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

اکتاہٹ محسوس ہوئی تو آخر میں نے کہا۔ ''اچھا یار اب پیپر کی تیاری کرنی چاہیے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

پھر ہم پیپر کی تیاری کرنے لگے۔ دن گزرتے گئے۔ ہمارے پیپرز ختم ہوئے تو ہم واپس گاؤں آ گئے۔ جب رزلٹ آیا تو ہم دونوں پاس ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد واصف نے آرمی جوائن کر لی اور میں نے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ وہ جب چھٹی پہ گھر آتا مجھ سے لازمی ملتا تھا۔ اس کی گفتگو کا محور لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ میں اس کی باتیں مزے لے لے کر سنتا تھا۔ اب میں بھی بھرپور نوجوان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں لڑکیوں میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ میں جب سیکنڈ ایئر میں تھا۔ انہی دنوں ایک حادثے میں میری بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ واصف ان دنوں کھاریاں کینٹ میں تھا۔ جب اسے پتا چلا تو وہ بھی آیا تھا اور یہ میری اور اس کی اس گاؤں میں آخری ملاقات تھی۔ وہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ وہ مجھے ہنس ہنس کر اپنی فلرٹ بازیوں کے قصے سناتا رہا۔ ''یار اعجاز جب سے آرمی جوائن کی ہے۔ سب برادری والے بہت عزت کرنے لگے ہیں اور سچ پوچھو تو جہاں جاتا ہوں لڑکیاں بہت لفٹ کرواتی ہیں۔''

حسبِ سابق اس کی تان لڑکیوں پہ آ کے ٹوٹی تھی۔

''اچھا۔'' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں موبائل فون نئے نئے متعارف ہوئے تھے۔ وہ جاتے ہوئے اپنا نمبر دے گیا اور میرا نمبر لے گیا تھا۔ ہمارا اب فون پہ رابطہ ہوتا تھا۔ میری اور اس کی جب بھی بات ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے نئے نئے معاشقوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ میں اسے فوجی فلرٹ باز کہتا تھا۔ جب میں اسے اس نام سے پکارتا تھا۔ وہ ہنس کر کہتا۔

''اعجاز! آپ جو بھی کہو میں لڑکیوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

☆......☆

وہ گرمیوں کی ایک خوبصورت سی شام تھی۔ دن بھر وقفے وقفے سے بارش کے بعد مطلع صاف ہو چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں صحن میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ سرگزشت کے ایک پرانے شمارے میں طاہر جاوید مغل صاحب کی سلسلہ وار کہانی ''تاوان'' پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ واصف کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کر لی۔ سلام دعا اور حال چال پوچھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اعجاز! آج میں بہت خوش ہوں۔ ہماری یونٹ افریقا جا رہی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں پاکستان سے دوسرے ملک جاؤں گا۔''

''اچھا یار موج کرنا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ کافی دیر ہماری افریقا کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ چند دن بعد وہ افریقا چلا گیا تھا۔ چھ سات ماہ بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ اس دوران مجھ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ میں ذرا ذرا سی بات پہ غصہ میں آ جاتا تھا۔ میں نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بعد فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل میں جاب کر لی۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ اچانک میری زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا کہ میں یکسر بکھر گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ 2009 اوائل مارچ کے دن تھے۔ میرے مخالفین کا قتل ہو گیا۔ انہوں نے میرے خلاف قتل کی ایف آئی آر درج کروا دی۔ پورا سال تھانے، جیل اور عدالتوں میں گزرا تھا۔ واصف سے میرا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ رہا ہونے کے بعد میں گھر والوں کے ساتھ ساہیوال شفٹ ہو گیا تھا۔ دشمنوں کی اوٹ پٹانگ کال سے تنگ آ کر میں نے اپنا نمبر بھی بدل لیا تھا۔ واصف کو افریقا گئے ہوئے تقریباً دو سال ہونے والے تھے۔ پاکپتن شریف والے گاؤں میں اب میں نہیں جاتا تھا۔

زندگی پھر سے اپنی ڈگر پہ چلنے لگی تھی۔ ہمیں ساہیوال آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ گزرا ہوا وقت جو بہت کٹھن تھا۔ مجھے اب خواب کی طرح لگتا تھا۔ ایسا خواب جس نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ گاؤں، وہ گھر جس میں میرا بچپن گزرا تھا اور واصف جو میرا بہت گہرا دوست تھا۔ میں نے بارہا اس کے بارے میں پتا کیا، لیکن میرا رابطہ نہ ہو سکا۔

☆......☆

وہ جنوری کی ایک خنک شام تھی۔ میں ان دنوں (مکوآنہ) فیصل آباد میں جاب کرتا تھا۔ پانچ بجے ڈیوٹی آف ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ مجھے

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

لیٹے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پہ نظر ڈالی۔ ان نون نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پھر خاموش ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بے دلی سے کال ریسیو کرلی۔

''السلام علیکم۔'' یہ آواز میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میں لیٹا ہوا تھا، ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''وعلیکم السلام واصف کیسے ہو یار؟''

''اعجاز! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟''

''بس یار! زندہ ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا۔ جی شکر کرو کہ زندہ ہو۔ اس دور میں زندہ رہنا ہی بہت بڑی بات ہے،'' موبائل کے اسپیکر سے اس کی آواز ابھری۔ ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔ ''مجھے پاکستان آئے دو ماہ ہوگئے ہیں۔ مجھے ابو نے آپ کے بارے میں بتایا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج کل میں پتوں عاقل میں ہوں۔ پندرہ دن بعد واپس گھر آرہا ہوں۔ آپ کہاں ہو؟ آپ کا نمبر بھی بڑی مشکل سے ملا ہے۔''

وہ نان اسٹاپ بولتا چلا گیا۔ مجھے بولنے کا موقع ملا تو میں نے کہا۔ ''میں فیصل آباد میں ہوں۔ آپ کا نمبر میرے پاس بھی نہیں تھا۔''

''اچھا جب میں گھر آؤں گا تو آپ بھی ساہیوال آجانا میں آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ سے ملے بہت عرصہ ہوگیا ہے۔''

اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ ہماری لگ بھگ ایک گھنٹے بات ہوئی۔ کافی باتیں ہوئیں۔ کال ڈراپ ہوئی تو میں کنٹین پہ چائے پینے چلا گیا۔ میں چائے پیتے ہوئے آنے والے لمحوں کے بارے سوچ رہا تھا۔ میں چائے پی ہی رہا تھا کہ میرا ایک دوست بھی آگیا۔ میں نے اس کے لیے بھی چائے منگوالی۔ ہم وہاں کافی دیر بیٹھے گپ شپ لگاتے رہے۔ اسی دوران کھانے کا وقت ہوگیا۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ رات کو ہماری پھر بات ہوئی تھی۔ ہم گزرے وقت کو یاد کرکے خوب ہنستے رہے۔

''واصف! سناؤ یار آج کل آپ کا کتنی لڑکیوں سے چکر چل رہا ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

یہ سن کر وہ تھوڑی دیر چپ ہوگیا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''اعجاز! اب میں نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔''

''میں نہیں مانتا یار۔''

''میں جب ملنے آؤں گا تو آپ کو یقین دلا دوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہماری کچھ دیر مزید بات ہوتی رہی۔ پھر کال منقطع ہوگئی۔ پندرہ دن بعد میں فیصل آباد سے واپس اپنے گھر آگیا تھا۔ ان دنوں میرا اور واصف کا فون پر روز رابطہ ہوتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ واصف کی کال آگئی۔

''میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔'' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

''او کے ٹھیک ہے۔ جب آپ کا دل چاہے آجانا۔ میں بھی گھر آگیا ہوں۔''

ہماری دس منٹ بات ہوئی پھر اس نے یہ کہہ کر کال منقطع کردی۔ ''اچھا اب باتیں سب روبرو ہوں گی۔''

اگلے دن لگ بھگ دس بجے واصف ہمارے گھر آگیا۔ وہ ایک روشن دن تھا۔ دھوپ چاروں اطراف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم گرمجوشی سے ملے۔ ایک دوسرے سے حال احوال پوچھا۔ پھر گزرے دنوں کی باتیں شروع ہوگئیں۔

''اعجاز! وہ دن کتنے اچھے تھے۔ کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ جب سے بڑے ہوئے ہیں زندگی مشکل ہوگئی ہے۔''

''ہاں یار آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا۔ جب ہم چھوٹے تھے، آپ کہا کرتے تھے، پتا نہیں ہم کب بڑے ہوں گے؟''

میری بات سن کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے۔ مگر اب اپنے بڑے ہونے کا بھی دکھ ہو رہا ہے۔''

باتوں کے دوران ہم نے چائے وغیرہ پی لی تھی۔ اسی اثنا میں میرا بھائی کھانا لے کر آگیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی ہماری گفتگو جاری رہی۔ کھانے بعد ہم گھومنے پھرنے دریا کی طرف نکل گئے۔ یہ دریا ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے اور سارا سال خشک رہتا ہے۔ تاہم بارشوں اور سیلاب کے دنوں میں اس میں پانی آجاتا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے، باتیں کرتے ہوئے ایک پتھر پہ آکر بیٹھ گئے۔

''اچھا اب بتاؤ کہ آپ کی فلرٹ بازیاں کہاں تک پہنچی ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یار بتایا تو تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔چور چوری چھوڑ سکتا ہے ہیرا پھیری نہیں۔''

وہ تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا۔''اعجاز آپ مجھے بچپن سے جانتے ہیں۔آپ کو یہ بھی پتا ہے میں لڑکیوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔میری کوئی بات آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔''میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔''کچھ ماہ پہلے میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔''

''کیسا واقعہ؟''میں نے تجسس زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''اچھا پھر سنو۔''وہ اپنی کہانی سنانے لگا۔

☆......☆

جب میں افریقا گیا تھا۔شروع شروع میں میرا دل نہیں لگا تھا۔میں ہر وقت اداس رہتا تھا۔میرا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح پاکستان پہنچ جاؤں۔شاید میں اپنی اس بات پہ عمل بھی کر لیتا مگر وہاں میری دوستی یونٹ کے ایک سپاہی شبیر سے ہوگئی۔وہ بہاولپور کا تھا۔ہم فارغ وقت اکٹھے رہتے، گپ شپ لگاتے۔اس سے وقت ہنسی خوشی گزرنے لگا تھا۔

واصف مجھے اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

''ہماری ڈیوٹی صرف یہ تھی وہاں کے جنگلی قبائل کے باشندوں کو نئی تہذیب سے متعارف کروانا اور پڑھانا لکھانا۔اس مقصد کے لیے وہاں پاکستان کے علاوہ مختلف ممالک کی افواج کی یونٹس بھی آئی ہوئی تھیں۔''

میں دلچسپی سے اس کی روداد سن رہا تھا۔

''ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا اور میری دوستی شبیر سے ہوگئی تھی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری اور اس کی دوستی گہری ہو رہی تھی۔ایک دن شبیر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔''

''واصف آج میری پاکستان اپنے گھر والوں سے بات ہوئی ہے۔گھر والوں نے میری منگنی کر دی ہے۔امی جان کہہ رہی تھیں کہ جب واپس آؤ گے۔تمہاری شادی کر دیں گے۔''

میں نے اسے مبارک باد دی اور کہا یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے۔پھر ہم کھانا کھانے میس میں چلے گئے۔

''وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ہم واپسی کی تیاری کرنے لگے۔آخر وہ دن بھی آگیا جب ہم کراچی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ہم فوراً آپ کے دیئے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

Urdu Soft Books

ائرپورٹ پر تھے۔ وہاں سے ہم پنوں عاقل آگئے۔ چار پانچ دن بعد ہمیں ایک ماہ کی چھٹی پہ گھر بھیج دیا گیا۔ شبیر اور میرا موبائل پہ رابطہ تھا۔ اس نے گھر جا کر مجھے کال کی کہ دس دن بعد میری شادی ہے۔ تم لازمی آنا۔ میرے سات آٹھ دن گھر والوں اور رشتے داروں سے ملتے ملاتے گزر گئے۔ پھر میں شادی سے ایک دن قبل بہاولپور شبیر کے گھر چلا گیا۔“

اس کی روداد میں خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا۔ ابھی تک مجھے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ واصف نے دو سگریٹ سلگائے، ایک میری طرف بڑھا دیا۔ ”شادی میں شبیر کے کافی رشتے آئے ہوئے تھے جن میں لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ میرا دل خوش ہوگیا تھا۔ میں خوب انجوائے کررہا تھا۔ عصر کے وقت میں اور شبیر ان کی بیٹھک کے سامنے چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکشا رکا۔ جس سے کچھ مہمان اترنے لگے۔ جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ شبیر مجھے ”ابھی آیا“ کہہ کر جلدی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔ رکشے سے اترنے والی عورت میری طرف ایک ٹک دیکھنے لگی۔

میں بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ عورت انتہائی خوبصورت تھی۔ سرخ وسفید گول چہرہ، روشن پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ کم وبیش چالیس سال کی تھی۔ مگر اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا، مسکرائی اور گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے ہمراہ آنے والا ایک مرد اور لڑکی بھی گھر چلے گئے۔ میرا دل بے قابو ہونے لگا تھا۔ اس کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش میں مچلنے لگا۔ کچھ دیر بعد شبیر بھی آگیا۔ وہ مجھے بھی گھر لے گیا۔ ہم دونوں کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شام ہوگئی۔ ہم نے رات کا کھانا جلدی کھالیا تھا۔ وہ مہندی کی رات تھی۔ پورا گھر رنگ برنگی لائٹس اور قمقموں سے سجا ہوا تھا مگر میری آنکھیں اس چاند چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دلہن کو مہندی لگائی جارہی تھی۔ میں اپنے موبائل سے تصویریں بنانے لگا۔ اچانک مجھے وہ نظر آگئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کو ٹھوکا دیا اور میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس کے لبوں پہ دل آویز مسکراہٹ ابھری۔ لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا۔

میں نے جھٹ سے اس کی دو تین تصویریں بنالیں۔“

وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا دل اس کی قربت کے لیے مچلنے لگا تھا۔ مہندی کی رسم ختم ہوئی تو سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں بستر پہ لیٹا اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ گو کہ تصویر صاف نہیں تھی مگر وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر سو گیا۔ اگلے دن برأت تھی۔ میں صبح سویرے اٹھا اور حمام پہ چلا گیا۔ شیو کروائی اور نہا کر گھر آگیا۔ گھر آکر میں لباس بدل کر تیار ہوا۔ بارات منڈی یزمان جانی تھی۔ میں نے شبیر کو گاڑی کا پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ برأت روانہ ہونے سے پہلے ایک لڑکا شبیر کا پیغام لے کر میرے پاس آیا کہ وہ بلا رہا ہے۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ بولا۔ ”واصف بھائی امی جان کی دوست خالہ شائستہ اور ان کی بیٹی اور داماد کو بھی اپنی گاڑی میں لے جانا۔ انہیں گاڑی نہیں مل رہی۔ آپ کے لیے جو گاڑی بک کروائی تھی وہ آگئی ہے۔ آپ اس لڑکے کو ساتھ لے جائیں، گاڑی دکھا دے گا۔“

میں اس کے ساتھ چل پڑا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا اور اسے کہا کہ انہیں بھیج دو۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا انہیں اپنے ساتھ لے کر آگیا۔ وہ تینوں وہی کل والے مہمان تھے۔ وہ عورت جس کا نام شائستہ تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ وہ تینوں بیک سیٹ پہ بیٹھ گئے۔

ہمیں گھر سے نکلے کافی وقت ہوچکا تھا۔ واصف کی کہانی میں انہماک سے سن رہا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

”برأت روانہ ہوئی۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ میں گاہے گاہے بیک ویو مرر میں شائستہ کے مہتابی چہرے کو دیکھ لیتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم دلہن والوں کے ہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے برأت کا پُرتپاک استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانا لگ گیا۔ سب نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد دلہن کی رخصتی ہوئی۔ شام کو ہم واپس بہاولپور آگئے۔ جب ہم گاڑی سے اترے تو شائستہ کے داماد وسیم نے مجھ سے گاڑی کے کرائے کے بارے پوچھا۔ تو میں نے کہا کہ کرایہ میں نے دے دیا ہے۔ اس نے حصہ دینا چاہا تو میں نے انکار کردیا۔ شائستہ بھی قریب کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔

”وسیم آرمی والے بڑے دل والے ہوتے

www.urdusoftbooks.com

ہیں۔واصف حصہ نہیں لے گا۔ویسے بھی افریقا سے کمائی کر کے آیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔وہ نہ صرف میرے نام سے واقف تھی بلکہ افریقا جانے کے بارے بھی جانتی تھی۔
"شکریہ واصف۔" وہ ہنستے بولی۔
پھر وہ تینوں گھر کے اندر چلے گئے۔میں وہیں کھڑا ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیٹھک میں آ کر بیٹھ گیا۔وہاں پہلے بھی دس بارہ مہمان بیٹھے تھے۔عشاء کے وقت میں نے کھانا کھایا اور بستر پہ لیٹ گیا۔میں عالم تصور میں شائستہ کو اپنے پاس دیکھتا رہا۔اس کی دل آویز مسکراہٹ پہ قربان ہوتا رہا۔میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔پھر نیند آنکھوں میں آ بسی۔
اگلے دن ولیمہ تھا۔کافی مہمان آئے ہوئے تھے۔دس بجے کھانا شروع ہوا۔کچھ مہمان کھانا کھا کر رخصت ہو گئے۔ظہر کے وقت تک بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔میرا ارادہ تھا صبح گھر واپس چلا جاؤں گا۔عصر سے کچھ دیر قبل میں گھر سے باہر نکلا۔ایک قریبی شاپ سے سگریٹ کا پیکٹ لیا اور بیٹھک میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ شبیر آ گیا۔
"یار واصف میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"
"خیر تو ہے نا؟" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔
"یار خالہ شائستہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"
یکبارگی میرا دل دھڑکا۔تاہم میں شبیر کی رہنمائی میں چل پڑا۔گھر کا صحن عبور کرنے کے بعد وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔میں بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا چھت پہ پہنچ گیا۔میری نظر شائستہ پہ پڑی۔وہ سامنے چارپائی پہ بیٹھی تھی۔میں اس کے پاس چارپائی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔اسے وفورِ شوق سے دیکھنے لگا۔اس کا چہرہ ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔شبیر نیچے چلا گیا تھا۔
"واصف بیٹھ جاؤ۔"
اس کی مترنم آواز ابھری۔میں اس کے بالمقابل دوسری چارپائی پہ بیٹھ گیا۔وہ حال چال پوچھنے کے بعد گویا ہوئی۔
"واصف میں نے جب تمہیں دیکھا۔مجھے خاصی حیرت ہوئی۔پھر میں نے شبیر سے تمہارے بارے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟" ذرا توقف کے بعد وہ بولی۔"اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔" میں خاموشی سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔"میری نسوانی حس نے مجھے آگاہ کر دیا کہ تم گاہے گاہے میری طرف دیکھتے ہو۔تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک صاف دیکھ لی تھی۔"
میرا دل بے طرح دھڑکا۔وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔"یہ مجھے بہت اچھا لگا۔میں تو خود تم سے قریب ہونا چاہتی تھی۔"
اس کے اس جملے نے میرے اندر طوفان اٹھا دیئے میں اپنی جگہ سے اٹھا۔اس کے برابر میں بیٹھ کر اس کے مغموم چہرے کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔اس نے بھی اپنا سر میرے کندھے سے لگا لیا۔میرے اندر جذبات کا طوفان سا اٹھنے لگا تھا۔ میں مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس نے کہا۔"واصف تمہاری شکل کافی حد تک عدنان سے ملتی ہے۔بالکل وہی چہرہ، ہیر اسٹائل، وہی آنکھیں، اسے بچھڑے آٹھ برس ہو گئے ہیں۔"
اس کی بات سن کر میرے جذبات پر اوس پڑ گئی۔میرے ذہن میں سوال ابھرا۔"کیا عدنان اس کا محبوب تھا؟"
"عدنان میری زندگی تھا۔مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔میری آس تھا۔" اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی۔
"شائستہ جی عدنان کون ہے؟ اور آپ بار بار تھا کیوں کہہ رہی ہیں؟" میں نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔
وہ میری طرف دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں میں اتری نمی میں صاف دیکھ رہا تھا۔پھر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔میں غیر ارادی طور پہ اس کا شانہ تھپکنے لگا۔پھر وہ روتے روتے بولی۔"واصف! عدنان میرا بڑا بیٹا تھا۔وہ بھی آرمی میں تھا۔ایک سال پہلے وانا میں وطن دشمنوں سے لڑتے ہوئے وہ شہید ہو گیا۔"
اس کی یہ بات سن کر میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
"ماں جی! پلیز چپ ہو جائیں۔آپ مجھے عدنان ہی سمجھیں۔"
ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔"میں اب بھی ان کے ہاں ملتان جاتا ہوں۔شائستہ کو ماں جی کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔ان کی بیٹی نسرین کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔وہ بھی مجھے اپنا بھائی سمجھتی ہے۔اس دن فلرٹ سے توبہ کر لی کہ عورت صرف کھلونا نہیں، ماں اور بہن بھی ہے۔"

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

جڑواں

محترم ایڈیٹر صاحب

میرے دوست کانام صفدر انجم ہے۔ وہ محکمۂ ریونیو رحیم یارخان میں ملازم ہے۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے جو اس کے قریبی دوست کے ساتھ پیش آیا۔ میں اسے آپ کی خدمت میں ارسال کررہا ہوں۔ اگر معیار پر پورا اترے تو سرگزشت کی قریبی اشاعت میں شامل کردیجیے گا۔

طارق عزیز خان
(رحیم یار خان)

میرا نام ریاض احمد ہے۔ میں نے ضلع رحیم یارخان کے ایک دیہاتی علاقے میں آنکھ کھولی۔ مقامی اسکول سے میٹرک کے بعد خواجہ فرید کالج رحیم یارخان سے انٹر کیا۔ والد کے انتقال کے بعد مجھے ان کی جگہ ایک سرکاری ادارے میں ڈرائیور کی ملازمت مل گئی۔ والد صاحب کے زمانے ہی سے ہمیں ایک سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا جس میں، میں اپنی بوڑھی والدہ اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ میری ملازمت بہت اچھی جارہی تھی۔ تنخواہ نہ کم تھی کہ روٹی کے لالے پڑ جاتے اور نہ اتنی زیادہ کہ... سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ میں ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ گاڑی چلانے میں میرا ہاتھ اتنا سیدھا تھا کہ اکثر و بیشتر افسرانِ بالا مجھے شہر سے باہر اپنے ساتھ لے جاتے۔ دورانِ ملازمت میں نے افسران کے سرکاری دوروں کا فائدہ اٹھا کر پنجاب کے تمام بڑے شہروں کی خوب سیاحت کی۔ اس دوران میری شادی ہوگئی۔ چھوٹے بہن بھائی اسکول سے کالج منتقل ہوچکے تھے۔ گوکہ گزارا ہورہا تھا تاہم میں نے بیوی کے مشورے سے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدلی اور شام کے اوقات میں اسے ٹیکسی کی طرح کرائے پر چلانے لگا۔ میں زیادہ تر ریلوے اسٹیشن سے سواریوں کو اٹھاتا۔ میری کوشش ہوتی کہ دو چار پھیرے لگانے کے بعد رات دس بجے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ سواری میسر آجانے کے بعد چھٹی کے دن گھر والوں کو بھی سیر وتفریح کے لیے جانا میرا معمول تھا۔ زندگی اچھی بسر ہورہی تھی۔ یہ 1995ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ تمام گھر والے چند دن کے لیے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں میرا معمول تھا کہ میں ڈیوٹی سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا پھر اپنے لیے کھانا بناتا اور مغرب سے کچھ پہلے گاڑی لے کر اسٹیشن کی طرف نکل جاتا۔ یہ جنوری کا آخری جمعہ تھا۔ میں غروبِ آفتاب کے بعد گاڑی لے کر اسٹیشن کے باہر واقع فوارے کے قریب کھڑا مسافروں کی راہ تک رہا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگا رکھی تھی۔ گوکہ ابھی دن ڈھلا ہی تھا تاہم سردی کی شدت اور تعطیل ہونے کی وجہ سے فوارا چوک قریب قریب ویرانی کا منظر پیش کررہا تھا۔ وہاں مجھ سمیت دو موٹر سائیکل رکشے بھی موجود تھے جن میں سے ایک کا مالک غائب تھا جبکہ دوسرا اگلی سیٹ پر کمبل کی بکل مارے چپ چاپ اسٹیشن کے داخلی راستے کو تک رہا تھا۔ پشاور سے براستہ لاہور آنے والی عوام ایکسپریس کی آمد کا اعلان ہوچکا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بی گودام کے راستے سے جنگلے کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے چند ایک مسافر دکھائی دیے جو گہری ہوتی ہوئی دھند میں ٹرین کی اگلی لائٹ کا سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کررہے تھے۔ موسم بتدریج سرد ہوتا جارہا تھا اور ہوا کی کاٹ بھی برداشت سے باہر تھی۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ آج چھٹی کرلوں اور گھر جاکر ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر مزے سے ٹی وی دیکھوں۔ تاہم اسی دوران ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹرین اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی۔ میں نے واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا اور سوچا کہ گھر کے قریب کی سواری ہی اٹھاؤں گا تاکہ وقت رہتے گھر پہنچ جاؤں۔ کچھ ہی دیر میں چند مسافر اسٹیشن کی سیڑھیوں سے باہر آتے دکھائی دیے۔ ایک نوجوان مسافر رکشے کو دیکھتے ہی اس پر سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ دو تین مسافر ہاتھوں میں بیگ اٹھائے پیدل ہی ریلوے روڈ کی طرف نکل گئے۔ اب وہاں چار افراد پر مشتمل ایک فیملی تھی جن کے ساتھ کچھ دستی سامان تھا۔ خالی موٹر سائیکل رکشے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے ان لوگوں کی مرکز نگاہ میری ہی ٹیکسی تھی۔ میں نے فرنٹ ڈور کھولا اور سگریٹ کو زمین پر پھینکتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔

''جی سر، سواری چاہیے؟'' میں نے مہذب انداز میں فیملی کے مرد کو مخاطب کیا۔ وہ پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر اسمارٹ سا شخص تھا۔ میں نے اندازہ لگایا جو بعد میں درست نکلا کہ خاتون اس کی بیوی اور ساتھ میں دو لڑکیاں اس کی بیٹیاں تھیں۔ وہ لوگ اپنے حلیے سے پڑھے لکھے معزز گھرانے کے لگ رہے تھے۔ باوقار سی خاتون نے گہرے رنگ کی موٹی شال پہن رکھی تھی جبکہ دونوں لڑکیوں نے شلوار قمیص پر جینز کی جیکٹس اوڑھ رکھی تھیں انھوں سر کو مفلر سے ایسے ڈھانپا ہوا تھا کہ ان کے چہرے واضح تھے۔ ایک لڑکی چھوٹی عمر کی تھی جبکہ دوسری کی عمر کا اندازہ اٹھارہ سے بیس کے درمیان تھا۔ دونوں بہنیں بے پروائی سے چیونگ چباتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''نوجوان، کیا یہ ٹیکسی تمہاری ہے؟'' مرد مسافر نے بلند آواز سے پوچھا۔

''جی سر حکم کریں، کہاں جانا ہے آپ کو؟''

''بھئی بات یہ ہے کہ ہمیں شہر سے کچھ دور جانا ہے۔'' مرد نے بتایا کہ ان کی منزل رحیم یار خان شہر سے 35 کلومیٹر مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے واقع قصبہ جمال دین والی تھا۔ انھیں قصبے سے کچھ پہلے مین سڑک پر واقع ایک ڈیرہ پر جانا تھا۔ جمال دین والی تک رسائی کے لیے پکی سڑک موجود ہے۔ اس وقت سات بجے کا وقت تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں جلد بازی نہ بھی کروں تو انھیں ان کی منزل تک چھوڑنے کے بعد میں دس بجے سے پہلے واپس اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ یوں کل ملا کر مجھے تین سے چار گھنٹے کا سفر درپیش تھا۔ تاہم سچ بات یہ ہے کہ میں اتنے طویل سفر کے موڈ میں نہیں تھا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی اور مجھ پر سستی غالب آ چکی تھی۔ مرد نے مجھے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر دگنا کرایہ ادا کرنے کی پیش کش کی۔

''بات کرائے کی نہیں ہے سر...... دراصل میں......''

''اگر تم چاہو تو رات وہیں ڈیرے پر ہی گزار سکتے ہو۔'' مرد نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''دیکھو بیٹا ہم یہاں اجنبی ہیں اور کسی ضروری کام سے آئے ہیں۔'' خاتون نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''ہم ایسے موسم اور رات میں ہر کسی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر ان کے سامان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ لوگ ٹیکسی کے قریب پہنچے تو میں نے سائیڈ ڈور کھول دیا۔ خاتون دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔ میں نے مرد کے ساتھ مل کر سامان

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

پچھلے حصے میں رکھا۔ ٹائروں کی ہوا چیک کی، اس دوران مرد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور اللہ کا نام لے کر گاڑی گیئر میں ڈال دی۔

ہم لوگ شاہی روڈ سے ہوتے ہوئے چوک بائی پاس پر پہنچے جہاں سے میں نے ٹائروں میں ہوا چیک کروائی اور نزدیکی پمپ سے پیٹرول بھروایا۔ اب ہم شہر سے باہر جانے والے راستے شہباز پور روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ اس دوران میں زیادہ تر خاموش رہا جبکہ وہ لوگ گاہے بگاہے آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ کوکا کولا فیکٹری سے کچھ آگے پہنچے تو مرد نے اپنے پیروں میں موجود بیگ کو ٹٹولا اور اچانک ایک ریوالور نکال کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ میں نے چونک کر مرد کی طرف دیکھا تو وہ بے پروائی سے بولا کہ رات کا وقت اور راستہ سنسان ہے اس لیے اس نے یہ اسلحہ ہم سب کی حفاظت کی غرض سے نکالا ہے۔ بات اس کی ٹھیک ہی تھی تاہم میں کچھ سٹپٹا گیا اور میرے دماغ میں عجیب عجیب خیال گردش کرنے لگے۔ کیا یہ لوگ مجھے لوٹ کر گاڑی چھین لینے کی فکر میں تھے؟ میں نے فوری طور پر اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ پڑھے لکھے خوشحال گھرانے کے معزز لوگ تھے اور انھیں خاص طور پر مجھے لوٹنے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے کچھ پریشان دیکھ کر مرد نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے اپنا نام عارف بتایا اور انکشاف کیا کہ وہ پاک آرمی کا ریٹائرڈ کرنل ہے۔ اس کا.... تعلق لاہور سے ہے اور آرمی کی طرف سے اسے جمال دین والی کے قریب زرعی زمین الاٹ ہوئی تھی۔

کرنل عارف نے کہا۔ ''ہم لوگ چاہتے تو اپنی گاڑی سے بائی روڈ سفر کر سکتے تھے لیکن میرے بچے ٹرین کا سفر کرنا چاہتے تھے۔''

کرنل نے مجھ سے صرف میرا نام پوچھا جو میں نے بتا دیا۔ اس دوران ہم لوگ چوک بہادر پور کراس کر کے جمال دین والی روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی کرنل کی بیوی اور چھوٹی بیٹی سیٹ سے ٹیک لگا کر آرام کر رہی تھیں جبکہ عین میری سیٹ کے عقب میں بیٹھی بڑی لڑکی متواتر چیونگم سے شغل کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے کو تک رہی تھی۔ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ اب تک کے سفر کے دوران میں نے ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں سنا تھا۔ کرنل صاحب مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے بھی سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ آخری راتوں کا کمزور سا چاند ماحول کو روشن کرنے میں ناکام دکھائی دیتا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں تاحد نظر سیاہ تارکول کی سنگل سڑک دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب گندم کے کھیت تھے۔ دن کے وقت جمال دین والی روڈ پر خاصا ٹریفک ہوتا ہے تاہم اس وقت سردی اور تاریکی کی وجہ سے روڈ سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ اب تک کے سفر کے دوران ہم نے گنے سے لدی دو تین ٹرالیوں کو ہی اوور ٹیک کیا تھا، جن کی منزل جمال دین والی شوگر مل تھی۔ ابھی ہم جمال دین والی سے قریب بیس کلومیٹر دور ہوں گے کہ ایک انہونی ہوگئی۔ اچانک تیز سیٹی کی آواز کے ساتھ گاڑی کا اگلا بائیں جانب کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا تاہم اس سے پہلے کہ وہ بے قابو ہوتی میں نے مہارت کے ساتھ اسے سڑک کنارے روک لیا۔

''کیا ہوا ڈیڈی؟'' کرنل کی چھوٹی بیٹی نے چونک کر باپ سے پوچھا۔ اس دوران اس کی ماں اور بڑی بہن بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

''کچھ نہیں، بس تمہارے ٹرین کے سفر کا پہلا ایڈونچر ہو چکا ہے۔'' کرنل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور نیچے اتر کر ٹائر چیک کیا۔ جس کا رم ہوا خالی ہونے کی وجہ سے زمین سے لگا ہوا تھا۔ میں گھوم کر پچھلے حصے کی طرف آیا جہاں ایکسٹرا ٹائر موجود تھا۔ ڈکی کھولنے پر ایک نئی پریشانی نے مجھے گھیر لیا۔ بدقسمتی سے ایکسٹرا ٹائر گاڑی میں موجود تو تھا لیکن وہ بھی پنکچر تھا۔ حالانکہ کل شام ہی کو میں نے ٹول بکس کے ساتھ اسے اچھی طرح چیک کر کے وہاں رکھا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' کرنل نے جو میرے ساتھ ہی نیچے اتر آیا تھا، پوچھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتایا کہ ہم کن حالات سے دوچار ہو چکے تھے۔ میری بات سن کر وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ریوالور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

''آپ فکر نہ کریں سر، یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''وہ سامنے روشنی دیکھ رہے ہیں آپ؟'' میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں سڑک کے کنارے چند ایک دکانیں موجود ہیں اور یقینی طور پر وہاں پنکچر کی دکان بھی ہوگی۔ ''میں وہاں جا کر پنکچر لگوا آتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے دکان زیادہ دور نہیں ہے، میں بچوں کے ساتھ رکتا ہوں تم جاؤ اور جلدی واپس آؤ۔'' کرنل نے

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

تحکمانہ لہجے میں کہا۔
کرنل کی بات پوری ہوتے ہی میں نے ڈکی سے ایکسٹرا ٹائر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس دوران کرنل ریوالور تھامے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے جلدی واپس آنے کی تاکید کی۔ میں نے ایک نظر پچھلی سیٹ پر ڈالی جہاں بیٹھے تینوں افراد سیٹ سے سر لگائے خاموش تھے۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہی رہنے دیں اور ٹائر ہاتھ میں پکڑ کر وقت ضائع کیے بغیر سامنے کی طرف چل پڑا۔
''میری بات سنیے۔''
میں ایک دم ٹھٹک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں کرنل کی بڑی بیٹی مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ''اگر برا نہ مانیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔
میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ''میں نے ڈیڈی سے اجازت لے لی ہے۔ ویسے بھی یہاں بیٹھی بور ہوتی رہوں گی۔''
''یہاں کھلے میں ٹھنڈ بہت ہے۔'' میں نے پیچھے گاڑی کی طرف دیکھا جو مجھ سے قریب بیس گز دور ہوگی۔ تاہم کچھ دور ہونے کی وجہ سے میں اندر کا منظر نہیں دیکھ سکا۔
''لاہور سے زیادہ تو نہیں ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور منہ میں موجود چیونگم سائیڈ میں اچھال دی۔
ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گاڑی میں خاموش بیٹھی لڑکی کی زبان کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے مسلسل باتیں کرنے لگی۔ اس نے اپنا نام شاہدہ بتایا اور کہا کہ وہ اپنے والد کی ملازمت کے دوران ملک کے تمام اہم علاقوں کی سیاحت کر چکی ہے۔ اس نے بی اے آنرز کیا ہوا تھا اور اسے فوٹو گرافی کا شوق تھا۔
باہر بلا کی سرد ہوا چل رہی تھی اور ہر سو دھند اور ویرانی کا راج تھا۔ دور تک جاتی سڑک خالی دکھائی دے رہی تھی۔ قریب کے کھیتوں سے کبھی کبھار آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ میں نے سڑک کنارے پڑا لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔
''کتے ہمارے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔'' شاہدہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔
''وہ کیوں؟'' میں نے ہنس کر کہا ''کیا وہ ہمیں جانتے ہیں؟''
''پتا نہیں...... شاید مجھ سے ڈرتے ہوں۔'' شاہدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر اگلے ہی لمحے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میں چلتے ہوئے ہولے ہولے کپکپا رہا تھا تاہم وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر سردی کا ذرا بھی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی مجھے اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنا مفلر اتار دیا اور وہ مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنی بنائی تصویروں کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ اکیلی ڈرائیو کرتی ہوئی شہر سے باہر نکل جاتی ہے اور مظاہر فطرت کے ہر نئے انداز کو کیمرے میں قید کرتی۔
ہم باتیں کرتے کرتے سڑک کنارے بنی دو دکانوں کے باہر پہنچ گئے جو اس وقت بند تھیں۔ دکانوں کے سامنے ایک کچا چھپر تھا جبکہ سائیڈ میں ایک گھر کا بند دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر زور زور سے دروازہ بجایا۔ اندر سے کھانسنے کی آواز آئی اور کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔ ہاتھ میں لالٹین اٹھائے ایک بوڑھا باہر نکلا۔ دونوں دکانیں اور گھر اسی کا تھا۔ اس نے ہمیں انتظار کرنے کو کہا اور اندر کی طرف سے جا کر دکان کھول دی۔ ہم دونوں دکان کے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے پنکچر لگانے سے پہلے اندر سے ایک انگیٹھی لا کر دکان میں رکھ دی اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ''میں نے چائے کا کہہ دیا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں میں ابھی پنکچر لگائے دیتا ہوں۔''
''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اندر جا کے خود چائے بناؤں؟'' شاہدہ نے بوڑھے سے پوچھا۔
''ہاں بیٹی کیوں نہیں، آؤ میرے ساتھ۔'' اس سے پہلے کہ میں کوئی تبصرہ کرتا وہ بوڑھے کے ساتھ اندرونی دروازے کے اندر جا چکی تھی۔ مجھے شاہدہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ ماڈرن زمانے کی شہری لڑکی تھی۔ اگر اندر کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو اس کا باپ مجھے گولی مار دیتا۔ میں بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی میں اسے آواز دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھا دکان اندر واپس آ گیا۔
''شہر کی تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔'' بوڑھے نے پنکچر کا سامان سیٹ کرتے ہوئے بتایا۔ باورچی خانے میں میری بیوی کے ساتھ ایسے گھل مل گئی ہے جیسے برسوں سے اسے جانتی ہو۔ میں نے بوڑھے کی بات سنی ان سنی کر دی اور بے چینی سے اندرونی دروازے کو تکنے لگا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گو کہ وقت زیادہ نہیں ہوا تھا تاہم پتا نہیں کیوں مجھے

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

خواہ مخواہ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ خیر سب کچھ ٹھیک رہا اور کچھ ہی دیر میں شاہدہ ہاتھ میں چائے کے دو کپ اٹھائے دکان میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی خاتون بھی تھی۔ شاہدہ نے کپ میری طرف بڑھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ ایک سرد لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ اس کی انگلیاں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی تھیں۔ شاید سردی کا اثر تھا۔ میں نے سگریٹ کی تلاش میں جیب پر ہاتھ مارا لیکن یاد آیا وہ تو میں گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ چائے پینے کے دوران شاہدہ نے حسب سابق اپنی باتیں جاری رکھیں۔ اس دوران بوڑھے دکاندار نے پنکچر لگا دیا۔ اس نے ہوا بھری اور ٹائر کو اچھی طرح چیک کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی بیوی نے پیسے لینے سے صاف منع کر دیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ شاہدہ اور میں اس کے بچوں جیسے ہیں اور وہ ہم سے کسی صورت پیسے نہیں لے گی۔ بوڑھے نے بھی بیوی کی تائید کی۔ خیر میں نے ٹائر اٹھایا اور شاہدہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں میاں بیوی نے خالص دیہاتی انداز میں ہمیں دعائیں دیں اور ہم رخصت ہو کر واپس سڑک پر پہنچ گئے۔

"آپ کو گھر کے اندر نہیں جانا چاہیے تھا۔ مجھے فکر ہو رہی تھی۔" میں نے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بے چارے سیدھے سادے دیہاتی لوگ تھے بھلا ان سے مجھے کیا پریشانی ہو سکتی تھی؟" شاہدہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ایک بار پھر اپنے بارے میں بتانے لگی۔

"دراصل ہم تین بہنیں ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"اچھا، تو آپ کی تیسری بہن ساتھ نہیں آئیں؟" میں نے سوچا شاید وہ شادی شدہ تھی اور لاہور میں اپنے گھر تھی۔

"آپ نے انٹر سے آگے کیوں نہیں پڑھا؟" شاہدہ نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چلتے چلتے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے آپ سے اپنی تعلیم کے بارے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"اب کہیں گے کہ مجھے یہ کیسے پتا چلا کہ آپ ایک سرکاری محکمے میں پچھلے سات سال سے ڈرائیور کی نوکری کر رہے ہیں؟"

شاہدہ کی اس بات سے میں گڑبڑا گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنی تعلیم یا ملازمت کے بارے میں اس سے کوئی ذکر تک نہیں کیا تھا...... لیکن شاید...... ہو سکتا ہے میں نے گاڑی میں اس کے باپ سے ذکر کیا ہو۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ایک اور بم پھوڑ دیا۔

"آج کل آپ گھر میں تنہا رہ رہے ہیں۔"

میں چلتے چلتے رک گیا اور قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اسے کیا کہوں۔ یہ لڑکی میرا دماغ خراب کیے دے رہی تھی۔ کہاں تو میں اس کے ساتھ چلنے پر خوش تھا اور اب یہ حال تھا کہ میں چاہتا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بولے اور ہم جلد از جلد گاڑی تک پہنچ جائیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" شاہدہ نے مجھے تسلی دی۔ "دراصل میں چہرے پڑھ کر اندازہ لگا لیتی ہوں۔"

"بہت اچھا......" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "تو پھر چہرہ دیکھ کر بتائیں میرے پاس کتنے سگریٹ باقی ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں۔" جواب دیتے ہی وہ کھلا کھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ کا پیکٹ ایک دم خالی ہے۔"

میں بھی مسکرا دیا۔ میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ اس کا اندازہ یکسر غلط تھا میرے پاس پیکٹ میں ابھی بھی دو سگریٹ باقی تھے۔ میں خوامخواہ ہی اس کی باتوں سے پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ چہرہ پڑھنے والی بات بکواس تھی اور وہ مجھے تنگ کر رہی تھی۔ یقینی طور پر میں نے اپنے بارے میں اس کی بتائی ہوئی باتوں کا ذکر اس کے باپ سے کیا تھا۔

اب ہم گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہیڈلائٹس کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ کرنل صاحب ریوالور تھامے گاڑی سے باہر کھڑے تھے اور ہماری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔

اس دوران شاہدہ نے میرے کان کے عین قریب آ کر گہری ٹھنڈی سانس لی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں الٹے قدموں پیچھے گھوم گیا۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں چکرا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ کرنل سے مجھے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ لیا وہ لپک کر میرے قریب پہنچا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"وہ سر، آپ کی......" میں ہکلا کر رہ گیا۔ "میں ٹھیک ہوں سر۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

پھاڑ کر اِدھر اُدھر اندھیرے میں گھورا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ ٹائر میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ شاہدہ اپنی چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ بالکل اسی طرح، اسی حالت میں جیسے میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ سے سر ٹکائے آرام سے چیونگ چبا رہی تھی۔ موسم سرد ہونے کے باجود میں پسینے میں نہا گیا۔ کرنل کی بیوی نے میری حالت کے پیشِ نظر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بوتل سے پانی کا ایک گلاس بھرا اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کر شوہر کی طرف بڑھا دیا جو اس نے مجھے تھما دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور متوحش ہو کر چور نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔ وہی بے پروائی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں واضح اجنبیت دکھائی دی۔ لگتا تھا اسے میری طبیعت کی بھی کوئی فکر لاحق نہیں تھی۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ کیا ہوا میں اڑ کر یہ کیا ماجرا ہے؟ یا اللہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ان گنت سوچیں میرے دماغ میں در آئیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا۔ کرنل مسلسل پوچھتا رہا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ تاہم میں ٹال گیا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ٹائر تبدیل کیے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ٹول بکس ڈکی میں رکھا اور دل سے اپنی سلامتی کی دعا کی۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ سفر ختم ہوجائے۔ کرنل نے میری حالت کے پیشِ نظر آفر کی کہ میں آرام کروں باقی کے راستے وہ گاڑی چلائے گا۔

''نہیں سر میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔ انجن کو گیئر میں ڈالا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر چور نظروں سے اوپر لگے شیشے کی طرف دیکھا۔ وہی بیگانگی انداز۔ نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے کم از کم آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارا تھا اور اب یوں بیٹھی تھی جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ سوال یہ تھا کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو کر گاڑی تک کیسے پہنچ گئی؟ ایک اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ کرنل نے میرے ساتھ جانے سے متعلق بیٹی سے کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کے ساتھ گزرا اب تک کا تمام وقت میرا وہم تھا۔ لیکن۔ یہ وہم بھی کتنا حقیقی تھا کہ پچھلے آدھے گھنٹے کی مصروفیت اپنی تمام تر جزیات کے ساتھ مجھے یاد تھی۔ سوالوں کی برسات میرے دماغ کو چکرائے دے رہی تھی۔ یہ کوئی بھوت ہے یا چھلاوا جو میری نظروں سے اوجھل ہو کر گاڑی تک پہنچ گئی۔ مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ گو کہ میں گاڑی کے اندر سواریوں کے ہوتے ہوئے کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ تاہم میں نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی۔

''بھئی معاف کرنا۔ ویسے تو میں کبھی کبھار ہی سگریٹ پیتا ہوں لیکن یہاں اس ویرانے میں مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

کرنل نے خوش دلی سے اطلاع دی کہ اس نے میری بچائی ہوئی دونوں سگریٹس پھونک ڈالی تھیں۔ اسٹیرنگ میرے ہاتھوں میں لرز کر رہ گیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ کچھ دیر پہلے اس کی بیٹی یہ اطلاع مجھے دے چکی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔

میری سیٹ کے عین پیچھے شاہدہ براجمان تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے میرے لیے گاڑی چلانا مشکل ہوگیا۔ میں نے کرنل سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو باقی کے راستے وہ ڈرائیونگ کریں۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔'' کرنل اپنی طرف کا دروازہ کھول کر میری سائیڈ کی طرف بڑھا۔ ''شاید سردی کا اثر ہے، تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو۔''

شاہدہ کی کہی چوتھی بات بھی درست تھی۔ لیکن شاید اس کی ہر بات سچ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے پنکچر والے میاں بیوی سے ان کی اولاد کے نہ ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے حیرانی ظاہر کی تو شاہدہ بات گول کر گئی تھی۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ میں نے اپنی نظریں سامنے گڑا لیں۔ کرنل مجھ سے کوئی بات کر رہا تھا لیکن میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میرے اندر اس کی بیٹی تو کجا خود اس کی طرف بھی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے ہم منزل کے قریب پہنچ گئے۔ یہ جہال دین والی سے چند کلومیٹر پہلے سڑک کے کنارے واقع ایک ڈیرہ تھا۔ وہاں مرکزی گیٹ پر کچھ لوگ موجود تھے۔ شاید انھیں کرنل کے آنے کی اطلاع پہلے ہی سے تھی۔ انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ خواتین اندر زنانے میں چلی گئیں جبکہ میں اور کرنل اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ کرنل نے میری حالت کے بارے میں اپنے میزبان کو بتایا جس نے مجھے رات وہیں گزارنے کی پیش کش کی۔ سچ یہ ہے کہ میرا فوری واپسی کا نہ تو ارادہ تھا اور نہ ہی ایسی حالت کہ میں رات کے وقت اسی راستے پر ڈرائیو کرتا۔ کرنل کے میزبان نے مجھے بیٹھک سے ملحقہ ایک کمرے میں پہنچا دیا۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

اور آرام کرنے کا کہا۔ وہ رات میری زندگی کی خوفناک ترین رات تھی۔ جب بھی آنکھ لگتی میں خواب میں شاہدہ ہی کو دیکھتا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ سوتے جاگتے کروٹیں بدلتے جیسے تیسے رات گزر ہی گئی۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد کرنل نے مجھ سے طبیعت کا پوچھا۔

''سر اگر آپ غلط نہ سمجھیں تو ایک بات پوچھوں؟'' میں نے خود پر بہت جبر کیا لیکن میں پوچھ ہی بیٹھا کہ کیا وہ گلبرگ میں رہتے تھے؟ میری بات سن کر کرنل حیران رہ گیا۔ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ مجھے گھورا اور پوچھا کہ یہ بات مجھے کیسے معلوم ہوئی؟ گویا وہ واقعی گلبرگ ہی کا رہائشی تھا۔

میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے رات پیش آنے والا پورا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔ اس دوران وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا میری بات سنتا رہا۔ میں نے اپنی بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

''سر کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں'' کرنل عارف نے ایک طویل گہرا سانس لے کر سر اٹھایا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' پھر اس نے انکشاف کیا کہ شاہدہ میری بیٹی تھی جو تین سال پہلے ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو چکی ہے۔ ''وہ میری زاہدہ کی جڑواں تھی۔'' کرنل کا اشارہ اپنی بڑی بیٹی کی طرف تھا۔ اس نے میری ہر بات کی تصدیق کی جو شاہدہ مجھ سے کر چکی تھی۔ اب میرے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اس عجیب و غریب واقعے کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے جانے کی اجازت مانگی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور ہم ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔ مجھے کرنل سے دلی ہمدردی تھی لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دماغ ابھی بھی رات کے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں پوری طرح نارمل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر فوری طور پر گھر پہنچ جاؤں۔ میں نے کرنل سے ہاتھ ملایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں اسے مین گیٹ سے نکال کر سڑک پر لایا اور آخری بار مڑ کر ڈیرے کے مرکزی گیٹ کی طرف دیکھا۔ یونہی میری نظر اوپر اٹھ گئی۔ اوہ میرے خدا۔ میری سٹی گم ہوگئی۔ قریب کی چھت پر کھڑی شاہدہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ کل پورے سفر کے دوران زاہدہ نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ یقینی طور وہاں شاہدہ ہی تھی۔ میں نے ایکسیلیٹر پر پورا وزن ڈال دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میں اس آسیبی ماحول سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ پنکچر والی دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ رک کر بوڑھے میاں بیوی سے حال احوال کرلوں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ میں جیسے تیسے شہر واپس پہنچا اور جاتے ہی گھر والوں کو فون کیا۔ میں نے انہیں جلد واپس آنے کی تاکید کی۔ اگلے ایک ہفتے تک میں بخار میں پھنکتا رہا۔ یہاں تک میرا قریبی دوست صفدر انجم مجھ سے ملنے آیا۔ وہ پہلا بندہ تھا جسے میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات بتائے۔

☆☆☆

قارئین کرام، آپ نے یہاں تک کہ تمام حالات ریاض احمد کی زبانی سنے۔ اب آگے کے مختصر حالات میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے ریاض سے پورا واقعہ سننے کے بعد اسے تسلی دی اور مستقبل میں محتاط ڈرائیونگ کا مشورہ دیا۔ آنے والے دنوں میں ریاض کے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات پیش آنے لگے۔ زیادہ تر واقعات گاڑی چلاتے ہوئے ہی ہوئے۔ دراصل اسے کچھ نادیدہ لوگ دکھائی دینے لگے تھے۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ خالی سڑک کے درمیان بریک لگا دیتا۔ پوچھنے پر بتاتا کہ کوئی سڑک پار کر رہا تھا۔ اس لیے اسے رکنا پڑا۔ کئی بار تو لوگوں نے اسے خالی گاڑی کے ساتھ دور دراز علاقوں کے چکر لگاتے پایا۔ وہ واپسی میں بتاتا کہ وہ کسی مسافر کو لے کر فلاں فلاں جگہ چھوڑ کر آیا ہے۔ اگر کوئی اسے جھوٹا کہتا تو وہ مسافر سے ملنے والی رقم نکال کر دکھاتا۔ ان دنوں اس کی ڈرائیونگ کی آمدنی غیر معمولی حد تک بڑھ چکی تھی۔ یہ ریاض کے پیش آنے والے واقعے کے چھ یا سات ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک اتوار کے دن اس کے ایکسیڈینٹ کی خبر ملی۔ اسے اسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ موقع پر موجود لوگوں نے بتایا کہ حادثہ ریاض کی غلطی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اچانک ہی بریک لگا دی اور پیچھے سے آنے والے ٹرک نے اسے کچل ڈالا۔ قارئین، ریاض کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی آپ جو بھی توجیح پیش کریں، بس میری ایک درخواست ہے کہ میرے دوست کے لیے دعاء کریں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ آمین۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کالا علم

محترم و مکرم معراج رسول
سلامتی
بعض باتیں مخفی ہیں۔ ان کا علم ہر ایک کو نہیں ہوتا۔ زیرِ نظر واقعہ میرا اپنا ہے اس لیے میں صداقت کی قسم کھا سکتی ہوں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا کیا یہ کالا علم تھا اس پر مجھے آج بھی شبہ ہے اور میں لاکھ کوشش کے بعد بھی سمجھ نہیں پائی ہوں۔

سائرہ
(کراچی)

آئے دن ڈبا پیروں، جعلی عاملوں اور نوسر باز پیروں کے واقعات میں پڑھتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ اکیسویں صدی میں بھی لوگ اس قسم کی جہالت پر یقین رکھتے ہیں، عورتیں نہ صرف اپنی جمع پونجی، زیورات حتیٰ کہ آبرو تک قربان کر بیٹھتی ہیں۔ مجھے ان بدعقیدہ لوگوں پر خاص طور پر عورتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ترس بھی۔

اس دن بھی میں اخبار میں ایک ایسی ہی خبر پڑھ رہی تھی ۔ایک پیر صاحب جو خود کو ڈبل شاہ کہتے تھے، وہ لوگوں

www.urdusoftbooks.com

کے لاکھوں روپے ہڑپ کر کے سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ رقم کو اپنی کرامت سے دگنا کر دیتے تھے۔ یعنی سو روپے لے کر انہیں دو سو روپے میں تبدیل کر دیتے تھے، اسی خاصیت سے انہیں ڈبل شاہ کہا جاتا تھا۔

پیر صاحب نے ابتدائی چند ماہ میں تو اپنی ہاتھ کی صفائی سے لوگوں کی رقم ڈبل کی۔ کسی کے پانچ سو کو ایک ہزار میں تبدیل کر دیا، کسی کے دس ہزار کو بیس ہزار بنا دیے۔ ان کی اس کرامت پر لوگوں کے بالخصوص عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ بات ہزاروں سے شروع ہو کر لاکھوں تک پہنچی تو پیر صاحب چلے اور مراقبے کے بہانے رقم دگنی کرنے میں ایک دن کا وقفہ کرنے لگے۔ یعنی آج رقم دو، پرسوں دگنے پیسے لے جاؤ۔

ایک دن اچانک وہ لوگوں کے لاکھوں روپے لے کر غائب ہو گئے۔ کچھ لوگ پولیس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لوگوں کا تقریباً دو کروڑ روپیا لے کر فرار ہو گئے تھے۔

میرے چہرے پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''کیوں ہنس رہی ہو سائرہ؟'' امی نے پوچھا۔

میں نے امی کو ان ڈبل شاہ صاحب کی کرامت کے بارے میں بتایا تو امی بھی ہنسنے لگیں، پھر بولیں۔ ''اچھا ہنسنا چھوڑو، ذرا گھر کی صفائی کر لو اور شام کو ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن لینا۔''

''کیوں امی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا، کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔'' امی نے کہا۔

''امی، آپ بھی کمال کرتی ہیں، ابھی تو میں نے صرف انٹر کیا ہے، بی اے کا داخلہ فارم جمع کرایا ہے اور آپ......''

''بیٹا، گھرانا بہت اچھا ہے۔ لڑکا انجینئر ہے اور لوگ انتہائی شریف ہیں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔'' امی نے کہا۔

شام کو ابو آئے تو انہوں نے بھی امی کی بات کی تائید کی۔ میں نے سوچا، اب تو مجھے یہ گھر چھوڑنا ہی پڑے گا۔ جب ابو بھی امی کے ہمنوا ہو گئے ہیں تو پھر کچھ کہنا سننا فضول تھا۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ ابو ایک بڑے بینک میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔

شام کو باوقار سی ایک خاتون کے ساتھ دو جوان اور خوب صورت عورتیں اور وجیہہ سا ایک نوجوان آ گیا۔

میں اس وقت کچن میں تھی، امی نے مجھے بتایا کہ عرفان اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ آ گیا ہے۔ چائے ذرا سلیقے سے لے کر آنا۔

میں چائے لے کر گئی تو تینوں خواتین کے ساتھ عرفان کی پُرشوق نظریں بھی میری طرف اٹھ گئیں۔

میں نے سلیقے سے چائے اور دوسرے لوازمات ان کے سامنے رکھے، اور امی کے اشارے پر ایک طرف بیٹھ گئی۔ مجھے عرفان اچھے لگے تھے۔ کسرتی جسم، دراز قامت اور گندمی رنگ کے مالک۔ ان کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ذہانت تھی۔

امی نے مجھے بتایا۔ ''یہ عرفان کی امی ہیں۔'' ان کا اشارہ ایک باوقار خاتون کی طرف تھا۔ ''یہ عرفان کی پھپھو ہیں۔'' انہوں نے ایک جوان اور خوب صورت خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ عرفان کی بڑی بہن ہیں۔'' ان کا اشارہ دوسری خاتون کی طرف تھا۔

تینوں خواتین ہی مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''آنٹی، آپ نے میرے بارے میں نہیں بتایا۔'' ایک بچی کی آواز آئی۔ مہمانوں کے ساتھ آئی ہوئی اس بچی کو سبھی نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری سی سرخ و سفید، گول مٹول بچی تھی۔ اپنے براؤن بالوں اور بھوری آنکھوں سے وہ مجھے بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ ''میں شمائلہ ہوں، عرفان بھائی کی کزن۔'' اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

''ارے بھئی۔'' امی ہنس کر بولیں۔ ''میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی۔'' پھر وہ بولیں۔ ''سائرہ، یہ شمائلہ ہے، عرفان کے رشتے کی پھوپی زاد بہن کی بیٹی۔''

بچی اٹھ کر میرے پاس آ گئی اور بولی۔ ''فرزانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ ہم بھابی ڈھونڈنے جا رہے ہیں، آپ میری بھابی ہیں؟''

اس کی بات سن کر میں نے نظریں جھکا لیں، پھر سب کے بے اختیار ہنسنے پر مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

وہ لوگ میرپور خاص میں رہتے تھے لیکن عرفان اپنی جاب کی وجہ سے لاہور میں تھے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ای کو یہ رشتہ پسند آگیا اور ان لوگوں کو میں پسند آگئی۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق دو ماہ کے اندر اندر میری شادی عرفان کے ساتھ ہوگئی اور میں کراچی جیسے شہر سے رخصت ہوکر میر پور خاص چلی گئی۔ چھوٹے سے اس شہر میں مجھے عجیب سی وحشت ہوئی تھی، عرفان نے مجھ سے کہا۔ ''سارو، بس کچھ دن اور برداشت کرلو، پھر میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ وہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔''

عرفان کی پھپو شائستہ کے تین بچے تھے، تینوں لڑکیاں تھیں، ان میں شائلہ سب سے چھوٹی تھی۔ وہ بہت پٹاخہ بچی تھی۔ باتونی بھی بہت تھی۔ گھر بھر بلکہ پورا محلہ اس کی شرارتوں سے تنگ تھا لیکن وہ عرفان کی لاڈلی تھی۔ وہ مجھے بھی اچھی لگتی تھی اب ہر وقت وہ میرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ ان دنوں پانچویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

عرفان کے پھوپا ٹھیکیداری کرتے تھے اور خاصے خوش حال تھے۔ ان کے خاندان کی ایک بات مجھے بہت گراں گزری کہ وہ لوگ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے خلاف تھے۔ عرفان کی بہن فرزانہ بھی صرف میٹرک پاس تھی۔

ایک مہینا دعوتوں اور آنے جانے میں گزر گیا پھر عرفان مجھے اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ میں ان کی محبت بلکہ وحشت دیکھ کر پریشان ہونے لگی تھی۔ میرے سر میں درد بھی ہوتا تو وہ فوراً مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ ایک سرکاری ادارے میں ایکس سی این تھے۔ اس لیے ان کی تنخواہ معقول تھی۔ مجھے ان کی صرف ایک بات ناگوار گزرتی تھی کہ وہ تنخواہ کے علاوہ بھی ''بہت کچھ'' کماتے تھے۔ میں اسے رشوت کہتی تھی لیکن وہ اسے نظرانہ سمجھتے تھے۔

میں نے شروع شروع میں انہیں منع کیا لیکن پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی۔ دو، دو گاڑیاں تھیں، دو ملازم تھے۔ محبت کرنے والا شوہر تھا تو مجھے دوسری باتوں میں سر کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

چند مہینے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے وجود میں ایک اور وجود سانس لے رہا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ عرفان تو گویا خوشی سے پاگل ہوگئے۔ انہوں نے میرے کام کرنے میں بلکہ چلنے پھرنے پر بھی پابندی لگادی۔

دو ہی دن بعد میری ساس صاحبہ لاہور آگئیں اور انہوں نے گھر کی کمان سنبھال لی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی تھیں کہ دلہن، مجھے پوتا چاہیے۔ میں کب سے اس آس میں زندہ ہوں۔

''اماں یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔'' عرفان ہنس کر کہتے۔

''اب پوتی یا پوتا سائرہ کے ہاتھ میں تو نہیں ہے ناں۔''

''میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی بیٹا۔'' میری ساس نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو پوتا ہی ہوگا۔''

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔'' میری بجائے عرفان نے جواب دیا اور میں مسکرانے لگی۔

پھر میری ساس کی دعائیں رائیگاں چلی گئیں۔ میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو جنم دیا۔ میری ساس صاحبہ نے کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بس نیم دلی سے پوتی کی تعریف کی۔ ثمین اتنی خوب صورت تھی کہ جو دیکھتا تھا اس کی تعریف کرتا تھا۔ ثمین کی پیدائش پر امی اور ابو بھی کراچی سے آگئے تھے اور عرفان کی پھپو، فرزانہ اور شائلہ بھی آئی تھیں۔ امی اور ابو بہت خوش تھے۔

سب لوگ چند دن لاہور میں رہ کر کراچی واپس چلے گئے۔ بس شائلہ رہ گئی۔ اس کے اسکول کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ وہ یوں بھی عرفان کی لاڈلی تھی۔

پھر وقت تیزی سے گزر گیا۔ ثمین تین سال کی ہوئی تھی کہ میں ایک دفعہ پھر اُمید سے تھی۔ میں نے عرفان کو یہ خبر سنائی تو وہ جھوم اٹھے اور اپنی ماں کے لہجے میں بولے۔ ''دلہن، اس دفعہ تو مجھے ہر حال میں پوتا چاہیے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے تو میں بولی۔

''اماں تو یوں کہتی ہیں جیسے پوتا پیدا کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''وہ اس مرتبہ بھی یہی کہیں گی بلکہ میں خود دعائیں مانگ رہی ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک بیٹا بھی دے دے۔ ہماری فیملی مکمل ہوجائے گی۔''

''یہ سب اللہ کی مرضی ہے سارو۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ ''ہماری قسمت میں لڑکا ہوا تو ہمیں ضرور ملے گا۔''

مجھے اپنے شوہر کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔

میری ساس صاحبہ دوسرے ہی ہفتے پھر لاہور آگئیں اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنالیا۔ وہ ہر طرح میرا دھیان رکھتی تھیں لیکن اٹھتے بیٹھتے ان کی پھر وہی رٹ شروع ہوچکی تھی کہ دلہن اس مرتبہ مجھے مایوس مت کرنا۔ میں تو اس دفعہ پوتے کا منہ دیکھ کر ہی واپس جاؤں گی۔''

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

''اماں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں اس لیے میں دلہن نہیں ہوں۔ رہی پوتے کی بات تو یہ میرے اختیار میں نہیں ہے اگر میں خود اس قابل ہوتی تو پہلی ہی دفعہ آپ کو پوتے کا منہ دکھا دیتی۔''

''دلہن۔'' انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہو۔ ہمارے خاندان میں عورت اس وقت تک دلہن رہتی ہے جب تک اس کا ایک بھی بزرگ زندہ رہتا ہے۔ عرفان کی شادی سے دو سال پہلے تک میں بھی دلہن ہی تھی کیونکہ میری ساس زندہ تھیں لیکن مجھے اس دفعہ ہر قیمت پر پوتا چاہیے۔''

میری پڑوسن رخسانہ اکثر ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ اس نے بھی میری ساس کی باتیں سن لی تھیں۔ موقع دیکھ کر وہ میرے کمرے میں آ گئی اور بولی۔ ''سائرہ! اگر تم چاہو تو تمہارے گھر بیٹا ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ ''میرے چاہنے سے بیٹا کیسے ہوگا؟''

''اگر تم میری بات مانو تو میں کچھ کہوں؟''

''چلو، تم بھی کہہ لو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''تم دیکھ رہی ہو کہ میری تین بیٹیاں ہیں، اس کے بعد بیٹا پیدا ہوا ہے۔''

''ہاں بھئی میں جانتی ہوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''تمہاری ساس کی طرح میری ساس کی بھی یہی آرزو تھی کہ انہیں پوتا چاہیے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ عرفان بھائی ایسی کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ میرے تو میاں بھی اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب چوتھی دفعہ بھی بیٹی ہوئی تو میں دوسری شادی کر لوں گا، پھر مجھے الزام مت دینا۔''

''تمہاری تمہید کچھ طویل ہو گئی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اصل بات کرو۔''

''میں چوتھی مرتبہ اُمید سے ہوئی تو میری ساس نے مجھ سے کہا کہ شیخوپورہ سے دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں میں کوئی پیر صاحب ہیں۔ ان کے تعویذ سے شرطیہ بیٹا ہی پیدا ہوگا۔''

''پیر صاحب نے لڑکوں کی کوئی فیکٹری کھول رکھی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''توبہ کرو سائرہ۔'' رخسانہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''اللہ والوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ پیر صاحب نے مجھے صرف تین تعویذ دیے تھے۔ ان تعویذوں کی تیاری میں انہیں بہت محنت کرنا پڑی تھی اور خاصے اخراجات بھی ہوئے تھے لیکن انہوں نے مجھ سے صرف دس ہزار روپے لیے تھے۔ دیکھ لو، ان کے تعویذوں کی برکت سے چوتھی دفعہ میں نے بیٹے کو جنم دیا۔'' پھر وہ سرگوشی میں بولی۔ ''تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ تمہارے پاس گاڑی بھی ہے اور تم اسے خود ہی ڈرائیو بھی کر سکتی ہو۔ ہم صبح جا کر شام کو واپس آ جائیں گے۔ عرفان بھائی سے میں کوئی بھی بہانہ کر دوں گی۔''

''رخسانہ تم کیسی پڑھی لکھی ہو کہ ان تعویذوں پر اعتبار کرتی ہو، یہ سب جعلی پیر ہوتے ہیں اور لوگوں سے صرف پیسا بٹورتے ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو سائرہ؟'' رخسانہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''تم بے شک وہاں مت جاؤ لیکن پیر صاحب کے بارے میں ایسی باتیں تو مت کرو۔''

''رخسانہ، بیٹا دینا ہوگا تو مجھے اللہ دے گا۔ کسی پیر، فقیر میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ مجھے بیٹا دے سکے۔''

رخسانہ خاموش ہو کر چلی گئی۔

جب ڈیلیوری کے دن قریب آئے تو میں خود بھی اُمید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ میری ساس ہر رات مجھے زبردستی دودھ کا ایک گلاس پلایا کرتی تھیں۔ مجھے دودھ سے ذرا بھی رغبت نہیں تھی لیکن ان کا دل رکھنے کو پی لیتی تھی۔

مجھے لیبر روم میں پہنچایا گیا تو میری نند، ساس اور پھپو تینوں باہر کاریڈور میں موجود تھیں۔ ان کے ساتھ رخسانہ بھی تھی۔ ڈیلیوری کے بعد نرس نے مجھے بتایا کہ مسز عرفان، مبارک ہو اللہ نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا فرمایا ہے۔''

میرا دل چاہا کہ میں بے اختیار سجدے میں گر جاؤں لیکن اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھی۔ میری آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد میری ساس اور نند کے ساتھ، ساتھ امی اور رخسانہ بھی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری ساس تو خوشی سے گویا پاگل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بچے کا منہ چوما پھر میرا منہ چوما۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسی وقت عرفان بھی آ گئے۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔ وہ اپنی ماں سے بولے۔ ''اماں اس دفعہ واقعی آپ

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوگئی۔''

''بیٹا، دعا کے ساتھ میں نے بہت کچھ کیا تھا۔'' اماں نے کہا۔

ان کا یہ جملہ سن کر میں چونک اٹھی کہ دعا کے علاوہ انہوں نے اور کیا کیا ہے؟

میں اسپتال سے گھر آئی تو عرفان نے ایک چھوٹے موٹے جشن کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگے۔ ''سارو، یہ تو تمہارے گھر آنے کی خوشی میں ہے۔ اصل جشن تو اس وقت ہوگا جب میں اپنے بیٹے کا عقیقہ کروں گا۔''

''عمران کا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے اپنے بیٹے کا نام عمران رکھا ہے۔''

پھر عرفان نے ایک ہفتے کے اندر، اندر عمران کا عقیقہ کرلیا۔ اس موقع پر انہوں نے بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہ یادگار جشن تھا۔

اس پارٹی میں خاصی تھکن ہوگئی تھی۔ لاہور کے علاوہ بہت سے مہمان میرپور خاص سے بھی آئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ عمران میرے نزدیک ہی سو رہا تھا کہ رخسانہ آگئی اور مسکرا کر بولی۔ ''سائرہ! دیکھا تم نے پیر صاحب کا کمال؟''

''پیر صاحب کا کمال؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو کسی پیر فقیر کے پاس نہیں گئی۔''

''تم نہیں گئیں لیکن میں آنٹی کو وہاں لے گئی تھی۔'' اس نے آنکھیں نچا کر کہا۔ وہ میری ساس کو آنٹی کہتی تھی۔

''رخسانہ، تم کیا کہہ رہی ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''بھئی جب آنٹی پچھلی مرتبہ آئی تھیں تو میں نے ان سے پیر صاحب کا ذکر کیا تھا۔''

مجھے یاد آگیا کہ جب میں اُمید سے ہوئی تھی تو میری ساس فوراً ہی آگئی تھیں۔

''میں نے ان سے کہا کہ سائرہ تو وہاں جانے پر راضی نہیں ہے۔'' رخسانہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی۔ ''آنٹی نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں، ہوسکتا ہے کہ پیر صاحب ہمیں سائرہ کے لیے کوئی تعویذ دے دیں۔''

''پھر کیا اماں شیخوپورہ گئی تھیں؟'' میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں وہ میرے ساتھ شیخوپورہ گئی تھیں۔ پیر صاحب پہلے تو تعویذ دینے پر راضی نہیں ہوئے تھے جس عورت کو بچے کی خواہش ہے اسے خود آنا چاہیے۔ آنٹی نے بہانہ کردیا کہ میری بہو بہت کمزور ہے۔ اتنا لمبا سفر نہیں کرسکتی۔ ان کی خوشامد پر پیر صاحب نے پورے گیارہ تعویذ دیے تھے اور آنٹی سے کہا تھا کہ اپنی بہو کو دودھ میں ملا کر پلادیں۔''

''تم عجیب باتیں بتارہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''آنٹی نے ان تعویذوں کے لیے پورے پچیس ہزار روپے پیر صاحب کو نذرانے کے طور پر دیے تھے۔'' رخسانہ نے کہا۔ ''تم تو پیروں اور اللہ والوں کو مانتی ہی نہیں ہو۔ اب اس کا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یاد آگیا کہ اماں مجھے روز دودھ کا گلاس زبردستی کیوں پلاتی تھیں۔

میں نے عرفان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ ''یہ اماں نے کیا حرکت کی؟'' وہ تلملا کر بولے۔ ''جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ اس فراڈیے پیر کو فضول میں اتنی بڑی رقم دے دی۔ میں ان سے ابھی پوچھتا ہوں۔''

''عرفان پلیز۔'' میں نے انہیں روک دیا۔ ''وہ بڑی ہیں، اس وقت وہ بہت خوش ہیں۔ ان کی خوشی کو خاک میں نہ ملائیں۔ ان سے کچھ مت کہیے گا۔'' رفتہ رفتہ سارے مہمان چلے گئے لیکن شائلہ وہیں رہ گئی کہ اس کے اسکول کی چھٹیاں تھیں وہ اب میٹرک میں پڑھ رہی تھی اور عمر سے کہیں زیادہ بڑی لگتی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ اس کی رنگت پہلے سے زیادہ سرخ وسفید، بال بہت گھنے اور ریشمی ہوگئے تھے۔ ہمیں احساس نہیں ہوا تھا کہ گزشتہ آٹھ سال پہلے نظر آنے والی چھوٹی سی گول مٹول بچی اب ایک بھرپور دوشیزہ بن چکی تھی۔

وہ ہمیشہ گرمیوں کی چھٹیاں ہمارے پاس ہی گزارتی تھی۔ وہ یوں بھی عرفان کی لاڈلی تھی۔ اس کی ضد پر عرفان مجھے اور بچوں کو لے کر اکثر رات کا کھانا باہر کھایا کرتے تھے۔ وہ گھر کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ میری زچگی کے دوران میں اس نے پورے گھر کو سنبھال رکھا تھا، وہ کھانا بنانے میں طاق ہوچکی تھی۔

اس کی چھٹیاں ختم ہوگئیں تو وہ چلی گئی اور ہمارا گھر سونا ہوگیا۔ عمران تو ابھی چھوٹا تھا لیکن ثمین .... اس سے گھل مل گئی تھی۔ وہ ہر وقت شائلہ باجی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ عرفان بھی کچھ بجھ سے گئے تھے، میں جانتی تھی کہ وہ

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

شائلہ کو بہت چاہتے ہیں اس لیے اس کے جانے کا صدمہ ہے۔

میٹرک کے بعد شائلہ کے گھر والوں نے اسے گھر بٹھانا چاہا تو وہ اڑ گئی کہ میں تو آگے پڑھوں گی۔ اس نے فوراً عرفان کو ٹیلی فون کر دیا۔ عرفان اسی شام فلائٹ سے روانہ ہو گئے۔ ان کی بہن اور بہنوئی عرفان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ وہ خاندان کے پہلے آدمی تھے جس نے انجینئرنگ کی تھی یوں بھی ان کی بہن ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

عرفان کے کہنے پر وہ دونوں شائلہ کو کالج میں ایڈمیشن دلانے پر راضی ہو گئے۔

عرفان شائلہ کا داخلہ کرا کر لوٹے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ میر پور خاص کیوں جا رہے ہیں۔

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“ میں نے کہا۔ ”بھلا یہ بھی کوئی تک ہوتی کہ لڑکیوں کو میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھایا جائے گا۔“ عرفان نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کرایا تھا بلکہ اس کی ٹیوشن کا بھی اہتمام کر دیا تھا۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے شائلہ کو معقول رقم بھیجتے تھے۔

مجھے خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا، ایک دن مجھے ثمین ہی نے بتایا کہ مما، شائلہ باجی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ پپا ان سے کہہ رہے تھے کہ میں صبح پیسے بھیج دوں گا۔ وہ کل ہی تمہیں مل جائیں گے۔

”بیٹا اگر وہ شائلہ باجی کو پیسے بھیجتے ہیں تو بھیجنے دو۔ وہ تمہیں بھی تو پیسے دیتے رہتے ہیں۔“ ثمین اس وقت سات سال کی تھی۔

پھر اچانک عرفان کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ کراچی میرا اپنا شہر تھا لیکن لاہور چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں عرفان کے ساتھ کراچی آ گئی۔ یہاں بھی ادارے کی طرف سے عرفان کو بہت بڑا بنگلا ملا تھا۔ اس کا لان ہی اتنا بڑا تھا کہ میری بیٹی ثمین .... اس میں سائیکل دوڑاتی پھرتی تھی۔ عمران بھی ابھی گھٹنوں چلنے لگا تھا۔ کراچی اور میر پور خاص میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس لیے میر پور خاص سے عرفان کے والد اور والدہ اکثر کراچی آ جاتے تھے۔ میرے سسر اب ریٹائر ہو چکے تھے اس لیے ان کے پاس وقت ہی وقت تھا لیکن میر پور خاص میں ان کی تھوڑی بہت زمین بھی اس لیے وہ مستقل طور پر کراچی آنے کو تیار نہیں تھے۔

کراچی آ کر دو سال میں مجھے دو بڑے صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے ابو دل کے دورے میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد امی بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ عرفان ان کی بہت دلجوئی کرتے تھے۔ وہ اکثر ان پر زور دیتے تھے کہ آپ مستقل طور پر ہمارے ساتھ چل کر رہیں لیکن امی ہمیشہ انکار کر دیتیں۔ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں جو ابو نے بہت محنت اور پیار سے بنایا تھا۔

امی بیمار رہنے لگی تھیں۔ آخر وہ ابو کے غم میں گھلتی ہی چلی گئیں اور ایک رات خاموشی سے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔

عمران اب تین سال کا ہو چکا تھا اور اپنی توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ ثمین ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

ایک طرف میں، عرفان اور بچے لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے کہ ملازمہ اندر سے عرفان کا سیل فون لے کر آئی اور بولی۔ ”صاحب کا ٹیلی فون آ رہا ہے۔“

جب تک وہ سیل فون، ہم تک لائی فون بند ہو چکا تھا۔ اسی وقت عرفان کے آفس کا کوئی سپروائزر آ گیا۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان کا سیل فون پھر بجا۔

میں نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“

”سائرہ بھابی!“ دوسری طرف سے شائلہ کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، بچے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، تم کیسی ہو؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”میرا مت پوچھیں۔“ اس نے کہا۔ ”عرفان بھائی کہاں ہیں؟“ اس کی آواز سے مجھے لگا جیسے اسے کوئی پریشانی ہو۔

”وہ ذرا مصروف ہیں، تم بتاؤ خیریت سے ہو، کوئی پریشانی ہے؟“

”ارے بھابی، کیا بتاؤں۔ میں تو بہت پریشان ہوں۔“

اسی وقت عرفان آ گئے۔ میں نے کہا۔ ”لو، تمہارے بھائی آ گئے ان سے بات کر لو۔“ میں نے سیل فون عرفان کی طرف بڑھا دیا۔

وہ شائلہ سے بات کرنے لگے۔ پھر بولے۔ ”ایسا

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

کیسے ہوسکتا ہے......اچھا......تم ایسا کرو، خاموشی سے یہاں چلی آؤ۔ پھپو سے میں خود بات کرلوں گا، پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

وہ فون سے فارغ ہوئے تو خود ہی مجھ سے بولے۔

"پھپو، شائلہ کی شادی کررہی ہیں۔"

"ارے کب، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ خوشی کی بات نہیں ہے سائرہ!" عرفان نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ شائلہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔ پھپو اسے پڑھانا نہیں چاہ رہی ہیں، دوسری بات یہ کہ جس لڑکے سے پھپو نے اس کی شادی طے کی ہے، وہ پھوپا جان کی طرح ٹھیکے دار ہے۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے۔ وہ لوگ وہیں میرپور خاص میں رہتے ہیں، میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔"

"پھر آپ نے کیا کہا شائلہ سے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم خاموشی سے کراچی چلی آؤ۔ میں پھپو سے خود نمٹ لوں گا۔" عرفان نے کہا۔

"لیکن عرفان، آپ کم سے کم پھپو سے بات تو کرلیں۔" میں نے کہا۔

"بھئی، ان سے کیا بات کروں؟" عرفان نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ مجھ سے بحث کرنے لگیں گی، میری بات ان کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک میں خود میرپور خاص نہیں جاؤں گا اور میں فی الحال کراچی سے جا نہیں سکتا، یہاں ایک ضروری پروجیکٹ میں مصروف ہوں۔ شائلہ یہاں آجائے گی تو اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دوں گا۔"

میں خاموش ہوگئی۔ پورے خاندان میں ان کی عزت تھی، خاندان والے ان کی بات مانتے تھے اور پھپو تو یوں بھی ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ خاندان کے کئی لڑکوں کو انہوں نے ملازمت دلائی تھی۔ اس وجہ سے لوگ مزید ان سے دبتے تھے۔

دوسرے دن دوپہر کو شائلہ اپنا سوٹ کیس لے کر کراچی آگئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہوگئی تھی۔ اس کے لباس اور گفتگو سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ میرپور خاص جیسے چھوٹے سے شہر میں رہتی ہے۔ اس کے کپڑے جدید فیشن کے تھے، اس کے پاس بہت مہنگا سیل فون تھا۔ میں جانتی تھی کہ اتنا مہنگا فون اسے پھپو نے نہیں دلوایا ہوگا، یہ عرفان ہی کا تحفہ ہوگا۔

عرفان نے دوسرے ہی دن اس کے داخلے کے سلسلے میں کوشش شروع کردی۔ داخلوں کی تاریخ گزر چکی تھی لیکن یہ کام عرفان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہر سرکاری ادارے میں ان کے تعلقات تھے۔ انہوں نے گھر بیٹھے دو چار فون گھمائے اور شائلہ کا داخلہ کراچی یونیورسٹی میں ہو گیا۔

اس دن عرفان اور بچوں کے جانے کے بعد میں ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ پھپو کا ٹیلی فون آگیا۔ میں نے سلام کرنے کے بعد ان کی خیریت پوچھی۔ "بیٹا، ہم لوگ خیریت سے ہیں، ذرا تم شائلہ سے میری بات کرادو۔"

"شائلہ تو اس وقت سو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک سو رہی ہے؟" پھپو نے ناگواری سے کہا۔ "اس سے کہنا کہ بس بہت کراچی کی سیر کرلی، اب واپس آجائے۔"

"کراچی کی سیر؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "پھپو، وہ تو یہاں پڑھنے آئی ہے۔"

"بھاڑ میں گئی ایسی پڑھائی۔" پھپو نے غصے میں کہا۔ "میں نے اس کی شادی طے کردی ہے اور اسے پڑھنے کی سوجھ رہی ہے۔"

"شادی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"ہاں بھئی شادی۔" پھپو نے کہا۔ "لڑکا دبئی کی کسی بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ بہت اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔"

اسی وقت مجھے شائلہ نظر آئی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں سے آواز دی۔ "شائلہ، تمہاری امی کا فون ہے۔"

شائلہ نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کیا، پھر میرے بلانے پر ناگواری سے آئی اور ریسیور مجھ سے لے لیا۔ "السلام علیکم امی......نہیں میں نے تو یہاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے......آپ عرفان بھائی سے بات کرلیں۔ ان کا فون نمبر تو آپ کے پاس ہے نا......میں نے کہہ تو دیا کہ میں ابھی نہیں آرہی......اچھا خدا حافظ۔" فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ مجھ سے بولی۔ "بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ انہیں یہ سب تفصیل بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پہلے میرے سیل فون پر کال کررہی تھیں، جب میں نے فون نہیں اٹھایا تو انہوں نے آپ کو فون کردیا۔ عرفان بھائی

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

نے کہا تھا کہ میں ان سے خود بات کرلوں گا۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ شائلہ۔" میں نے کہا۔ "تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ لڑکا ٹھیکے داری کرتا ہے اور واجبی سی تعلیم ہے؟"

"بھابی! میں ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولتی تو عرفان بھائی کبھی مجھے یہاں نہیں رہنے دیتے۔ وہ فوراً مجھے لے کر میر پور خاص چلے جاتے، ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کو میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

"اب انہیں معلوم ہوگا تو کیا سوچیں گے؟" میں نے کہا۔

"اب وہ کچھ نہیں سوچیں گے۔ میرا ایڈمیشن ہو چکا ہے۔ وہ امی سے خود بات کرلیں گے۔"

پھر وہی ہوا۔ عرفان نے پھپھو سے بات کی اور ان سے کہہ دیا کہ جب شائلہ مزید پڑھنا چاہتی ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ شادی دو سال بعد بھی ہوسکتی ہے۔

یوں شائلہ ہمارے گھر میں رہنے لگی .... ثمین تو پہلے ہی اس سے بے تکلف تھی، اب عمران بھی اس کا گرویدہ ہوگیا، وہ یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی، انہیں ہوم ورک کراتی تھی، اور شام کو گاڑی لے کر انہیں گھمانے لے جاتی تھی۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ شائلہ نے ڈرائیونگ کب اور کیسے سیکھ لی۔

میں نے شائلہ سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔ "بھابی! میر پور خاص کوئی گاؤں دیہات نہیں ہے بلکہ اچھا خاصا شہر ہے، وہاں ڈرائیونگ سکھانے کے بھی کئی ادارے ہیں۔ میں نے وہیں ڈرائیونگ سیکھی ہے۔ لائسنس تو مجھے عرفان بھائی نے گھر بیٹھے بنوا دیا تھا۔"

پھر وہ مستقل گاڑی ہی میں یونیورسٹی جانے لگی۔ عرفان نے ایک گاڑی اس کے لیے مخصوص کردی تھی۔

عرفان ایسے عہدے پر تھے کہ ان کے پاس سرکاری گاڑیوں کی کمی نہیں تھی۔ ان کے اپنے استعمال کے لیے ٹویوٹا کی سرکاری جیپ تھی۔ ذاتی طور پر انہوں نے لینڈ کروزر اور ہنڈا سوک رکھی ہوئی تھی۔ لینڈ کروزر تو میرے استعمال میں رہتی تھی۔ ہنڈا سوک مستقل شائلہ استعمال کررہی تھی۔

اس کے تمام اخراجات عرفان ہی اٹھا رہے تھے۔ اسے ہر مہینے ڈھیروں شاپنگ کراتے۔ ہم لوگ اکثر باہر کھانا کھایا کرتے تھے وہ بھی محض شائلہ کی فرمائش پر۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ عرفان اور بچے جا چکے تھے، تھوڑی دیر پہلے شائلہ بھی گاڑی لے کر نکلی تھی۔ میں اون اور سلائیاں لے کر لان کی چمکیلی دھوپ میں بیٹھ گئی اور اپنی ملازمہ زینت سے چائے لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے کا مگ لے آئی اور میرے نزدیک ہی نیچے گھاس پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے زینت؟" میں نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "آج تمہیں پھر ایڈوانس پیسوں کی ضرورت ہوگی؟"

وہ ادھیڑ عمر کی بہت ذہین عورت تھی، اس کا شوہر عرفان ہی کے دفتر میں چپراسی تھا۔

"بی بی جی، مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" زینت نے کہا۔ "مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"ایسی کیا بات ہے زینت؟" میں نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے بیگم صاحبہ۔" اس نے کہا۔ "آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گی۔"

"ارے، منہ سے کچھ پھوٹو گی بھی؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"بیگم صاحبہ!" زینت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ شائلہ بی بی کو فوراً واپس میر پور خاص بھجوا دیں۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "شائلہ نے کیا کردیا؟"

"کچھ نہیں کیا ہے تو کردے گی؟" زینت نے کہا۔ "میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی۔"

"زینت، صاف صاف بات کرو۔" میں نے بھنّا کر کہا۔ "یہ تم مجھے پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟"

"بیگم صاحبہ!" زینت آہستہ سے بولی۔ "اگر آپ نے شائلہ بی بی کو فوراً واپس نہ بھجوایا تو آپ کا بسا بسایا گھر اجڑ جائے گا اور......"

"کیا بکواس کیے جارہی ہو؟" میں چیخ اٹھی۔ زینت سہم کر رہ گئی۔ "تم نے صاحب کے سامنے ایسی بکواس کردی تو وہ تمہیں مار کے گھر سے نکال دیں گے اور تمہارے شوہر کی ملازمت بھی جائے گی۔ شائلہ صاحب کی بہت لاڈلی اور چہیتی بہن ہے۔ وہ اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنیں گے۔"

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

"میں بھی تو آپ کو یہی بتانے کی کوشش کررہی ہوں بیگم صاحبہ!" زینت نے کہا۔ "صاحب اور شائلہ بی بی کے تعلقات......"

"بس کرو زینت۔" میں نے مشتعل ہوکر کہا۔ "دفع ہوجاؤ یہاں سے، تم شائلہ کے ساتھ ساتھ عرفان پر بھی کیچڑ اچھال رہی ہو۔" میں بھنّا کر اٹھی، اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے زینت پر شدید غصہ آگیا تھا۔ شائلہ، عرفان کی گود میں کھیلی ہوئی بچی تھی۔ وہ اس کے لیے کوئی ایسی بات برداشت کرہی نہیں سکتے تھے۔

ایک ہفتے بعد میں نے عرفان کے جانے سے پہلے کہا۔ "مجھے کچھ پیسے دے دیں، میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی۔"

"اکیلی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں، فرحانہ کو بلالوں گی۔" فرحانہ میری شادی سے پہلے کی دوست تھی۔ وہ فیڈرل بی ایریا میں رہتی تھی۔

"اتنی دور سے اس بے چاری کو بلاؤ گی؟" عرفان نے کہا۔

"میں پہلے اس کے گھر جاکر اسے ساتھ لوں، پھر شاپنگ کے بعد ہم لوگ یہاں آئیں گے، رات کا کھانا فرحانہ ہمارے ساتھ کھائے گی، پھر ڈرائیور اسے چھوڑ آئے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ بھی بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

عرفان نے جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے چند بڑے نوٹ نکالے اور گنے بغیر مجھے دیتے ہوئے بولے۔ "تم کب تک واپس آؤ گی؟ بچے بھی اسکول سے آجائیں گے۔"

"انہیں زینت دیکھ لے گی، آپ فکر مت کریں۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے پہلے تو خود ڈرائیونگ کا فیصلہ کیا لیکن یہ سوچ کر ڈرائیور کو ساتھ لے لیا کہ پارکنگ مشکل سے ملتی تھی۔ یوں بھی لینڈ کروزر جیسی بڑی گاڑی کو پارک کرنے کے لیے بھی بڑی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے فرحانہ کو پہلے ہی فون کردیا تھا۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا ہارن بجایا تو فوراً ہی گھر سے باہر آگئی۔ شادی کے دس سال بعد بھی اس بے چاری کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر فرحانہ بولی۔ "سائرہ، میں تم سے......" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ "میں تم سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم میری بات سنتی کب ہو؟"

میں سمجھ گئی کہ وہ ڈرائیور کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی ہے۔ ہمارے طبقے کے ساتھ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ گھر کے ملازمین کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کرسکتے کیونکہ وہ بات لمحوں میں پھیل جاتی ہے۔

گھریلو ملازمین مالی، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ جب دوسرے گھروں کے ملازمین کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں تو ان کا پسندیدہ موضوع ان کے مالکان کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔

ڈرائیور نے ہمیں کلفٹن کے ایک معروف شاپنگ مال پر چھوڑ دیا۔ میرے دل میں کھد بد مچی ہوئی تھی کہ فرحانہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایک سال پہلے تک ایک اسکول میں پڑھاتی تھی، پھر اس کے شوہر نعیم نے اسے ملازمت کرنے سے منع کردیا تھا کیونکہ فرحانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

میں نے اس دن اپنے بچوں اور شائلہ کے لیے خوب شاپنگ کی۔ ضد کرکے دو سوٹ فرحانہ کو بھی دلوادیے ورنہ وہ سوٹ لینے پر راضی نہیں تھی۔

شاپنگ سے فارغ ہوکر ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور میں نے فرحانہ سے کہا۔ "ہاں، اب بتاؤ تم کیا کہنے والی تھیں؟"

"میں تمہیں بتا تو دوں گی لیکن تم برداشت نہیں کر پاؤ گی۔" فرحانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بات بہت خاص ہے۔" وہ سنجیدہ ہوکر بولی۔ "پچھلے ہفتے میں اپنے اسکول کی ٹیچرز کے ساتھ پکنک کے لیے سی سائڈ پر گئی تھی۔ میں نے اسکول چھوڑ دیا ہے لیکن وہاں کی ٹیچرز مجھے نہیں چھوڑتیں۔"

"بتا بھی چکو، سسپنس کیوں پھیلا رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"وہاں میں نے تمہاری کزن شائلہ اور عرفان بھائی کو دیکھا تھا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے کہا۔

"خاص بات یہ ہے کہ وہ وہاں پکنک منا رہے تھے، میں سمجھی کہ تم اور بچے بھی موجود ہوگے لیکن شائلہ وہاں اکیلی تھی۔ عرفان بھائی وہاں اپنے محکمے کے ہٹ میں ٹھہرے

www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ہوئے تھے۔ وہ دونوں دیر تک پانی میں اٹکھیلیاں کرتے رہے تھے، پھر ہماری طرف دیکھے بغیر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہٹ میں گھس گئے۔ میں وہاں کئی گھنٹے رہی تھی۔ اس وقت تو وہ ہٹ سے نکلے نہیں تھے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرے ہاتھ پیروں میں سنسنی ہورہی تھی اور دل بیٹھا جارہا تھا۔

''یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے۔'' فرحانہ نے کہا۔

مجھے ایک دم یاد آگیا کہ شائلہ نے اس دن یونیورسٹی کی طرف سے پکنک پر جانے کا بہانہ بنایا تھا اور صبح صبح ہی گاڑی لے کر نکل گئی تھی۔ پھر وہ شام ڈھلے لوٹی تھی۔ اس کے آنے کے آدھے گھنٹے بعد عرفان بھی آگئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ یہ آپ کا رنگ کیوں اتنا کالا ہورہا ہے تو وہ بیزاری سے بولے تھے کہ آج مجھے دھوپ میں کھڑے ہوکر گھنٹوں کام کرانا پڑا ہے۔ اتنی شدید دھوپ میں میرا رنگ کالا نہیں ہوگا تو گورا ہوگا؟

شائلہ کا رنگ بھی پھیکا پھیکا سا بلکہ کچھ جھلسا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں تو مجھے علم تھا کہ وہ پکنک پر گئی تھی۔ پکنک پر جا کر چہرے کی جلد اسی طرح جھلس جاتی ہے۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ عرفان ہی تھے؟'' میں نے اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینا چاہی۔

فرحانہ نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولی۔ ''اب تم کہو گی کہ تمہیں یقین ہے کہ تم میرے ساتھ بیٹھی ہو۔ ان باتوں کو چھوڑو اور گھر کی فکر کرو، اس سے پہلے کہ عرفان بھائی تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ تم انہیں لگام دینے کی کوشش کرو۔''

''میں ان سے کس منہ سے ایسی بات کرسکتی ہوں؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''اس کا واحد حل یہ ہے کہ شائلہ کو یہاں سے چلتا کر دو۔ وہ اگر مزید تمہارے گھر میں رہی تو تمہارا بسا بسایا گھر اجڑ جائے گا، تم کہتی ہو کہ عرفان اسے اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتے ہیں، سگی بہنوں کے ساتھ کوئی بھائی یوں اٹکھیلیاں نہیں کرتا۔ پھر اس کا گیلا لباس جسم سے چپکا ہوا تھا اور وہ دونوں ساحل پر دوڑتے پھر رہے تھے۔''

مجھے اچانک زینت کی بات یاد آگئی۔ اس نے بھی مجھ سے اسی قسم کی باتیں کی تھیں لیکن میں نے اسے جھڑک دیا تھا۔ اب فرحانہ بھی وہی بات کررہی تھی۔ زینت تو ملازمہ تھی، وہ اپنے فائدے کے لیے مجھ سے جھوٹ بھی بول سکتی تھی لیکن فرحانہ کو تو مجھ سے یا عرفان سے کوئی لالچ نہیں تھا، وہ میری ہمدرد تھی۔ اس لیے مجھے وہ سب کچھ بتارہی تھی۔

میں گھر پہنچی تو میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ عرفان مجھ سے بے وفائی بھی کرسکتے ہیں اور یہ بات تو حلق سے اتر ہی نہیں رہی تھی کہ وہ شائلہ کے بارے میں اس انداز میں سوچ بھی سکتے ہیں۔ بقول ان کے شائلہ ان کی بہت چہیتی اور لاڈلی بہن تھی۔ انہوں نے اسے گودوں میں کھلایا تھا بہن سے زیادہ وہ اسے بیٹی سمجھتے تھے، پھر اس کے ساتھ ایسی گھناؤنی حرکت۔ میں نے نفرت سے سوچا۔ مجھے تو اب کوئی رشتہ قابلِ اعتبار نہیں لگتا تھا، اس کے باوجود ایک اُمید تھی کہ ممکن ہے عرفان، شائلہ کو گھمانے ہی لے گئے ہوں اور فرحانہ نے اسے کوئی اور ہی رنگ دے دیا۔ پھر مجھے زینت کی بات یاد آئی۔ زینت نے بھی تو کوئی ایسی بات دیکھی ہی ہوگی۔ وہ سلجھی ہوئی ذہین عورت تھی اور بلاشبہ میری ہمدرد تھی۔ وہ بغیر دیکھے اتنی بڑی بات نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے ہی اسے جھڑک کر خاموش کردیا تھا ورنہ وہ مجھے اپنے خدشات کی وجہ بھی ضرور بتاتی۔

اس وقت تو سب گھر میں تھے۔ میں کل دن میں سب کے جانے کے بعد زینت سے بات کرنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عرفان بھی آگئے۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا بریف کیس اور کوٹ لاؤنج کے ایک صوفے پر پھینکا اور خود دوسرے صوفے پر نیم دراز ہوگئے۔ زینت فوراً ہی ان کے لیے پانی لے آئی۔

''سارو ڈارلنگ!'' انہوں نے کہا۔ ''جلدی سے تیار ہوجاؤ، آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔''

''آپ آج مجھے کچھ زیادہ ہی تھکے ہوئے لگ رہے ہیں، آج آرام کریں، ڈنر ہم پھر کسی دن کرلیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی، یہ تھکن تو روز ہی ہوتی ہے، تم بس جلدی سے تیار ہوجاؤ، اس وقت تک میں بھی فریش ہوجاتا ہوں۔''

عرفان ہم سب کو شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ ریسٹورنٹ کا وہ حصہ خالی تھا۔ عرفان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، میں نے ان سے کہا بھی کہ کھانا منگوالیں، بہت بھوک لگ رہی ہے۔

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

''ابھی منگواتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''بس کچھ دیر اور صبر کرلو۔''

''ٹھیک بارہ بجے ریسٹورنٹ کا ایک ویٹر ایک ٹرے میں کیک لے کر آگیا اور ریسٹورنٹ کے بینڈ نے ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' کی دھن بجانا شروع کردی۔

میں حیران تھی کہ کس کی برتھ ڈے ہے؟ اچانک میری نظر کیک پر پڑی۔ اس پر کریم سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ڈیئر شائلہ۔''

شائلہ یوں حیرانی ظاہر کررہی تھی جیسے وہ خود بھی اس سے لاعلم ہو، ممکن ہے، عرفان نے اسے بھی سرپرائز دیا ہو۔ پھر انہوں نے شائلہ کو ایک بیش قیمت ڈائمنڈ رنگ، مہنگا ترین موبائل فون سیٹ اور قیمتی گھڑی تحفے میں دی تو وہ کھل اٹھی۔

''اگر آپ مجھے بتادیتے تو میں بھی شائلہ کے لیے کوئی گفٹ لے آتی۔'' میں نے کہا۔

''یہ گھڑی تمہاری طرف سے تو ہے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''عرفان بھائی، آپ بھی بعض اوقات حیران کر دیتے ہیں۔'' شائلہ نے بہت لگاوٹ سے کہا۔

پہلے تو میں اس کی اداؤں اور نازنخروں کو یہ سوچ کر نظرانداز کردیتی تھی کہ وہ عرفان کی بہن تھی۔ لیکن اب مجھے اس کی ہر بات کھل رہی تھی۔ عرفان کا پُرشوق نظروں سے اسے دیکھنا اور اس کا شرمانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھارہا تھا۔

اس رات ہم دو بجے تک گھر پہنچ سکے۔ عرفان وہاں سے آتے ہی سوگئے ورنہ شاید میں ان سے لڑ پڑتی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ مجھے زینت سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

تیسرے دن جب سب چلے گئے تو میں نے زینت کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے بیٹھنے کو کہا۔

وہ میرے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گئی۔

''زینت، تم اس دن کیا کہہ رہی تھیں؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ سہم کر رہ گئی اور بولی۔ ''بیگم صاحبہ، مجھے معاف کر دیں، مجھے ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

''ڈرو مت۔'' میں نے کہا۔ ''میں واقعی جاننا چاہتی ہوں کہ تم اس دن مجھے کیا بتانے کی کوشش کررہی تھیں؟''

زینت چند لمحوں تک تذبذب کی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر بولی۔ ''بیگم صاحبہ، میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گی، آپ اس پر یقین نہیں کریں گی۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''بیگم صاحبہ، کچھ دن پہلے جب آپ اپنی کسی دوست کی بہن کی شادی میں گئی تھیں تو صاحب نہیں گئے تھے۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس دن شائلہ بی بی بھی گھر پر تھی۔ میں کچن سے فارغ ہوکر اپنے کوارٹر میں چلی جاتی ہوں۔ اس دن میں اتفاق سے اوپر چلی آئی۔ صاحب کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی، میں نے حیرت سے سوچا، آپ تو ہیں نہیں، پھر صاحب کس سے ہنس ہنس کر باتیں کررہے ہیں، کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا پردہ ایک طرف سے کچھ سرکا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو......'' زینت اچانک خاموش ہوگئی۔

''تو کیا؟'' میرے اندر غبار سا بھر گیا۔

''اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ...... صاحب اور......شائلہ بی بی......'' وہ پھر خاموش ہوگئی۔

میں سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں شائلہ کو ابھی چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں۔ پھر میں نے...... بمشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا اور سوچا کہ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑوں گی۔

دو دن بعد تیئس مارچ کی چھٹی تھی۔ میں نے عرفان اور شائلہ کے سامنے ناشتے کی میز پر اعلان کردیا کہ میں بچوں کو لے کر آج ماموں جان کے گھر جاؤں گی۔

احمد ماموں امی کے رشتے کے کزن تھے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار چلی جاتی تھی۔

''بھئی، میں تو کہیں نہیں جاؤں گا۔'' عرفان نے کہا۔ ''میں تو آج چھٹی کو گھر پر رہ کر ہی انجوائے کروں گا۔''

''بھابی، مجھے بھی اپنی ایک دوست کے گھر جانا ہے، اس کے ساتھ مل کر پڑھائی کروں گی، میرے امتحان بھی تو سر پر آپہنچے ہیں۔'' شائلہ نے کہا۔

''اچھا بھئی۔'' میں مسکرا کر بولی۔ ''آپ خوب دل بھر کے سوئیں لیکن ایسا نہ ہو کہ آپ سوتے ہی رہ جائیں اور کھانا بھی نہ کھائیں۔ ویسے میں شام سات آٹھ بجے تک آجاؤں گی۔''

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books

میں نے ..... بچوں کو ساتھ لیا اور فوراً ہی گاڑی ڈرائیو کر کے لے گئی۔ بچوں کو علم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں انہیں فرحانہ کے پاس چھوڑ کر واپس آنا چاہتی تھی۔ فرحانہ کو میں نے پہلے ہی ٹیلی فون کر دیا تھا۔

میں کچھ دیر فرحانہ کے گھر رکی اور بچوں سے کہا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں، تم لوگ فرحانہ آنٹی کے ساتھ رہو۔

میں دوبارہ گھر پہنچی تو اپنی گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دی اور پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

مجھے دیکھ کر زینت چونک اٹھی اور بولی۔ ”آپ بہت اچھے موقع پر آئی ہیں بیگم صاحب! شمائلہ بی بی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آپ کے کمرے میں گئی ہیں۔“

میں غصے میں پاگل ہوگئی اور تیزی سے اوپر کی طرف لپکی۔ دروازہ بند تھا لیکن اندر سے شمائلہ کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے غصے میں دروازہ دھکیلا تو وہ ایک دم کھل گیا۔

وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ میں خود شرما گئی۔

”تت...... تم......“ عرفان نے ہکلا کر کہا۔ شمائلہ جلدی سے بیڈ سے اتر کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔

”تم تو اپنی کسی دوست کے گھر پڑھائی کے لیے جانے والی تھیں؟“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ پھر میں نے عرفان سے کہا۔ ”یہ تو تمہاری لاڈلی بہن ہے۔ بہنوں کے ساتھ تم......“

”بکواس بند کرو۔ شمائلہ میری کزن ہے۔“ عرفان بپھر کر بولا۔

”لیکن تم تو اسے بہن کہتے رہے ہو؟“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”آیندہ نہیں کہوں گا۔“ عرفان ابتدائی صدمے سے سنبھل چکا تھا۔ ”میں شمائلہ سے محبت کرتا ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

عرفان کی ڈھٹائی اور شمائلہ کی بے حسی دیکھ کر مجھے زوردار چکر آیا اور میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی۔

مجھے ہوش آیا تو عرفان میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولے۔ ”سائرہ! مجھے معاف کر دو، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ میں بھی بہک گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم بہت بڑے ظرف کی مالک ہو، مجھے معاف کر دو گی۔“ انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ارے، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”مجھے گناہ گار مت کریں۔“

عرفان نے اسی شام شمائلہ کو واپس میرپور خاص بھجوا دیا اور میرے دل کو سکون مل گیا۔ زینت اور فرحانہ کی بروقت مداخلت سے میرا گھر اجڑنے سے بچ گیا لیکن یہ میری بھول تھی۔

اب عرفان ہر تیسرے، چوتھے دن سرکاری دوروں پر جانے لگے۔ وہ کبھی دو دن اور کبھی تین دن کے بعد واپس آتے تھے۔

ایک دن میری ساس کا فون آیا تو وہ مجھ سے بولیں۔

”دلہن، کیا عرفان آ گیا؟“

”اماں، وہ تو پرسوں سے سرکاری دورے پر گئے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”سرکاری دورہ؟“ میری ساس حیرت سے بولیں۔ ”لیکن عرفان تو دو دن سے یہاں تھا۔ دوپہر میں گاڑی لے کر یہاں سے نکلا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک کراچی پہنچ چکا ہوگا۔“

”اماں، شاید وہ آتے ہوئے اپنے دفتر کی طرف چلے گئے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آئیں گے تو میں آپ کی بات کرا دوں گی۔“

تھوڑی دیر بعد عرفان آ گئے میرا موڈ آف تھا۔ اگر انہیں میرپور خاص جانا تھا تو مجھے بتاتے، میں بھی وہاں کا چکر لگا لیتی۔

”کیا بات ہے سارو؟“ عرفان نے پوچھا۔ ”تم کچھ ناراض لگ رہی ہو؟“

”میری ناراضی کو چھوڑیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ پہلے اماں سے بات کریں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ آپ دو دن سے میرپور خاص میں تھے۔“

”ہاں، تو، پھر؟“ عرفان ایک دم مشتعل ہو گئے۔ ”کیا میں اپنے ماں باپ سے ملنے نہیں جا سکتا؟“

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ میں نے کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی۔“

”تم کیوں میری جاسوسی میں لگی رہتی ہو؟“ عرفان جھنجلا کر بولے۔ ”اب میں ہر ہفتے میرپور خاص جاؤں گا،

www.urdusoftbooks.com

دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکو گی۔'' سمجھ گئی کہ ان کے دل کا چور بول رہا ہے۔ ''جاہل عورت، سمجھتی ہی نہیں کہ میری کیا ذمے داریاں ہیں۔''

''میں آپ کی ذمے داری کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔

''سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو، اب میں ہر ہفتے میر پور خاص جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

میں دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر تو انہوں نے معمول بنا لیا کہ وہ ہفتے کی شام کو میر پور خاص جاتے تھے اور پیر کی صبح وہاں سے لوٹ آتے تھے۔

معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ میں نے فرحانہ سے مشورہ کیا اس نے کہا کہ تم جا کر عرفان کی پھپھو اور پھوپا کو سب کچھ صاف صاف بتا دو، یا پھر اپنی ساس کو اعتماد میں لے لو۔''

''نہیں فرحانہ۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مجھے دھمکی دے چکے ہیں کہ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔''

فرحانہ نے مجھے تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

زینت نے مجھے عجیب مشورہ دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سپر ہائی وے کے نزدیک تھانہ بولا خان کے علاقے میں ایک بہت کرامت والے بزرگ ہیں۔ وہ ایسا تعویذ دیتے ہیں کہ......

''جہالت کی باتیں مت کرو زینت۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ سب پیر فقیر صرف لوگوں کو لوٹنے کے لیے بیٹھے ہیں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، کسی بابا یا عامل کی مرضی سے نہیں۔ یہ سب ڈھکوسلا ہوتا ہے لوگوں کو لوٹنے کا۔''

''لیکن بیگم صاحبہ۔'' زینت نے کہا۔ ''شاہ جی کسی بھی ضرورت مند سے ایک پیسا بھی لینا حرام سمجھتے ہیں۔''

''اچھا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ بغیر پیسوں کے خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں تو خود کھاتے کہاں سے ہیں؟''

''ان کی تھوڑی بہت زمین ہے، اس کی آمدنی پر گزارہ کرتے ہیں۔'' زینت نے کہا۔ ''آپ ایک دفعہ چل کر تو دیکھیں۔ اگر کام ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کا کیا نقصان ہوگا؟''

''وہ کام ہونے کے بعد رقم کا تقاضا کرتے ہوں گے؟'' میں نے کہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ شاہ جی فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں۔

''وہ بعد میں بھی کسی سے کوئی پائی پیسا نہیں لیتے۔ ان کی بس ایک شرط ہے، کام جائز ہونا چاہیے۔ ہمارا کام تو بالکل جائز ہے۔'' زینت نے کہا۔ پھر اس نے مجھے قائل کر ہی لیا کہ میں اس کے ساتھ شاہ جی کے آستانے پر چلوں۔

لمبا سفر تھا، میں ڈرائیور کے بغیر اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی تھی۔ راستے میں گاڑی خراب ہو جاتی یا کوئی ٹائر پنکچر ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟

میں نے حسبِ معمول بچوں کو فرحانہ کے پاس چھوڑا اور روانہ ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور کو ہزار روپے کا نوٹ دے کر کہا۔ ''اکبر خان! یہ پیسے رکھ لو لیکن صاحب کو معلوم نہیں

مدینے کے وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مکہ سے آنے والے مسلمان مہاجرین کی مدد کی۔ انصار کہلائے۔ انصار و مہاجرین کا ذکر قرآن حکیم کی سورۂ الانفال اور سورۂ برأت میں آیا ہے اور لوگوں کو ان کے اتباع کی تلقین کی گئی ہے۔ مدنی زندگی میں اگرچہ مسلمانوں کے یہ دو گروہ تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدا ہی سے ان میں بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو مشورے کے لیے جمع کیا تو مہاجرین نے جاں نثارانہ تقریریں کیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کی طرف دیکھا کیوں کہ ان سے معاہدہ تھا کہ وہ صرف اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ سعد بن عبادہ سردار خزرج نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم تو آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا۔

مرسلہ: فیض محمد۔ سکھر

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

ہونا چاہیے کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

"بیگم صاحبہ!" اکبر خان نے کہا۔ "امارے کو معلوم اے کہ آپ سندھ والے شاہ جی کے پاس جاتا ہے ہم کو شرمندہ مت کرو بیگم صاحبہ، یہ پیسا رکھ لو۔ ام کسی کو بھی کچھ نہیں بتائے گا۔"

ان دنوں شدید گرمی پڑھ رہی تھی۔ میری گاڑی اگر ائرکنڈیشنڈ نہ ہوتی تو میں جھلس کر رہ جاتی۔ سپر ہائی وے پر تو محض آدھا سفر تھا۔ باقی سفر تو کچے میں تھا۔ شاہ جی نے بھی نہ جانے اس ویرانے میں ٹھکانا کیوں بنایا تھا۔

میں صبح نو بجے گھر سے نکلی تھی اور شاہ جی کے آستانے پر پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے تھے۔ اس سے کہیں کم وقت میں تو میں حیدرآباد پہنچ سکتی تھی۔

وہاں بہت سی عورتیں اور مرد موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن سے شاہ صاحب ملنا نہیں چاہتے تھے۔ زینت نے بتایا کہ ان کے کام ناجائز ہوں گے، یہ اس اُمید پر یہاں پڑے ہوئے ہیں کہ شاید شاہ صاحب کو ان پر رحم آجائے۔

شاہ صاحب کا ایک ملازم خاص ایک رجسٹر میں ہر سائل کا نام اور اس کا کام لکھ رہا تھا۔ کئی عورتوں کو اس ملازم ہی نے جھڑک دیا تھا۔

شاہ صاحب کا مکان پختہ اینٹوں کا تھا۔ اس کے سامنے بہت بڑا احاطہ تھا جس میں ایک طرف ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے دریاں بچھی ہوئی تھیں۔

میں ابھی شاہ صاحب کے آستانے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ شاہ صاحب نے مجھے بلا لیا۔

ان کے خدمت گار نے زینت کو وہیں روک دیا۔

میں شاہ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خاصے خوبرو اور جوان آدمی تھے۔ عام پیروں اور عاملوں کی طرح نہ ان کی داڑھی تھی، نہ گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ وہ صاف ستھرے کاٹن کے شلوار قمیص میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے رجسٹر دیکھ کر کہا۔ "تو تمہیں اپنا گھر اجڑنے کا خدشہ ہے؟"

"جی شاہ صاحب۔" میں نے کہا پھر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں بولی۔ "شاہ صاحب! مجھے اس مشکل سے نجات دلا دیں، میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"مشکل سے نجات دلانے والا تو اللہ ہے بی بی۔" شاہ صاحب نے کہا۔ "میں تو بس اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کے بندوں کی خدمت کرتا ہوں۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ "مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے بی بی، میں تمہیں کچھ تعویذ بھی دوں گا اور کچھ عمل بھی بتاؤں گا لیکن میری ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ تم نے اگر یہ عمل ادھورا چھوڑ دیا تو یہ تم ہی پر الٹ جائے گا۔ اس میں تمہارے حوصلے کی آزمائش ہوگی۔ اگر تم نے عمل پورا کر لیا تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔"

انہوں نے مجھے تین تعویذ دیے اور بولے کہ انہیں گھر میں ایسی جگہ دبا دینا جہاں کسی کے قدم نہ پڑیں اور ان پر ہر وقت آگ روشن رہنا چاہیے۔ یہ تعویذ جتنے گرم ہوں گے عمل اتنی ہی جلدی کامیاب ہوگا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک چٹکی میں تھوڑا سا آٹا دیا اور بولے۔ "اس آٹے کو دوسرے آٹے میں اچھی طرح ملا دینا اور روزانہ دوپہر کو تین روٹیاں پکا کر اسے کسی کتے کو کھلا دینا۔ یہ روٹیاں تمہیں سات دن تک پکانا ہوں گی۔ ہاں جو آٹا اس کے باوجود بچ جائے اسے گھر کا کوئی آدمی نہ کھائے بلکہ اسے کسی کنویں یا سمندر میں ڈلوا دینا۔ ایک بات اور، ان تعویذوں کو چاندی کے خول میں بند کر کے زمین میں دبانا اور ان پر کوئلوں یا لکڑی کی آگ جلا دینا۔ آگ جتنی تیز ہوگی، اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ عمل تمہیں اکتالیس دن تک کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی نماز کی پابندی بھی کر سکو تو بہت اچھا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، یہ عمل ادھورا مت چھوڑنا، اللہ نے چاہا تو تمہارا کام ہو جائے گا اور کام نہ ہو تو سمجھ لینا کہ اس میں اللہ کی مرضی نہیں ہے۔ بس اب جاؤ اور میری ہدایات پر عمل کرنا۔

☆☆☆

"یہ سارا بندوبست زینت نے کیا۔ اس نے سرونٹ کوارٹر کے نزدیک خاصہ گہرا گڑھا کھود کر چاندی کے خول میں بند تعویذ اس میں دبا دیے اور اس گڑھے میں کوئلے ڈال کر مجھ سے آگ لگانے کو کہا۔ میں نے کوئلوں پر تھوڑا سا مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔

شاہ جی کا دیا ہوا آٹا میں نے اچھے خاصے آٹے میں ملا کر الگ رکھ لیا۔ روٹیاں سات دن تک مجھے خود پکانا تھیں۔

میں سات دن تک روزانہ تین روٹیاں پکا کر زینت کو دیتی رہی اور وہ چند قدم آگے بڑھ کر وہ روٹیاں باہر سے پڑوسیوں کے کتے کو ڈال دیتی۔ انہیں وہ فوراً کھا جاتا۔ اس کے بعد بھی اچھا خاصا آٹا بچ گیا تھا۔ میں نے وہ آٹا اکبر

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

خان کے حوالے کر دیا کہ اسے سمندر میں ڈال آئے۔ اسے بھی میں نے تاکید کر دی کہ یہ آٹا کوئی انسان نہ کھانے پائے۔

اس کے بعد میں پابندی سے سرونٹ کوارٹر کی طرف جاتی اور تعویذوں والے گڑھے میں کوئلے ڈال دیتی۔ یہ اکتالیس دن کا عمل تھا اس لیے میں نے اکبر خان سے کوئلوں کی پوری بوری منگوالی تھی۔

سات دن گزرنے کے باوجود کچھ نہ ہوا اور عرفان حسبِ معمول میرپور خاص چلے گئے۔ میں مایوس نہ ہوئی اور گڑھے میں کوئلے جھونکتی رہی اور نمازوں کی پابندی کرتی رہی۔

دوسرے ہفتے جب عرفان پھر سوٹ کیس لے کر جانے کو تیار ہوئے تو میں... جھنجلا گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے گڑھے میں بہت سے کوئلے ڈالے اور زینت سے کہا کہ اس آگ کو پنکھا کر کے دہکاتی رہو۔ میں نے اسے ایک ٹیبل فین دے دیا کہ آگ جونہی مدھم پڑنے لگے تم اس میں نئے کوئلے ڈال دینا اور پنکھا چلا دینا۔

مجھے خود پر حیرت ہوئی تھی میں جو کبھی ان عاملوں اور باباؤں کا مذاق اڑایا کرتی تھی، آج خود اس چکر میں پڑی ہوئی تھی۔

عرفان جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو میں نے جھنجلا کر گڑھے میں پڑے کوئلے جھونک کر پنکھا چلا دیا آگ تیزی سے دہکنے لگی میں زینت کو آگ روشن رکھنے کی تاکید کر کے لان میں آ گئی۔

اچانک دروازے پر گاڑی کا ہارن گونجا۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ کھلتے ہی عرفان کی گاڑی اندر داخل ہوئی اور عرفان حواس باختہ سے گاڑی سے اترے اور گرتے پڑتے اندر آ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔

”کیا بات ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے سے پانی کی طرح پسینا بہہ رہا تھا۔

”میرا سر چکرا رہا ہے، سائرہ، میں کمرے میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے اور بستر پر گر سے گئے اور مجھ سے بولے۔ ”مجھے ٹھنڈا پانی لا دو اور اے سی کا تھرمو اسٹیٹ بڑھا دو۔ میرے جسم میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔“

میں نے ان کے لیے ٹھنڈا پانی منگوایا اور اے سی تیز کر دیا۔ کمرے میں اتنی خنکی ہو گئی کہ مجھے سردی لگنے لگی لیکن عرفان نے بنیان تک اتار پھینکی تھی اور وہ بار، بار پانی پی رہے تھے۔

میں آگ مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی اور اسے اکثر دہکا بھی دیتی تھی۔

ایک ہی ہفتے میں عرفان نڈھال ہو گئے۔ وہ برائے نام کھاتے تھے، بس زیادہ وقت پانی پیتے رہتے تھے یا نہاتے رہتے تھے، کہتے تھے کہ میرے جسم میں آگ سی بھر گئی ہے۔ انہوں نے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔ ہفتہ آیا تو میں نے پوچھا۔ ”میں آپ کا سوٹ کیس تیار کر دوں، آپ کو میرپور خاص نہیں جانا؟“

”کیوں جاؤں میں میرپور خاص؟“ عرفان چیخ کر بولے۔ ”اماں، ابا کو خیال ہوگا تو وہ خود مجھ سے ملنے آئیں گے۔“

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور ان کی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ اب تو ان سے چلا پھرا بھی بہت مشکل سے جاتا تھا، وہ باتھ روم بھی میرے سہارے سے جاتے تھے۔ دو ہی ہفتے میں وہ مجھے برسوں کے مریض لگنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور وہ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔

تیسرا ہفتہ گزرا تو وہ بالکل بستر سے لگ گئے اور بولے۔ ”سائرہ، تم اماں اور ابا کو بلا لو۔ شاید میں اب نہیں بچ سکوں گا۔“

ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر آپ کو دوائیں تو دے رہا ہے، آپ انشاءاللہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے اکتیس دن گزر گئے لیکن یہ اکتیس دن میں نے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزارے۔ عرفان کی حالت مردوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی جا کر آگ بجھا دوں اور تعویذ نکال کر پھینک دوں۔ لیکن پھر مجھے شاہ صاحب کی ہدایات یاد آ جاتی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ عمل کو ادھورا کسی بھی حالت میں مت چھوڑنا۔ اس میں تمہاری آزمائش بھی ہے۔

مجھے اُمید نہیں تھی کہ میری آزمائش اتنی سخت ہو گی۔

پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ عرفان سے اب بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا وہ بہت نحیف آواز میں بولتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”میں اماں کو میرپور خاص سے بلوالوں؟“

Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com

''تم نے ابھی تک انہیں اطلاع نہیں دی؟'' وہ مجھے گھور کر بولے۔ ''انہیں بلا لو۔''
''اور شمائلہ کو؟'' میں نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔
''کون شمائلہ؟'' وہ چونک کر بولے۔ ''اچھا وہ پھپو کی بیٹی، اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟''
شام تک امی، ابا کراچی پہنچ گئے۔ شمائلہ ان کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری ساس عرفان کو دیکھ کر رونے لگیں اور بولیں۔ ''دلہن، عرفان کی طبیعت اتنی خراب تھی اور تم نے ہمیں اطلاع بھی نہیں دی۔''
''اماں انہوں نے مجھے خود منع کیا تھا کہ اماں فضول میں پریشان ہو جائیں گی۔''
عمل پورا ہونے میں پانچ دن باقی تھے لیکن عرفان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بار، بار مجھ سے یہ کہہ رہے تھے کہ سائرہ اب میں نہیں بچوں گا لیکن تم فکر مت کرو۔ میں نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ تمہیں اور بچوں کو میرے بعد کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پھر وہ خاموش ہو کر غنودگی میں چلے گئے۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ گلے سے عجیب خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میری ساس بلک بلک کر رونے لگیں انہوں نے یٰسین شریف کا ورد شروع کر دیا۔ میرے سسر بھی باہر بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ بچے بھی بری طرح رو رہے تھے۔ میری آنکھیں بھی بری طرح برس رہی تھیں۔
اچانک عرفان زور، زور سے ہچکیاں لینے لگے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں دیوانہ وار سرونٹ کوارٹر کی طرف دوڑی اور جلتی ہوئی اس آگ میں بالٹی بھر کے پانی ڈال دیا۔
''بیگم صاحبہ، یہ کیا کر دیا آپ نے چار ہی دن تو باقی رہ گئے ہیں، عمل ادھورا کیوں چھوڑ رہی ہیں؟''
''مجھ سے ان کی حالات دیکھی نہیں جا رہی۔ چار دن تو بڑی بات ہے، وہ آج کی رات ہی نکال لیں تو غنیمت ہے، میں نے آگ پر مزید پانی ڈالا اور کفگیر لے کے اس میں سے کوئلے نکال لیے۔ کوئلے نکالنے کے بعد میں نے گڑھا کھود کر تینوں تعویذ بھی نکال لیے اور انہیں بھی پانی کی بالٹی میں ڈال دیا۔ پھر میں روتی ہوئی اندر کی طرف دوڑی۔
اندر کا منظر دیکھ کر میں خوش ہو گئی۔ عرفان بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بشاشت تھی۔ وہ مجھ سے بولے۔ ''سائرہ، مجھے بہت بھوک لگی ہے، کھانا لاؤ۔''

میری ساس خوش ہو گئیں۔ عرفان نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور گہری نیند سو گئے۔
وہ شام تک سوتے رہے شام کو اٹھے تو ان کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھال گئی تھی۔
وہ مجھ سے بولے۔ ''میرا سوٹ کیس تیار کر دو، مجھے میر پور خاص جانا ہے۔''
''اماں اور ابا تو یہیں ہیں، میں نے کہا۔'' آپ میر پور خاص جا کر کیا کریں گے؟''
''بحث مت کرو۔'' وہ چیخ کر بولے۔ ''اماں اور ابا بھی میرے ساتھ جائیں گے۔''
ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے جسم میں کمزوری تھی لیکن چہرے پر بشاشت تھی پھر وہ تیار ہو کر میر پور خاص چلے گئے۔
دو دن بعد مجھے اماں کا فون موصول ہوا کہ دلہن غضب ہو گیا۔ عرفان، شمائلہ کو لے کر لاہور چلا گیا۔ اس نے وہاں اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔
میں سناٹے میں رہ گئی۔ میں شاہ صاحب کے پاس دوڑی لیکن انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا اور بولے۔ ''اب میرے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔''
میں روتی دھوتی واپس آ گئی۔
عرفان نے اپنا ٹرانسفر بھی لاہور کرا لیا اور وہیں سے مجھے طلاق نامہ بھجوا دیا۔
مکان سرکاری تھا اس لیے مجھے خالی کرنا پڑا۔ امی کا مکان موجود تھا۔ میں روتی دھوتی اس مکان میں آ گئی۔
میں نے مکان کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا ہے اور ایک پرائیوٹ فرم میں ملازمت کرتی ہوں۔ ثمین نے انٹر کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔...............اور عمران بھی بہت ذہین ہے۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی ہوں لیکن آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ سب کیا تھا؟ کیا وہ کالا علم تھا یا پھر واقعی کوئی حقیقی علم تھا میں آج بھی ان عاملوں اور باباؤں پر یقین نہیں رکھتی ہوں لیکن میں اپنی ذات پر گزرنے والے واقعات سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا وہ شاہ صاحب بھی واقعی عامل تھے یا پھر کالے علم کے ماہر تھے؟ اگر زندہ ہوتے تو ضرور معلوم کرتی۔

Urdu Soft Books www.urdusoftbooks.com

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

Join us on Google+

Get Notifications About Newly Uploaded Books

Click Here to Join